چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

MAR 2020

قیمت =/90 روپے

Pakistanipoint
Learning Point

عنوان	مصنف	تعارف	صفحہ
خوابناک حقیقت	ثناء شیخ	ایک حقیقی خواب جس کو وہ روزانہ اپنی ڈائری میں لکھتی تھی لیکن جب حقیقت سامنے آئی تو......	18
انگوٹھی کا راز	طارق محمود	برائی کے لبادے میں لپٹی ہوئی عجیب وغریب سبق آموز اور ڈراؤنی داستان ......حیرت	47
موت کا تعاقب	ایس امتیاز احمد	قدم قدم پر لرزاں براندام کرتی رگوں میں خون منجمد کرتی...... حیرت ناک...... کہانی	55
جہنمی دروازہ	راشد نذیر طاہر	رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردیگی	60
پراسرار وادی	فیصل مشتاق	ایک بہت ہی...... اچھوتی کہانی شاید ہی کسی نے اس سے...... پہلے پڑھی ہو	83
منحوس ڈھانچہ	شہزاد خان	دنیائے حیرت کی ایک عجیب کارستانی جس نے لوگوں کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر دیا تھا	91
کالا عمل	افشاں رمضان	سبق آموز اور ایمان افروز حقیقت جسے پڑھنے والے برسوں نہ بھول پائیں گے	99
خطرناک وحشی	ایم الیاس	خوفناک دہشتناک اور خونچکاں بھونچکاں کہانیوں کے متلاشی قارئین کیلئے خونی کہانی	106
چاندی چوک	محمد حمزہ سہیل	حکایات وروایات سے ماخوذ عہد رفتہ کے انمٹ نقوش لئے ایک ناقابل فراموش تحریر	130

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

پیانو	ضرغام محمود	ایک دلکش، دلنشین روح کی روداد جو کہ پڑھنے والوں کو گدگدا کر رکھ دے گی	152
بھٹے کا آسیب	خلیل جبار	حیرتناک خوفناک دہشت ناک کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے..... حقیقی..... کہانی	169
موت کی سرگوشی	مظہرالحق علوی	ایک ایسے..... شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت..... سے نکل آیا تھا	174
پراسرار پٹاری	نشاوقار	دل ودماغ پر خوف کا سکہ بیٹھاتی تحیر انگیز خونچکاں..... بھونچکاں..... ڈراؤنی کہانی	193
بددعا کا آسیب	مونا شہزاد	خودغرضی اور مطلب پرستی کی ایک انٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر کپکپی طاری کردے گی	203
پنکی کی گڑیا	کرن خان	ایک روح کا عجیب وغریب شاخسانہ جس نے اپنے بچوں کے لئے..... قربانی..... دی	210
وادی کا آسیب	ناصر محمود فرہاد	ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز سرد لہر دوڑاتی خوف وہراس کے لبادے میں لپٹی کہانی	217
قوس قزح	ادارہ	قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں.....	227
پہاڑوں کی قسم	عثمان غنی خان	اکثر انسان مستی اور خرمستی کی وجہ سے موت کو گلے لگالیتا ہے دل فگار تحیر انگیز کہانی	232

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈرڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

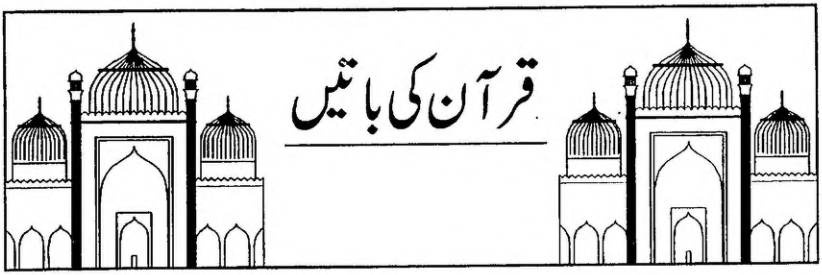

☆ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ ہم اللہ واحد پر ایمان لائے اور جس چیز کو اس کے ساتھ شریک بناتے تھے۔ اس سے نامنعقد ہوتے لیکن جب وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے اس وقت ان کے ایمان نے ان کو کچھ بھی فائدہ نہ دیا۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں کے بارے میں چلی آتی ہے اور وہاں کافر گھاٹے میں پڑ کر رہ گئے۔ (سورۃ مومن 40 آیت 84 سے 85)

☆ مومنوں! اللہ سے ڈرو اور اگر ایمان رکھتے ہو تو جتنا سود باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو خبردار ہو جاؤ کہ تم اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے کے لئے تیار ہوتے ہو اور اگر توبہ کر لو گے اور سود چھوڑ دو گے تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 278 سے 279)

☆ تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے کہ تمہارے رفیق محمدؐ نہ رستے بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ قرآن تو حکم اللہ ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا یعنی جبرائیل طاقتور نے۔ پھر وہ پورے نظر آئے اور وہ آسمان کے اونچے کنارے میں تھے پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔ پھر اللہ نے اپنے بندے کی طرف جو بھیجا سو بھیجا جو کچھ انہوں نے دیکھا ان کے دل نے اس کو جھوٹ نہ جانا کیا جو کچھ وہ دیکھتے ہیں تم اس میں ان سے جھگڑتے ہو اور انہوں نے اس کو ایک اور بار بھی دیکھا ہے پرلی حد کی بیری کے پاس اسی کے پاس رہنے کی بہشت ہے جبکہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی انہوں نے اپنے رب کی قدرت کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔ (سورۃ نجم 53 آیت 1 سے 18)

☆ یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا۔ ''اے چیونٹیوں اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔'' سلیمانؑ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا۔ ''اے میرے رب، مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔'' (سورۃ نمل 27 آیت 18)

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

☆ مومنوں تم کو جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ۔ اور دیکھنا اس نیت سے کہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے کچھ لے لو انہیں گھروں میں مت روک رکھنا۔ ہاں اگر وہ کھلے طور پر بدکاری کی مرتکب ہوں تو روکنا نامناسب نہیں اور ان کے ساتھ اچھی طرح رہو سہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت کرنی چاہو اور پہلی عورت کو بہت سال مال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ مت لینا۔ بھلا تم ناجائز طور پر اور صریح ظلم سے اپنا مال اس سے واپس لو گے؟ اور تم دیا ہوا مال کیونکر واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو اور وہ تم سے عہدہ واثق بھی لے چکی ہیں۔ (سورۃ نساء 4 آیت 19 سے 21)

☆ اور ہم نے داؤد کو اپنی طرف سے بزرگی بخشی تھی۔ اے پہاڑو ان کے ساتھ تسبیح کرو اور پرندوں کو ان کا مسخر کر دیا اور ان کے لئے ہم نے لوہے کو نرم کر دیا کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور کڑیوں کو اندازہ سے جوڑو اور نیک عمل کرو جو عمل تم کرتے ہو میں ان کو دیکھنے والا ہوں اور ہوا کو ہم نے سلیمان کا تابع کر دیا تھا، اس کی صبح کی منزل ایک مہینے کی راہ ہوتی اور شام کی منزل بھی مہینے بھر کی ہوتی اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا تھا۔ (سورۃ سبا 34 آیت 10 سے 12)

☆ اور کسی مومن کو شایاں نہیں کہ مومن کو مار ڈالے مگر بھول کر۔ اور جو بھول کر بھی مومن کو مار ڈالے تو ایک مسلمان غلام آزاد کر دے اور دوسرے مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں تو ان کو اختیار ہے اگر مقتول تمہارے دشمنوں کی جماعت میں سے ہو اور وہ خود مومن ہو تو صرف ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہئے اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو تو وارثان مقتول کو خون بہا دینا اور ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہئے اور جس کو یہ میسر نہ ہو وہ متواتر دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ کفارہ اللہ کی طرف سے قبول توبہ کے لئے ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے اور بڑی حکمت والا ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 92)

☆ وہی تو ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو فرش بنایا اور اس میں تمہارے لئے رستے جاری کئے اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے انواع واقسام کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں کہ خود بھی کھاؤ اور اپنے چارپایوں کو بھی چراؤ۔ بے شک ان باتوں میں عقل والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے دوسری دفعہ نکالیں گے۔ (سورۃ طٰہٰ 20 آیت 53 سے 55)

☆ اور بڑی عمر کی عورتیں جن کو نکاح کی توقع نہیں رہی اور وہ اپنی چادریں اتار کر رکھ دیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں، بشرطیکہ اپنی زینت کی چیزیں نہ ظاہر کریں تاہم وہ بھی حیاداری ہی برتیں تو یہ ان کے حق میں بہتر ہے اور اللہ سنتا جانتا ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 60)

(کتاب کا نام ''قرآن مجید کے روشن موتی''، بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

امرحہ خان ملتان سے، ماہ فروری کا ڈرڈائجسٹ مل گیا۔ ٹائٹل پیج بہت پیارا تھا۔ مجھے اچھا لگا۔ حبیب خان آپ نے جو بھی لکھا۔ بہت خوب لکھا، بلقیس خان کو سالگرہ کی مبارک باد قبول ہو۔ آپ کا خط بے حد پسند آیا۔ خطوط میں جتنے بھی لوگوں نے تبصرے کیے تھے سب بیحد پسند آئے۔ دل نور کا تبصرہ اچھا رہا۔ فریال عروج آپ کا تبصر بھی بہت اچھا لگا۔ شرف الدین کے تبصرے داد کے قابل ہیں، عثمان غنی خان کا خط بھی اچھا لگا اور پسند آیا، کیونکہ بہترین تبصرہ تھا۔ سب کو برتھ ڈے وش کی تھی۔ اس ماہ کی پہلی کہانی خونی آتما بہت بہت اچھی کہانی ہے۔ واقعی شکیل نیازی نے اسپیشل کہانی لکھی ہے۔ مکافات عمل خوبصورت کہانی ہے۔ شہزاد خان آپ نائس لکھ رہے ہیں۔ لاسٹ ڈنر ایس امتیاز احمد بھائی کی لاجواب رہی، یہ بیسٹ کہانی ہے۔ آخری صفحات پر جان لیوا کی لاسٹ قسط پسند آ گئی۔ پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان کو پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ ٹرائی اینگل کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ عثمان غنی خان بھائی بہت اچھی کہانی ہے۔ آخری حصے کا بے صبری سے ویٹ ہے۔ جنون آمیزنگ کہانی ہے۔ خونی کہانی بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ نامکمل سوال بہت نائس کہانی ہے۔ زومبی وری گڈ، مونا شہزاد کا جواب نہیں۔ خاص کہانی ثناء اے شیخ کی لیڈی ٹیکسی ڈرائیور کا پہلا حصہ دسواں ستون رہی، جو کہ اب شائع ہوئی۔ ویسے دستواں ستون کمال ہے۔ مکافات عمل کہانی بے حد عمدہ زبردست ہے۔ شمارہ عثمان غنی خان، ایس امتیاز، ثناء اے شیخ، شکیل نیازی کے نام رہا۔

☆☆ امرحہ صاحبہ: دل کی گہرائی سے لکھا ہوا تجزیہ پڑھ کر اچھا لگا، عثمان غنی خان واقعی ہر دل عزیز ہیں اللہ اور زیادہ زور قلم دے۔

بینا خان اسلام آباد سے، فروری کا ڈر بہت جلد مل گیا۔ قرآن کی باتیں بہترین ہیں، خطوط کی محفل بے حد پسندیدہ ہے جہاں آپ سے اور باقی سب سے ملاقات تو ہو جاتی ہے۔ وہاں کچھ نوک جھونک بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ بلقیس خان، عثمان غنی خان، ایس حبیب خان، شرف الدین، عامر شہزاد، دل نور عبیر، بینا خان، کرن، عنادل شہریار، مون بخاری، ایس امتیاز، سردار اعظم، فریال عروج، بسما خان، کائنات بلوچ، کے خطوط دل کی گہرائیوں سے پسند آئے، آپ سب کو سلام! ڈر کا شمارہ اس ماہ کا اچھا تھا، جتنا پڑھا اس پر تبصرہ کر دوں۔ عثمان غنی خان، آپ کو ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔۔۔!! یہ آپ کی کریزی فین لیٹ وش کر رہی ہے۔ بلقیس خان کو بھی سالگرہ ، مبارک ہو۔ خونی آتما کہانی نے خوب پزیرائی پائی، نیا موضوع اور اچھے انداز میں چونکا گئی۔ مکافات عمل بھی پسند آئی۔ خونی کہانی بورنگ رہی، زومبی اچھی اور گڈ لکھا۔ آسیبی ڈھانچہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آسکی، کالا جادو پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ جنون بالکل بھی پسند نہ رہی تھی۔ خوف نگر بہت نائس تھی۔ نامکمل سوال ویلڈن گڈ اچھی اسٹوری لکھی۔ حقیقت بہت بہت اچھی تھی۔ دستواں ستون کا اچھوتا موضوع تھا، بہترین عمدہ اور خاص کہانی تھی، ثناء اے شیخ گڈ۔ ایس امتیاز احمد کی لاسٹ ڈنر پڑھ میں حیران رہ گئی ہو۔ واؤ نئی قسط وار کہانی۔ جان لیوا آخری قسط بہت اچھی لگی۔ موت کی سرگوشی قسط نمبر ۲ مزے دار تحریر ہے، عثمان غنی خان، پہاڑوں کی قسم اول حصہ گریٹ، شینل کو کچھ کرنا چاہیے۔ اس کی مدد اس بار امسواک کرے گا۔ مگر میمل کو سبق سکھانا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ میمل نام جتنا اچھا لگا، اس کا کردار اتنا ہی برا لگا۔ اتنی اچھی کہانی پر مبارک باد قبول کریں۔

☆☆ بینا صاحبہ: آپ کا تجزیہ پڑھ کر اچھا لگا، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thaks۔

بسما خان نوشہرہ وا کینٹ سے، السلام علیکم .....!! ماہنامہ ڈر فروری کا جلد مل گیا، سب کو سلام، سب کے خطوط بے حد پسند آئے، ایس حبیب خان نے جو کچھ بھی لکھا، وہ داد کے قابل ہے۔ عثمان غنی خان بہت پیارا تبصرہ لکھا ہے۔ میری طرف سے بھی آپ کو برتھ ڈے مبارک ہو۔ بلقیس خان، ساحل دعا سب کو سالگرہ مبارک ہو۔ اس ماہ کا شمارہ بے حد اچھا ہے۔ پہلی کہانی خونی آتما سب سے پہلے پڑھی۔ کہانی بہت اسپیشل ہے۔ ایس تمیاز احمد کی لاسٹ ڈنر بھی اچھی کہانی ہے، آپ ہمیشہ نت نئے انداز میں لکھتے ہیں، دل جیت لیتے ہیں۔ دستواں ستون ثناء اے شیخ گڈ، آپ کو کہانی پر مبارک باد قبول ہو۔ کامیاب کہانی لکھ کر دل جیت لیا ہے۔ پہاڑوں کی قسم کہانی بہت اچھی اور شاندار و جاندار تھی، عثمان غنی خان، آپ کی کہانی دل سے پڑھی، شینل کو میمل نے دھکا دیا۔ مگر وہ بچ گئی۔ اب میمل کی شادی کروا کر اسے دفع کر کے عزام اور شینل کو ملوا دے۔ ورنہ میں نے ناراض ہو جانا ہے۔ خطرناک وحشی قسط نمبر ۱۳ اب پسند آ رہی ہے۔ آخری قسط جان لیوا کی اچھی رہی۔ موت کی سرگوشی دوسری قسط بہت زبردست جا رہی ہے۔۔ والسلام

☆☆ بسمہ صاحبہ: دل سے لکھا ہوا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، آئندہ ماہ بھی خط لکھنا نہ بھولئے گا۔

دل نور عبیر کو ہاٹ سے، ڈیئر ایڈیٹر السلام علیکم! ڈرفرڈ ڈائجسٹ جلدی مل گیا۔ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ اداریے نے جو قرآن کی باتیں دی تھیں، پہلے وہی پڑھیں۔ پھر خطوط کی طرف چلے آئے، ارے واہ۔۔۔۔!!! عثمان غنی خان کو پیاری سالگرہ مبارک ہو، آپ بہت اچھا خط لکھتے ہیں۔ بلقیس خان آپ کا تبصرہ بہت پیارا ہوتا ہے، ایس حبیب خان آپ دل کی گہرائیوں سے مطالعہ کرتی ہیں۔ ضرغام محمود آپ کی محبت ہے۔ جو اتنا خاص خط لکھا۔ مجھے لگتا ہے۔ مون بخاری آپ کا خط بھی پیارا تھا، عنادل شہریار آپ کا خط اچھا ہے۔ سردار اعظم خان آپ کا تبصرہ بھی بہت مثبت ہوتا ہے۔ مسز خائستہ کا تبصرہ اچھا تھا، فلک زاہد آپ کی نئی کہانی کا ہمیں بے حد انتظار ہے۔ شمارے میں پہلے صفحات پر موجود خوبی آتما بہت نائس لگی۔ پہاڑوں کی قسم اول پارٹ عثمان غنی خان کی ایک اور بہترین بے مثالی کہانی جس کے ہر کردار کا نام بہت پیارا لگا، کہانی بہت آمیزنگ، اور اچھی لگی، کہانی اول سے آخر تک زبردست رہی۔ آخری قسط آخری کا بے صبری سے انتظار ہے۔ دسواں ستون کہانی نے الجھایا، کیونکہ اس کا ایک پارٹ دسمبر میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ یہ ایک جاندار اور اچھی کہانی ہے۔ زومی اس جیسی کہانیاں کم کم لکھی جاتی ہے۔ لاسٹ ڈنر امتیاز احمد کی بے حد خوبصورت کہانی نے دل موہ لیا۔ موت کی سرگوشی قسط نمبر ۲ کہانی مزے کی ہے۔ جان لیوا چلی گئی۔ مگر ہمیشہ یاد رہے گی۔

☆☆ دل نور صاحبہ: آپ کا ہر ماہ خط پڑھ کر اچھا لگتا ہے، امید ہے ہر ماہ ضرور خط لکھا کریں گی۔ Thanks۔

فریال عروج کو ہاٹ سے، قرآن کی باتیں بہت خوبصورت اور دیدہ زیب لگیں، دل میں سکون پہنچانے کا سبب بن گئی، خطوط کی محفل میں پہنچے۔ ویلڈن عثمان غنی خان! لاجواب انداز اور وش کرنے کا انداز نے تو دل میں ہلچل سی مچا دی۔ سالگرہ مبارک ہو۔ روہانیہ خط آپ اچھا لکھتی ہیں۔ عنادل شاہ آپ کا خط بے حد پیارا لگا۔ ضرغام محمود آپ کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ شرف الدین انکل دل جیت لیا، سردار صاحب کا تبصرہ بھی ٹھیک تھا۔ اللہ سب کو خوش رکھے۔ سب کو سلام قبول ہو۔ اس ماہ فروری کی کہانیاں کافی اچھی تھیں۔ پہلی کہانی خونی آتما شاہکار تحریر ثابت ہوئی۔ کہانی بے مثال تھی، اختتام چونکانے والا تھا۔ پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان کی لکھی اس کہانی نے میرا دل جیت لیا۔ دسواں ستون ثنا اے شیخ اس کہانی نے دل جیت لیا ہے۔ لیڈی ٹیکسی ڈرائیور کا پہلا پارٹ بعد میں لگا۔ زومی دل سے پڑھنے والی تحریر ہے۔ خونی کہانی اچھی ہے۔ ایس امتیاز احمد لاسٹ ڈنر نے دل میں جگہ کر لی۔ خطرناک وحشی قسط نمبر ۳ بھی اچھی لگی، اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گی۔ ۱۱ ماہ کے اچھے لکھاری عثمان غنی خان، ایس امتیاز احمد، شکیل نیازی، ثنا اے شیخ، نے اس ماہ بہترین تحریریں لکھیں۔

☆☆ فریال صاحبہ: آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ویلڈن، آئندہ ماہ بھی دلکش تبصرے کا انتظار رہے گا۔

کائنات بلوچ بلوچستان سے، السلام علیکم! ڈرفروری کا ڈائجسٹ مل گیا، دل خوشی سے جیسے پاگل ہو گیا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھی کافی دل کو سکون عطا کر گئی۔ پھر خطوط کی محفل میں چلے گئے، عثمان غنی خان بہت بہت پیارا تھا، بلقیس خان آپ بے حد اچھا لکھتی ہیں، ایس حبیب خان آپ کا جواب نہیں۔ ضرغام محمود صاحب آپ نے جو بھی لکھا، مثبت لکھا۔ ویسے باقی سارے خطوط بھی اچھے تھے۔ شرف الدین، دل نور آپ نے اچھا لکھا، نرن خان آپ اچھا لکھ رہی ہے۔ امر حد خان آپ کا خط پسند آیا۔ ذیشان سمیر کا خط بہت بہت اچھا لگا۔ بلال کا خط نائس تھا، روہانیہ عامر کا خط اچھا ہے، فریال عروج آپ کا خط اچھا ہے، سردار اعظم، صبا رمضان، کا پیارا خط تھا، خونی آتما پہلی کہانی بہت پیاری رہی، شکیل نیازی نیا انداز اپنا کر دل خوش کر دیا۔ مکافات عمل بہت اچھی لگی۔ خونی کہانی یہ کہانی ڈرکی جان دار کہانی ہے۔ کالا جادو کہانی خوب تر رہی، زومی بہت ہی پیاری تحریر رہی، جنون بھی اچھی کہانی لکھی۔ خاص کہانیوں میں اس ماہ لاسٹ ڈنر بہت خوب رہی۔ پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان عمدہ کہانی لکھ کر کامیابی برقرار رکھی۔ دسواں ستون ثنا اے شیخ کی تحریر بہت اچھی نائس لگی۔ جان لیوا کی آخری قسط مزے کی تھی۔ موت کی سرگوشی قسط نمبر دو بھی اچھی لگی، اس ماہ بہترین لکھاری، عثمان غنی خان ایس امتیاز احمد، اور ثنا اے شیخ اور شکیل نیازی نے بہت بہت اچھا لکھا ہے۔

☆☆ کائنات صاحبہ: آپ نے بھی اس ماہ بہت خوب تجزیہ پیش کیا اور دل خوش کر دیا۔ ویلڈن۔

خانسہ غیور سوات سے، ماہ فروری کا ڈرڈائجسٹ بہت جلد ملا، اور اس بار کور بہت پیارا تھا، ڈر جلد ملنے کی خوشی بہت ہوئی، اور اس ماہ خطوط کافی سارے تھے۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے شروعات کی، پھر خطوط کی محفل میں آئے، ارے واہ بہت اچھے تبصرے تھے، سب کو خوش آمدید اور سب کو سلام، اس بار خطوط میں عثمان غنی خان نے اچھا اور مثبت تبصرہ لکھ کر گوڈوں گوڈوں جیت لیا۔

ایس حبیب خان کا تبصرہ دیکھ کر خوشی سے بے حال ہوگئی۔ بلقیس خان کا تبصرہ بھی بہت عمدہ اچھا، نائس اور پوز یٹو تھا۔۔!! شرف الدین کا خط بے حد پسند آیا۔ ثنا اے شیخ، آپ بہت لکھ رہی ہیں۔ سب کے تبصرے بس ٹھیک اور اچھے تھے۔ اس بار ڈر میں جن کہانیوں نے دل جیت لیا۔ خونی آتما سب سے پہلے پڑھی۔ بہت اچھی مزے دار کہانی ہے۔ مگر آتما جیت گئی، بیوی ہار گئی۔ خونی کہانی بے حد مزے دار کہانی رہی، مکافات عمل بہت عمدہ لکھا۔ کالا جادو اچھی لکھی، زوسی نے واقعی آمیزنگ کی۔ پہاڑوں کی قسم حصہ اول عثمان غنی خان کی کہانی اچھی رہی۔ ایس امتیاز احمد کی لاسٹ ڈنر کہانی نے بہترین کہانیوں میں اپنے آپ کو منوایا اور کامیاب ترین رہی۔ بہترین کہانی دسواں ستون ثنا اے شیخ کی اچھی رہی۔ جان لیوا اچھا اینڈ ہوا۔

☆☆ خانسہ صاحبہ: آپ نے تبصرہ کر کے دل جیت لیا، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا بہت انتظار رہے گا۔

مہرینہ غلام علی بدین سے، السلام علیکم۔۔۔!!! امید واثق ہے کہ ادارہ بخیر و خیریت ہوگا، ڈر کا نیا شمارہ جلد مل گیا، بلقیس خان آپ کو سلام، اور آپ کی سوچ کی قدر کرتے ہیں۔ عثمان غنی خان، آپ میرے فیورٹ رائٹر ہے، سالگرہ بہت مبارک ہو، دل جلانے والے انداز میں آپ جو کہانیاں لا رہے ہیں۔ وہ بہت زبردست ہیں۔ حافظہ مون شاہ آپ کو اللہ اچھی صحت اور زندگی دے آمین! عنادل شہریار کیا آپ بھی رمضان فیملی کا حصہ ہیں؟ فریال عروج بہت اعلیٰ تبصرہ پیش کیا تھا۔ اول صفحات پر خونی آتما بہت بے مثال تحریر ہے۔ ویلڈین۔ خونی کہانی بہت اچھی تھی، پہاڑوں کی قسم حصہ اول عثمان غنی خان جہاں تک اینڈ میں سوالات ہے۔ تو میرے خیال میں کہانی کے یہ جوابات آپ ہی دے سکتے ہیں۔ مگر شینل کے ساتھ کچھ بھی برا نہیں ہونا چاہیے۔ نامکمل سوال بھی ٹھیک ٹاک تھی۔ آسیبی ڈھانچہ کو بس جلدی ختم کیا، حقیقت پسند نہ آسکی۔ دسواں ستون بھی بیسٹ تھی۔ خونی کہانی بالکل بیاری تھی، لاسٹ ڈنر ایس امتیاز احمد کی بھی پسند آئی۔ جان لیوا بہترین انداز میں ختم ہو ہی گئی۔

☆☆ مہرینہ صاحبہ: دل کی گہرائی سے لکھا ہوا تجزیہ پڑھ کر دل خوش ہوگیا، امید ہے آئندہ بھی اچھا تبصرہ ضرور پیش کریں گی۔

مسز خانستہ رحمان مدین بحرین سے، اس ماہ کا ڈر بہت جلد ملا، کور بہت پیارا تھا، سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے شروعات کی۔ پھر خطوط کی محفل میں آئے، عثمان غنی خان کا خط بے حد اچھا لکھا تھا۔ جیسے بہار آگئی ہو۔ ایس حبیب خان کا لاجواب خط بھی من کو بھایا۔ سب کو خوش آمدید.....!!! اور سب کو سلام۔ ویسے سب نئے اور پرانے آنے والوں کو پھر سے ویلکم بیک۔ اس بار خطوط سب کے اچھے تھے، اس ماہ اول صفحات پر خونی آتما قابل قدر تحریر تھی، بہت اچھی کہانی ہے۔ زوسی گڈ بیاری دل سے سراہنے والی تحریر ہے۔ مکافات عمل اچھا اور نیا موضوع ہے۔ خونی کہانی بھی اچھی کہانی ہے، پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان کی کمال کی تحریر ہے۔ مجھے بے حد پسند آئی، ایس امتیاز احمد، لاسٹ ڈنر کہانی بہترین کہانیوں میں ایک اچھوتی تحریر رہی۔ دسواں ستون ثنا اے شیخ واؤ۔۔۔!! یو آر گریٹ رائٹر۔۔۔!! کیا کمال لکھتی ہو۔۔۔!! کہانی بہت بہت اچھی لگی۔۔۔!! جان لیوا آخری قسط پڑھ کر دل خوش ہوگیا۔۔۔!! وسلام!

☆☆ خانستہ صاحبہ: جی ہاں اور آپ کا خط پڑھ کر بھی دل بہت خوش ہوا، آئندہ ماہ بھی دلکش تبصرے کا انتظار رہے گا۔

نوری بشریٰ یونی ٹاؤن سے، السلام علیکم۔۔۔!!! ڈر ڈائجسٹ فروری کا مل گیا، ٹائٹل اچھا تھا، پہلے قران کی باتیں پڑھیں، پھر خطوط کی محفل میں چلے آئے۔ عثمان غنی خان صاحب بہت اچھا پیارا اور دل سے سراہنے والا تبصرہ تھا، دل خوش کر دیا۔ آپ کو بھی سالگرہ بہت مبارک ہو۔ بلقیس خان دل سے آپ کا محبت پارہ پڑھا۔ امرحہ خان، کا تبصرے دل کو چھو گئے، ایس حبیب خان کا لکھنے کا انداز بہت اچھا ہے، ویسے فلک زاہد، کی کمی خطوط میں محسوس ہوتی رہی، خانسہ، ایس امتیاز، سردار اعظم، مہرینہ، کرن خان، حما خان، امرحہ، فریال، دل نور ذیشان سمیر، روبانیہ عامر، شرف الدین جیلانی، کے خطوط بھی پسند آئیں۔ اس ماہ کا ٹائٹل بہت پیارا ہے۔ اول صفحات پر خونی آتما موجود تھی، ڈرتے ڈرتے شروعات کی، مگر بے ساختہ مسکراہٹ کا سبب بنی۔ بے حد پسند آئے، مکافات عمل اچھی کہانی تھی۔ خونی کہانی پسندیدہ کہانی مجھے پسند آگئی، زوسی بہت اچھی کہانی رہی۔ نامکمل سوال کہانی کافی اچھی لکھی ہے۔ دسواں ستون ثنا اے شیخ بہت پیاری تحریر تھی، گڈ اور نائس اسٹوری لکھی۔ ایس امتیاز احمد کی لاسٹ ڈنر نائس رہی۔ پہاڑوں کی قسم، عثمان غنی خان کو پڑھ کر کہانی کا اندازہ ابھی لگا ہی رہے تھے کہ باقی آخری حصہ آئندہ ماہ نے خوب منہ کڑوا کرلیا۔

☆☆ نوری بشریٰ صاحبہ: آپ کا منہ کڑوا ہوا اس کے لیے عثمان غنی سے ضرور معلوم کریے گا۔ خیر اینڈ پڑھ کر دل خوش ہو جائے گا۔

روحانیہ عامر مردان سے، ہیلو ایوری ون! فروری کا شمارہ مل گیا، دل خوشی سے جیسے پاگل ہوگیا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں

پڑھیں، کافی دل کو سکون عطا کرگئیں۔ پھر خطوط کی محفل میں چلے گئے، عثمان غنی خان نے جاندار تبصرہ کرکے دل جیت لیا ہے۔ ویلڈن۔۔۔!! بہت زیادہ اچھا لکھا۔ عثمان غنی خان آپ کو دل کی گہرائیوں سے سالگرہ مبارک ہو۔! ضرغام محمود صاحب آپ جو کہہ رہے ہیں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ بڑے دل کے مالک ہیں۔ ویسے آپ واقعی میں اچھے لکھاری ہیں۔ پہلی کہانی خونی آتما اچھے انداز میں تحریر کی گئی تھی۔ شکیل نیازی نے کمال اینڈ کرکے کمال کردیا۔ دسواں ستون ثنا اے شیخ کی کہانی بہت اچھی اور بہترین تھی۔ ویلڈن۔۔۔!! خونی کہانی بھی ایک بہترین اور اچھی کہانی ہے۔ پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان نے دل میں جیسے گھر کرلیا ہے۔ بہت خاص الخاص تحریر ہے، دوسرے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے دل سے پسند آگئی ہے۔ عثمان غنی خان بھائی آئندہ بھی اس جیسی کہانیاں ضرور لکھئے گا۔

☆☆ روحانیہ صاحبہ: امید ہے کہ اب عثمان غنی اینڈ لکھ کر سب کو خوش کردیں گے کیوں ٹھیک ہے ناں۔

سردار اعظم خان چترال سے، ڈر کا نیا شمارہ جلدی مل گیا، قرآن کی باتیں، ہمیشہ کی طرح سب سے بہترین رہیں، کہانیوں میں اس بار بھی کچھ ریگولر لکھاریوں کی تحریریں موجود تھیں، سب سے پہلے خطوط کی بات کرتے ہیں۔ عثمان غنی خان آپ نے کمال کا تجزیہ لکھ کر ہمارا جیت لیا ہے۔ اور ساتھ میں اپنے قارئین کا بھی، اللہ آپ کی تمام مرادیں پوری کریں۔ آمین، ڈر کی محفل میں سب دوستوں کو خوش آمدید.....! سب کو سلام۔ بلقیس خان بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ جس نے اچھی باتیں کرکے دل جیت ہی لیا۔ باقی اچھے تبصرہ نگاروں میں کائنات بلوچ، مسز خائستہ رحمان، مہرینہ، بسما، بینا، کرن، ھما اور عامر شہزاد، عنادل شہریار، کا نام قابل ذکر رہا ویلڈن۔۔۔!! آپ کے خطوط بہت خوبصورت تھے بہت پسند آئے۔ خونی آتما کو پڑھنا شروع کردیا اور روانی میں پڑھتے چلے گئے۔ کہانی میں آتما کا پیار جیت گیا، اور ایک انسان کو ہرادیا۔ بہت عجیب سی اینڈنگ تھی۔ پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان کی تحریر نے چھکے چھڑا دیے، دسواں ستون ثنا اے شیخ کی بے حد مزے دار انوکھی واچھوتی تحریر ہے، کیا بات ہے، مزہ آگیا پڑھ کر۔ ایس امتیاز احمد بھائی کی لاسٹ ڈنر واقعی بہت زبردست آمیزنگ کہانی ہے۔ زومبی اچھی لگی ہے، زبردست تحریر ہے۔ قسط وار جان لیوا کی آخری قسط مزے کی ہے۔ خطرناک وحشی قسط نمبر ۱۳ ایم الیاس صاحب کی بھی نائس رہی۔

☆☆ سردار اعظم صاحب: لاجواب خط کا جواب نہیں اچھا خط لکھ کر دل خوش کردیا۔

ذیشان سمیر گلاب ٹاؤن سے، فروری کا شمارہ اس بار جلدی ملا، خطوط کی محفل میں اچھے خطوط تھے۔ خطوط میں، عثمان غنی خان بہت اچھی باتیں لکھی ہیں، آپ کو بھی سالگرہ کی مبارکی قبول ہو۔ فلک کو مس کیا، بلقیس خان کا تو جواب ہی نہیں، ایس حبیب خان پلیز نئی کہانی! اس ماہ، کائنات بلوچ، امرحہ خان، بینا خان، بلال، دل نور، فریال عروج، مہرینہ غلام، کرن، ہما خان، عنادل شہریار، کے خطوط پسند آئے۔ اول کہانی خونی آتما نے خوب رنگ جمایا، کہانی کا اینڈ کچھ سمجھ سے بالاتر تھا۔ مگر روایتی نہیں تھا۔ پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان بھائی بالکل بھی اندازہ نہیں تھا۔ پہلا حصہ ہے۔ ورنہ تبصرہ محفوظ کرلیتے۔ کہانی نے اس بار بھی خوب رنگ جمایا۔ بہت اچھی اسٹوری لکھی ہے۔ دسواں ستون، یہ جاندار وشاندار تحریر ہمیشہ یاد رہے گی۔ زومبی کہانی کو دل سے پسند کررہا ہوں۔ خونی کہانی بے ربط سی تحریر جلد بازی میں ختم ہوئی، کالا جادو پسندیدہ کہانی رہی۔ ایس امتیاز احمد لاسٹ ڈنر بھی بے حد پسند آئی۔ لاجواب کہانی لکھی ہے۔ آسیبی ڈھانچہ بے حد پسند آئی۔ موت کی سرگوشی قسط نمبر دو بہت اچھی ہے، اگلے قسط کا انتظار ہے۔ جان لیوا تمام ہوگئی۔ میرا دل خوش کردیا۔ یہ تحریر بہترین تھی، اور ایک بہترین موڑ پر ختم ہوگئی۔

☆☆ ذیشان صاحب: بہت خوب اور آپ کا خط بھی، بہترین موڑ پر ختم ہوا اور دل خوش کردیا۔

عبدالرؤف ہائی وے تاروجبہ سے، السلام علیکم......!!! فروری کا ڈائجسٹ جلدی مل گیا، ٹائٹل اچھا تاثر دے رہا تھا، کہانیوں کی فہرست دیکھی، پھر خطوط کی محفل میں آگئے۔ ایس حبیب خان اللہ آپ کی ماں کا سایہ سلامت رکھے۔ بلقیس خان جو کچھ بھی کہا، ٹھیک کہا، اور اچھے انداز میں سب کو سمجھایا۔ شہزاد خان خط لکھنے کا انداز بہت اچھا ہے، عثمان غنی خان میرے خیال میں ڈر آپ کے بنا ادھورا ہے۔ فلک زاہد کیوں نہیں لکھا، شرف الدین جیلانی کا بالکل خط پسند آیا، دل نور، بلال تابش، خانسہ غیور، بینا خان، کے تبصرے دل کو چھو گئے۔ اس ماہ کہانیوں میں یہ کہانیاں مجھے بہت اچھی لگیں پہلی کہانی خونی آتما بہت اچھی تھی۔ مکافات عمل اچھی کہانی تحریر تھی، زومبی بھی اچھی تھی۔ کالا جادو گڈ تحریر، کوئی کہانی کمال کہانی ہے۔ دستواں ستون ثنا اے شیخ ویلڈن کہانی زبردست ہے۔ آسیبی ڈھانچہ ناپسندیدہ

Pakistanipoint.com

تھی، حقیقت کہانی بالکل بے مزہ تھی، جنون ڈر کے عین مطابق تھی، خوف نگر میری من پسندیدہ رہی۔ نامکمل سوال بہت آمیزنگ اسٹوری تھی، پہاڑوں کی قسم ایک ہی سانس میں پڑھی، ویلڈن، دل جیت لیا۔ عثمان غنی خان کی کہانی روانی میں پڑھی، خوبصورت دیدہ زیب کہانی جس کا جواب نہیں۔

☆☆ عبدالرؤف صاحب: دل سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دل جھوم اٹھا اور بہت خوش ہوا۔ ویلڈن۔

ابرار بشیر یونی ٹاؤن سے، السلام علیکم ڈر ڈائجسٹ فروری کا جلدی مل گیا، اس ماہ کا ٹائٹل کافی شاندار تھا۔ خطوط میں بلقیس خان، عثمان غنی خان، عامر شہزاد، سردار اعظم، زیشان سمیر، کرن خان، شرف الدین، الیس حبیب خان، کائنات بلوچ، مہرینہ غلام، بسما خان، امرحہ خان، بیناخان، کے تبصرے دل کو چھو گئے۔ پھر کہانیوں کی طرف گئے۔ عثمان غنی خان کی نئی کہانی پہاڑوں کی قسم سب سے پہلے پڑھی۔ ادا اسٹوری ہونے کے باوجود دل سے انجوائے کی، اس کہانی کی ہیپی اینڈنگ چاہیے۔۔۔!! ورنہ میں نے ناراض ہو جانا ہے۔ دل سے پسند آئی، نئے انداز میں طرز تحریر لکھ کر ثنا اے شیخ چھا گئیں۔ ایم الیاس کی خطرناک وحشی بالکل بھی بارنہیں ہے، مگر پسند آئی، جان لیوا کا اینڈ کر کے دل خوش کر دیا۔ زومبی پسند آئی۔ ویلڈن مونا شہزاد۔ خونی آتما بہترین رہی، واہ مزہ آگیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوگئی۔ حقیقت بس ٹھیک تھی۔ نامکمل سوال بھی اچھی کہانی ہے۔ لاسٹ ڈنر بے حد پسند آئی۔ خوف نگر اچھی کہانی ہے۔ جان لیوا کی آخری قسط پسند آگئی۔

☆☆ ابرار صاحب: دل کی گہرائی سے لکھا ہوا تجزیہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ۔

بلال تابش کوہاٹ سے، فروری کا شمارہ جلدی ملا، خطوط کی محفل میں اچھے خطوط تھے، ویلڈن جی۔۔۔!! عثمان غنی خان آپ کا خط بہت اچھا اور مثبت ہوتا ہے۔ سالگرہ مبارک ہو۔ مہرینہ، امرحہ، روہانیہ، کرن، ماریہ مسعود، مون بخاری، عامر شہزاد، سردار اعظم، الیس حبیب خان، عنادل شہریار، سنبل، شرف الدین، ضرغام محمود وغیرہ کے خطوط اچھے اور پسند آئے، سب کے اشعار وانتخابات بھی بہت بہت پسند آئے۔ آرٹیکل بھی اچھے لگے۔ لطائف بہت پیارے تھے۔ ٹائٹل کور بہت پیارا تھا۔ ڈرخونی آتما سے شروع کر دیا، کہانی میں بھرپور مزے دار سین تھے۔۔۔!! اینڈ الگ سا تھا۔ جیسے عموماً ہالی وڈ ہارر موویز کا ہوتا ہے۔ پہاڑوں کی قسم عثمان غنی خان نے توقعات سے بڑھ کر لکھا، عثمان غنی خان، پہاڑوں کی قسم کے تینوں کردار کے نام بہت خاص رکھے ہیں۔ خاص کر کاشینل نام کا جواب نہیں، آپ اتنے اچھے نام کہاں سے ڈھونڈ لیتے ہیں؟ مائی فیوریٹ رائٹر، پلیز شینل کو کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ خونی کہانی، نے دل جیت لیا۔ زومبی اچھی بہترین کہانی رہی۔ نامکمل سوال میری من پسند کہانی رہی۔ جان لیوا کی لاسٹ اینڈنگ کمال کی تھی۔

☆☆ بلال صاحب: آپ کا خوبصورت تجزیہ باکمال ہے، آئندہ بھی ایسا ہی تبصرہ لکھئے گا۔ شکریہ۔

عثمان غنی خان پشاور سے، فروری کا ڈر اس ماہ جلد مل گیا۔ ٹائٹل بہت زیادہ پیارا تھا۔ اس بار قرآن کی باتوں نے دل میں سکون کی ٹھنڈک اتار دی، خطوط کی محفل میں پہنچے، بہن الیس حبیب خان، جی بالکل ماں جو دنیا کا واحد رشتہ ہے۔ جس کی محبت میں کوئی غرض شامل نہیں ہوتی ہے۔ اللہ آپ کی والدہ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین۔ ڈیئر ضرغام محمود۔۔۔!! آپ کی محبت ہے۔ جو اتنی بڑی بات کہہ دی۔ آپ ڈر کے خاص رائٹر ہیں۔ آپ بہت محنت اور لگن سے لکھ رہے ہیں۔ مجھے آپ کی ہر کہانی نمبرون لگتی ہے۔ آپ کا لکھا بہت خاص ہوتا ہے۔ اللہ آپ کو دائمی خوشیاں عطا فرمائے آمین۔ صبا فیملی ڈر ڈائجسٹ کی محفل میں کافی عرصے بعد دکھائی دی ہیں۔ اب آپ لوگوں کو گم نہیں ہونا ہے۔ بلقیس خان، بہت نائس خط لکھا ہے۔ فلک زاہد بھی جیسے خطوط کی محفل سے دور ہو گئی ہیں، ساحل دعا بہن پلیز حاضری لگایا کریں۔ مون بخاری جی بالکل آپ کو بہن کہا نہیں مانا بھی ہے۔ عامر شہزاد بھائی آپ بہت محبت سے ڈر کے لیے لکھتے ہیں۔ شرف الدین صاحب تبصرہ نگاری کے ساتھ آپ قوس وقزح میں بھی لکھنا شروع کر دیں۔ باقی سب کے خطوط پسند آئے۔ کہانیوں میں اس ماہ، شکیل نیازی کی پہلی کہانی خونی آتما نے ایک بہترین کہانی کا اعزاز حاصل کر لیا۔ مکافات عمل بھی بہت اچھی لگی۔ خونی کہانی، بہن صبا رمضان کی بہترین کہانی ہے، پیاری مونا شہزاد کی زومبی کہانی نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ کالا جادو، شہزاد خان کی بھی ٹھیک ٹھاک تھی، حقیقت پسندیدہ تھی۔ آسیبی ڈھانچہ اچھی کہانی رہی۔ نامکمل سوال معلوماتی تحریر تھی، خوف نگر بہترین کہانی تھی۔ دسواں ستون، سسٹر ثنا اے شیخ نے پارٹ ٹو لکھا تھا، جو کہ اعلیٰ تھا، عمدہ طرز تحریر نے کافی حد تک چونکا ڈالا۔ بھائی امتیاز احمد کی تحریر لاسٹ ڈنر تو بہت زوردار انداز میں لکھی تھی، لاسٹ ڈنر میں ہر رنگ موجود تھا۔ قسط وار تحریریں، ایم الیاس کی قسط نمبر ۳ بہت اچھی جا رہی ہے۔ موت کی سرگوشی بھی اچھی

ہے۔اور جان لیوا کی آخری قسط بہت اچھی لگی۔ جاتے جاتے نئے لکھاری بہن بھائیوں سے اتنا کہنا چاہوں گا کہ پلیز کسی کی باتوں سے نہ گھبرائیں۔ ہر انسان کا ذہن مختلف ہوتا ہے۔ ہر انسان ایک جیسی سوچ نہیں رکھتا۔ یہ اللہ کی تقسیم ہے۔ نئے لکھاری کسی کی دل جلی باتوں سے ہرگز نہ گھبرائیں، اور اپنا کام جاری رکھیں۔ ضروری نہیں، ایک کو آپ کا آئیڈیا پسند نہیں آیا، تو پورے پاکستان کو پسند نہیں آئے گا۔ یہاں ہمیشہ روز اول سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ کوئی پسند کرتا ہے۔ تو کوئی ناپسند، مگر قابل وہی ہے۔ جو اپنا کام ایمانداری سے جاری رکھے۔ وہ کہتے ہیں۔ صبح اٹھ کر صرف ایک مثبت چیز سوچ لینے سے دن پورا پوزیٹو میں گزرتا ہے۔

☆☆ عثمان صاحب: واہ جواب نہیں آپ کے خط کا۔ دل خوش کر دیا اور اتنا خوش کیا کہ دل جھومنے لگا، آپ کی ساری باتیں کامیابی کی سیڑھی ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر کے پڑھنے والے اسے چاہنے والے اور اس کے خوبصورت رائٹرز خیریت سے ہونگے۔ ڈر کا تازہ شمارہ ہاتھ میں ہے خطوط کی بزم میں پہنچی تو خوبصورت خطوط سے مزین اس بزم کی رونق عروج پر تھی، بلقیس کان، بینا خان، امرحہ خان، ہما خان، کرن خان، بسما خان، عثمان غنی خان، سنبل وسیم، دل نور بھیر، فریال عروج، کائنات بلوچ، مسز خائستہ رحمان، روہانیہ عامر، خانسہ غیور، نوری بشریٰ، ذیشان شمیر، سردار اعظم، بلال تابش، عبدالرؤف، ابرار بشیر، شرف الدین جیلانی صاحب، محمد حنیف شاکر صاحب کے خطوط میں مجھے جن اچھے الفاظ میں یاد کیا گیا اس کے لیے میں ان تمام دوستوں کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ ساتھ ہی عنادل شہریار، جنیفر اسمتھ، مشیل اسمتھ اور ڈاکٹر عامر شہزاد کا مجھ ناچیز کی تحریروں کو سراہتے ہوئے پسندیدگی کی سند سے نوازنا! یہ آپ سب کی ذرہ نوازی ہے ورنہ ہم اس قابل کہاں۔ آپ سب کی میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں! ضرغام محمود صاحب! آپ نے اپنے بارے میں کسر نفسی سے کام لیا ہے۔ ورنہ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ڈر کا اثاثہ ہیں، آپ کے جادوئی قلم سے نکلا اک اک لفظ پڑھنے والے کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے۔ میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں اگر آپ کے بارے میں بس اک جملہ کہوں تو وہ ہوگا۔ "You are the best!" "Happy Belatd birth day!" عثمان غنی صاحب: آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ! مگر میرا برتھ ڈے اکتوبر میں آتا ہے۔ سنبل وسیم آپ کو شادی کی مبارکباد! آپ کی نئی زندگی کے لیے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں، ساحل دعا بخاری! Happy Birth day my sister آپ کہاں غائب ہیں؟ میں آپ کو اور آپ کی عمدہ تحریروں کو مس کر رہی ہوں۔ اس بار مصروفیت کے باعث چند تحریریں ہی پڑھ سکی ہوں۔ ''لاسٹ ڈنر'' ایس امتیاز احمد صاحب نے Out Standing تحریریں پیش کیں۔ کیا لکھتے ہیں آپ!'' ''کالا جادو'' شہزاد خان صاحب کی تحریریں عمدہ تو ہوتی ہی ہیں مگر ان سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہارر میگزی کے فارمیٹ کے عین مطابق ہوتی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر سچ مچ ڈر لگتا ہے۔ Excellent!'' ''خونی کہانی'' صباء رمضان آپ کے لیے اتنا ہی کہوں گی ویلکم اینڈ ویلڈن!'' ''دسواں ستون'' ثناء اے شیخ کی ہر تحریر گزشتہ تحریر سے بڑھ کر ثابت ہوتی ہے۔ بہت عمدہ لکھتی ہیں ثناء آپ!'' ''جان لیوا'' ''رولوکا'' کے بعد شروع ہونے والی اس قابل تعریف تحریر کو بھلایا نہیں جا سکے گا۔ اس اعلیٰ پائے کی تحریر نے پہلی سطر سے ہی اپنی گرفت میں جکڑے رکھا اور شاندار طریقے سے اختتام پذیر ہوئی! در میں شائع ہونے والی لازوال تحریریں جو کہ آج ناول کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ ان کی فہرست میں ''جان لیوا!'' بھی شامل ہے۔ راشد نذیر طاہر صاحب اتنی بہترین تحریر پر مبارکباد، محترم ایڈیٹر صاحب! احسان الحق صاحب جو کہ ڈر کے سینئر اور بہترین رائٹر ہیں۔ کافی عرصے سے نظر نہیں آتے۔ پلیز! ان کی خیریت سے ضرور آگاہ کیجیے گا! میں ان کی تحریروں کو مس کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و زندگی عطا فرمائے۔ (آمین)

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لیے شکریہ، احسان الحق صاحب کی آج کل طبیعت ناساز ہے، دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کلی صحت عطا کرے۔ (آمین)

صبا احتشام خوشاب سے، سب کو سلام.....! جنوری 2020ء کا رسالہ موصول ہوا۔ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ وہ ایسے کہ صبا رمضان نے سارے رسالے کے Images والٹس اپ کر دیئے۔ ہم ڈر ڈائجسٹ کے کتنے فین ہیں۔ ایس حبیب آپ کا تجویز نامہ بہت خوبصورت تھا۔ ویلکم افشاں، سعدیہ، ہما، سلمان یوسف، سعدیہ بیگم میں آپ سے کہنا چاہوں گی کہ لکھاری جو ایک دوسرے کی تعریف وتنقید کرتے ہیں اس کا ایک فائدہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ پرانے مانجھے ہوئے رائٹرز نئے رائٹرز کو تنقید برائے اصلاح کرتے ہیں اور یہ تو انسانوں کا اصول ہے کہ وہ استاد کی بات زیادہ مانتے ہیں۔ عثمان غنی اور بلقیس آپ تو اپنے ہی لگتے ہو پتہ نہیں کیوں دل سے سلام آپ کو،

اب کہانیوں کی جانب آتے ہیں۔فرسٹ پر ضرغام صاحب کو دیکھا ویری گڈ۔عثمان غنی کی کہانی بھی زبردست تھی۔موتیوں کا حجاب کہانی پڑھتے ہوئے دماغ میں Arabic Music چلتا رہا۔دوسرا جنم زبردست، عاشق جن اور موت کی جیت بس ٹھیک تھیں۔غزلیات میں الیس امتیاز احمد، سنبل وسیم، عائشہ معین، عامر شہزاد اور شرف الدین کمال کے رنگ بکھیرتے نظر آئے۔سر مجھے فروری میں اپنے بچوں ماہ نور اور محمد علی کو برتھ ڈے وش کرنا ہے اور میرا بھانجا فرحان کو بھی۔میری سسٹر کو بھی عاصمہ سب کو سالگرہ مبارک ہو۔خدا حافظ۔

☆☆ صبا صاحبہ: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔سب کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، امید ہے آئندہ بھی خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

عائشہ جہلم سے، آداب عرض ہے۔ڈرڈائجسٹ کے تمام اسٹاف اور اس رسالے سے منسلک سب کو عائشہ کا آداب قبول ہو، ٹوئنٹی ٹوئنٹی مطلب 2020ء سب کو مبارکباد ہو، جنوری کا شمارہ دیکھا۔ٹائٹل دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ اس بار خوف کی حدیں ٹوٹنے والی ہیں۔ جناب امیدوں کے عین مطابق رسالہ نکلا۔قرآن کی باتیں پڑھیں، یقین جانیے میرا ایمان تازہ ہوگیا۔''اللہ آپ کو جزا دے شاہد صاحب.....'' خطوط میں افشاں رمضان کا خط دیکھا تو دل سے خوشی ہوئی ویلکم ڈیئر...... ماہین آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ہما خان میری طرف سے بھی آپ کو "Worm Welcome" طارق محمود صاحب سچ میں آپ نے ٹھیک کہا۔رسالے اور کتابوں کے ادارے چلانا واقعی داد کی بات ہے۔کہانیوں میں آتے ہیں اس بار تو آپ سب نے کمال کردیا۔آپ کو پتہ ہے مجھے بلیوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور ضرغام محمود اور شہزاد خان کے بلوں نے میری نیندیں حرام کردی ہیں یار اتنا زبردست بیان۔ایسی ہونی چاہیے کہانیاں کہ کہانی پڑھنے کے بعد کم از کم دو دن تک خوف آتا رہے۔پھر دوسرا جنم ڈیول ڈاٹر نے بھی کمال کردیا۔موت کی جیت میں آپ کے الفاظ کا چناؤ اور بیان کرنے کا طریقہ عمدہ ہے آپ کہانی میں تھوڑا سا ڈر پیدا کردیتے تو زبردست ہوجاتا۔عثمان غنی الفاظ کا اثر لائے اور مجھے اپنے الفاظ کے سحر میں لے لیا۔الیس حبیب خان یہ چناؤ آپ نے کیا ہے کہانیوں کا؟ سردار اعظم مجھے آپ کا شہر بہت پسند ہے۔حسرت ہے کہ چترال جاؤں کبھی اچھا جناب اجازت دیں۔

☆☆ عائشہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم آئندہ ماہ بھی آپ کے دلکش خط کا انتظار رہے گا۔

عروج سنبل پنڈ دادن خان سے، سب کو سلام، جنوری کا ڈرڈائجسٹ ملا تو بے حد خوشی ہوئی۔سب سے پہلے میں ایڈیٹر صاحب کی بے حد مشکور ہوں۔جنہوں نے ہماری کہانی کو اتنی عزت بخشی۔''ڈھائی بجے'' تو آپ نے خوفناک کہانیاں میں جگہ دی اور اس کے علاوہ ہماری غیر موجودگی پر بھی ہماری شاعری پر آپ نے توجہ دے رکھی آپ نے تسلسل سے قائم رکھا ہماری شاعری کو جگہ دیے رہے۔ بہت شکریہ، اب اجازت دیں۔

☆☆ عروج صاحبہ: خط پڑھ کر خوشی ہوئی آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

شیخ ثناء اللہ دریا خان سے، السلام علیکم! کیسے ہو آپ سب ایڈیٹر صاحب آپ کا بے حد شکریہ میرا اشعار اور غزل شائع کرنے کے لیے میں اصل میں بہت مصروف ہوتا ہوں، میرا پیشہ ہی ایسا ہے کہ میں آرام بھی نصیب نہیں کر پاتا، ایڈیٹر صاحب مجھے پوچھنا تھا کہ میری کہانی ''رحم'' آخر کب شائع ہوگی۔آپ کے پاس پہنچی بھی ہے کہ نہیں۔پلیز بتادیں۔ڈرڈائجسٹ کا مطالعہ کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔جنوری کے شمارے میں مجھے ساجد بشیر کی کہانی بے حد پسند آئی۔باقی بھی اچھی تھیں۔اب اجازت چاہتا ہوں۔خدا حافظ۔

☆☆ ثناء اللہ صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

سنبل وسیم پنڈی بھٹیاں سے، السلام علیکم! کیسے ہو آپ سب، امید ہے خدا کی حفاظت میں ہونگے۔آپ سے ناراض ہوں۔آپ نے میری اسٹوری پبلش نہیں کی۔جنوری کا رسالہ میں نے سارا پڑھ لیا۔خطوط میں بھی تجزیے پسند آئے۔سعدیہ جی خود اپنے منہ میاں مٹھو کوئی نہیں بنتا۔تھینکس صبا رمضان اعلان کے لئے۔میری شادی فکس ہوچکی ہے اس لیے شاید اب لمبی چھٹی پر جاؤں۔ کہانیوں میں نمبر ون دوسرا جنم رہی۔نمبر ٹو پر ڈیول ڈاٹر اور نمبر تھری پر اندھیرا ایکسپریس، نمبر فور پر شیطان کی موت رہی اور نمبر فائیو پر انوکھا عشق تھی۔جنوری کا ڈرڈائجسٹ بے حد زبردست رہا، تمام کہانیاں خوفناک تھیں۔ایڈیٹر صاحب میری دوسری اسٹوری بھی شائع کردیجیے گا۔اب خدا حافظ۔

☆☆ سنبل صاحبہ: شادی کی خوشیاں بہت بہت مبارک۔آپ کی کہانی بھی اپنی باری پر ضرور شائع ہوگی۔گھبرائیں نہیں۔

Pakistanipoint.com

ماریہ مسعود بانٹھ گوجر خان سے، السلام علیکم، جنوری کا ڈر ڈائجسٹ 20 دسمبر کو ڈاک کے ذریعے مل گیا، سب کو میری طرف سے نیا سال مبارک ہو، سب سے پہلے افشاں رمضان آپ کا بہت شکریہ میرے غم کو سمجھا، میری مشکل اب آسان ہوگئی ہے۔ امرحہ خان، کائنات بلوچ، نوری بشریٰ، بلال تابش، سردار اعظم خان، ذیشان سمیرا آپ سب کا بہت شکریہ، میرا خط آپ سب کو پسند آیا، مہرینہ غلام علی میں نے پہلا ڈر ڈائجسٹ ماہ جون میں لیا تھا اور اکتوبر سے مستقل ریڈ کررہی ہوں، اس ماہ میری کہانی عاشق جن شائع ہوئی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ایڈیٹر صاحب کا بہت بہت شکریہ کہ میری کہانی شائع کی۔ ہمیشہ کی طرح عثمان غنی خان کی کہانی بہت شان دار تھی۔ ویمپائر مریم فاطمہ کی کہانی بہت مزیدنے کی کہانی تھی۔ ضرغام محمود کی شاہکار کہانی تھی۔ اندھیرا ایکسپریس عمران قریشی نے بہت اچھی کہانی لکھی اسے پڑھتے ہوئے انجوائے کیا موتیوں کا حجاب ناصر محمود فرہاد، آدم خور، محمد رضوان قیوم بہت شاندار کہانیاں تھیں، باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں۔

☆☆ ماریہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لیے بہت بہت شکریہ۔ آئندہ ماہ بھی خط لکھنا نہ بھولئے گا۔ Thanks۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ فروری کا دلکش شمارہ سامنے ہے۔ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ Story`s ایک سے بڑھ کر ایک رہیں۔ سلسلے عمدہ رہے۔ ڈر کے پلیٹ فارم پر خوب صورت لکھنے والے آرہے ہیں اور ڈر نے انہیں یکجا کرکے کوزے میں جمع کردیئے ہیں۔ ہر لکھنے والا نگینے کی طرح فٹ ہے۔ Story`s خوب سے خوب تر جارہی ہیں۔ ان رائٹرز کے لیے دعا ہے کہ اور زور قلم زیادہ۔ ''ڈر'' کے وویورز دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ جو کہ خوش آئند ہے۔ کہانی ارسال خدمت ہے۔ قریبی اشاعت میں جگہ دیں، آپ کو اور دیگر اسٹاف کو اور ''ڈر'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے وویورز کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ سردی شباب پر ہے اپنا خیال رکھیں۔

☆☆ امتیاز صاحب: آپ کی ڈر ڈائجسٹ سے لگاؤ قابل تعریف ہے اللہ تعالیٰ اپ کو کلی صحت عطا کرے تاکہ ڈر ڈائجسٹ میں آپ کا نام جگمگاتا رہے۔

عامر شہزاد ننکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! امید کرتا ہوں ڈر کا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ ڈر کا شمارہ اس بار قدرے لیٹ ملا۔ قرآنی صفحہ نے روح کو معطر کردیا۔ سرورق بھی عمدہ لگا۔ جنیفر اور مشیل اسمتھ کا بہترین اور منفرد خط پڑھ کر خوشی ہوئی ہمیشہ کی طرح ایس حبیب خان نے عمدہ اور بھرپور تبصرہ کیا اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ محترمہ کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ کرن خان کا اسلوب بیان بہت اچھا ہے۔ ہما خان کے مختصر مگر جامع خط نے اپنا لوہا منوالیا۔ عنادل شہریار بھی اچھا لکھتی ہیں۔ سنبل وسیم آپ کو شادی مبارک ہو خدا آپ کا دامن خوشیوں سے بھردے۔ حنیف شاکر صاحب نے اس بار بہترین خط لکھا ویلڈن، مہر پرویز صاحب آپ تو ہمارے دلوں میں بستے ہیں۔ مون بخاری، ماریہ مسعود، ایس امتیاز احمد، ضرغام محمود، شرف الدین جیلانی، خائستہ غیور، عثمان غنی، سردار اعظم خان، بلال تابش، ابرار بشیر، نینا خان، امرحہ خان، بسمہ خان، دل نور عبیر اور فریال عروج نے بھی اچھے خطوط لکھے۔ البتہ ایس حبیب خان مسند صدارت پر فائز ہیں۔ ساحل دعا بخاری، رابعہ آفرین، عبدالحق، نینا خان اور فلک زاہد کے خطوط نہ پاکر سخت مایوسی ہوئی۔ خونی آتما، مکافات عمل، زومبی، موت کی سرگوشی، کالا جادو، خونی کہانی، دسواں ستون، خطرناک وحشی، آسیبی ڈھانچہ، حقیقت، لاسٹ ڈنر، جنون، خوف نگر، خونی گڑیا، پہاڑوں کی قسم، نامکمل سوال اور جان لیوا تمام کہانیاں بہت اچھی، عمدہ اور خوفناک ہیں یقیناً تمام معزز رائٹرز نے بڑی لگن اور محنت سے یہ کہانیاں لکھی ہیں اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر تمام رائٹرز کو میری طرف سے مبارک ہو۔ احسان الحق، مریم ماہ منیر، ایس حبیب خان، افشاں رمضان، ڈاکٹر ندیم، شرف الدین، محمد اسلم، محمد حنیف شاکر، عائشہ ناز، ساجدہ، محمد عمران، کائنات رشک، عطیہ راؤ، رابعہ آفرین، پروفیسر واجد نگینوی اور فلک زاہد نے اعلیٰ معیار کی شاعری تخلیق کی البتہ ایس حبیب خان سب پر بازی لے گئیں۔ نیز ایس امتیاز احمد کی ''تم آزاد ہو'' شرف الدین جیلانی کی ''کنـ • ـ'' اور ایس حبیب خان کی ''وقت کی اہمیت'' بھی عمدہ تحریریں ثابت ہوئیں۔ آخر میں دعا ہے کہ پاکستان کا نمبرون ''ڈر ڈائجسٹ'' ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ (آمین) خدا حافظ۔

☆☆ عامر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لیے شکریہ، کہانی کمپوز ہوچکی ہے، اگلے شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔ Thanks۔

ایم اویس پاکپتن سے، السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہونگے۔ تمام رائٹرز اور قارئین کو سلام۔ میں پچھلے ڈیڑھ

سال سے ڈرڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں اور ماشاءاللہ سے میرا پسندیدہ بھی رہا ہے۔ میرے سب سے فیورٹ رائٹر عثمان غنی ہیں اس کے بعد فلک زاہد ہیں اور پھر آپی نیا خان ہیں۔ فلک زاہد از دی بیسٹ رائٹران ڈرڈائجسٹ۔ اس ماہ کی سب سے بہترین اسٹوری ''الفاظ کا اثر'' ضرعام محمود کی ''شیطان کی موت'' اس کے بعد سب کی پڑھی۔ محمد حنیف، مریم فاطمہ، مظہر الحق، ساجد بشیر، ناصر محمود فرہاد کی اسٹوری موتیوں کا حجاب، شوالا کا انجام اور عاشق جن بہت اچھی رہی۔ ویسے کہانیاں تمام ہی شاندار رہیں۔ آخر میں درخواست کرتا ہوں کہ پہلی بار لکھنے کی کوشش کی ہے ضرور شائع کیجیے گا۔

☆☆ اویس صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لیے ویری ویری تھینکس۔

شیخ معین اختر چنیوٹ سے، سب کو سلام، جنوری کا شمارہ اس بار جلدی ملا۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دلی سکون میسر ہوا۔ بھی کے تبصرے پسند آئے۔ افشاں رمضان، ہما خان، بینا خان، عثمان غنی، چھلاوا پسند کرنے کے لیے شکریہ، حافظہ مون صاحبہ آپ کا شہر تو میرا اپنا ہے ہفتے کے چار دن میں سرگودھا اور باقی تین دن اپنے گھر چنیوٹ میں رہتا ہوں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مجھے آدم خور بلا پسند آئی پھر شیطان کی موت، الفاظ کا اثر، دوسرا جنم زبردست رہی، موت کی سرگوشی اچھی لگی، قوس قزح میں سمرین بلال، تانیہ شیر خان، افشاں، منیر عرف منی، ندیم ساگر، محمد حنیف شاکر کے رنگ پسند آئے۔ ایس حبیب خان آپ نے جو حضرت خواجہ حسن کی لاجواب بات لکھی۔ بہت زبردست لگی۔ اچھا مجھے ایک بات کہنی ہے میں نے جب سے ہارر رائٹر اسٹوری پڑھی ہے تب سے اشتیاق سا ہونے لگا ہے کہ ہمارے رائٹرز کیسے ہونگے۔ اچھا میں آپ کو اپنے خیالات بتاتا ہوں۔ سب سے پہلے ایس حبیب خان مجھے لگتا ہے وہ انتہائی سنجیدہ اور خاموش طبع لگتی ہیں۔ ایس امتیاز احمد اپنے کام سے کام رکھنے والے اور ایسے انسان جو کم بولتے ہیں پر جب بولتے ہیں تو کمال کر دیتے ہیں۔ بلقیس خان جو غلط کے لیے لڑ پڑتی ہیں صحیح کا ساتھ دینے کے لیے جان تو ڈ کوشش کر کے چھوڑتی ہیں۔ بینا خان Again سیریز۔ امرحہ خان جو تھوڑی سی چالبلی معلوم ہوتی ہیں۔ عثمان غنی جو مجھے پرسنلی کافی ہینڈسم اور سوبر انسان لگتے ہیں۔ آخر میں ایڈیٹر صاحب آپ..... ہاہاہا۔ ایڈیٹر صاحب جی ہاں میں نے آپ کو بھی نوٹ کیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب آپ مجھے کافی خوش دل انسان لگتے ہیں۔ بات بات پر مسکرانے والے جو اپنے اسٹاف سے دوستانہ رویہ رکھتے ہیں۔ مجھے آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔ اگر میں کراچی ہوتا تو آپ کے آفس ضرور آتا میں ڈائجسٹ سے زیادہ آپ کا فین ہوں اچھا اگر کسی کو برا لگا ہو تو سوری باقی اگر اچھا لگا تو شکریہ کی ضرورت نہیں۔ سر میری کہانی کب شائع کریں گے۔ چلیں اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ سب کو اور اسپیشل چاند زیب عباسی کو سلام۔

☆☆ شیخ معین صاحب: آپ نے جن لوگوں کے مزاج کا تجزیہ کیا، اس کے لیے شکریہ، اور آپ کا تجزیہ بالکل پرفیکٹ ہے، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اہل خانہ کو خوش رکھے۔ کہانی اگلے ماہ شائع ہوگی، خط کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، السلام علیکم! سردی میں مزاج بہ خیریت ہوگا، نوک جھونک شروع کرتے ہیں اپنے پیاروں سے، عنادل شہریار صاحب ایک بار پھر آپ خالد بھائی، شاہد بھائی سے مل لیں، پھر آپ ہی ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں گے، غنی صاحب آپ لکھتے ہی رہا کریں، ہم پڑھتے ہی رہیں گے۔ جنیفر مشیل اسمتھ، دیگر ناولوں کے مقابلے میں ڈراب بھی نمبرون ہے۔ دیگر ادارہ ڈر کا عملہ ہر کسی کے خط کا جواب بہت حوصلہ افزائی سے دیتا ہے۔ قارئین کی ہر کڑوی بات برداشت کر جاتے ہیں۔ ڈرمین اب ایس حبیب خان، بلقیس وغیرہ وغیرہ نمایاں ہیں۔ ہم تبلیغی سفر میں بھی چلنے والے ہیں ابھی صحت صحیح ہونے کا انتظار ہے۔

☆☆ شرف الدین صاحب: خلوص نامہ ارسال کرنے کے لیے شکریہ۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے، خلوص نامہ ہر ماہ بھیجا کریں۔ شکریہ۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، کافی عرصہ بعد آپ کو خط تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، بہت شرمندہ ہوں کہ میں آپ کو یاد نہ کر سکا، ہر ماہ پرچے سے ملاقات ہو جاتی تھی مگر خط لکھنے کا جواب ادھورا ہو جاتا وہ لمحہ قریب تھا کہ ڈرڈائجسٹ پریس میں جانے کا وقت تھا یہ سوچ کر چپ ہو جاتے کہ آئندہ خط لکھوں گا مگر باعث مجبوری اور دیگر باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوتاہی ہو جاتی، میں پرچے کا بہت پرانا قاری ہوں ایسا دیدہ زیب اور کامیاب پرچہ نکالنا اس مہنگائی کے ہاتھوں آپ ہی کا کام ہے ویسے بھی کافی پرچے بند ہو گئے ہیں۔ بڑی امید ہے کہ بکسٹال پر گیا تو ماہ فروری 2020ء کے تازہ پرچے سے ملاقات ہو گئی۔ سرورق بڑے کمال کا تھا۔ انداز چھلکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات نصیب ہوئی۔ پرچے کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر خوب تھے

اشعار اور غزل شائع کرنے کا شکریہ ویسے بھی آپ قارئین سے دوستی کا حق ادا کردیتے ہیں اور ہمارے دل میں آپ کے لیے احترام ہے۔ ڈر ڈائجسٹ کا اپنا ہی معیار ہے۔ غزلیں اور اشعار اچھے تھے ویسے بھی تمام کہانیوں کا اپنا ہی لطف ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجازت چاہوں گا۔

☆☆ اسلم جاوید صاحب: برائے مہربانی ہر ماہ خط ضرور بھجا کریں آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔

عجب گل اداسی ٹنڈوالہ یار سے، امید ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کی ٹیم، اسٹاف اور رائٹر حضرات خیر و عافیت سے ہوں گے۔ کافی عرصہ سے ڈر ڈائجسٹ سے غیر حاضر رہا اس کے لیے معذرت۔ فروری کا شمارہ نہایت خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ میرے ہاتھ میں موجود ہے۔ چند کہانیوں کے نام ٹائٹل کے اوپر نظر آرہے ہیں، طریقہ پسند آیا۔ Weldone، ابھی تک شمارہ پڑھنا شروع نہیں کیا۔ فہرست میں بہت سے نئے نام دیکھ رہے ہیں۔ اچھی بات ہے آپ نئے لکھاریوں کو جگہ دیتے ہیں۔ لیکن فہرست میں آپی فلک زاہد اور آپی ایس حبیب کان کے نام نہ دیکھ کر تھوڑی مایوسی ہوئی۔ خیر میں نے اس بار (لالچی انسان) کہانی بہت محنت سے لکھی ہے۔ امید ہے آپ کو ضرور پسند آئے گی اور مجھے قریبی اشاعت میں جگہ ملے گی۔

☆☆ عجب گل صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لیے اور نئی کہانی بھیجنے کے لیے شکریہ قبول کریں، کہانی بہت جلد شائع کردی جائے گی، ہو سکے تو ایک اور کہانی ارسال کردیں۔

محسن عزیز کوٹھا کلاں ضلع قصور سے، السلام علیکم! تمام ڈر اسٹاف ریڈرز اینڈ رائٹرز کو میری طرف سے محبت بھرا اسلام، فروری کا شمارہ ملا اچھا تھا، جلدی سے کھولا اور دل ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا، نہ ہی میرا لیٹر اور نہ ہی میری اسٹوری، جنوری میں شائع کرنے کا وعدہ تھا تب بھی شائع نہیں ہوئی۔ تو سوچا کہ فروری میں تو لازمی آئے گی پھر بھی نہیں آئی، کوئی بات نہیں ہم اتنے ہی بے وقعت ہیں تو آئندہ ہم آپ کو ڈر میں نظر ہی نہیں آئیں گے۔ باقی باتیں اپنی جگہ مگر رئیلی میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ ہماری ہاؤس پر ابلم چل رہی ہے۔ عیدالفطر سے اس لئے ٹائم نہیں ملتا کہ میں کچھ لکھوں۔ خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔ اس لیٹر کو لکھتے ہوئے دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔

☆☆ محسن صاحب: دل برداشتہ نہیں ہوتے، اگلے ماہ کہانی ضرور شائع ہوگی، سالگرہ نمبر پر کہانی تھی لہٰذا وقت گزر گیا تو اس لیے رک گیا۔ خیر آئندہ ماہ شائع کردی جائے گی۔ خوش رہنا اچھی بات ہے۔

حافظہ مون بخاری سرگودھا سے، السلام علیکم! آج سب سے پہلے مجھے ایک تجویز پر بات کرنی ہے۔ جو میں آپ کو اس سے قبل کئی بار دے چکی ہوں۔ اگر میری ان سطور کو خط سے کاٹ نہ دیا جائے تو میں تجویز پر احباب اور قارئین کی رائے بھی چاہوں گی۔ تجویز نمبر ایک یہ ہے کہ دیگر جرائد کے مانند ڈر ڈائجسٹ میں بھی ''اداریہ'' چھپنا چاہیے۔ دوسری یہ ہے کہ ''قرآن کی باتیں'' کارنر کو صرف ترجمہ تک محدود نہ کریں۔ بلکہ ہلکی پھلکی تفسیر بھی دی جائے۔ یا پھر مختصر سا ''اسلامی مضمون'' چھاپ دیا جائے۔ امید کرتی ہوں کہ قارئین میری اس رائے سے متفق ہوں گے اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے بشرطیکہ میری ان سطور کو من و عن شائع کردیا جائے۔ تاہم فیصلہ اراکین ادارہ کا ہے۔ جزاک اللہ۔ اب بات ہو جائے اس ماہ کے سرورق اور تحاریر کی۔ سرورق اچھا تھا۔ ابتدائی صفحات کی تحریر ''خونی آتما'' اور فرح انیس کی جنون یکسانیت کا شکار تھیں۔ خونی گڑیا کی کارستانیاں بھرپور تھیں۔ خونی کہانی کے متعلق صرف اتنا کہوں گی جو آپ نے کہا کہ خدا کے کلام سے بڑھ کر کوئی طاقتور بھلا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں جناب۔ جادوکوری کی داستان ''دسواں ستون'' عمدہ تحریر تھی۔ اسی طرح لاسٹ ڈنر اور حقیقت اعلیٰ رہیں۔ نامکمل سوال میں والدین کے لیے اچھا پیغام تھا، واقعی کبھی کبھار والدین بچوں کی بات پر توجہ نہیں دیتے۔ ''پہاڑوں کی قسم درمیانے درجے کی رہی۔'' کالا جادو' لالچی انسان کا انجام ایسا ہی ہونا تھا۔ خلیل جبار اور فیصل ندیم ساحل نے اچھا لکھا۔ مگر خلیل جبار کی تحاریر میں اکثر یکسانیت ہوتی ہے۔ مکافات عمل بس سو سو رہی۔ مونا شہزاد کی زومبی پسند آئی۔ قسط وار کہانیاں اچھی جا رہی ہیں۔ آخر کار جان لیوا کا اختتام ہوا۔ شاندار اختتام۔ راشد نذیر طاہر نے ''جان لیوا'' کی فیورٹ اچھی کہانی پڑھنے کو دی۔ اب یہ خواہش ہے کہ جلد اپنی تحریر کو بھی ڈر کے صفحات پر دیکھ لوں۔ یہ ساتھ خدا نے چاہا تو ہمیشہ رہے گا۔ انشاء اللہ ''ڈر'' ارسال کرنے کا بے حد شکریہ۔ خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔ آسانیاں کمائیں اور آسانیاں دوسروں کے لیے بھی پیدا کریں۔

☆☆ مون بخاری صاحبہ: خط لکھنے کہانیوں کی تعریف کے لیے شکریہ تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔ انتظامیہ بہت جلد مثبت قدم اٹھالے گی۔ Thanks۔

☆☆

خواب ناک حقیقت

ثنا اے شیخ - لاہور

اگر وہ اپنے دانت تمہارے جسم میں گاڑ دے تو سارا خون ایک بار میں پی سکتی ہے اور تمہارے جسم میں خون کا ایک قطرہ نہیں بچ سکتا کیونکہ اس غیر انسانی مخلوق کو خود پہ کنٹرول حاصل نہیں ہے۔

ایک حقیقی خواب جس کو وہ روزانہ اپنی ڈائری میں لکھتی تھی لیکن جب حقیقت سامنے آئی تو.....

لندن ایئرپورٹ پہ اس کا پہلا قدم اور نئی فضا کی ہلکی ہلکی خوشگوار ہوا کا اسے چھونا بھی اس کے چہرے کی اداسی دور نہ کر سکا۔ جس نئے جہان کو اس نے خود کو ملک بدر کرنے کے بعد چنا تھا وہ اسے خوش آمدید کہہ رہا تھا لیکن اس کی یہاں آمد کتنی خوش آئند ہوتی ہے یا نہیں، وہ ابھی اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ نہ وہ اپنی یہاں آمد پر خوش تھی اور نہ ہی کوئی اس کی دید پر۔۔ خوشی جیسے اس کے لیے دنیا کی سب سے بے معنی، سب سے ثانوی اور سب سے ناپائیدار چیز تھی۔ وہ یہاں آ تو گئی تھی لیکن اب اس ایئرپورٹ سے نکل کے اسے کہاں جانا ہے وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کی گندمی رنگت، کالی آنکھیں اور گہرے بھورے بال اسے اس کے اردگرد چلتے پھرتے رنگین آنکھوں اور سنہرے بالوں والے گوروں سے واضح طور پر الگ دکھا رہے تھے۔ اس نئی زمین پہ قدم رکھتے ہی ایک بار تو اس کے دل کی دھڑکن رک ہی گئی تھی۔۔۔ کیا اس نے صحیح کیا تھا؟ پر اب یہ ہو چکا تھا۔۔۔ اس نے ایسا کرنے میں بھی تو سالوں گنوا دیے تھے یہی سوچ سوچ کر کہ کیا ایسا کرنا ٹھیک ہوگا؟ اور اب جب وہ ایسا کر چکی تھی تو اسے اتنا تو یقین تھا کہ یہ کوئی ایک دن کا جذباتی فیصلہ نہیں تھا بہت سالوں کی سوچ بچار کے بعد وہ اپنی بیڑیاں توڑنے کی ہمت جتا پائی تھی۔ اور پھر تھا ہی کیا اس کے پاس کھونے کو؟ نہ اسے تحفظ فراہم کرنے والے کھوکھلے رشتے، نہ مطلبی دوست، نہ اس کی سرپرستی کا ذمہ دار سائبان۔۔۔ کہرے کی ٹھنڈ سے صحرا کی دھوپ تک کا سفر اس نے تنہا ہی کاٹا تھا سب نام نہاد رشتوں کے ہوتے ہوئے، یتیموں کی سی زندگی۔۔ ان کے بیچ رہتے ہوئے بھی تنہا ہی رہنا تھا تو پھر اکیلے کیوں نہیں؟ اس لیے اب نہ اسے کسی کے بارے میں سوچنا تھا نہ ان کی دنیا میں رہنا تھا۔

جب زندگی حرام ہو جائے تو خودکشی حلال ہو جاتی ہے، یہ اس کی ذاتی سوچ تھی پر خدا کے بنائے آئینِ زندگی میں خودکشی حرام ہی کہلاتی ہے اور پھر اپنی ذاتی رائے کا کوئی بھی جواز آپ کی حرام موت کو حلال موت نہیں ٹھہرا سکتا۔ سو اس نے خود کو حرام موت کے حوالے کرنے سے پہلے ایک آخری بار خود کو اپنی حرام ہو چکی زندگی کے حوالے کرنے کی ٹھانی، وہ زندہ رہ سکتی ہے اگر وہ ان لوگوں کی شکلیں نہ دیکھ سکے جن پہ اس کے لیے حقارت اور اس کا بوجھ ڈھونے کے احسان کا تفاخر ان کے چہرے کا مستقل زاویہ بن چکا ہے، جہاں وہ اپنی ذات، اپنی شخصیت کھو کر محض خود سے جڑے زبردستی کے

Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com

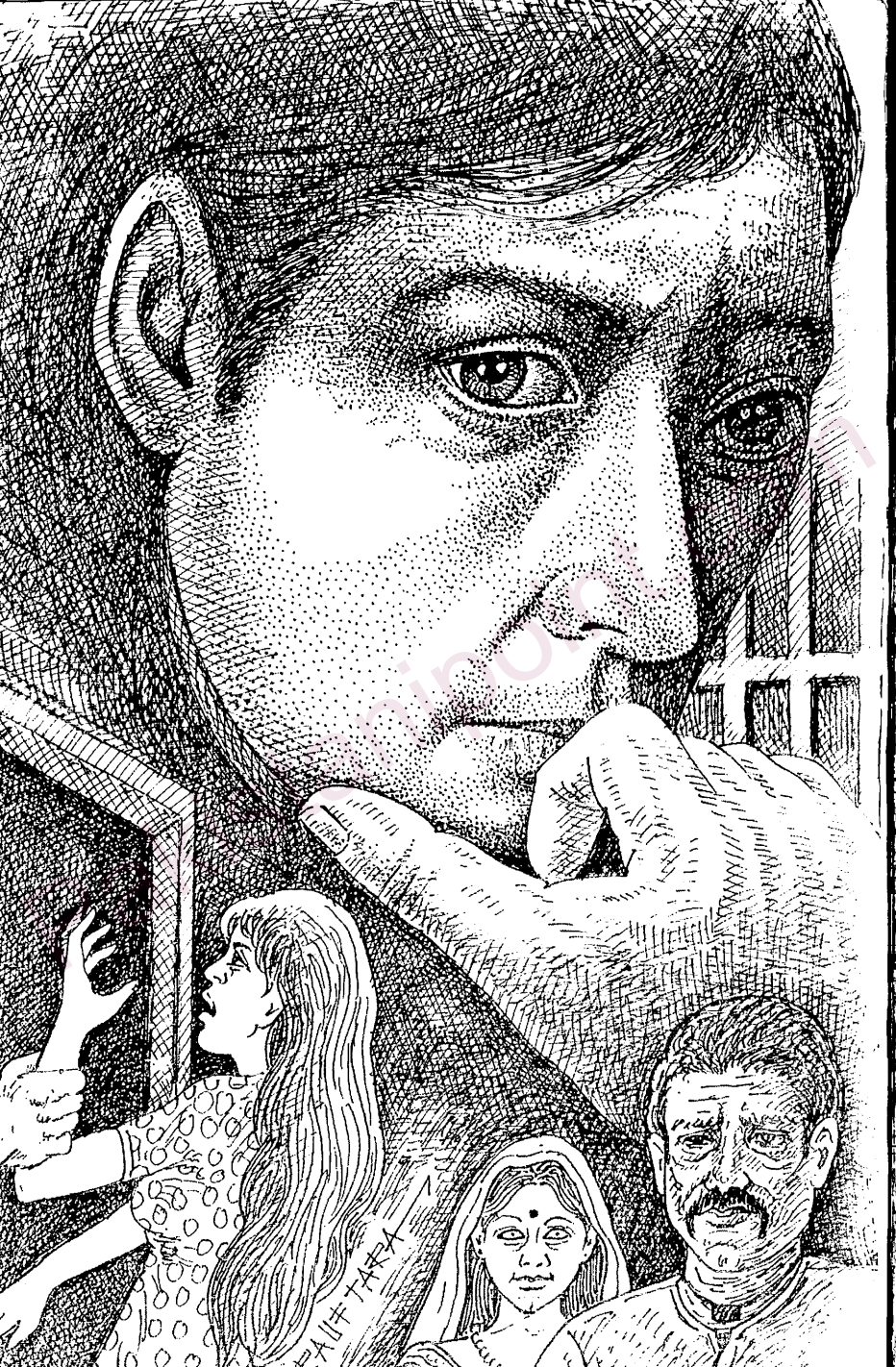

رشتوں کو نبھانے کی اداکاری کرتے کرتے تھک چکی ہے۔ جہاں وہ بیوی، بہن اور بیٹی کے نام پر اپنے بوجھ کو ڈھونے کے لیے دوسروں پر منحصر ہے اور اسے خودمختار ہونے کا بھی حق حاصل نہیں کہ مرد کی بالادستی سے مزین معاشرے میں کسی عورت کو اپنی ہر چھوٹی بڑی ضرورت اور مرضی کے لیے خود کے تابع رکھنے میں بہت سے مردوں کی شان ہے اور وہ اسی شان کے عوض اپنی نام نہاد مردانگی کو تاعمر سینچتے رہتے ہیں۔

دنیا کے سبھی مردوں کے بارے میں وہ ایسا نہیں سوچتی تھی لیکن کم از کم اس کی زندگی میں سرپرست بن کے آئے سبھی مرد ایسے ہی نکلے۔ جبکہ سرپرست مرد کی شان تو عورت کو عزت، تحفظ، اعتبار اور محبت دینے میں ہونی چاہیے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ سب کر کے دیکھ چکی تھی۔ ہر حربہ ہر طریقہ، ہر انداز، نرمی، غصہ، درخواست، احتجاج۔ لیکن اس کی ملیا میٹ ہوتی ذات اور بیمار ہوتی روح کو نجات دینا اس کے سرپرستوں کو کسی صورت قبول نہ تھا۔ اور پھر اس نے اس حرام زندگی اور حرام موت کے فلسفے پہ بہت غور کیا اور نتیجہ یہی نکلا کہ حرام موت کے حوالے کرنے سے بہتر خود کو حرام ہو چکی زندگی کے حوالے ہی رکھے۔۔۔ اور اب زرا زندگی سے بات کر کے دیکھے کہ آیا وہ اس کے کھاتوں میں بھرے نقصانات کو کسی نفع سے بیلنس کرتی ہے یا نہیں کیونکہ زندگی کی طرف اس کا بہت حساب باقی تھا۔ اب اگر جینے کا فیصلہ کیا ہی ہے تو زندگی جیسے دشمن سے لڑنا ہی آخری آپشن بچتا تھا۔

لوگ موت سے بھاگتے ہیں، موت سے ڈرتے ہیں، موت سے لڑتے ہیں اور ایک وہ ہے جو زندگی سے بھاگتی تھی زندگی سے ڈرتی تھی لیکن زندگی سے لڑنے کی اس نے پہلی بار ٹھانی تھی۔ جیسے موت سے لڑنا آسان نہیں ویسے ہی زندگی سے لڑنا بھی آسان نہیں، دونوں ہی کام بہت بہادری کے ہیں، موت سے آنکھیں ملانے والے اور زندگی کے آگے ڈٹ جانے والے دونوں ہی طرح کے لوگ سپاہی ہیں، غازی نہیں تو شہید سہی، ایسی جنگوں میں تیسرا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ موت تو اسے منہ ہی نہیں لگاتی تھی۔ وہ جب جب موت کے پاس گئی اسے موت نے واپس لا کے زندگی کے آگے پٹخ دیا۔ اور زندگی اسے مظلوم باندی بنا کے معاشرتی بیڑیوں میں جکڑے گھسیٹتے ہوئے کسی ظالم حکمران کی طرح آگے بڑھتی رہی۔ اور یہ بات اسے کئی سالوں کی قید میں اپنی عزت نفس، اپنی ذات، اپنا وجود کھونے کے بعد سمجھ میں آئی کہ اگر اپنے ہاتھوں سے اپنائی موت حرام ہے تو دوسروں کے ہاتھوں برباد ہوتی زندگی بھی تو حرام ہے؟

موت حلال ہونی چاہیے تو زندگی بھی تو حلال ہونی چاہیے۔ اگر زندگی تمہارے ساتھ ظالم ہو جائے تو تم اس کے سامنے ڈٹ جانا کہ اس کے ہاتھوں اس کے حساب سے رہنے کی سزا بھگتو۔ سزا اور جزا پہ بس خدا کا ہی اختیار رہنے دو۔ زندگی جینی ہے تو آزاد رہ کے جیو، معاشرتی بیڑیوں میں قید ہو کے کاٹو نہیں۔ اور اپنے اسی سارے تھیسس کا نچوڑ اس کا اپنے لیے کیا گیا یہاں آنے کا فیصلہ تھا۔ یہاں وہ کسی کو نہیں جانتی تھی نہ کوئی اسے جانتا تھا۔ جیسے ایک بچہ جب دنیا میں پہلی بار آنکھ کھولتا ہے اس کی آنکھیں سب دیکھتی کان سب سنتے ہیں لیکن وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے اس وقت اس کی ذہنی کیفیت بھی کسی نومولود بچے سے مختلف نہیں تھی۔

وہ ریسٹریکٹڈ ایریا سے پبلک ایریا میں نکل آئی تھی مگر اب کہاں جانا ہے وہ نہیں جانتی تھی۔۔۔ ابھی تو وہ اپنے دیس سے نکل کر ایک نئے دیس میں چلے آنے کی اپنی ہمت پہ یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ سب کچھ ایک خواب جیسا لگ رہا تھا۔ پتہ نہیں یہ حقیقت تھی یا جو وہ پچھلے پینتیس سالوں سے جیتی آ رہی تھی وہ حقیقت تھی۔۔۔ اپنا ماضی اسیڈرائے خواب جیسا دھندلا لگ رہا تھا۔ ماضی کی تلخیوں کے اثرات ابھی اس کے جسم اور روح سے جدا ہونے کو تیار نہیں تھے۔ چہرے سے وہ برسوں کی بیمار دکھائی دیتی تھی۔۔۔ جسم جیسے بے جان سا تھا اور روح اس بیمار اور ناتواں جسم کی قید سے آزاد

ہونے کے لیے ہر وقت ہی بے چین رہتی تھی۔ ابھی اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ایئرپورٹ سے نکل کر باہر کوئی ٹھکانہ ڈھونڈتی۔۔۔

بارہ تیرہ گھنٹے کی فلائٹ، ماضی کے نائٹ میئر سے آنکھیں کھلنے کے فوراً بعد کی تازہ ترین دماغی حالت، اور ایک انجان اجنبی دیس میں پہلی بار سانسیں لیتا، بے ترتیب دھڑکتا دل۔۔۔ وہ بہت تھک چکی تھی اس نے سب کچھ جھٹک کے اپنا سامان والا بیگ ایک دیوار کے ساتھ لگایا اور اپنا ہینڈ کیری بازوؤں میں تھام کر سو گئی۔۔۔ اور پھر پوری رات اور آدھا دن وہ سوتی ہی رہی۔۔۔ پبلک ایئریا کا رش اور فلائٹ ارائیول اور ڈیپارچر کے اوقات میں اُمڈتا لوگوں کا سیلاب بھی اس کی نیند میں خلل نہ ڈال سکا۔

ایک وہ وقت تھا جب وہ اپنے نرم بستر میں سوتے ہوئے ہلکے سے کھلتے اور بند ہوتے دروازوں کی آواز سے بھی ڈسٹرب ہو جایا کرتی تھی اور اس کی نہایت کچی نیند ہلکی سی آہٹ پہ بھی کھل جاتی تھی اور آج زمین کی سختی اور ہزاروں لوگوں کے ہجوم میں بھی وہ گہری نیند سوتی رہی۔۔۔ فکروں سے دماغ بھرا پڑا ہو تو وہ آنکھوں میں بھی گہری نیند اترنے نہیں دیتا اور جب ہر فکر سے آزاد ہو جائے تو شاید اسی طرح بے سدھ ہو جاتا ہے۔

سیکورٹی گارڈ تین راتوں سے مسلسل اسے پبلک ایریا کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ سوتے دیکھ رہا تھا۔ پہلے دو دن تو اس نے سوچا کہ یا تو اس کی فلائٹ مس ہو گئی ہے یا وہ یہاں کسی کا انتظار کر رہی ہے اسی لیے ایئرپورٹ پر ہی سو جاتی ہے۔ لیکن چوتھی رات اس سے رہا نہیں گیا۔ اس نے اپنے سیکورٹی ہیڈ کو اس کی رپورٹ کر دی۔۔۔ سیکورٹی آفس طلب کیے جانے پر وہ حیران نہیں ہوئی۔۔۔ پاسپورٹ پر اس کا نام پڑھتے ہوئے اس نے انگریزی میں اسے مخاطب کیا، مس۔۔۔ امل!؟ یہی تلفظ ہے ناں؟ اس نے ایک نظر اٹھا کے ہاں میں سر ہلاتی امل کو دیکھا اور پھر سے اس کے پاسپورٹ پہ نظریں گاڑ کے اپنا سوال مکمل کرنے لگا، بقول آپ کے نہ تو آپ کو اگلی کسی فلائٹ کا انتظار ہے نا کسی دوست یا رشتہ دار کا آپ کو یہاں سے پک کرنے کا، تو پھر آپ چار راتوں سے یہاں کیوں پڑی ہیں؟ وہ اس کی معصوم اور دنیا سے بیزار صورت دیکھ کر نرمی برت رہا تھا ورنہ وہ عموماً اتنے شائستہ انداز سے بات کرنے کا عادی نہ تھا۔

اپنے بیس سال کے کیریئر میں اس نے بے شمار دھوکے باز، مجرم، شاطر اور چالاک لوگ دیکھے تھے جو پکڑے جانے پر بھرپور معصومیت اور اداکاری کا مظاہرہ کرتے تھے اور وہ ان سب سے نمٹنا اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس لڑکی کے چہرے کی معصومیت بناوٹی نہیں بہت اصلی اور بے نیازی تھی وہ شاید خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اس کی اداس آنکھوں اور بنا تاثرات کے چہرے پہ کتنی شفافیت تھی۔ ”کیونکہ میرے پاس اور کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔“ اس نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

”تو کیا آپ جانتی نہیں تھیں کہ یہاں آ کر آپ کو کوئی ٹھکانہ تو ڈھونڈنا ہو گا۔ وزٹ ویزہ ہے! آپ کہیں تو آپ کے لیے کسی ٹورسٹ گائیڈ کا بندوبست کر سکتا ہوں حالانکہ یہ ہماری ڈیوٹی نہیں، میری ڈیوٹی اس ایئرپورٹ کی سیکورٹی ہے لیکن آپ چونکہ یہاں کسی کو جانتی نہیں تو میں ان آفیشلی آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ اس نے آفر کی۔

”اس کی ضرورت نہیں، آپ کا بہت شکریہ!“ جواب آیا۔

”تو مس! آپ کو ایئرپورٹ پر اپنی ذاتی وجوہات کی بنا پر رکنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جب تک کہ آپ کے پاس ایئرپورٹ سے منسلک کوئی وجہ نہ ہو۔ یہ ہمارے سیکورٹی اصولوں کے خلاف ہے۔ آپ کو جانا ہو گا۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو صبح تک کی فیور دے سکتا ہوں لیکن اس سے آگے مزید ایک رات نہیں۔۔۔ اسے پتہ نہیں اس پاکستانی سیاح سے اتنی ہمدردی کیوں ہو رہی تھی؟ نہ تو وہ کم عمر تھی، نہ ہی گلیمرس اور نہ ہی بجلیاں گراتی ناز و انداز لیے کوئی ایسی صورت جس کے

Pakistanipoint.com

ظاہری حسن سے متاثر ہو کر وہ اس سے دوستانہ رویہ رکھتا۔ اور ذاتی طور پر اسے پاکستانیوں سے ایک خاص قسم کی چڑ تھی۔ بھلے پوری دنیا سے ہر سال تیس سے چالیس ملین لوگ لندن کی سیاحت پر آتے ہوں لیکن یہ پاکستانی تو اسے لگتا تھا جیسے انگریزوں سے برصغیر پہ دوسو سال حکومت کرنے کا بدلہ لے رہے ہیں۔ یہاں آ کر ان کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے ہیں، نوکریاں کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں سیٹل ہوتے ہیں اور یہاں سے ڈھیروں کما کما کر اپنے ملک بھیجتے ہیں۔۔۔ یونائیٹڈ کنگ ڈم کی بیس فیصد آبادی ان پاکستانیوں کی ہے۔ ہماری نسلوں میں ملاوٹ، ہمارے کلچر میں ملاوٹ حتی کہ ہمارے مذہب میں بھی ملاوٹ، ہماری عورتوں کو مسلمان کر کے مسلمان بچے پیدا کرتے ہیں اور یہاں ایسے دھڑلے سے رہتے ہیں جیسے یہ ان کا ملک ہے اور ہم کہیں اور سے اٹھ کے یہاں آئے ہیں۔ وہ اس بے ضرر سی پاکستانی لڑکی سے جسے صرف اس کے ڈاکیومینٹس ہی خاتون ثابت کر سکتے تھے ورنہ وہ دیکھنے میں بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی، اپنی شدت پسند سوچوں کو چھپاتے ہوئے بولا تھا۔ شکر یہ! شاید اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ طبیعت بہتر ہوئی تو میں رات سے پہلے ہی چلی جاں گی، اس نے اس کی مدد قبول نہیں کی۔ اوہ! آپ کو میڈیکل چیک اپ کی ضرورت ہے؟ میں آپ کے لیے۔ اس کا پاسپورٹ واپس دیتے ہوئے آفیسر نے ایک اور مدد کی آفر کی۔

' اس کی ضرورت نہیں! میں ٹھیک ہوں بس تھوڑی تھکاوٹ ہے۔'' اس بار بھی مدد لینے سے انکار کر دیا گیا۔ وہ اپنا پاسپورٹ اپنے بیگ کی اندرونی جیب میں رکھ کے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے ساتھ ہی وہ بھی اپنی سیٹ سے خود بخود اٹھ گیا اور اس احساس کے ساتھ کہ وہ کس حساب سے ایک پاکستانی لڑکی کو اتنا پروٹوکول دے رہا ہے کچھ خجل سا ہو کے واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اب مانیٹر پر اس کی حرکات وسکنات کا جائزہ لینے لگا جو باہر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

سورج ڈھل چکا تھا مگر اس کی ذہنی تھکاوٹ نہیں وہ فیصلہ نہیں کر پائی باہر نکلنے کا اور اب تو باہر اندھیرا بھی ہو چکا تھا کیوں نہ وہ ایک رات اور یہیں رہ لے۔ اتنی رات انجان جگہ کہاں پھرے گی؟ اور پھر سیکورٹی آفیسر تو پہلے ہی اسے آج رات کی اجازت دے چکا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اپنی مخصوص جگہ جا کر فرش پہ لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اس نے محسوس کیا کہ دو سیکورٹی گارڈز اس کی طرف دیکھ کر آپس میں باتیں کر رہے ہیں ان میں سے ایک تو وہی شام والا گارڈ تھا جو اسے اپنے ساتھ سیکورٹی ہیڈ کے آفس لے کر گیا تھا جبکہ دوسرے کو اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ آج سے پہلے اس نے لوگوں پہ غور ہی کرنا شروع نہیں کیا تھا لیکن آج کی گفتگو سے اس کا دماغ تھوڑا کھل گیا تھا اور اب اس نے سوچ بچار شروع کر دیا تھا۔ اپنی دماغی صحت کی طرف یہ اس کی پہلی ذہنی ورزش تھی۔ وہ دونوں ضرور اس پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔

بھلا میں کوئی دہشت گرد ہوں؟ یہاں آ کر پہلی بار کسی کی نظروں میں آنا اسے بے چین کر رہا تھا۔ وہ تو یہاں کی بھیڑ میں گم ہونے آئی تھی نہ کہ نظروں میں آنے کے لیے اور وہ جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ اس کے اٹھنے کی دیر تھی کہ اس پہ دو دن سے نظر رکھنے والا سیکورٹی گارڈ اور مانیٹر پہ بیٹھا سیکورٹی آفیسر دونوں ایک ساتھ چونکے۔۔۔ ایک کالی پرچھائی ٹھیک اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی اور دو قدم چل کر وہ کالا سایہ غائب ہو گیا تھا۔۔۔

سیکورٹی گارڈ بھاگتا ہوا مانیٹر روم میں آیا تو مانیٹر آپریٹر کو بھی خوفزدہ پا کر سمجھ گیا کہ اس نے بھی کچھ دیکھا ہے اور پھر ان دونوں نے مل کر وہ فوٹیج کئی بار دیکھ ڈالا جس میں واضح ایک کالا سایہ اس لڑکی کے ساتھ اٹھتا اور چلتا دیکھا گیا تھا۔ ''مجھے یہ فوٹیج مل سکتا ہے؟'' گارڈ نے پوچھا۔ ''تم کیا کرو گے؟'' مانیٹر آپریٹر نے پوچھا۔ یو ٹیوب پہ دوں گا، وائرل ہو گیا تو میرا بھی نام ہو جائے گا۔۔۔ کل باس سے پوچھیں گے۔ اور پھر وہ دونوں

لڑکی کے آسیب زدہ ہونے پر بحث کرنے لگے۔

ایک ہاتھ سے وہیل بیگ تھامے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے کندھے پہ جھولتے ہینڈ بیگ کو پکڑے وہ ائیر پورٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ ٹیکسی لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ یہ خبر نہیں تھی کہ اسے کہاں جانا ہے؟ سمت کا تعین کیے بنا وہ پیدل چلتے ہوئے کار پارکنگ اور ائیر پورٹ کی رونقیں بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

رات کے سناٹے میں سڑک کے کنارے چلتے ہوئے اس علاقے کے سنسان ہونے کا احساس بڑھ گیا تھا۔ دور دور تک کسی آبادی کے آثار نہیں تھے۔ وہ بھی جیسے بس چلتے ہی رہنا چاہتی تھی اس کے بعد چاہے تھک کے سڑک کنارے ہی کیوں نہ لیٹ جائے۔۔۔ وہ ماضی کے ساتھ ساتھ آنے والے وقت سے بھی بے نیاز ہو رہی تھی جو کہ نارمل بات نہیں تھی پر جیسے اب وہ کسی بھی بات کو اپنے اعصابوں پر سوار کرنے کو تیار نہ تھی۔

''امل!'' اسے اپنا نام سنائی دیا تو اس نے رک کر اپنے چاروں اور دیکھا، اپنا وہم جان کر دو قدم آگے بڑھی ہی تھی کہ پھر سے سرگوشی ہوئی۔ ''امل!'' کوئی اس کا نام لے رہا تھا لیکن آواز کی سرگوشی سے آواز کی جنس کا تعین نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے پھر سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا جہاں دور دور تک کوئی نہ تھا اس نے چلنا شروع کر دیا تیسری بار اس کا نام لیے جانے پر وہ نہیں رکی اور چلتی رہی کہ تبھی اچانک اس کے بائیں جانب ایک درخت کی اوٹ سے کوئی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس نے نووارد کو دیکھا تو ایک پل کے لیے وہ لڑکھڑا گئی۔ اس کے سامنے عجیب الخلقت سی کوئی عورت کھڑی تھی۔۔۔ کالے، مٹیالے، الٹے سیدھے کپڑے جسے وہ کسی مخصوص لباس کا نام نہ دے سکی، اجاڑ، گندے الجھے ہوئے بال جن پہ اس کے لباس سے جڑا کپڑا کسی ہوڈ کی مانند اس کے آدھے سر پہ پڑا ہوا تھا۔ کالے گہرے حلقوں میں گھری اس کی خوفناک تقریباً باہر کو نکلتی ہوئی آنکھیں اور کالے ہونٹوں کی بھیانک ترین مسکراہٹ اس کے غیر انسانی ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔

انسانوں نے اس کے ساتھ کون سا انسانی سلوک روا رکھا تھا غیر انسانی رویے وہ پہلے ہی سہہ چکی تھی اب غیر انسانی وجود بھی سہی۔۔۔

اس نے دل کڑا کر کے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس کی اس دیدہ دلیری پہ حیران رہ گئی، کبھی کوئی انسان اس کے وجود سے اتنا بے خوف نہیں ہوا تھا۔ عام انسان اس سے ڈر کر بے ہوش اور مرنے کی حد تک بھی پہنچ جاتے تھے تو یہ بھلا کس مٹی کی بنی تھی؟

نہ وہ کوئی جادوگرنی تھی، نہ کوئی مذہبی پیشوا تو بھلا اتنی نڈر کیسے ہو سکتی تھی؟ اس نے اسے اپنی توہین جانا اور ایک آخری حربے کے طور پہ امل پہ کود پڑی، وہ اب امل کے اوپر چڑھے بیٹھی تھی مگر امل پھر بھی خاموش تھی جبکہ وہ اچھے سے دیکھ سکتی تھی کہ امل کی یہ خاموشی ڈر کے نتیجے میں نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ وہ بولنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ زمین پر لیٹے ہوئے امل نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی بجائے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو اس عجیب الخلقت عورت نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔۔۔

''دیکھا! اتنی بھی بہادر نہیں ہے تو جتنا ظاہر کر رہی۔ ہمت ہے تو دیکھ میری آنکھوں میں۔۔۔ دیکھ! میرا نام امبرا ہے، وہ چلائی تو امل نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔

''مارنا ہے؟ تو مار لو، لوگوں کو خوف میں مبتلا کر کے تمہاری اذیت پسندی کو جو تسکین ملتی ہے وہ تمہیں مجھ سے نہیں ملے گی۔ تم سے زیادہ بھیانک روپ دیکھے ہیں میں نے انسانوں کے، انسانی شکلیں، شیطانی رویے۔۔۔ تم تو اپنے اصل میں ہو، تم جو ہو سامنے ہو، تم سے کیا ڈر؟ وہ جو اسے زمین پہ گرا کر اس پہ چڑھ بیٹھی تھی گردن ایک طرف کر کے اسے حیرت سے تکنے لگی۔ اور پھر اپنی بھیانک غیر انسانی آواز میں بولی۔

''جانتی ہوں میں موت کی بہت چاہ ہے نہ تجھے؟ اور جب اس نے جملے میں وقفہ دے کر آخری تین الفاظ ادا کیے تو اپنی جیت پہ قہقہے لگانے لگی۔ اور اس کے

اوپر سے ہٹ کر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

امل نے اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیسے جانتی ہو مجھے؟ کون ہو تم؟''

''مجھے دیکھ کر بھی اندازہ نہیں ہوا کہ میں کون ہوں؟ تمہاری زبان میں تو مجھے نہ جانے کیا کیا کہا جاتا ہے؟ بہت سے نام ہیں میرے۔۔۔ چڑیل، ڈائن، بلا اور جو تمہارے معاملے میں مجھ پہ سب سے زیادہ صحیح بیٹھتا ہے، آسیب!''

''کیا تم وہی ہو جو پچھلے کئی سالوں سے میرے خوابوں میں میرا پیچھا کرتی رہی ہو؟ نہ جانے اسے ایک دم سے کیسے اپنے خوابوں میں روپ بدل بدل کے نظر آنے والی اس چڑیل کا خیال آ گیا؟

''واہ! تو نے تو بڑی جلدی پہچان لیا مجھے۔۔۔ ہاں! میں وہی ہوں، اب یہ نہ پوچھنا کہ میں تجھ سے کیا چاہتی ہوں؟ تیرے ہر سوال کا جواب نہیں دوں گی میں۔'' وہ اپنی بھیانک آواز و انداز میں بولی۔

''مجھے جواب چاہیے بھی نہیں اور تم کیا چاہو گی مجھ سے؟ کوئی بھی مجھ سے کیا چاہ سکتا ہے؟ مجھے ڈرانا، دھمکانا، بلیک میل کرنا، برباد کرنا، زندگی تباہ کر دینا، بے سکون کر دینا، اکیلا کر دینا، دربدر کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور کر دینا؟ یہ سب تو ہو چکا ہے میرے ساتھ سوائے موت کے، تو لو تمہارے حصے بس اتنا ہی آیا ہے۔'' وہ پرسکون سے انداز میں سب کہہ گئی۔

''تمہیں مارنا ہی ہوتا تو کبھی مار دیتی جب مجھے تمہارے پیچھے لگایا گیا تھا پر اپنے کالے عمل کے ذریعے مجھے تمہارے پیچھے لگوانے والی نہ تو تمہاری وہ رشتہ دار رہی نہ ہی تمہارے پیچھے مجھے لگانے والا وہ عامل۔۔۔ اب میں آزاد ہوں۔'' ایسا کہہ کر وہ ہوا میں اوپر اٹھ گئی اور اپنے بازو کھولے امل کے گرد قہقہے لگاتے ہوئے ایک چکر کاٹا۔ اور پھر اس کے سامنے زمین پہ اترتے ہوئے بولی۔ ''پوچھو گی نہیں اس رشتہ دار عورت کا نام؟ نہیں!''

''جانتی ہوں اسے، بچپن سے لڑکپن اور پھر جوانی تک کئی بار اسے اپنے خوابوں میں مجھ پر جادو کرتے دیکھ چکی ہوں۔'' امل جانتی تھی کہ کون سی حاسد عورت اس سے بغض رکھتی تھی۔ ''اوہ! ہاں تمہارے خواب! میں تو بھول ہی گئی کہ تم تو بہت کچھ دیکھ لیتی ہو اپنے خوابوں میں، بہت یقین رکھتی ہو نہ تم اپنے خوابوں کی دنیا پہ؟ مجھ تک کو پہچان لیا تم نے۔۔۔'' وہ بھیانک آواز میں بولی۔

''ہاں! حقیقت سے یقین اٹھ چکا ہے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا؟ بتانا آسان نہیں! لیکن میرے خوابوں نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سب سچ دکھاتے رہے ہیں، سب کی اصلیت۔۔ کون دوست ہے اور کون دشمن؟'' امل دھیمے سے بولی۔ ''میری تم سے دشمنی تو تمہارے دشمنوں کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو چکی ہے اب تو میری اپنی غرض ہے تم سے۔'' وہ اپنے خوفناک چہرے پہ ایک بھیانک مسکراہٹ لیے بھیانک لہجے میں بولی۔

''غرض؟ تم سے کیا بعید؟ کہو!'' امل نے با آسانی حامی بھر لی۔

امبر ایک قدم پیچھے ہٹی اور حیرت سے ایک بار پھر اپنے چہرے کو ایک طرف جھکا کے امل کو تکنے لگی۔۔۔ ''تمہیں تو انسانوں کے علاوہ ہمیں بھی حیران کرنے کا ہنر آتا ہے۔ حیران ہوں تمہارے اس اطمینان پہ۔۔۔ کچھ عجب نہیں کہ کوئی بھی انسان تم سے حسد کرنے لگے۔۔۔ اب اس عورت کی تم سے دشمنی کی وجہ سمجھ میں آئی، واقعی بہت قابل ہو۔۔۔ وہ بھیانک آواز میں اپنی حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ ایک آسیب کے منہ سے اپنی تعریف سننا اس کے لیے نیا تھا مگر اسے اس بات سے دلچسپی نہیں ہوئی کہ وہ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے، اس نے زمین پہ جھک کے اپنا سامان اٹھایا اور بولی۔ ''اپنی غرض بتا۔''

''ضرور بتاؤں گی۔ اتنی آسانی سے تو مجھ سے پیچھا چھٹنے والا نہیں تمہارا۔ ابھی ایک ٹیکسی آ کر تمہارے پاس رکے گی، اس میں بیٹھ جانا۔'' اتنا کہتے ہی وہ جھٹ سے غائب ہوگئی۔ اس کا غائب ہونا تھا کہ فوراً ہی اسے

گاڑی کا ہارن سنائی دیا وہ پلٹی تو ایک ٹیکسی اس کے پاس آ کے رکی۔۔۔اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا جو کسی ٹرانس کی سی حالت میں تھا اور اس کی پچھلی سیٹ پہ ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی مسکرا رہی تھی، امل کو دیکھتے ہی بولی! ''آ وَ امل! بیٹھو۔ وہ سمجھ گئی کہ کار میں بیٹھی لڑکی کون ہے؟ اس نے دروازہ کھولا اور پہلے اپنا سامان سیٹ پہ رکھا اور پھر تھوڑی سی جگہ پہ خود بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اس نے اپنے اور اس کے بیچ جیسے ایک باڑ بنا لی تھی۔ امبرا مسکراتے ہوئے امل سے مخاطب ہوئی۔'' کافی ذہین ہو۔ خود کو میرے حوالے کرنے کی بہادری دکھانے کے باوجود اپنے تحفظ سے غافل نہیں ہو۔''

نہ جانے زندگی اسے کہاں لیے جا رہی تھی اور ابھی تو امبرا اسے جہاں لے جا رہی تھی وہ بھی بنا مزاحمت اس کے ساتھ ہو لی تھی۔ تقریباً پینتالیس منٹس کی ڈرائیونگ کے بعد گاڑی ایک جگہ رکی تو امبرا نے اسے پھر سے مخاطب کیا۔''میرے جانے کے پانچ منٹ بعد ریسپشن سے اپنے کمرے کی چابی لے لینا۔'' یہ کہہ کر وہ گاڑی سے اتر کر اندر چلی گئی۔۔۔ڈرائیور ابھی بھی کسی کٹھ پتلی کی طرح سیدھا بیٹھا بس سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ امبرا کے زیر اثر ہے۔ پانچ منٹ بعد وہ اندر گئی تو ریسپشنسٹ نے بنا کوئی سوال و جواب مسکرا کر اس کے آگے ایک رجسٹر بڑھا دیا جس میں اس نے اپنے سائن کیے اور بس اتنی سی کاروائی پر اس نے کمرے کی چابی اسے پکڑا دی تو ایک ملازم نے آگے بڑھ کر اس کا سامان تھام لیا اور اسے اس کے کمرے کی طرف لیجانے کی غرض سے آگے چلنے لگا۔

وہ ایک اوسط درجے کا ہوٹل تھا جس میں رش نہ ہونے کے برابر تھا وہ دروازہ لاک کرتے ہی آ کر بستر پر گر پڑی۔۔۔اس نے یہ بھی دیکھنا گوارہ نہ کیا کہ یہاں تک لانے والی امبرا کمرے میں پہلے سے موجود تھی۔ تین راتوں سے لگاتار ائیر پورٹ کے فرش پر لیٹنے سے اس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا جس کا احساس اسے اس نرم بستر پر لیٹتے ہی ہوا تھا۔ پھر تو اس میں ریسپشن پہ کال کر کے کوئی پین کلر منگوانے کی بھی ہمت نہ رہی اور درد اور تھکاوٹ کی ملی جلی کیفیت میں کب وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی اسے پتہ ہی نہ چلا۔

صبح ملازم کے بار بار دروازہ بجانے پر بھی جب وہ نہیں جاگی تو اسے جگانے کے لیے اس کے کمرے کا نمبر ڈائل کیا گیا فون کی مسلسل گھنٹی سے اس کی آنکھ کھلی، نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے فون کان سے لگایا اور پھر نیند بھرے لہجے میں بولی ڈونٹ ڈسڑرب می اگین! وہ اتنا کہہ کر پھر سے سو گئی اور فون بنا کریڈل پہ رکھے ہوا میں جھولتا رہ گیا۔

سہ پہر تک اس کی آنکھ کھلی وہ فریش ہو کر باہر نکلی، ائیر پورٹ سے نکلنے سے لیکر اس ہوٹل میں آنے تک کے سارے لمحے اس کے ذہن میں فلم کی مانند چل رہے تھے۔۔۔وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلی آئی دروازہ بند کر کے پلٹی تو سامنے امبرا بیٹھی تھی اسی حسین لڑکی کے روپ میں۔۔۔وہ ایک دم چونک گئی۔۔۔بہتر لگ رہی ہو۔۔۔ہاتھ آگے کرو۔۔۔امبرا کے کہنے پہ امل نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو اس نے اس کی کلائی پہ ایک کٹ لگایا یہ سب اتنا جلدی ہوا کہ امل کو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا وہ وہیں بیٹھ گئی۔۔۔امبرا نے ایک شیشے کی کھلے منہ والی بوتل لیکر امل کی کلائی سے بہتے خون کے نیچے رکھ دی اور بوتل میں خون بھرنے لگا۔ امل نے اب بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بوتل کو بند کر کے امبرا نے ایک ہینڈ بیگ میں ڈالا اور امل کے سر پہ ہاتھ پھیرتی دروازے سے نکل گئی۔۔۔امل کی نظریں اپنی کلائی پر پڑیں تو وہاں نہ خون تھا نہ کوئی زخم بس ایک ہلکا اور باریک سا نشان تھا جیسے کوئی بہت پرانا کٹ لگ جانے پر رہ جاتا ہے۔۔۔اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے حیرت ابھری اور پھر اگلے ہی لمحے وہ پھر سے بے نیاز نظر آنے لگی۔

اور پھر امبرا اکثر آنے لگی، وہ کچھ سرنجوں میں امل کا خون بھرتی اور بیگ میں رکھ کے چلی جاتی۔

ایک ہفتے سے امل نے ہوٹل سے باہر ایک قدم

Pakistanipoint.com

نہیں نکالا تھا۔۔۔ کھانا بھی دن میں ایک بار کھاتی وہ بھی جب جاگنے پر اس کا دل گھٹنے لگتا تو اسے معلوم پڑتا کہ اسے کچھ کھانے کی ضرورت ہے تو اپنے کمرے میں ہی منگوا لیتی، ہوٹل کا اسٹاف اس کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگا تھا۔ اس نے بن بلائے کسی کو بھی اپنے کمرے میں آنے یا اسے فون کر کے ڈسٹرب کرنے سے منع کیا تھا۔

ذہنی کمزوری تو پہلے سے تھی اب جسمانی کمزوری بھی بہت بڑھ چکی تھی وہ یا تو سوتی رہتی یا بیڈ پر لیٹی خلاں میں گھورتی رہتی، نہ جانے کیا کچھ سوچتی رہتی اور پھر اس کی آنکھیں بہنے لگتیں اور وہ یونہی روتے روتے پھر سے سو جاتی، اتنی نیند تو اسے کبھی نہیں آئی تھی۔ ہائپر ایزونیا کی شکایت اسے پہلے بھی رہ چکی تھی لیکن اب تو وہ اس ڈپریشن سے نکل آئی تھی یا پھر ابھی صرف ڈپریشن کے ماحول سے ہی نکلی تھی؟

ایک دو بار اس نے ہوٹل سے باہر نکل کر گھومنے پھرنے کا سوچا مگر جسم نے ساتھ نہ دیا۔۔۔

آج بھی وہ سارا دن سوتی رہی تھی آنکھ کھلی تو کمرے میں گھپ اندھیرا تھا کھڑکی سے باہر اسٹریٹ لیمپ کی دھیمی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آن کرنا چاہی کہ تبھی اس کے کانوں میں بھیانک سرگوشی ہوئی۔۔۔ لیٹی رہو۔ میں ہوں ناں؟ اور پھر کسی نے کمرے کا سوئچ آن کر دیا۔

امبرا اسی حسین لڑکی کے روپ میں اس کے بستر کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ بڑی ڈیمانڈ ہے بھئی تمہاری! امبرا نے اہل کو اپنی طرف دیکھتے ہی کہا۔

کیا مطلب؟ اہل نے سوال کیا۔

تمہیں معلوم ہے کہ میرا تعلق غیر انسانی مخلوق کی جس قسم سے ہے ان کی خوراک کیا ہے؟ امبرا نے سوال کے جواب میں ایک اور سوال کر دیا۔

خون! اہل نے دھیمے سے جواب دیا۔ ارے واہ! پھر تو تمہیں یہ بھی اندازہ ہوگا کہ آج کے مہذب اور ترقی یافتہ معاشرے میں ہم جیسوں کے لیے اپنی خوراک کا بندوبست کرنا کتنا مشکل کام ہوگا؟ اب یہ کام ہم کھلے عام کریں تو تم انسان تو ہماری نسل ہی ختم کر دو۔۔۔ بڑے اختیارات ہیں بھئی تمہارے پاس۔۔ دماغ، تعلیم، علم کی طاقت، نئی نئی ایجادات، نئے نئے حربے، قابلیت، وغیرہ وغیرہ۔۔۔ جانور ٹھیک رہتے ہیں، وہ کیا کہتے ہو تم انہیں؟ بے زبان! تو نہ وہ احتجاج کرتے ہیں نہ ہم سے بچنے کے لیے ہم پر حاوی ہو سکتے ہیں آسان شکار ہوتے ہیں ناں۔۔۔ لیکن تم انسان ہمارے پسندیدہ ہو، تم لوگوں کا خون ہمارے لیے سب سے لذیذ اور اعلیٰ ہوتا ہے تو ظاہر ہے بہت قیمتی بھی ہو گا۔ امبرا حسین لڑکی کی حسین آواز میں یہ سب بھیانک باتیں کر رہی تھی۔

جانور بے زبان نہیں ہوتے، وہ تو ہم انسانوں کو ان کی زبان سمجھ نہیں آتی اور ہم اپنی اس کمی کو اس جھوٹ سے ڈھانپ لیتے ہیں کہ جانور بے زبان ہوتا ہے۔ جانور بے زبان نہیں کمزور ہوتا ہے، بے اختیار ہوتا ہے، اہل کمزور لہجے میں بولی تو امبرا اس کے اور نزدیک آ کے بولی۔۔۔ تم بھی تو انسان ہو؟ مگر انہی کے بنائے اصولوں سے منحرف کیوں ہو؟ امبرا نے سوال کیا۔ جب انسان خود میں جھوٹ اور بے حسی کی ملاوٹ کر لے تو اس میں انسانیت رہتی کہاں ہے؟ ایسی صورتِ حال میں، میں منحرف ہی سہی۔ خود کو ان میں سے ایک کہلوانا میرے لیے باعثِ فخر نہیں شرمندگی ہے۔ اہل نے جواب دیا۔

شاید اسی لیے ڈیمانڈ ہے تمہاری۔۔۔ تمہارے خون کے نمونے میں نے انگلینڈ کے کونے کونے میں پہنچا دیے تھے، بڑے مثبت نتائج رہے۔ اب تو سوچ رہی ہوں کیوں نہ تمہاری نیلامی کر دوں۔۔۔ بہت قیمتی ہو تم! امبرا پھر سے بھیانک باتوں پر اتر آئی تھی۔ نیلامی کر کے کیا ملے گا؟ تم ایک ہی بار میرے جسم کا سارا خون نکال لو۔'' اہل نے اطمینان سے کہا۔

''جس طرح تم انسانوں میں قیمتی چیزوں کے عوض روپیہ، پیسہ اور دولت ملتی ہے نہ اسی طرح ہماری

دنیا میں قیمتی چیزوں کے عوض بہت سے اختیارات، رتبے، طاقتیں اور وسائل ملتے ہیں۔ جیسے تم انسانوں میں اپنے قیمتی اثاثوں کی نیلامی ہوتی ہے ٹھیک ویسے ہی ہمارے ہاں اپنے قیمتی اور انمول شکاروں کو لے کر بھی نیلامی ہوتی ہے۔ لیکن کوئی عام انسان اس نیلامی کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہاں کا ماحول، وہاں کی سفاکیت، وہاں کی دعوت، وہاں کے شیطان دیکھنا کسی کے بس کی بات نہیں۔۔۔ پتہ چلے کہ جس کی بولی لگانے کے لیے اسے نیلامی میں لایا گیا ہے اس ہی کی بولتی ہمیشہ کے لیے پہلے ہی بند ہو چکی ہے، امبرا اپنی ہی بات پہ زور زور سے قہقہے لگانے لگی اور پھر امل کو اپنی طرف دیکھتے اس کے پاس آ کر بولی، ویسے تم ہو بہت تعاون کرنے والی! کوئی مزاحمت نہیں، کوئی چلانا ولانا نہیں، رونا دھونا، شور شرابا یا بھاگ جانے کے جتن نہیں، تم آج تک کی میری سب سے خاص ہو تو تمہارے لیے کچھ خاص ہی سوچنا پڑے گا۔''

''کہاں تک بھاگوں گی میں؟ انسانوں سے بھاگتی آئی ہوں اب تم لوگوں سے بھی بھاگوں؟ تو پھر جانا کہاں؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ کچھ چاہتی بھی ہوں یا نہیں؟''

امل نیا پنا سر تھام لیا۔

امبرا کچھ توقف کے بعد بولی، اگر واقعی تمہارے لیے اپنی زندگی میں کوئی مقصد، کوئی خواہش نہیں بچی تو پھر تو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تم کہاں رہتی ہو اور کیا کرتی ہو؟ اپنے کام نہیں آ سکتی تو کسی اور کے آ جاؤ۔ میں کل آؤں گی تمہیں لینے'' اور یہ کہہ کر امبرا اس کے بستر سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی مگر دروازہ کھولنے سے پہلے ہی غائب ہو گئی۔ جب وہ ماضی میں گڑگڑا کر دعائیں کرتی تھی کہ جو اذیتوں بھری زندگی وہ گزار رہی ہے کاش کہ یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہو اور جب اس کی آنکھ کھلے تو ایک نئی خوبصورت اور پرسکون زندگی انہیں کھولے اس کے انتظار میں کھڑی ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ سب حقیقت ہے۔

خاندان کی بے رخی، شوہر کے ظلم، سب کے سفاک، بے حس رویے سب حقیقت ہے اس کی دن رات کی اذیتیں سب کچھ حقیقت ہے یہ خواب نہیں جو ختم ہو گا اور وہ شکر کرے گی کہ اس نے ایک برا خواب دیکھا تھا اور سب بھول جائے گی۔

اور آج جب وہ بہت کوششوں سے خود کو اس تکلیف دہ ماحول سے نکال کر یہاں اتنی دور آ گئی تھی تو اب بھی سب خواب جیسا ہی لگ رہا تھا۔ جینے کی طلب اب بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی اور پھر یہ غیر انسانی دنیا کا نیا باب؟ تو کیا اب وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟ پتہ نہیں یہ سب کیا تھا۔۔۔ وہ سوچتے سوچتے پھر سے سو گئی۔

اگلی سہ پہر ریسپشنسٹ نے امل سے گزشتہ ہفتے کی پیمنٹ لے کر رجسٹر میں اس کے سائن لیے، اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اسے اس کے کمرے کی جانب جاتے دیکھا وہ غالباً چیک آؤٹ کرنے سے پہلے بل ادا کرنے آئی تھی اور اب کمرے میں اپنا سامان لینے جا رہی تھی۔ ایک ہاؤس کیپر نے مشکوک سی امل کو اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے اور پھر اپنی طرف مڑ کر مسکراتے دیکھا۔ جواباً وہ بھی مسکرایا اور اندر جا چکی امل کے پیچھے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی تو دیکھا کہ کمرے کے اندر بیڈ پر کوئی لیٹا ہے لیکن سامنے کھڑی امل نے اپنی مسکراہٹ کو سنجیدگی میں بدلتے ہوئے اسے گھورا اور دروازہ بند کر دیا۔ جب وہ بیڈ کی طرف مڑی تو امل کی جگہ امبرا اسی حسین لڑکی کے روپ میں کھڑی بیڈ پر سوتی امل کو دیکھ رہی تھی۔ وہ کچی پکی نیند سوتی امل کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سوتی ہوئی امل کی بند آنکھوں پہ اپنا خوبصورت ہاتھ رکھ دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک بھیانک، لمبے اور تیز ناخنوں والے ہاتھ میں تبدیل ہو گیا۔ امبرا اپنے اصلی روپ میں آ چکی تھی۔

چیک آؤٹ کا ٹائم گزرے بھی ایک گھنٹا اوپر ہو چکا تھا تو ریسپشنسٹ نے ہاؤس کیپر کو امل کے کمرے میں چیک کرنے کے لیے بھیجا کہ اسے کمرہ خالی کرنے میں اور کتنی دیر ہے؟ تاکہ وہ اس کمرے کو پھر سے ٹھیک

کر کے آنے والے کسٹمرز کے لیے دستیابی کے زمرے میں لا سکے۔

کافی دیر دروازے پہ دستک دینے کے بعد بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو ہاؤس کیپر نے ہینڈل گھما کے دیکھا جو ان لاک تھا۔ کمرے سے امل اپنے سامان سمیت غائب تھی، واش روم بھی چیک کیا گیا لیکن اس کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ اسے باہر آتے اور لابی سے گزرتے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لابی میں ریسیپشن کا سٹاف اور گارڈ سمیت کوئی یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ امل ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر کے ہوٹل سے باہر نکلی ہو۔ سی سی ٹی وی کیمرہ میں بھی بس آخری بار اسے کمرے میں ہی جاتے دیکھا گیا تھا۔ اور وہ ہوٹل کے کمرے سے اندر ہی اندر کہیں غائب ہو چکی تھی۔

منیجر نے پولیس کو اطلاع نہ دینے کی یہ توجیہہ پیش کی کہ چونکہ نہ تو یہاں کوئی واردات ہوئی ہے نہ کوئی فراڈ، بلکہ ایک کلائنٹ اپنی رہائش اور کھانے پینے کی فل پیمنٹ کر کے اپنا اکاؤنٹ کلیئر کر کے جا چکا ہے بھلے اسے کسی نے اپنی آنکھوں سے ہوٹل سے باہر نکلتے نہیں دیکھا پھر بھی اس ایک غیر نقصان دہ عمل پہ انہیں خود کو کسی جھمیلے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ جو ہوا وہ ناسمجھ میں آنے والا صحیح مگر ایک بے ضرر واقعہ ہے سو اس کی غیر ضروری تشہیر سے اجتناب برتا جائے۔

وہ ایک سنہری غار نما کشادہ عمارت میں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے وکٹورین طرز کی لیکن بنا شیشے والی ایک کھڑکی تھی جس کے باہر وہ گھنا ترین مگر سرسبز جنگل دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کھڑکی کے سامنے اس گھنے جنگل کو دیکھ رہی تھی اور تبھی اس کے دائیں جانب سے کوئی اس جگہ داخل ہوا اور اس سے بیس بائیس گز پہلے کھڑی امبرا کے پاس رک گیا۔ امبرا نے اس سے کچھ مختصر بات چیت کی اور وہاں سے چلی گئی۔ وہ باوقار انداز میں چلتا ہوا کھڑکی سے باہر دیکھتی امل کے پاس آیا اور امل کی گردن پہ جھک گیا۔۔۔ امل جو اس کے یہاں آنے، امبرا کے اس کے ساتھ بات کرنے، امل کو یہاں چھوڑ کر چلے جانے، اور پھر اس کے امل کی گردن پہ جھک کے اس کا خون پینے تک کی پوری روداد سے باخبر تھی مگر وہ اب بھی بنا کسی احتجاج کے وہیں کی وہیں کھڑی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی جہاں سامنے جنگل کے اندر سے کوئی چیز اسے اپنی طرف آتی دکھائی دے رہی تھی۔

قریب آنے پر اس نے دیکھا کہ وہ ایک بیل ہے کوئی بہت خوبصورت ہرے بھرے پتوں سے لدی ایک بیل اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تیزی سے اگتی ہوئی بیل نے اس کھڑکی سے لپٹ کے ایک فریم کی سی صورت اختیار کر لی۔ ایک جیتا جاگتا سانس لیتے پتوں کی تازہ بیل سے بنا کھڑکی کا فریم اور یہ سب بس کچھ سیکنڈز کے اندر ہوا اور بس اتنی ہی دیر تک وہ بھی اس کی گردن پہ جھکا رہا اور جب وہ اس کا خون پی کر سیدھا ہوا تو امل نے پہلی بار اسے دیکھا۔۔۔ ساڑھے چھ فٹ کے آس پاس کی قد وقامت والا وہ بارعب شخص اس کے سامنے کھڑا تھا جس نے ابھی ابھی اس کا خون پیا تھا لیکن عجیب بات کہ امل کو اس سے رتی بھر بھی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا جبکہ پہلی بار تو امبرا کو بھی دیکھ کے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ سنہری رنگت، گھنگریالے کالے لمبے کندھوں تک آتے بال اور بے حد سنجیدہ گہری کالی آنکھیں۔۔۔ ان دونوں نے کچھ پل ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر وہ بنا کچھ کہے جانے کے لیے پلٹ گیا۔ یہ سب وہ پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔ وہ اس شخص کو پہلے دیکھ چکی ہے۔ یہ کھڑکی یہ جنگل، یہ خود بخود اگتی بیل، یہ سنہرا غار، امبرا کا اسے یہاں لا کر اسے اس شخص کے حوالے کر کے چلے جانا اور پھر اس کا خون پینا۔۔۔ ہاں! یہ سب حرف بہ حرف آج سے بیس سال پہلے اس نے ایک خواب میں دیکھا تھا۔

اس وقت وہ اپنا ہر خواب ایک ڈائری میں لکھتی تھی لیکن یہ خواب اسے کبھی نہیں بھولا تھا کیونکہ ایک جادوگرنی کے حلیے والی عورت کا اسے دور دراز کے ایک انجانے جنگل کے سنہرے غار میں لانا اور پھر اسے وہاں خون پینے والے کسی کے حوالے کر کے چلے جانا اور امل کا

پھر بھی بنا تاثرات کا چہرہ لیے بے خوف کھڑے رہنا اس لیے کوئی معمولی خواب نہیں تھا۔ اس وقت تک کسی آدمی کے گھنگریالے بال یا کالی آنکھیں اس کی پسندیدہ بالکل نہیں تھیں لیکن جب اس نے خواب میں اسے دیکھا تھا تب وہ سوچنے پہ مجبور ہو گئی تھی کہ کیا کالے گھنگھریالے بال اور کالی سیاہ آنکھیں بھی کسی کے حسین ترین ہونے کی وجہ ہو سکتی ہیں؟ اس کے چہرے کی سنجیدگی اور اس کے مضبوط، قد و قامت نے اس کی شخصیت کے گرد جو ایک بارعب ہالہ بنا رکھا تھا وہ اس سب سے غیر متاثر کیسے وہاں کھڑی تھی؟ اور آج سمجھ آیا کہ اس کی اب کسی چیز سے اثر انداز نہ ہونے والی ذات زندگی کی کن کن تکلیفوں اور آزمائشوں سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی کہ انسان تو انسان اب یہ مافوق الفطرت چیزیں بھی اس پہ اثر انداز نہیں ہو پا رہی تھیں۔ اور شاید اسی لیے غیبی دنیا کے مشاہدے بھی اس کے سامنے یوں آشکار ہونے لگے تھے۔ کون ہو تم؟ وہ چہرے پہ سنجیدگی اور آنکھوں میں اترتا نشہ لے کے اہل کے سوال پہ پلٹا اور اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے جواب دیا روش۔۔۔

اس کے جانے کے بعد ایک سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی اہل کو ایک کمرے میں لے آئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑی اور نہایت آرام دہ خوابگاہ تھی جس کی در و دیوار اور چھت سب سنہری تھے۔ خوبصورت پلنگ پہ آرام دہ بستر، قدیم و کٹورین طرز کے صوفے، بے انتہا خوبصورت قالین جس کے اوپر بہت نفاست سے کسی جنگل کا پورا منظر بنا گیا تھا۔۔۔ اتنی باریک بینی کا کام اس نے آج تک کسی قالین یا کپڑے پر نہیں دیکھا تھا وہ وہیں بیٹھ کے اس صاف ستھرے قالین پہ بنے منظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی مگر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک بچھے اتنے بڑے قالین کے منظر کو اتنے قریب سے ایک ہی بار اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا ممکن نہ تھا۔ وہ یہ سمجھتے ہی وہاں سے اٹھ گئی۔ یہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی لیکن کمرے کے وسط میں لگے بے حد بڑے فانوس میں ہزاروں کی تعداد میں شمعیں روشن تھیں۔ پلنگ کے سامنے والی دیوار میں لگے بہت بڑے شیشے کے پیچھے اسے کچھ خالی جگہ کا احساس ہوا، وہ آگے بڑھی تو وہاں ایک دھندلے سے شیشے کا دروازہ تھا جس کے دوسری طرف نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہاں ایک خوبصورت حوض تھا اور حوض کی دیواروں سے چھوٹے چھوٹے جھرنے نما سوراخوں سے پانی حوض میں گر رہا تھا۔ اس نے حوض کے کنارے بیٹھتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈالا تو وہ نیم گرم تھا اور تبھی اسے احساس ہوا کہ لندن کی سرد آب و ہوا کے برعکس اس جگہ کا موسم بالکل بھی سرد نہیں ہے، نہ جانے یہ کون سی جگہ ہے؟ ہوٹل کے کمرے سے اس سنہرے محل تک کے سفر کے بارے میں اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ امبرا اسے یہاں کب اور کیسے لائی تھی۔ نیم گرم پانی اور جھرنوں سے نکلتی چھوٹی چھوٹی آبشاروں کو دیکھ کر اس کے دل میں شدت سے نہانے کی خواہش جاگی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ ایک بہت بڑا اور خوبصورت واش روم ہے جہاں غسل کا ہر سامان موجود تھا۔ حوض کے پچھلی جانب کی دیوار پوری شیشے کی بنی تھی جس کے باہر کا ہرا بھرا اور خوبصورت جنگل اسے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ تذبذب کا شکار ہو کر وہاں سے اٹھنے لگی کہ تبھی شیشے کے دروازے پہ دستک ہوئی۔ کون؟ اس نے پوچھا۔

تبھی کمرے تک اس چھوڑنے والی لڑکی اندر داخل ہوئی۔ میں اینجلا ہوں! روش کا آپ کے لیے پیغام ہے کہ یہ کمرہ اور یہ حوض آپ ہی کے لیے ہیں، آپ بلا جھجک اسے استعمال کر سکتی ہیں۔ یہاں آپ کی اجازت کے بغیر کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے سامنے بنی شیشے کی دیوار کی جانب دیکھا تو وہ لڑکی فوراً بولی۔ آپ اس کی فکر مت کریں اس شیشے کے ذریعے آپ باہر سب کچھ دیکھ سکتی ہیں لیکن اس شیشے کے باہر سے کوئی اندر نہیں دیکھ سکتا۔ باہر سے یہ ایک دیوار جیسا ہے اور ویسے بھی یہ روش کی سلطنت ہے یہاں

اس کی اجازت کے بنا کوئی نہیں آ سکتا۔ آپ کی ضرورت کا ہر سامان اس الماری میں موجود ہے، اس لڑکی نے دائیں جانب ایک دیو قامت شیشے کی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے مطلع کیا اور جانے کے لیے پلٹ گئی۔

اہل نے دیکھا کہ نہ تو اس نے دروازہ کھولا اور نہ باہر نکلی، بس دروازے کے قریب پہنچ کر دیکھتے ہی دیکھتے کہیں غائب ہوگئی تھی۔

عجب جادو نگری ہے یہ۔۔۔ بچپن سے جوانی تک دیکھی جادوئی دنیا کی فلموں جیسی۔۔۔ کیا یہ سب حقیقت میں موجود ہوسکتا تھا؟ اور اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

اس کا کمرہ اتنا بڑا تھا کہ وہیں ایک طرف جہاں بیٹھنے کے لیے جگہ تھی وہیں دوسری طرف ایک ڈائننگ ٹیبل موجود تھی اور اس کے پلنگ سے کچھ فاصلے پہ ڈریسنگ ایریا تھا جہاں بہت بڑا سنگھار میز موجود تھا۔ جب وہ نہا کر کمرے میں آئی تو اسے لگا کہ گلاب کی ہلکی ہلکی خوشبو سے سارا کمرہ مہک رہا ہے، اس کے پلنگ کی دونوں سائیڈ ٹیبلز، ڈریسنگ ٹیبل حتی کہ ڈائننگ ٹیبل پر بھی سفید گلاب کے گلدستے سنہری گل دانوں میں رکھے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے کمرے میں رہتے ہوئے اس نے بمشکل جب بھی گرم پانی سے شاور لیا تھا، اپنے آپ کو کبھی اتنا تازہ دم محسوس نہیں کیا تھا جتنا وہ آج کر رہی تھی۔ جہاں ہوٹل کے کمرے میں بیماروں کی طرح پڑی ہوئی اسے بھوک نہیں ستاتی تھی وہیں آج اتنے دنوں بعد پہلی بار اسے بھوک کا احساس ہوا تو اس کی نظر بے ساختہ ڈائننگ ٹیبل کی جانب اٹھ گئی جہاں اسے کھانا لگا ہونے کا احساس ہوا وہ قریب آئی تو اس کا اندازہ صحیح نکلا۔۔۔

میز پر موجود کسی ڈش سے وہ واقف نہیں تھی لیکن جو کچھ بھی اس نے کھایا وہ سب کچھ بہت لذیذ تھا۔ کھانا کھاتے ہی اسے پھر سے نیند آنے لگی وہ اٹھی اور پلنگ پہ جا کر لیٹ گئی۔۔۔ پلنگ اس کی سوچ سے زیادہ نرم اور گداز تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد جب وہ نیند سے جاگی تو وہ کسی فکر سے اٹھ بیٹھی۔۔۔ اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر بھاگتی ہوئی حوض کے پاس گئی جہاں اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر آ گئی۔ وہ اپنی گھڑی لیے کمرے میں آ گئی۔

جب سے لندن آئی تھی اس نے ایک بار بھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ وہ جیسے دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے بھی غافل ہوچکی تھی۔

ذہنی جسمانی، تھکاوٹ، کمزوری اور نہ سمجھ میں آنے والی بیماری نے اسے جیسے ہر چیز سے لاتعلق کر دیا تھا لیکن آج اتنے پر آسائش غسل، کھانے اور آرام کے بعد جو پہلی چیز اس کے دماغ میں آئی وہ نماز تھی۔ لیکن اسے وقت کا تعین کرنے کے لیے اپنی رسٹ واچ درکار تھی جو بند پڑی تھی اور اس میں نظر آتی تاریخ اور دن کے حساب سے یہ گھڑی آج ہی بند ہوئی تھی۔ پاکستان سے آنے سے کچھ دن قبل ہی اس نے نئے سیل ڈلوائے تھے اور ابھی ایک سال کی وارنٹی بھی باقی تھی۔ نہ تو یہاں جائے نماز تھی نہ اسے قبلہ رخ کا پتہ تھا۔ وہ نماز پڑھنے کے لیے بے چین تھی۔ پچھلے ایک ہفتے کی قضا نمازیں بھی ادا کرنی تھیں۔ لڑکپن سے اس کی ایک عادت تھی کہ اس کی جو بھی نمازیں قضا ہوتیں تھیں انہیں وہ اپنی یادداشت کے لیے ایک ڈائری میں نوٹ کر لیتی تھی اور جب سے موبائل فون استعمال کرنا شروع کیا تھا تب سے اس کے نوٹس میں اپنی قضا نمازوں کو درج کر لیتی تھی لیکن یہاں نہ اس کے پاس ڈائری تھی اور نہ موبائل فون۔۔۔ اور اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اتنے دنوں کی قضا نمازوں کی لسٹ مزید لمبی نہیں ہونی چاہیے۔۔۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ تبھی اس کے کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی۔ آجا، وہ بولی تو اینجلا ہاتھ میں جائے نماز لیے اس کی طرف بڑھی۔ روش نے بھیجی ہے، وہ لڑکی بنا پوچھے بول پڑی۔

مجھے قبلہ رخ نہیں پتہ۔ اہل بولی، حالانکہ اسے امید تھی کہ اس بلونڈ لڑکی کو جو دیکھنے میں کسی پرانے برٹش دور کی نظر آتی تھی، قبلہ رخ کا معنی بھی پتہ نہیں ہوگا۔ کہ

بھی اینجلا بولی آپ اسے زمین پہ کسی بھی سمت بچھالیں تو جان جائیں گی۔ زمین؟ اہل نے سوالیہ نظروں سے اپنے پیروں کے نیچے بچھے دبیز قالین کی جانب دیکھا جس پہ بنے جنگل کے منظر میں جا بجا پرندے، جانور اور انسانوں کا رش لگا ہوا تھا۔۔۔ اس پہ نماز پڑھوں؟ وہ جیسے خود سے مخاطب ہوئی۔ اس طرف جائیں گی تو آپ کو جگہ مل جائے گی۔ اینجلا نے اس کے پلنگ کے دائیں جانب اشارہ کیا جہاں صوفے پڑے تھے۔ یہ کہہ کر وہ پلٹی کہ اہل پھر سے بولی۔۔۔ ''مجھے یہاں وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا۔'' اینجلا اس کی طرف مڑی، آپ کو یہاں وقت کا اندازہ ہو بھی نہیں سکتا۔ یہاں کے دن و رات کی مسافت الگ ہے پھر بھی آپ یوں سمجھ لیں کہ آپ کی دنیا کے حساب سے دن کے تین پہر گزر چکے ہیں آپ اسے عصر کا وقت سمجھ سکتی ہیں۔ وہ پھر سے پلٹی اور دروازے کے پاس جا کر غائب ہو گئی۔ اب تک کی ہونے والی ساری عجیب باتوں کے باوجود وہ اس لڑکی کے عصر کے بارے میں آگاہی پہ چونکی ضرور تھی اور پھر اس جانب بغور دیکھتے ہوئے جہاں اینجلا نے اشارہ کیا تھا، آگے بڑھی تو اسے دیوار کے پاس ایک شگاف نظر آیا جو اب سے پہلے اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔ خوبصورت سنہرے فرش پر وہ جیسے ہی جائے نماز بچھا کر کھڑی ہوئی وہ سفید رنگ کی بے انتہا خوبصورت اور دبیز جائے نماز دائیں زاویے کی طرف گھوم گئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ وہی قبلہ ہے۔

☆.....☆.....☆

میں تمہیں کئی سال پہلے ایک خواب میں دیکھ چکی ہوں لیکن تمہارے نام کے سوا تمہارے بارے میں کچھ جانتی نہیں۔ وہ اس کمرے کے ڈرائنگ ایریا میں موجود اپنے سامنے بیٹھے روش سے مخاطب تھی۔ کل تمہارا خون پینے سے پہلے تک میں بھی تمہیں نہیں جانتا تھا۔ روش کی بات پہ اہل کا ہاتھ اپنی گردن تک گیا لیکن وہاں کسی قسم کا کوئی زخم نہیں تھا۔ تو تم نے اتنی جلدی کیسے چھوڑ دیا مجھے؟ کیا میرا خون پسند نہیں آیا تمہیں؟ اہل نے سوال کیا۔ کل محض تمہارا تعارف درکار تھا تو بس اپنے اندر اتنا ہی اتارا جتنا تمہارے بارے میں مکمل معلومات کے لیے کافی تھا۔ روش نے جواب دیا۔ اچھا تو بلڈ ٹیسٹ کیا تھا؟ وہ نہ جانے کس دھن میں بول گئی، مزاق تھا یا طنز؟ مگر وہ اپنی برجستگی محسوس کیے بنا نہ رہ سکی جو کبھی اس کی شخصیت کا خاصا تھی۔ نہ جانے وہ اس کی بات سمجھا بھی تھا یا نہیں؟ مجھ میں اور امبرا میں بہت فرق ہے۔ اگر وہ ایک بار تمہارے جسم میں اپنے دانت گاڑ دیتی تو بنا رکے ایک ہی ساتھ تمہارے جسم کا سارا خون پی جاتی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ خود کو روک نہیں سکے گی، اس میں اتنا کنٹرول ہی نہیں ہے، اس میں کیا اس قسم کے کسی بھی اور شکاری میں نہیں ہے لیکن میرا تعلق جس نسل سے ہے اسے اپنے حساب اور اپنی مرضی کے تحت ایک ہی انسان سے بار بار اپنی ضرورت پوری کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ پہلے وہ تمہاری نیلامی کرنا چاہتی تھی لیکن پھر امبرا کو لگا کہ مجھ سے تمہارا سودا اس کے لیے زیادہ فائدہ مند ہو گا اور ایسے میں وہ تم پہ اپنا ہاتھ صاف نہ کرنے کی پابند تھی۔ تم خوش قسمت ہو جو اس نے تمہیں یہاں پہنچا دیا ورنہ وہ ایک ہی وار میں تمہیں ختم کر دیتی اور تم یہاں کی پر آسائش خوابگاہ کی بجائے کسی قبر میں پڑی ہوتی۔

روش چپ ہوا تو وہ بولی، احسان جتانے کا شکریہ! تمہیں صرف آگاہ کر رہا ہوں، یہ آسائش اور خوابگاہ تو ہر اس لڑکی کو تب تک میسر آتی ہے جب تک مجھے اس کے خون کی طلب رہتی ہے یا یوں سمجھ لو کہ جب تک اس میں خون کا آخری قطرہ رہتا ہے تو تم پہ کوئی مہربانی نہیں، جب تک زندہ ہو، تمہاری ضروریات پوری کرنا یہاں کی روایت ہے۔ اس نے بڑے آرام سے اسے یہاں دی جانے والی آسائشوں کا پس منظر بیان کیا۔

ہوں! یعنی پہلے کئی انسان ایک ساتھ مل کر میرا خون چوستے رہے ہیں اور اب ایک غیر انسانی مخلوق صحیح معنوں میں مرتے دم تک میرا خون پیے گی۔ روش اہل

کی مایوسی بھانپتے ہوئے بولا، امبرا نے ٹھیک کہا تھا تمہارے بارے میں، تم باقیوں جیسی نہیں ہو۔ پہلی بار کسی لڑکی کو اپنے سامنے اتنا بے خوف پایا ہے، کل بھی تم نے کوئی مزاحمت کی اور نہ آج میری باتیں سن کے تم ڈری ورنہ کسی بھی لڑکی کو بنا زبردستی قید میں رکھنا کبھی ممکن نہیں ہوا، اسے قابو کرنے کے لیے اس کے دماغ پہ قابو کرنا پڑتا تھا۔ لیکن تم نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جو میرے لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں نے امبرا سے تمہیں کیوں خریدا؟ روش نے پوچھا۔

ہاں کیونکہ اسے کچھ مراعات چاہیے تھیں اور تمہیں خون! وہ یقین سے بولی۔ ہاں! امبرا کے بارے میں تو تمہارا اندازہ بالکل درست ہے لیکن میں تمہیں ہی کیوں خریدوں گا؟ جبکہ مجھے تم سے کم عمر لڑکیاں مل سکتی ہیں جن کی صحت بھی تم سے بہتر ہوتی یعنی ان کا خون زیادہ بہتر ہوتا؟ روش کے سوال پہ امل نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تو چلو تمہارے خاص ہونے کے انعام کے طور پر میں تمہیں اپنے ایک ایسے راز کے بارے میں بتاتا ہوں جو آج سے پہلے میرے بارے میں کوئی انسان نہیں جان سکا۔ امل ہمہ تن گوش تھی۔

روش نے کہنا شروع کیا۔۔۔ تم انسان اپنی تفریح کے لیے جو کچھ کرتے ہو اسے دیکھ کہ ہم رشک کرتے ہیں۔ گزرتی صدیوں کے ساتھ تم انسانوں نے دنیا میں جس قدر ترقی کی ہے وہ سب دیکھ کر تمہارے سب سے بہترین مخلوق ہونے کی بات پہ یقین آ جاتا ہے۔ تم لوگوں نے صحرا میں نخلستان اگا لیے، پہاڑوں کو کاٹ کر رستے بنا لیے، اونچی اونچی، عجیب وغریب عمارتیں بنا لیں، بڑے بڑے خوبصورت باغات، اور تو اور ہوا میں اڑنے کی سکت نہ ہونے کے باوجود، ہوا کو تسخیر کر لیا، انہی ہواؤں کے دوش پہ ہزاروں لاکھوں میل سفر طے کر کے دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنے کی کامیابی بھی حاصل کر لی، راتوں کے اندھیروں کو مصنوعی روشنیوں سے روشن کر دیا گویا زمین پہ چاند ستارے اتار لیے، اپنی زندگی سہل بنانے کے لیے نت نئی ایجادات سے ہماری طاقتوں اور قوتوں کو چیلنج کیا۔۔۔ جہاں تم لوگ زمین اور خلاؤں کو مسخر کرتے رہے وہیں ہم میں سے بہت سی غیر انسانی اور غیبی مخلوقات جو تم عام انسانوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہوئے بھی تمہاری طرح اسی زمین پہ موجود خشکی، ہواؤں اور پانیوں میں بستی ہے، ان کے تم سے حسد اور حسد کی بنا پر انسان دشمنی کو پروان چڑھنے کا موقع بھی ملا کیونکہ جب سے یہ زمین تم انسانوں کے اس میں آزادی کے ساتھ رہنے کے لیے چنی گئی، ہماری دنیا محدود ہو گئی۔۔۔ اور اس زمین پہ اتنے ٹھاٹھ سے رہنے کے لیے تم انسانوں نے اپنی تفریح کے لیے جو کچھ کیا وہ کھلے عام ہم غیر انسانی مخلوق کے لیے کرنا اتنا آسان نہیں۔ تم لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم نظر نہیں آتے اس لیے سب کچھ کر سکتے ہیں اور ہمارا یہ ماننا ہے کہ ہم نظر نہیں آتے اس لیے بہت کچھ نہیں کر سکتے۔۔۔

مثال کے طور پہ کچھ صدیوں سے پنپتی تمہارے تماشوں کی دنیا۔۔۔ روش جو پورے کمرے میں چکر لگاتا اپنے اور انسانوں کے بیچ تنازعات پہ روشنی ڈال رہا تھا پھر سے اس کے سامنے آ بیٹھا۔۔۔ ہمارے تماشوں کی دنیا؟ امل نے نہ سمجھتے ہوئے اس کے آخری الفاظ دہرائے۔۔۔ ہاں! وہ کیا کہتے ہو تم لوگ اسے اپنی زبان میں؟؟؟ شوبز، انٹرٹینمنٹ انڈسٹری۔۔۔ اب دیکھو آج تک تم لوگوں نے کتنے ان گنت تماشے کر ڈالے اور اپنے بنائے مصنوعی تماشوں کو ایک دوسرے کی تفریح کا ذریعہ بناتے رہے۔ ان تماشوں میں ہر طرح کا انسانی موضوع دکھایا اور تو اور تم انسانوں نے تو ہمیں بھی نہیں چھوڑا، ہمارے بارے میں نہایت کم اور ناقص علم رکھنے کے باوجود اپنی قیاس آرائیوں پر مبنی تماشوں میں ہمیں بھی گھسیٹ لائے، ویسے کبھی کبھی خوشی بھی ہوتی ہے کہ تم لوگوں نے اس قدر کامیابیوں اور ترقیوں کے باوجود ہمیں بھلایا نہیں، روش مسکرایا۔

ان تماشوں کو ڈرامے اور فلمیں کہتے ہیں، امل نے کہا۔

جانتا ہوں جانتا ہوں، ڈرامے، فلمیں، اسٹیج شوز، سب جانتا ہوں، آٹھ صدیوں سے تمہاری ہر ترقی کو اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھا ہے، ان میں حقیقت سے زیادہ قریب صرف ڈاکیومینٹریز ہی ہوتی ہیں۔ علم و تحقیق پر مبنی جبکہ باقی سب تماشے ہی ہیں حالانکہ آج کل کے جھوٹے انسانوں نے تو ڈاکیومینٹریز کو بھی تماشہ ہی بنا دیا ہے۔ روش نے اہل کو ثابت کیا کہ وہ ذخیرہ الفاظ سے انجان نہیں، صرف اپنی پسند کے حساب سے الفاظ کا چنا کر رہا تھا۔

ہوں! لیکن تم غیر انسانی مخلوقات پہ بنی سبھی فلمیں اور ڈرامے مطلب سبھی تماشے محض قیاس آرائیاں نہیں ہیں، انسانوں کے تم غیبی مخلوقات سے جڑے تجربات اور مشاہدات بھی ہیں، پتہ نہیں وہ غیر دانستہ طور پہ انسانوں کی حمایت کر رہی تھی یا روش کی غلط فہمی دور کر رہی تھی۔۔۔ اچھا! واقعی؟ مثلاً اگر کسی انسان کے ساتھ کبھی ہمارا آمنا سامنا ہوا تو بھلا وہ ہماری طاقتوں، ہمارے اختیارات اور ہماری دنیا کے بارے میں کچھ بھی دکھا کے انسانوں کو گمراہ کیسے کر سکتا ہے؟ روش نے قیاس آرائی والی بات پہ دلیل دی۔

گمراہ تو شاید غیبی مخلوق ہی کرتی ہے انسان کو اپنے بارے میں کچھ کا کچھ دکھا کے، تو پھر سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا انسان کو کیسے پتہ چلے گا؟ اور ویسے بھی تمہارے بارے میں مکمل علم نہ سہی لیکن جتنا بھی علم انسان کو ہے وہ مذہبی کتابوں اور ان میں درج تاریخ کے واقعات سے ہی انسان کو ملا ہے جو بھلے نامکمل ہے کیونکہ تمہیں یقیناً کچھ خاص وجوہات کی بنا پر ہی انسانی آنکھ سے پوشیدہ رکھا گیا ہے اور جتنا تم لوگ اپنی مرضی یا کبھی کبھار انسان کی زبردستی سے خود کو ان پہ ظاہر کرتے ہو تو وہی سب مواد انسان کو تم پہ یہ تماشے بنانے پہ اکساتا ہے۔ اہل نے غیبی مخلوقات پر بنائے تفریحی مواد کے صحیح یا غلط ہونے کی دلیل پیش کی۔ ہوں! یہ بات تمہاری درست مان لیتا ہوں، روش نے کہا۔

تم تو مجھے اپنے کسی راز کے بارے میں بتانے والے تھے لیکن انسانوں سے اپنی مخلوق کے بڑھتے حسد اور دشمنی کی وجوہات گنوانے لگے۔ اہل نے کہا تو روش بولا، کیونکہ میرا راز تمہاری انہیں انسانی ایجادات، ترقیوں اور بدلتے وقت سے جڑا ہے، ہماری دنیا اپنے آپ میں وسیع صحیح لیکن تم انسانوں کی طرح تفریحی آزادی سے اس قدر لیس نہیں۔۔۔ اب چونکہ ازل سے آج تک ہم تمہیں دیکھ پا رہے ہیں تو یہ بھی جان چکے ہیں کہ تم انسانوں کے پاس کرنے کے لیے بہت کچھ ہے، رنگ برنگی تفریحات، الگ الگ پیشوں سے جڑے علم، اپنی مصروف ترین زندگیوں کی بے شمار کہانیاں اور رنگ برنگے طریقوں سے اپنی ہی دنیا کو بتانے کے لیے ان گنت قصے، اتنے لاتعداد کہ تم لوگ زندگی بھر بھی ان کو اپنے تماشوں میں استعمال کرو تو کبھی ختم نہ ہوں۔

میرا تعلق خون پینے والی غیبی مخلوق کی جس قسم سے ہے ان میں سے بس چند ہی ایسے ہیں جو خون کو صرف اپنی خوراک کے طور پہ ہی استعمال نہیں کرتے بلکہ تمہارے خون کے ذریعے تمہاری دنیا کی سیر بھی کر سکتے ہیں لیکن مجھ جیسوں کی تعداد بہت کم ہے اور جن کے پاس یہ خاصیت ہے وہ اپنی دنیا کے بہت با اثر اور طاقتور لوگ ہیں۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے میں کسی بھی انسان کے خون کو تب تک پیتا ہوں جب تک کہ میرا دل چاہے اور میرا دل تب تک چاہتا ہے جب تک کہ میں اس سے جڑی ان ساری تفریحات کا مشاہدہ نہ کر لوں جو وہ اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے اور جب تک اس کی زندگی کے تجربات سے میرے مشاہدوں کی مکمل تسکین نہیں ہو جاتی وہ زندہ رہتا ہے اور اس کے بعد۔۔۔ روش نے اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی انگلیوں کو کھولتے ہوئے اوپر اٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنا جملہ جیسے مکمل کیا لیکن اہل اب بھی ہمہ تن گوش تھی۔

روش نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔۔۔ اب تمہیں یہ بتاتا ہوں کہ میں ایسا کیسے کرتا ہوں؟ جب میں کسی کا خون اپنے جسم میں اتارتا

ہوں اور وہ خون میرے دماغ تک پہنچتا ہے تو مجھ پہ ایک غشی سی طاری ہونے لگتی ہے بالکل جیسے کوئی نشہ آور اس نشے میں میرے دماغ میں خون کے چھوٹے چھوٹے ان لاکھوں خلیوں میں لاکھوں تصویریں ابھرنے لگتی ہیں، وہ متحرک تصویریں جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی ہوتیں، وہ اس انسان کی زندگی پہ محیط لاکھوں مشاہدوں کی تصویریں ہوتیں ہیں، وہ جو کچھ کرتا رہا ہے، اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے، وہ جہاں جہاں جاتا رہا، جو کچھ کھاتا پیتا، پہنتا رہا ہے، وہ کس بات پہ ہنسا، کس بات سے رویا، جس بات نے اس کا دل دکھایا، یہاں تک کہ جو سارے تماشے اس نے کبھی بھی دیکھے یا وہ کسی تماشے کا حصہ رہا، وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا رہا یا کبھی ملا، میں ان کی شکلوں یا ان کی آوازوں سے ان لوگوں کی زندگیوں تک بھی رسائی کر سکتا ہوں۔ اب یہ مجھ پر ہے کہ میں اپنی تفریح کے لیے کیا دیکھنا پسند کرتا ہوں اور ان متحرک تصویروں میں سے جس تصویر کو میں چاہوں اسے چن کر اس کی تفصیل اپنی بند آنکھوں کے سامنے بالکل ایسے دیکھ سکتا ہوں جیسے تم انسان کسی پردے پر اپنی بنائی فلموں کو دیکھتے ہو اور صرف یہی نہیں بلکہ میں چونکہ اس انسان کے توسط سے وہ مشاہدات کر رہا ہوتا ہوں تو میں اس انسان کے اصل جذبات بھی محسوس کر سکتا ہوں کہ جیسے یہ سب میرے ساتھ ہی ہو رہا ہو۔ بس میری یہی خاصیت مجھے میری دنیا کی محدود تفریحات پہ افسوس کرنے سے بچاتی ہے اور یوں میری یہ خوبی تم انسانوں کے ذریعے میری غیر معمولی اور بہت وسیع پیمانے کی سیاحت کا باعث بنتی ہے۔ روش خاموش ہوا تو اہل نے ایک سوال کیا۔

تو کیا تم ایسا صرف انسانوں کا خون پی کر ہی کر پاتے ہو؟

نہیں! میں کسی بھی جاندار کا خون پی لوں، چاہے کوئی جانور ہی کیوں نہ ہو، میں ہر کسی کی زندگی میں اس کے گزرے وقت کو دیکھ سکتا ہوں لیکن جانوروں کی دنیا تو ہم سے بھی زیادہ محدود ہوتی ہے بے شک ان کی زندگی میں بھی کئی کہانیاں اور جذبات ہوتے ہیں لیکن انسانوں جتنی وسیع دنیا تو کسی کے پاس نہیں اور انسانوں میں سے بھی مجھے اپنی تفریح کی غرض سے لڑکیوں کا خون پینے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ ایک تو ان کے پاس جذبات اور احساسات کی بھرمار ہوتی ہے تو ان کی نظر سے دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا نظریہ اپنے آپ میں ہی بہت تفریحی اور دلچسپ ہوتا ہے اور مجھے یہ قبول کرنے میں بھی کوئی آر نہیں کہ میں حسن پرست ہوں اور اپنی رہائش گاہ میں حسین لڑکیوں کی موجودگی بھی میرے لیے باعث تسکین ہوتی ہے۔ میرے لیے عورت کا ظاہری اور باطنی روپ حسین ترین ہے۔ روش نے کچھ توقف کیا اور پھر بولا۔

تمہیں ایک خون پینے والے درندے کے منہ سے یہ رومانوی قسم کی باتیں بہت عجیب لگ رہی ہوں گی؟ نہیں! اگر میں رومانوی باتیں کرنے والے انسانوں کی درندگی نہ دیکھ چکی ہوتی تو شاید ایک درندے کے منہ سے رومانوی باتیں مجھے عجیب لگتیں، اہل نے سنجیدگی سے کہا۔ جانتا ہوں! تم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے، اسی لیے میں نے امبر اسے تمہیں خریدا ہے۔

کچھ عرصے سے ہر دوسرے انسان سے مجھے تقریباً ایک ہی جیسے تجربات دیکھنے کو مل رہے تھے، وہی طرزِ زندگی، وہی رہن سہن، وہی جھوٹی سچی محبتیں، یہاں تک کہ ان کے دیکھے وہی ایک ہی تماشے یعنی فلمیں اور ڈرامے۔ ایک بار ایک انڈین لڑکی کے خون سے میں نے اس کی دنیا میں قدم رکھنا چاہا لیکن اس کا طرزِ زندگی بھی یورپین لڑکیوں جیسا ہی تھا۔ اس کے خون سے مجھے کوئی خاص تفریح تو نہ ملی لیکن اس کی بولی جانے والی زبانوں پہ رسائی حاصل ہو گئی۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔ وہ انگلش کے علاوہ ہندی، اردو، پنجابی اور گجراتی بھی جانتی تھی۔ اور اس سے پہلے میں ان زبانوں سے کچھ خاص واقف نہ تھا۔ اس سے پہلے میرا شکار زیادہ تر برٹش، اسپینش، اٹیلین اور امریکن لوگ رہ چکے تھے اور کچھ افریقی نسل کے انسانوں سے بھی میں نے بہت کچھ سیکھا۔۔۔ لیکن اس ایشیا لڑکی کے تجربات اور زندگی

دلچسپ کہانیوں کا رسالہ

ماہنامہ

بچوں کا میگزین

کراچی

مارچ کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

جس میں جن، بھوت، چڑیل، بادشاہوں،
شہزادیوں کے علاوہ دلچسپ معلومات عامہ،
پہیلیاں، لطیفے، اقوال زریں اور مزیدار کہانیاں شامل ہیں۔
لہٰذا قلم اٹھائیں اور اپنی اچھی اچھی تحریریں فوراً ارسال کر دیں
تاکہ آپ بھی انعامات کے حق دار بن جائیں۔

ماہنامہ
بچوں کا میگزین
میں لکھنے کے لیے کوئی شرط نہیں بلکہ تحریر کا معیاری ہونا ضروری ہے۔

پیارے بچو! بچوں کے میگزین میں رنگین تصاویر بھی شائع کی جائیں گی تو آپ اپنی اچھی اور رنگین تصویر فوراً ارسال کر دیں۔

پیارے بچو، قلم اٹھائیں اور جلد از جلد اپنی تحریریں ارسال کر دیں۔

خط و کتابت کا پتہ:

ماہنامہ
بچوں کا میگزین

گوالی لائن نمبر 3، نورانی آرکیڈ
نیو اردو بازار کراچی
فون نمبر: 021-32744391

Pakistanipoint.com

مجھے کچھ خاص مختلف اور دلچسپ نہ لگے تو محض ایک ہی ملاقات کے بعد میں نے اسے زندگی اور اپنی قید سے آزاد کر دیا اور ایک لمبے عرصے کے بعد جب مجھے تمہارے بارے میں بتایا گیا تو میں نے بنا آزمائے تمہارے سودے سے انکار کر دیا لیکن کل محض چند قطروں میں تمہارا تعرف ہوا تو جانا کہ تمہارے اندر تو واقعی بہت کچھ ہے، بے انتہا کہانیاں، بے شمار قصے، بے تحاشہ جذبات، اور تو اور زندگی کے رشتوں اور تجربوں سے گزرتے تمہارے انسان اور ہمارے بارے میں نظریات۔۔۔ معاشرتی اور معاشی غلامی سے آزاد زندگی کی طرف آنے تک کا تمہارا سفر انسانوں کے بہت غیر معمولی رویوں اور بے حسی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ بات میرے لیے دلچسپی کا باعث ہے کہ جب بہت سارے انسان مل کر کسی ایک انسان کی طرف بے حسی اور بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو کیا وہ ہم بظاہر بے حس اور بے رحم خونی درندوں کو بھی مات دے سکتے ہیں؟ اور میں نے تمہارے مختصر سے تعارف میں تمہاری زندگی اور موت کے بارے میں نظریات کو بھی جان لیا لیکن تفصیل سے اجتناب برتا کہ ابھی صرف تمہیں یہاں رہنے کے لیے چنا گیا ہے۔ روش نے اسے احسان مندی سے دیکھا۔

پھر تو میر یہاں زیادہ عرصہ زندہ رہنے کے چانسز کم ہیں کہ میرے پاس افسردگی اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں اور میری نظر میں یہ مثبت تفریح نہیں ہوگی، اہل نے نظریں جھکالیں۔

تمہیں کیا خبر کہ کون سا موضوع میرے لیے تفریح کا باعث ہو؟ تم نے ساری زندگی بے شمار مطالعہ کیا ہے، بے تحاشہ قصے کہانیاں، تاریخ پڑھ رکھی ہے اور بہت بڑی تعداد میں تماشے یعنی فلمیں اور کچھ ڈرامے بھی دیکھ رکھے ہیں تو ان سب کہانیوں کو پڑھنا، تمہاری تصوراتی آنکھ سے دیکھنا اور ان ساری فلموں کا لطف اٹھانا ابھی باقی ہے جو تم پڑھ اور دیکھ چکی ہو۔ تمہاری زندگی کی طوالت کا تو پتہ نہیں لیکن مجھے میری تفریح کے لیے ایک لمبی مدت کا سامان میسر آ چکا ہے تو جب تک زندہ ہو مطلب یہاں ہو، کھاؤ پیو اور آرام کرو، اپنی پچھلی بے آرام زندگی کی ساری کسر یہاں پوری کرلو۔ اسے اپنی انفرادیت کا اور میرے ساتھ تعاون کا معاوضہ سمجھ لو، اور بس۔۔۔ روش یہ کہتے ہوئے اس صوفے کے پیچھے چلا گیا جس پہ اہل بیٹھی تھی۔ وہ شاید اس کا خون پینے لگا تھا لیکن کافی دیر تک جب روش اس کی گردن پہ نہیں جھکا تو اس نے پلٹ کے دیکھا، وہ وہاں موجود نہ تھا۔۔۔ وہ جا چکا تھا۔

رات نیند میں اس نے اپنی گردن پہ کچھ سنسناہٹ محسوس کی تو اپنا ہاتھ گردن پہ لے جانا چاہا لیکن اس کے ہاتھ اور گردن کے بیچ کوئی سر تھا، اہل کی انگلیاں اس سر کے گھنگریالے بالوں میں الجھ گئیں اس نے آنکھ کھولی تو روش کو اپنا خون پیتے پایا۔ وہ دم سادھے اسی طرح سیدھی لیٹی رہی۔۔۔ اس نے کئی فلموں میں دیکھا تھا کہ کسی انسان کی گردن میں دانت گاڑے جب کوئی خون پیتا ہے تو وہ لمحے انسان کے لیجنڈ فناک اور تکلیف دہ ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ اسے تو روش کے دانت اپنی گردن میں گاڑے جانے کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ وہ جب اس کا خون پی رہا ہوتا تھا تب بھی کوئی تکلیف، کسی درد کا نام ونشان نہیں ہوتا تھا۔ کسی بے حس انسان کی بات اور اس لمحے کا تصور اس کے دماغ میں اچانک ابھرا۔ اگلے ہی لمحے روش نے اپنا سر اٹھا کے جاگتی ہوئی اہل کو دیکھا جس کی آنکھیں اب بھی اس بے حس جملے سے پہنچی تکلیف سے نم تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں میں کچھ پل دیکھتا رہا اور پھر اس کی گردن پہ جھک گیا لیکن خون پینے کے لیے نہیں اس کے نوکیلے دانتوں کے چھوٹے سے زخم پہ اپنی زبان پھیرنے جس سے اس کا تازہ زخم کسی پرانے زخم کے نشان کی طرح بند ہو گیا۔ اور پھر فوراً ہی وہ واپس اٹھ بیٹھا۔ وہ جو اس کے اس عمل کو محسوس کر چکی تھی بولی، تم نے ایسا کیوں کیا؟ آئینے میں دیکھ لینا، یہ کہہ کر وہ بمشکل اپنی نشے میں چور آنکھیں کھولیں پھر اہل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

بولا۔۔۔تمہارے ذریعے کوئی دل کو خوش کر دینے والی کہانی دیکھنے آیا تھا ڈھونڈ رہا تھا کہ اتنی ساری متحرک تصویروں میں سے تم کس میں مسکرا رہی ہو؟ لیکن تمہارے ابھی کے اس تصور نے مجھے اس کا پس منظر دیکھنے پہ مجبور کر دیا کہ دیکھوں کہ وہ کون ہے جو یہ کہتا ہے کہ درد جسمانی مسئلہ نہیں محض ذہن کی خرافات ہے؟ اور وہ اپنے آخری ٹوٹے پھوٹے جملوں کے ساتھ وہیں آنکھیں بند کیے لیٹ گیا۔۔۔ اہل جو اس کے وہیں لیٹ کے اس کی زندگی کی سیاحت پہ نکل جانے کی اس اچانک افتاد پہ کسی قدر جھجک گئی تھی، اپنا لباس بمشکل اس کے نرغے سے کھینچتی ہوئی بستر سے اتری۔ اس نے روش کا بستر سے نیچے لڑھکتا ایک بازو اس کے سینے پہ رکھا اور اس کی پلنگ سے نیچے لٹکتی ٹانگوں کو بہت جان لگا کے پلنگ پہ سیدھا کیا۔ روش کو دیکھ کے اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کافی مضبوط اور وزنی جسم کا مالک تھا اسی لیے اسے بستر پہ ٹھیک کرتے کرتے اہل کی سانس پھول چکی تھی۔ وہ ابھی اتنی تندرست نہیں تھی نہ ہی اس میں اتنی سکت تھی۔ پھر وہ کسی خیال سے سنگھار میز کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی، گردن سے اپنے بال پیچھے کر کے اس نشان پہ ہاتھ پھیرا تو وہاں تازہ زخم جیسا کچھ بھی نہیں تھا بس ایک بہت ہلکا اور غیر واضح نشان تھا وہ اب روش کی اس حرکت کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ وہ ہر بار اس کا خون پینے کے بعد اس لیے ایسا کرتا تھا تاکہ زخم مندمل ہو جائے اور اس کے اس عمل کے جادوئی اثر سے وہ زخم فوراً ہی ٹھیک ہو جاتا تھا۔ وہ اپنے بستر کے پاس چلی آئی کچھ دیر پلنگ پہ بے خبر پڑے روش کو دیکھتی رہی جس کی بند آنکھوں کی پتلیاں ادھر ادھر حرکت کرتی محسوس ہوتیں تو کبھی اس کی پیشانی پر بل آ جاتے۔۔۔

نہ جانے وہ کیا دیکھ رہا تھا اگر بقول اس کے اس نے اپنے دیکھنے کے لیے وہ لمحہ چنا تھا جو اس کا خون پیتے ہوئے اہل کے تصور میں ابھرا تھا تو یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی اداسیوں کو کسی کے لیے بھی تفریحی موضوع بنانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنی زندگی میں وہ ہمیشہ رونے دھونے والے ٹی وی ڈراموں اور فلموں سے دور بھاگتی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ اصل زندگی میں کیا کم پریشانیاں ہیں جو اپنے تفریحی لمحوں میں بھی یہ سب دیکھوں۔ اور اب وہ روش کو اپنے سامنے انہی اداس لمحوں کو جیتے دیکھ رہی تھی۔ کیا وہ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرے؟ مگر کیسے؟ پانی؟ نہیں وہ ناراض ہو گیا تو؟ یہ سب اس نے اپنی مرضی سے چنا ہے، مجھے اس کی اس چیز میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ وہ اس کے چہرے پہ نظریں ٹکائے پیچھے ہٹتی گئی اور صوفے پہ جا کر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا وہ جلد ہی اس سب فضولیات سے تنگ ہو کر خود ہی اپنی آنکھیں کھول دے گا لیکن وہ اس طرح پڑا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی، یہ اندازہ اہل نے اس خوابگاہ کے گلاس ڈور سے آتی روشنی سے لگایا وہ روشنی جو اس کے خوبصورت شاہی حوض کے پیچھے والی بڑی سی شیشے کی دیوار سے منعکس ہو کر آ رہی تھی۔

روش نے آنکھیں کھول کے دائیں جانب صوفے پہ نیند سے نڈھال بیٹھی تھکی تھکی سی اہل کو دیکھا۔

تم سوئی نہیں؟ روش نے بستر سے اترتے ہوئے پوچھا لیکن اہل خاموش رہی۔ ویسے تو یہ پورا محل میرا ہے میں جہاں چاہے آ جا سکتا ہوں، بیٹھ یا سو سکتا ہوں اور تمہیں میں خرید چکا ہوں تو میں تم سے معافی مانگنے کا مجاز نہیں ہوں۔ پھر بھی میں نے آج جو کچھ تمہارے بارے میں دیکھا اس کے لیے مجھے افسوس ہے۔ کوئی تمہیں اپنی ملکیت کہتا تھا اور شادی کے کاغذات کو ملکیت نامہ اور اس نے تمہیں ایک بے جان چیز کی طرح ہی سمجھا اور رکھ کر بھول گیا، نہ تمہاری ذمہ داری اٹھا سکا، نہ تمہیں محبت دے سکا بلکہ تمہیں یہ کہہ کر کہ تمہاری ساری دردیں بس تمہارے ذہن کی اختراع ہیں تمہارے علاج معالجے سے بھی لاپرواہ رہا اور یوں تمہاری جسمانی تکلیفوں کے ساتھ تمہاری ذہنی تکلیفیں بھی بڑھتی گئیں۔۔۔ یہ سب دیکھنے کے بعد، تمہیں خریدنے کے باوجود میں تمہیں اپنی ملکیت نہیں کہوں گا۔ میں نے سوچا نہیں تھا کہ میرے تصور اتنے طویل ہو جائیں گے۔ میں تو بس کچھ پل کے

لیے یہاں آیا تھا لیکن تمہاری تکلیفوں کی تہہ در تہہ صورتحال مجھے تمہاری زندگی میں پیچھے اور پیچھے لی جاتی رہی اور میں ہر بات جاننے کی غرض سے نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا۔۔۔ افسوسناک تھا سب میرے لیے لیکن بے حد حیران کن بھی۔۔۔

انسان! ہاں! روش نے انسان کا لفظ اپنا سر جھٹک کے طنزیہ ادا کیا۔۔۔ امل نے اپنی بھیگی آنکھیں جھکا لیں اور بولی، تم نے کہا تھا نہ کہ میں تم سے تعاون کرتی ہوں اور خاص بھی ہوں تو اس کے انعام میں تم مجھے اپنا رازدان بنا کر بری کیسے ہو سکتے ہو؟ میں تو تمہارے رحم وکرم پہ زندہ ہوں، یہاں سے نکل کے کہیں نہیں جا سکتی تو بھلا تمہارا راز مجھ سے افشاں ہو جانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ انعام تو نہ ہوا۔ متفق! تو کیا چاہتی ہو؟ روش نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی مرضی کا انعام پوچھا۔

میرے ساتھ تم نے ایک ذہنی تعلق قائم کیا ہے جو میرے لیے ایک نیا اور انوکھا تجربہ ہے میں تم سے یہ تعلق یہیں تک رکھنے کی درخواست کرتی ہوں۔ جانتی ہوں تم اپنی خوراک کے لیے میرے خون کے محتاج نہیں کیونکہ نہ تو یہ اتنا جوان ہے اور نہ ہی صحتمند، میں صرف تمہاری انسانی زندگی کی سیاحت کا ذریعہ ہوں۔۔۔ تو تم اپنی باقی ہر طرح کی ضروریات یا طلب کہیں سے بھی پوری کر سکتے ہو، ویسے بھی تم حسن پرست ہو تو مجھ جیسی عام لڑکی کی وجہ سے کم سے کم تم اپنا سابقہ ریکارڈ تو توڑنا نہیں چاہو گے۔ امل کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ پلک جھپکتے اس کے سامنے آ بیٹھا۔ سمجھ گیا! ویسے تمہیں یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے خون کی ایک ہی خوراک سے تمہیں اتنا تو جان ہی گیا تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور مزید بولا، اور واقعی میں اپنا سابقہ حسن پرستی والا ریکارڈ بھی توڑنا نہیں چاہوں گا۔ تم بس میری سیاحت کا سامان کرنے کے لیے ہی ہو۔ تمہارے جسم میں خون ہی نہ رہا تو میں اپنے اندر کیا اتاروں گا؟ اور کیا دیکھوں گا؟ چلتا ہوں۔۔۔

اس نے پلٹ کر جانے کے لیے قدم بڑھائے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ امل نے چین کی ایک سانس لی، روش کی باتوں سے اس کے سر سے ایک بوجھ اترا تھا۔ ساری رات یوں بیٹھے رہنے کی تھکن اور اپنے ایک وسوسے سے چھٹکارے نے اسے ایک دم ہی ہلکا کر دیا تھا وہ بستر میں گھستے ہی سو گئی۔

وہ کھانے کی میز پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ کمرے کے دروازے کی طرف سے اس نے اینجلا کو اپنی طرف آتے دیکھا جو ایک سنہری ٹرے میں رکھے شیشے کا گلاس لیے اس کی طرف بڑھ رہی تھی اس گلاس میں ہرے رنگ کا پانی موجود تھا۔ یہ روش نے آپ کے لیے بھیجا ہے اور کہا ہے کہ آپ کچھ کھانے سے پہلے اسے نوش کر لیں۔ اس لڑکی نے وہ گلاس میز پر اس کے سامنے رکھ دیا۔

کیوں؟ اس میں کیا ہے؟ امل نے پوچھا۔ روش نے کہا ہے کہ اس سے آپ کی اینیمیا اور ہائپر ازونیا دونوں بیماریاں ٹھیک ہو جائیں گی۔ وہ جانے کے لیے پلٹی اور دروازے تک جاتے جاتے غائب ہو گئی۔ روش کو کیسے پتہ کہ اسے؟؟؟ ہاں! یقیناً اس کے خون سے۔۔۔ اس نے دل ہی دل میں خود سے سوال و جواب کیا۔ اس گلاس میں موجود شربت کا رنگ تازہ سبز تھا اور اس سے ایک ٹھنڈی اور میٹھی سی خوشبو آ رہی تھی۔۔۔ کریلے کا جوس تو ہو نہیں سکتا اس کی خوشبو سے وہ واقف تھی۔ پیئے یا نہ؟ اپنا ملک چھوڑ کے چلے آنے کے سوا اب تک اس نے اپنی مرضی سے کیا کیا ہے؟ جب خود کو حالات کے رحم وکرم پہ چھوڑ ہی دیا ہے تو ضد لگانا یا کسی چیز سے انکار کرنا ویسے بھی لاحاصل تھا۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ اس نے یہ سوچتے ہی گلاس کو اٹھایا اور تین سانسوں میں گلاس خالی کر دیا۔

وہ جو کچھ بھی تھا اتنا تازہ اور مزیدار تھا کہ اسے یہ پینے کے بعد ذرا افسوس نہیں ہوا اور پھر اس نے میز پر موجود کھانا کھایا۔

تین دن تک اسے وہی شربت تین وقت پلایا

جاتا رہا، اس دوران روش بھی کبھی کبھار اس کے سوتے تو کبھی جاگتے ہوئے اس کے پاس آتا۔۔۔ اپنی سیاحت کے شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔۔ وہ اس کی زندگی سے جڑے بہت سے سچ، بہت سے واقعات، بہت سے لمحات بہت سے رشتوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کی عادتیں، اس کی باتیں اس کی سوچیں اس کی ذات۔۔۔ لیکن ابھی بھی کتنا کچھ تھا جن سے وہ واقف ہونا چاہتا تھا۔

امل نے زندگی کے کئی سال گھر کی چار دیواری میں گزارے تھے اور اس کی زندگی میں عملی طور پر تفریحاتی سیر و سیاحت کے مواقع بہت کم آئے تھے تو روش اس کے شہر اور ملک کو زیادہ تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن جتنا دیکھا تھا اسے دلچسپ پایا تھا اور وہ دیکھتا بھی چونکہ امل کی نظر سے تھا تو کبھی کبھار کوئی معمولی سی عمارت، کوئی معمولی سا علاقہ کوئی معمولی سا باغ بھی امل کی باریک بینی سے بہت دلچسپی کا باعث بن جاتا تھا۔ وہ قدرتی مناظر کو دیکھ کر بے انتہا خوش ہوتی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے روش نے لوگوں کے ذریعے اس بات کا مشاہدہ کیا تھا۔ کہ کسی ریسٹورانٹ میں بیٹھے، پکنک مناتے یا دعوتوں میں شامل ہوتے ہوئے لوگ اردگرد کے ماحول پہ نظر دوڑانے کی بجائے ہاتھ میں پکڑے اس چھوٹے سے جادوئی ڈبے پہ نظریں گاڑے رکھتے تھے جس کے ذریعے وہ سب ایک دوسرے سے باتیں کرتا اور نہ جانے کیا کیا متحرک تماشے دیکھتے تھے۔ غالباً اسے موبائل فون کہتے ہیں۔ انسان کی ایک اور جادوئی تخلیق! ویسے تو انسان دنیا کے سامنے جادو کو غلط کہتا ہے اور خود اپنی جادوئی عملیات کو سائنس کا نام دے کر نہ جانے کیا کیا تخلیق کیے جا رہا ہے، روش سوچتا۔

امل جب گھر سے باہر کسی دعوت، کسی سیاحت، یا کسی سفر میں ہوتی تو اس کا فون دوسرے لوگوں کی طرح اس کے ہاتھ کی بجائے اس کے بیگ یا اپنی جیکٹس اور ٹراؤزر کی جیبوں میں ہوتا تو وہ قدرت کو مکمل طور پہ انجوائے کرتی اور لوگوں کی طرف پوری طرح متوجہ ہوتی تھی اور یوں روش کی دلچسپ سیاحت کے مشاہدے کا تسلسل بالکل نہ ٹوٹتا۔ امل اپنے موبائل فون کا استعمال زیادہ تر قدرتی تصویریں کھینچنے کے لیے کرتی کیونکہ اس کے پاس کیمرہ خریدنے کے پیسے نہیں تھے۔ روش کیمرہ کے استعمال سے بھی واقف تھا اور پھر اس نے کیمرے کو موبائل فون میں منتقل کرنے کا سفر بھی دیکھا تھا مگر وہ انسانوں کے اس فون کے بے جا بڑھے ہوئے استعمال سے تنگ ہونے لگا تھا خیر امل کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ امل کو فون کی بیل، گاڑیوں کے ہارن اور یہاں تک کے دروازے کی گھنٹی جیسی سبھی مصنوعی آوازوں سے چڑ تھی لیکن پرندوں کی آوازیں، ہواؤں کی سنسناہٹ، بارش برسنے، جھرنے بہنے کی آوازوں کو وہ جس وثوق اور دلچسپی سے سنتی، وہ سب روش کے لیے بھی بہت دلچسپی کا باعث تھا۔ روش نے دیکھا کہا امل جب بھی قدرتی مناظر سے دور واپس گھر جانے لگتی بے حد اداس ہو جاتی تھی یا جب وہ مہینوں گھر میں مقید اپنی ضرورت کا سامان لینے کے لیے بھی گھر سے باہر نہ نکل پاتی تو وہ بہت مایوس ہو جاتی کیونکہ وہ جس کی ملکیت تھی وہ اس کی بنیادی ضروریات کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی و ذہنی صحت سے بھی لاپرواہ تھا۔ ایسی بے بسی میں روش نے کئی بار گھر کی چار دیواری میں امل کو تڑپ تڑپ کے روتے دیکھا تھا۔۔۔ وہ ذہنی جسمانی، معاشرتی اور معاشی طور پہ پوری طرح سے کسی اور پہ منحصر تھی اور یہ بات اس کے لیے بہت اذیت کا باعث تھی۔

آج تک جن لڑکیوں کا خون وہ پی چکا تھا ان میں زیادہ تعداد آزاد اور خود مختار لڑکیوں کی تھی اور وہ جو کسی دوسرے کی ذمہ داری تھیں اس میں خوش اور مطمئن تھیں اور جو خوش نہیں ہوتی تھیں وہ اپنی ناپسندیدہ صورتحال سے خود کو نکال کر اپنی راہیں الگ کر لیتی تھیں لیکن امل کے کیس میں تو اسے اپنی صورت حال سے نجات پانے کا بھی کوئی اختیار نہ تھا اور ایک لمبے عرصے تک وہ ایک ہی طرح کی صبحوں اور شاموں کے دائرے میں گھومتی رہی تھی۔۔۔ شاید پچھلی قید نے امل کو

روش کی قید سے مزاحمت نہ کرنے کی مشق کروادی تھی اور قید میں رہنا اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن اگر اسے قید میں رہنے سے کوئی اختلاف نہ تھا تو یہ اپنی ساری معاشرتی بیڑیاں توڑ کے یہاں کیوں چلی آئی؟ کیونکہ وہاں اس کے جذبات مجروح ہوئے تھے، اس کے اپنوں نے بار بار اعتبار توڑا تھا، وہاں اس قید کو اپنی مرضی سے قبول کرنے کے باوجود اس کی قدر نہیں کی گئی تھی، اسے دھتکارا گیا تھا اسے ذہنی اور جسمانی اذیتیں دی گئی تھیں اور اس کے اپنوں میں اسے حد درجہ ذلیل کیا گیا تھا۔

جذباتی طور پر اسے ہر بار بلیک میل کر کے اسی تکلیف دہ زندگی گزارنے پہ مجبور کیا گیا تھا۔ اس کا اعتبار، بھروسہ، جینے کی امید، کچھ کرنے کا جذبہ، آگے بڑھنے کا حوصلہ، سب ختم کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہاں کی قید میں بھی وہ کتنی مطمئن تھی۔۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ یہاں اس کا کوئی اپنا اسے تکلیف دے کر، بے اعتنائی برت کر اس کا اعتبار توڑ کر اسے کسی قسم کی ذہنی یا جسمانی اذیت نہیں دے رہا تھا۔ تو کیا امل نے ماضی کے ان سب دکھوں سے نجات کے عوض کھلی فضا میں سانس لینے کی اپنی آخری خواہش کو قربان کر دیا؟ یعنی اگر اسے محض عزت اور اعتبار ہی دے دیا جاتا تو اسے وہ قید بھی قبول تھی؟ روش سوتی ہوئی امل کو دیکھ کر یہی سب سوچتے ہوئے اس کے یہاں اطمینان سے ہونے کی وجہ کھوج رہا تھا۔ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد روش نے امل پہ ایک نظر ڈالی تو دل ہی دل میں خود سے کہا۔۔۔ تبھی اسے نہ زندگی سے دلچسپی ہے نہ ہی اپنی موت کا ڈر۔۔۔ وہ شاہانہ چال چلتا ہوا اس کے بستر کے پاس آیا، کچھ دیر اسے یونہی گہری نیند میں بے خبر سوتا دیکھتا رہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

☆......☆......☆

وہ بہت دیر سے خوبصورت حوض کے پیچھے بڑی سی شیشے کی دیوار سے باہر اس خوبصورت جنگل کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں کے ہرے بھرے درخت اور عجیب وغریب پرندے سب بہت دلچسپ تھا۔ بس باہر کی دنیا کا یہی ایک منظر تھا جو وہ روز دیکھتی تھی وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تو بیڈروم کی طرف واپس پلٹی، سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے بال سنوارتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کچھ دن پہلے دوائی کے طور پر اسے پلائے گئے اس سبز مشروب نے اس کی جسمانی کمزوری بہت تیزی سے ختم کر دی تھی، اس کی دن رات کی وقت بے وقت نیند نے بھی اس کی جان چھوڑ دی تھی۔ اب وہ ایک مخصوص وقت پر سوتی اور جاگتی تھی۔ گزشتہ چند سالوں سے اس کی آنکھوں کے نیچے پڑے ہوئے حلقے بھی چند ہی دنوں میں غائب ہو چکے تھے۔ اور اس کے بال جو ایک لمبے عرصے سے متواتر گر رہے تھے ان کا جھڑنا بھی بند ہو چکا تھا۔ پر اس بہتر ہوتی صحت کا اب وہ کیا کرے گی؟ جب روش کی سیاحت مکمل ہو جائے گی وہ اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے گا اور باقی رہ جائے گی صرف موت۔

لیکن بیماری کے عالم میں وہ یہی تو ہمیشہ کہتی تھی کہ لمبی زندگی کا کیا کرنا ہے اسے، بس جتنا جیے صحتمند جیے۔۔۔

چلو مجھے اپنے لیے تو صحت نصیب نہ ہو سکی آج ملی بھی ہے تو۔۔۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے اپنی نظریں اٹھائیں تو سامنے آئینے میں روش تھا اسے اپنے پیچھے کھڑا دیکھا پھر امل نے اپنی گردن سے اپنے بال ہٹا دیے کہ وہ اس کی آمد کی وجہ سے واقف تھی لیکن روش نے اس کے بال واپس اس کی گردن پر کیے اور آئینے میں امل کی اداسی سے بھری آنکھوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا، تم جنگل دیکھنا چاہو گی؟

نہیں! فلموں میں بہت دیکھے ہیں، جواب آیا۔

یہاں جنگلی جانور بھی ہیں لیکن میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہارے پاس پھٹکے گا بھی نہیں، روش کی بات پہ وہ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اتنی جلدی اعتبار بھی کر لیا؟ روش نے پوچھا تو امل بولی، میں نے تم پہ اعتبار نہیں کیا! کسی پہ اعتبار نہیں ہے اس لیے اعتبار ٹوٹنے

کا ڈر بھی نہیں، باقی ڈر ثانوی ہیں۔ یہ سن کر وہ آگے بڑھ گئی۔

اس دن روش نے اسے اس جنگل کے عجیب و غریب لیکن نہایت خوبصورت درخت، اور پودے دکھائے۔ اور ایک بہت بڑے اور اونچے درخت کے تنے سے لپٹی ایک بیل دکھاتے ہوئے بولا۔ یہ بیل اس درخت سے اپنی خوراک حاصل کرتی ہے اور دیکھو یہ درخت اور یہ بیل دونوں کتنے ہرے بھرے ہیں، اس درخت کی عجیب بات یہ ہے کہ اگر اس درخت کے پاس یہ بیل نہ اگے تو یہ درخت بھی جی نہیں پاتا اور مرجھا جاتا ہے۔ یعنی جو بیل اس کی وجہ سے زندہ رہتی ہے اس بیل کو اپنے پاس اگتا نہ پا کر اور اس بیل کو خود سے خوراک نہ پہنچا کر یہ بھی زندہ نہیں رہتا۔

امل نے بہت نرمی سے اس بیل کے پتوں اور درخت کے تنے کو چھوا، روش پر ایک گہری نظر ڈالی تو وہ جیسے اپنی ہی بات میں کہیں الجھ گیا۔ امل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے روش جیسے اس موضوع کو وہیں ختم کرتے ہوئے بولا، چلیں؟ امل اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

اس جنگل میں پھول کیوں نہیں ہیں؟ مطلب جنگلی پھول ہی سہی، اتنا ہرا بھرا جنگل لیکن کہیں گھاس میں اگا ہوا ایک چھوٹا سا پھول تک نہیں۔۔۔

امل کے سوال پہ روش بولا، اس جنگل میں بس ایک ہی نسل کے سبز رنگ کے بہت ہی نایاب اور بے حد چھوٹے چھوٹے پھول اگتے تھے امرود کے بیج سے بھی چھوٹے۔۔۔ اور اس قدر حسین پھول جس کا تم نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا لیکن تعداد میں بہت کم، اس پورے جنگل میں بس چند ہزار۔۔۔ اس پھول کا نام کیوری تھا۔ اگر ان کی ادویاتی خصوصیت سے فائدہ اٹھانا ہو تو اس جنگل میں موجود اس آخری پھول کو بھی تلاش کر کے ان سب کو ایک ساتھ پیس کر ایک ایسا مشروب بنایا جا سکتا تھا جس کے اثر سے کسی بھی بیمار کی کوئی بھی بیماری دور کی جا سکتی تھی۔ لیکن ایک بار توڑے جانے کے بعد وہ پھول دوبارہ کبھی نہیں اگ سکتے تھے، سو پہلی اور آخری بار استعمال کیے جانے پر وہ دوبارہ کبھی نہیں اگے۔ روش نے بتایا۔

تو کیا وہ پھول توڑ لیے گئے ہیں؟ اس نے رک کر روش کو دیکھا اور پھر کچھ یاد آنے پر چونکی۔۔۔ کیا وہ مجھے پلائی جانے والی دوا؟؟؟

اوہ! روش نے ہاں میں سر ہلایا اور وہ پریشان سی اسے تکنے لگی۔ مجھے ایسی کونسی جان لیوا بیماری تھی؟

خون کی کمی کی بیماری تھی اور ڈپریشن کی وجہ سے ہر وقت نیند میں رہنے کی بیماری تھی، روش نے بتایا۔ تو؟

اچھا ہی تھا جتنا سوتی رہتی اتنا سوچوں سے بچی رہتی اور خون کی کمی سے ایک دن جان ہی چلی جاتی ناں؟ وہ تو کچھ دن بعد ویسے بھی جانے والی ہے؟ آخری جملہ اس نے دھیمے سے ادا کیا اور روش کے چہرے سے اپنی نظریں پھیر کر آگے بڑھ گئی۔ وہ وہیں کھڑا امل کو مختلف پرندوں، پودوں اور درختوں کو دیکھنے لگا اس نے نوٹس کیا کہ آج پہلی بار امل کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر زندگی کی جو رمق اس نے کچھ دیر پہلے تک دیکھی تھی وہ ایک بار پھر گہری اداسی میں بدل گئی تھی۔ وہ اتنا جان چکا تھا کہ جب وہ مایوس ہوتی ہے تو خاموش ہو جاتی ہے اور اس وقت وہ بہت خاموش ہو گئی تھی اس نے روش سے پھر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

دن بیتتے گئے، روش اس کے خون کے کچھ گھونٹ پی کر اس سے وابستہ ماضی کی پرتیں کھولتا جا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں چلتی ان گنت متحرک تصویروں میں سے اپنی پسند کی متحرک تصویر اپنے دماغ کی پردہ اسکرین پر دیکھتے ہوئے روش کی غشی کے یہ دورانیے اکثر بے حد طویل ہو جاتے اور امل ہر گزرتے دن کے ساتھ یہی سوچتی کہ روش کی تفریح کا سامان عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ ایک بار روش اسی طرح امل کی زندگی کی لمبی سیاحت پہ نکلا ہوا تھا اور تبھی امل نے دیکھا کہ روش کی بند آنکھوں کے کونوں سے آنسو نکل رہے ہیں وہ قالین پہ بیٹھ گئی اور حیرانی سے اسے تکنے لگی اور پھر اس کے چہرے پر جھلکتے ایک آنسو کو اپنی انگلی سے اٹھا کے

دیکھنے لگی۔۔۔وہ رو رہا تھا۔۔امل نے دیکھا کہ اس کی بند آنکھوں کے کونوں سے نہ جانے کتنی دیر تک آنسو بہتے رہے۔۔۔وہ اس کی آنکھوں کے کونوں سے ٹپکتے آنسو صاف کرتی تھی کہ وہ پھر بھیگ جاتے، آنسوؤں کی لمبی لڑی لگی ہوئی تھی جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔اور جب روش نے آنکھیں کھولیں تو خون کا نشہ تو اتر چکا تھا لیکن اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے لال ہو رہی تھیں۔وہ امل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔۔۔تم نے اتنی بار جسمانی تشدد برداشت کیا؟ کتنی بار تمہاری جان جاتے جاتے بچی؟ کیوں؟ تم بھی جواب میں مارتی اسے۔۔۔پھر اپنی بات پہ خود ہی سر جھٹک دیا۔۔۔تم چاہتی تھی لیکن جسمانی طور پہ اس کی برابری نہیں کر سکتی تھی جیسے وہ زبانی طور پہ تمہاری دلیلوں کی برابری نہیں کر پاتا تھا اور تمہیں جذباتی طور پہ کمزور کرنے کے لیے اس نے تمہارے حوصلے توڑنے کی ٹھانی، وہ بھی نہ کر سکا تو جسم کو توڑنے کی کوشش کی۔۔۔اور تم جانوروں کی طرح مار کھاتی رہی؟ تم میری جسمانی طاقت کا اندازہ نہیں کر سکتی، میں اگر کسی کو ایک تھپڑ مار دوں تو شاید وہ دوبارہ زمین سے نہ اٹھ پائے اور وہ ایک عام بلکہ ایک ناکارہ سا انسان ہو کے تم پہ پوری طاقت سے ہاتھ اٹھاتا رہا؟ ایسا تو میں نے بھی کبھی اپنے اس شکار کے ساتھ نہیں کیا جو مزاحمت کرتا تھا یا مجھ سے لڑنے کی کوشش کرتا تھا۔وہ درد جو تمہاری ہڈیاں ٹوٹنے پر تم نے محسوس کیا وہ میں نے محسوس کیا۔تمہارے ماضی سے جڑنے کے بعد میرے جذبات، احساسات، سوچیں، سب وہ ہوتے ہیں جو اس وقت تمہارے ہوتے ہیں یعنی میں اس وقت تمہارے وجود کا حصہ ہوتا ہوں۔تو کیوں سہا؟

مجھ میں روکنے کی سکت نہیں تھی لیکن تم میں تو تھی، امل نے بھیگی آنکھوں سے پوچھا۔وہاں میں جسمانی طور پہ نہیں ہوتا بلکہ روحانی طور پہ ہوتا ہوں، جسم تو تمہارا ہی ہوتا ہے لیکن اس سے جڑی تکلیفیں، اس دماغ میں چل رہی سوچیں، اس دل پہ ان سب تکلیفوں کا اثر میں تمہارے اندر کی روح سے جڑ کے محسوس کر رہا ہوتا ہوں۔۔۔کاش میری روح کی طرح میرا جسم بھی تمہارے ماضی کا سفر کر سکتا تو میں وہ سب ہونے ہی نہ دیتا سب بدل دیتا۔۔۔روش نے اسے اس کے ماضی میں اپنے اختیارات کے حدود کی تفصیل بیان کی۔

میں نے بہت سے ظالم لوگوں کا خون پیا ہے اور ان کے ہاتھوں ہوئے قتل کے مشاہدات بھی کیے ہیں لیکن میرا دل کبھی نہیں پسیجا مگر تمہارے توسط سے پہلی بار کسی مظلوم کی نظر سے اس درجہ جسمانی تشدد کو محسوس کیا تو میں تمہاری تکلیف سے نجات کے راستے ڈھونڈنے کے لیے تمہارے اردگرد کی ہر ممکن صورتِ حال میں پھرا اور ایک لمبی تگ ودو کے بعد بھی جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو یہ جان کر زیادہ تکلیف ہوئی کہ تمہارے چہرے کے زخم اور ٹوٹی ہوئی ہڈیوں تک کو دیکھ کر تمہارے اپنوں نے بھی آنکھیں بند کیے رکھیں، یہاں تک کہ تم نے اپنی زبانی خود پر ہوئے ہر ظلم کا خلاصہ کیا تب بھی انہوں نے تمہیں پناہ دینے یا کسی بھی طرح تمہارا ساتھ دینے سے انکار کر دیا، تم بالکل اکیلے رہ گئی، روش کو اتنا پریشان امل نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

بہت ہوگئی انسانی زندگیوں کی کڑوی حقیقتوں کی سیاحت! میں ہمیشہ سے افسردہ فلمیں بنانے کے خلاف رہی ہوں جو انسان کو ہنسانے کی بجائے رلاتی ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو یہ سب دیکھ کر خود کو بہتر انسان بنانے کا سوچتے بھی ہیں؟ مٹھی بھر بھی نہیں۔لیکن یہی کسی سپر ہیرو کی یا جنگ وجدل، مار دھاڑ سے بھرپور فلم ہو تو ہر انسان اپنے آپ کو ایکشن ہیرو سمجھنے لگتا ہے۔یہاں تک کہ ظالم ولن کی طاقت سے مرعوب ہو کے خود کو طاقتور کہلوانے کی سعی میں اس کی نقل کرنے لگتا ہے، ہم دوسروں کو اپنی طاقت سے نیچا دکھا کر غرور کرتے ہیں، کھوٹ کے لبادے اوڑھ کر، نقلی بن کر خود پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

تم جانتے ہو میں اس قید میں بھی مطمئن کیسے ہوں؟ کیونکہ جناتی ہوں کہ مجھے قید کرنے والے نے خود کو طاقتور ثابت کرنے کے لیے طاقتور ہونے کا لبادہ نہیں اوڑھ رکھا، لیکن جس دنیا سے میرا تعلق ہے وہاں

نقلی اور جھوٹے لوگ بہت کثرت سے ہیں تو جھوٹ سے بنی نام نہاد آزاد دنیا سے بہتر تمہاری دنیا کی قید ہے۔بس بہت ہو گیا،اب میرا قصہ ختم کردو تاکہ تمہارا یہ نیا غم بھی میرے ساتھ ہی ختم ہو جائے۔امل نے غمگین روش کو دیکھتے ہوئے التجا کی لیکن وہ جا چکا تھا۔

کئی دن گزر گئے وہ نہیں آیا۔۔۔امل کو لگا کہ اس کا دل شاید اس افسردہ تفریح سے اوب چکا ہے۔وہ دن رات اسی کمرے میں رہتے ہوئے کبھی پلنگ پہ لیٹی سنہری چھت کو تکتی رہتی، کبھی سنہرے فانوس کو یا کبھی حوض کے پیچھے شیشے والی دیوار سے باہر جنگل کو، نہ روش آتا اور نہ موت۔۔۔

قید کو اس نے ماضی میں بھی برداشت کیا تھا مگر زبردستی لیکن یہاں اپنی مرضی سے کر رہی تھی۔پھر ایک دن ہمت کرکے اس نے اس کمرے سے قدم نکالنے کا فیصلہ کیا۔اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو سنہری راہداری خاموش تھی مگر نامعلوم سرگوشیاں پھیلی ہوئی تھیں لیکن کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔اس غارنما محل میں گھومتے پھرتے اور روش کا کمرہ تلاش کرتے کرتے اس نے تقریباً پوری عمارت چھان ماری تھی جہاں اس کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا، ہر لمحے کسی کے ساتھ ہونے کا خوفناک احساس زور پکڑتا جا رہا تھا اور پھر وہ سرگوشیاں شور میں بدلتی گئیں یہاں تک کہ ان غیر انسانی آوازوں کا شور اتنا بڑھ گیا کہ وہ بھاگنے لگی مگر اسے اپنا کمرہ نہیں مل رہا تھا وہ واپس بڑے سنہری ہال میں آن موجود ہوئی، سامنے بہت بڑا دروازہ تھا وہ اس کی جانب لپکی تو چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا گیا اور جب اس نے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تو وہ باآسانی کھل تو گیا لیکن باہر قدم رکھتے ہی اس نے جنگل کو بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا پایا۔محل سے پیچھا کرتا نظر نہ آنے والی بلاؤں کا شور ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکا تھا، وہ کانوں پہ ہاتھ رکھے اور آنکھیں بھینچتے وہیں بیٹھ گئی۔اس نے محسوس کیا کہ کسی بادل کی مانند خوفناک آواز میں گرجتے دھوئیں جیسے وجود نے اسے آن جکڑا ہے وہ چیخ پڑی۔۔۔وہ خوف سے چیختی رہی جب تک کے اسے اپنا نام سنائی نہیں دیا۔۔

امل!اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے روش تھا۔اس نے خوف سے کانپتی امل کو کسی بچے کی طرح اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھایا اور امل نے دیکھا کہ ان کے اردگرد سارے جنگل میں پھر سے دن کا سا سماں ہے، سب کچھ روشن اور نارمل ہے۔روش کے عمارت کے اندر قدم رکھتے ہی محل نما غار کا سنہری پن بھی لوٹ آیا، وہ اندھیرا اور خوفناک آوازیں غائب تھیں۔

وہ اسے اس کے کمرے میں موجود صوفے پہ بیٹھاتے ہوئے خود اس کے سامنے بیٹھ گیا۔تم کمرے سے باہر نکلنا چاہتی تھی؟ مجھے بتاتی تو اس سب کا سامنا نہ کرنا پڑتا، روش بولا۔میں یہاں سے بھاگ نہیں رہی تھی، امل نے معصومیت سے کہا۔جانتا ہوں، تم یہاں سے بھاگ بھی نہیں سکتی، اتنا تو تم بھی جانتی ہو گی۔بس یہاں کی دنیا ہی کچھ ایسی ہے، میری غیر حاضری میں سب کچھ ویسا ہی چلتا ہے جیسا کہ چلنے کا میں نے ایک رواج قائم کر رکھا ہے لیکن اگر تم مجھ سے کہتی تو میں یہاں کے نظام میں تمہارے لیے وقتی لچک پیدا کر دیتا۔روش خاموش ہوا تو وہ بولی۔تم تھے نہیں۔

ہاں میں حقیقی طور پہ یہاں کہیں نہیں تھا۔اب جب کہ تم صحت مند ہو تو زندگی کی دلچسپیاں بھی تمہاری ذات کا پھر سے حصہ بننے لگی ہیں، مثلاً تم نے دن رات کی بیزاری سے تنگ آ کر کمرے سے نکلنا چاہا، اندھیرے، غیبی آوازوں اور بھیانک جنگل کو دیکھ کر تم پہ خوف طاری ہوا اور اب میرے سامنے ان سب باتوں کی وضاحتیں بھی دینے لگی ہو۔۔۔تم جب سے یہاں آئی ہو، پہلی بار کسی چیز کے لیے بے چین ہوئی ہو، پہلی بار ڈری ہو، یہ سب زندگی کے آثار ہیں۔تمہارے نارمل ہونے کا ثبوت ہیں۔روش شاید سچ بول رہا تھا۔

نہیں مجھے کسی چیز میں کوئی دلچسپی نہیں، تم آج ہی یہ زندگی ختم کردو، امل بولی۔

مایوسی بھی زندہ لوگوں کی نشانی ہے ورنہ میں نے

تمہیں یہاں آنے کے بعد مایوسی سے بھی لاپرواہ دیکھا ہے۔ تمہیں تو کسی بات سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور اب تم کچھ دنوں سے تم سے موت کا مطالبہ کرنے لگی ہو۔ کس سے بھاگ رہی ہو؟ زندگی کی دلچسپیوں سے؟ جینے کی امید سے؟ نارمل ہو جانے کے ڈر سے؟ روش نے اس کی آنکھوں میں بغور دیکھا۔ خود سے! امل نے دھیمے سے جواب دیا۔

خود سے بے نیازی جب تک راس نہ آئی، دنیا بھی میرے پاس نہ آئی

جیسے جیسے میں اس عارضی دنیا سے بے نیاز ہوتی گئی اور میرا دل دنیا کی ہر شے سے کٹتا گیا تو میں خود سے مطمئن رہنے لگی تھی پر اب لگتا ہے میں پھر سے نارمل ہو گئی تو میرا دل پھر سے یہاں لگنے لگے گا، خواہش کرے گا، پھر خواب دیکھے گا، اعتبار کرے گا اور پھر ٹوٹے گا۔ میں اس سب سے دوبارہ نہیں گزرنا چاہتی، امل نے سچائی کے ساتھ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا۔

تمہیں پتہ ہے کہ میں تمہارے بارے میں سب جان چکا ہوں، تم سے جڑے ہر دن، ہر درد، ہر خواب، ہر خواہش، ہر شئے کو دیکھ لیا ہے۔ وہ جو اتنی طویل نیندیں تھیں میری، میں تمہارے بارے میں سب کھوجتے کھوجتے دور نکل جاتا تھا۔ تمہارے بچپن تک۔۔۔ تم سے جڑے ہر درد ہر تکلیف سے واقف ہو چکا ہوں۔۔۔ ہم دونوں کی دنیاں کے طول وعرض کے فرق کی وجہ سے تمہارے دنوں کی طوالت میرے لیے سیکنڈز کا سفر ہے روش نے بتایا۔

تو اب تو میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں۔۔۔ امل نے کہا تو روش اٹھ کر چلتا ہوا اس کے پیچھے گیا۔ امل کو لگا کہ یہ اس کے آخری لمحے ہیں وہ آج ہی اس کے جسم کا سارا خون ایک ساتھ پی جائے گا کہ وہ پھر سے اس کے سامنے آ گیا اور بولا، تم اپنے دماغ میں ایک نئی دنیا بنالو۔۔۔ خوشیوں اور رنگوں سے بھری، جیسا کبھی تم تصور کرتی تھی کہ دنیا ایسی ہونی چاہیے، جیسا تم اس کو دیکھنا چاہتی ہو، جو تم سوچتی ہو، پھر میں اس دنیا کی سیر کیا کروں گا۔

کوشش کرتی ہوں، وہ بولی اور وہ پھر سے کہیں غائب ہو گیا۔ امل بیڈ پر لیٹی سنہری چھت کو تکتے، کبھی خوبصورت حوض میں تیرتے، کبھی شیشے سے باہر رنگین جنگل کو دیکھتی اور کبھی کھانے کی میز پر بیٹھی ہر وقت سوچتی رہتی، اس کا دماغ نہ جانے کون کون سی کہانیاں بنتا اور روش محض خون کے چند قطروں سے اس کی بنائی دنیا کی سیر کرتا لیکن یہ دورانیہ بہت مختصر ہوتا وہ جلد ہی آنکھیں کھول لیتا تو امل کی آنکھوں میں مایوسی اتر آتی۔۔۔ وہ چلا جاتا۔۔۔ پہلے تو وہ کتنے کتنے گھنٹوں کے سفر پہ ہوتا تھا لیکن اب محض چند سیکنڈز؟؟؟ اس کی تصوراتی کہانیاں جو وہ کتنے کتنے دن لگا کے تخلیق کرتی تھی وہ چند سیکنڈز میں ہی دیکھ کر لوٹ آتا تھا۔ ایسا کب تک چلے گا؟ وہ خود سے سوال کرتی۔

ایک روز روش نے اس سے پوچھا۔ تم نے پھر کبھی باہر جانے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اب ایسا کچھ نہیں ہو گا جو اس دن ہوا تھا، روش نے جیسے اسے گارنٹی دی۔ دل نہیں چاہتا۔۔۔ ایسا کہتے ہوئے روش نے امل کی آنکھوں کی گہری اداسی بھانپ لی، اس نے ہاتھ ہوا میں اٹھایا، جب نیچے کیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔ اس نے امل کے حوالے کیے اور کہا تم آزاد ہو، میری اس محدود دنیا میں رہنے کی پابند نہیں ہو۔

وہ پڑھتی گئی۔۔۔ یہ شیفیلڈ فلم اکیڈمی یو۔کے میں اس کے ایڈمیشن کے کاغذات تھے۔ وہ کچھ بول نہ سکی تو روش بولا۔ وہیں تمہاری رہائش کا بھی بندوبست ہو چکا ہے۔ تم ہمیشہ سے فلم میکنگ پڑھنا اور اس میں اپنا کیریئر بنانا چاہتی تھی نا؟ جس کے لیے تم نے کسی کے وعدوں پہ اعتبار کر کے اس سے شادی بھی کر لی۔ اپنے ہر سرپرست کی منتیں بھی کیں۔ مگر کسی نے کسی بھی قسم کا تعاون نہیں کیا اور یوں تم نے اپنے اکلوتے خواب کو بھی دل کی گہرائیوں میں دفن کر دیا۔ میں یہ سب پہلے ہی جان چکا تھا لیکن اب تمہاری تصوراتی دنیا کو دیکھنے کے بعد ہر بار میں نے یہ بھی دیکھا کہ تم اس دنیا کو کسی فلم کی طرح تخلیق کرتی ہو،

اور یوں مجھے احساس ہوا کہ یہ خواب اب بھی تمہارے اندر زندہ ہے بس تم اس کا اظہار نہیں کرتی اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے مگر اپنی تصوراتی کہانیوں کو کسی ڈائریکٹر کی طرح ہی بناتی ہو کیمرے کی آنکھ سے، بڑی اسکرین کے پردے پر چلاتے ہوئے۔۔۔ میں چاہتا ہوں تم وہاں جاؤ اور پوری دنیا کو اچھی اور مثبت تفریح مہیا کرو۔۔۔ بہترین فلمیں بنا کر۔۔۔ روش بولا۔

یعنی تماشے بنا کر؟ امل نے پوچھا۔ اور روش نے پہلی بار امل کو مسکراتے دیکھا۔ امل کو اپنی مسکراہٹ کا بالکل اندازہ نہ ہوا۔۔۔ وہ کبھی اپنے ہاتھ میں تھامے کاغذ کو دیکھتی کبھی روش کو مگر روش صرف اس کی مسکراہٹ کو دیکھ رہا تھا۔

تمہارے جنگل کے خونخوار جانور اس دن اس لیے میرے پاس نہیں آئے تھے کہ وہ تمہاری سلطنت تھی اور بقول تمہارے، تمہارے ہوتے ہوئے کوئی میرے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اب جبکہ میں انسانی دنیا میں واپس آ چکی ہوں تو جس غیر انسانی مخلوق میں میرے خون کے نمونے بانٹے گئے تھے وہ تو اب بھی میرے تعاقب میں ہو سکتی ہیں اور مجھے اکیلا دیکھ کر با آسانی اپنا شکار بھی بنا سکتی ہوں گی۔ امل نے ہاسٹل کے اس کمرے پہ نظر ڈالی تو اسے روش کی سلطنت میں اپنا با حفاظت رہنا یاد آ گیا۔ اور اب وہ کسی قدر خوفزدہ بھی ہو رہی تھی۔

یہ تمہاری گردن پہ جو ہلکا سا غیر واضح نشان ہے ناں؟ ہمیشہ چمکتا رہے گا لیکن صرف غیر انسانی مخلوق کی نظر میں، کوئی انسان اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اس نشان سے نکلتی ہرے رنگ کی روشنی اس بات کا ثبوت ہو گی کہ تم روش کی سلطنت سے زندہ لوٹی وہ واحد انسان ہو جسے روش کے جنگل کے نایاب پھول کیوری کی شفا اور روش کا ساتھ دونوں حاصل ہیں۔ تمہاری گردن کا نشان تمہیں شکار کی نیت سے دیکھنے والی ہر مخلوق کی نظر میں کیوری بن کر چمکے گا اور تب کوئی تمہیں نقصان پہنچانے کا نہیں سوچے گا۔ بس شکاری انسانوں سے بچ کے رہنا۔۔۔ یہ کہہ کر روش مسکرایا تو امل کا خوف بھی زائل ہو گیا۔ وہ پھر سے مسکرانے لگی۔۔۔ مگر میرا وزٹ ویزہ اسٹوڈنٹ ویزہ میں کیسے کنورٹ ہوا اور۔۔۔؟؟؟ روش نے امل کا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی اس کی بات کاٹ کر کہا، تمہیں یہ سب سوچنے کی ضرورت نہیں، تم یہاں بے فکر ہو کر رہو۔

روش اسے اس کے ہاسٹل روم میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔۔۔ وہ اپنی پڑھائی اور پراجیکٹس میں اتنا مصروف ہونے کے بعد بھی مسکرانا نہ بھولی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس کے چہرے کا مستقل حصہ بن چکی تھی۔ اس کے کلاس فیلوز اس کے ہر وقت مسکرانے پر اسے ہمیشہ چھیڑتے تھے۔۔۔ آر یو ان لو؟ ایک لڑکی نے پوچھا۔

یس! شی از ان لو ود می۔۔۔ اس کے گروپ کے دوسرے لڑکے نے جواب دیا۔ آئے ہیوٹو گو۔ اس نے ہنستے ہوئے اپنے دوستوں کو کہا تو ایک لڑکی نے پوچھا، آن ڈیٹ؟ آئے ایم ریڈی، تو دوسرے لڑکے نے مزاق جاری رکھا۔ سم اور ٹائم! اسی یو گائز! یہ کہہ کر وہ مسکراتی ہوئی یونیورسٹی اسٹوڈیو سے باہر نکل آئی جہاں آج اس کے آس پاس لال اینٹوں کی عمارتیں، پیروں کے نیچے پتھروں سے بنی زمین اور ارد گرد پیدل چلتے چند لوگ تھے۔ وہ بہت مطمئن اور ہلکا محسوس کر رہی تھی بادلوں میں گھرا ہوا خوبصورت موسم کسی بھی پل برسنے والا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی گھومی اور پھر ایک دم تھم کر اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔۔۔ یہ بلند لال عمارت، یہ اسکوائر، یہ پرسکون ماحول، یہ طمانیت کی اڑان بھرتی اس کی آزادی کا احساس۔۔۔ یہ سب وہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی لیکن وہ تو یہاں پہلی بار آئی تھی۔۔۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور پندرہ سال پہلے دیکھا ایک خواب اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔۔۔ وہ اسی کالے لباس میں، اسی لال عمارت کے سامنے، اسی ماحول، اسی اسکوائر پہ طمانیت بھرے احساس سے خوشی میں جھوم رہی تھی۔۔۔ وہ بے انتہا خوش اور اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھی۔ اس کی آنکھ کھلی، تو اسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کونسا ملک تھا جو بھی تھا وہ پاکستان نہیں تھا۔۔ پھر

سوچا۔۔۔خواب میں ہی سہی، میں کتنی خوش اور مطمئن تھی اکیلی ہونے کے باوجود۔۔۔

یا اللہ! تیرا شکر کہ تو نے اتنا خوبصورت خواب دکھایا مجھے۔۔۔وہ اس وقت اپنے خواب ڈائری میں لکھا کرتی تھی مگر یہ مختصر سا خواب اس کے دل پہ لکھا گیا تھا جس میں اس نے خود کو کسی انجان جگہ پر خوشی اور طمانیت سے جھومتے دیکھا تھا۔۔۔ اہل نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔ بہت سال پہلے دیکھا وہ چھوٹا سا خواب اتنے سالوں بعد آج پورا ہو چکا تھا۔ اوہ! وہ جگہ شیفیلڈ اسکوائر تھی۔ پندرہ سال پہلے اس خوبصورت خواب کو حقیقت تک پہنچنے کے بیچ وہ ان گنت تکلیفوں، اذیتوں اور بے رحم لمحوں سے گزری تھی جو اس وقت تک وہ اپنے ساتھ ایسا ہونے کا سوچ بھی نہ سکتی تھی اور آج جب وہ اس سب سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی تو وہ اپنی اس خوشی اور طمانیت کا مطلب بھی تھی۔

اس نے پھر سے اللہ کا شکر ادا کیا۔ اسے اپنی تکلیف کے دنوں میں کی گئی اپنی التجا یاد آئی جب وہ روتے ہوئے خدا سے کہتی تھی کہ یا اللہ! کاش یہ سب ایک ڈراؤنا خواب ہو اور میری آنکھ کھل جائے۔۔۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ جس بے رحم زندگی کے دن وہ کاٹ رہی ہے وہ کوئی ڈراؤنا خواب نہیں ایک بھیانک حقیقت ہے اور اس کی آنکھ کبھی نہیں کھلے گی، وہ مزید رونے لگتی۔

اور آج وہ کہہ رہی تھی یا اللہ! اگر یہ کوئی خوبصورت خواب ہے تو کبھی ختم نہ ہو لیکن وہ آج بھی جانتی تھی کہ یہ کوئی سہانا خواب نہیں ایک خوبصورت حقیقت ہے ایک خوابناک حقیقت۔۔۔

اس نے کلمہ شکر پڑھ کر سامنے دیکھا، وہ ایک طرف نہ جانے کب سے کھڑا اسے خوشی سے جھومتے دیکھ رہا تھا۔ اہل اس کی جانب لپکی اور اسے گلے سے لگا کے بھینچ لیا۔۔۔ کیا سوچ رہی تھی؟ روش نے پوچھا۔ اس نے گردن سے بال پیچھے کیے اور بولی، خود جان لو!

یہ سب لوگ کچھ اور سمجھیں گے، وہ مسکرایا۔ تو سمجھنے دو! انہیں اگر معلوم نہیں کہ تم ایک فلم دیکھ رہے ہو تو پھر انہیں اپنی لائیو فلم سمجھ کر انجوائے کرنے دو، ہم ان کی نظروں کے دھوکے پر اختلاف کیونکر کریں؟ اہل اپنے اور روش کے نایاب سے روحانی تعلق پہ اتنی مطمئن تھی کہ اسے کسی کی الٹی سیدھی سوچ کی بھی پرواہ نہیں تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ اب تم دنیا کے رویوں سے متاثر نہیں ہوتی، روش بولا تو اہل نے اسے حیرت سے دیکھا۔۔۔ خدا!؟؟؟ آر یو کنوٹڈ؟ یو نیور نو۔۔۔ روش نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور تبھی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔۔۔ آج وہ جان بوجھ کر چھتری لے کر نہیں نکلی تھی۔ بہت عرصے بعد بارش میں بھیگنے کی خواہش جاگی تھی۔۔۔

پتہ ہے میں نے یہ جگہ خواب میں دیکھی تھی تقریباً پندرہ سولہ سال پہلے۔۔۔ تم تو یہاں کئی بار آئے ہو گے؟ اہل نے پوچھا۔ ہاں ہزاروں بار۔۔۔ جب یہاں کچھ نہیں ہوتا تھا تب سے آ رہا ہوں، روش نے جواب دیا۔

اف کتنے پرانے ہو تم؟ اہل نے مسکراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک اور سوال کر دیا۔ ویسے آٹھ صدیوں میں تم نے شادیاں تو بہت کیں ہوں گی؟ ہاں! سینکڑوں۔۔۔ روش نے جواب دیا تو اہل حیرت سے ہنسی پھر پوچھا اور محبتیں؟ ہزاروں، روش نے جواب دیا اور ساتھ ہی اپنے جواب پر ہنستی ہوئی اہل سے پوچھا، اور تم نے؟

تم نہیں جانتے؟ اہل نے الٹا سوال کیا۔ ہاں! بالکل تم نے بھی بہت محبتیں کیں ہیں۔ روش نے خود کو یاد دہانی کروائی۔ ہاں! مجھے تو ہر بار محبت ہو جاتی تھی۔ روش نے پوچھا۔ اور اب؟ تو اہل فوراً بولی، نہ بھئی! بہت بیکار چیز ہے، ویسے بھی زندگی میں کرنے کے لیے اب اور بہت کچھ ہے، محبت سے تو میری توبہ ہو چکی ہے۔۔۔

میری بھی۔۔۔ روش نے بھی کہا وہ ہنستے ہوئے موسم سے لطف اندوز ہونے لگے اور ابھی تو بارش ٹھیک سے برسی بھی نہیں تھی بس ہلکی ہلکی ہوا میں پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں اوس کی طرح ان پر پڑ رہی تھیں اور وہ دونوں ایک ساتھ چلتے جا رہے تھے۔

انگوٹھی کا راز

طارق محمود۔ کامرہ اٹک

ایک ناقابل یقین روداد جو کہ لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کسی صورت کوئی یقین نہیں کرتا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے جو بھی سنتا وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوجاتا کہ پھر اچانک.....

برائی کے لبادے میں لپٹی ہوئی عجیب وغریب سبق آموز اور ڈراؤنی داستان..... حیرت

ایک پوش علاقے میں میری گھڑیوں کی شاپ تھی، شاپ چھوٹی سی تھی لیکن جدید ماڈل کی ملکی و غیر ملکی گھڑیاں رکھنا میرا شوق بھی تھا اور دور جدید کی ضرورت بھی اسی لئے کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا۔ چھوٹا سا گھر چھوٹی سی گاڑی اور ہم دو لوگ شادی کو چند ماہ ہی ہوئے تھے اس چھوٹے سے کاروبار سے ہماری زندگی کی گاڑی بہت ہی خوبصورتی سے چل رہی تھی زیادہ خواہشیں نہ زیادہ خواب تھے کچھ دنوں بعد آؤٹنگ کے لئے کسی تفریحی مقام پر گھوم پھر آتے لیکن کھانا ہم لوگ گھر سے بنا کر لے جاتے تھے یا پھر واپس آ کر گھر میں ہی کھاتے، ہوٹلز کے کھانے ہم دونوں کو اچھے نہ لگتے تھے ہم دونوں میاں بیوی اس زندگی سے بہت ہی مطمئن تھے۔ کبھی کسی ضرورت مند کی مدد بھی کر دیتے تھے اور اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔

میں جب کبھی بینک جاتا کسی کمپنی یا ڈیلر کو آن لائن

پیمنٹ کرنے تو لوگوں کے اکاؤنٹ دیکھ کر حیران رہ جاتا اور بہت ہی افسوس ہوتا ایک دن میرے سامنے ایک بیوہ عورت کے اکاؤنٹ کی بات ہونے لگی جس کی کوئی اولاد نہ تھی اس کی سالانہ زکوٰۃ بائیس لاکھ بتائی جارہی تھی اس کے اکاؤنٹ میں رقم کا حساب لگانا میرے لئے مشکل تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ دنیا کی تمام دولت آہستہ آہستہ گنے چنے آدمیوں کے پاس جارہی ہو، زندگی فانی ہے اگر یہ دولت منداس بات کو سمجھ جاتے تو زیادہ تر غربت کا علاج ہوجاتا۔ مجھے زیادہ دولت وجائیداد سے دلچسپی نہ تھی اور نہ ہی میری بیوی عابدہ کو۔

اپنی شاپ پر میں اس آدمی کو اس ہفتہ میں تیسری مرتبہ دیکھ رہا تھا جو کہ صاف لباس اور اپنی باتوں سے پڑھا لکھا لگتا تھا لیکن اس کی حرکات مجھے مشکوک لگتی تھیں وہ کچھ چیز خریدتا نہ تھا۔ بس مختلف گھڑیوں کی قیمتیں پوچھتا گھڑیوں کے لیے لگے اسٹینڈ اور الماریوں کے بارے میں پوچھتا۔ ”کہاں سے بنوائے۔ کتنے میں بنے وغیرہ......وغیرہ۔“

چونکہ میں ایک سیلز مین تھا اسی لئے خوش اخلاقی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتا۔

”اگر کوئی اس طرح کی شاپ بنانا چاہے تو کتنی رقم کا تخمینہ ذہن میں رکھے۔“ اس نے آخر اپنا وہ سوال پوچھ ہی لیا جس کی میں آج امید کررہا تھا۔

میں نے آج تک جتنا اس شاپ پر خرچ کیا تھا اسے تمام تخمینہ بتادیا تھا اور پھر اس کے مختلف سوالوں کے خوش خلقی سے جواب دیئے اسے چائے پلائی۔

”لگتا ہے آپ کا بھی گھڑیوں کی شاپ بنانے کا ارادہ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا تو وہ بھی مسکرانے لگا۔ ”بس یہی سمجھ لیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”میں انگوٹھیوں کا کاروبار کرتا تھا اس کے لیے مجھے مختلف ملکوں میں گھومنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ لیکن اب اس کام سے میں اکتا گیا ہوں اسی لئے اسی طرح کا چھوٹا اور صاف ستھرا کاروبار کرنا چاہتا ہوں، آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مائینڈ کیئے بغیر اس کاروبار کے بارے میں اتنی معلومات بتائیں...... یہ میری طرف سے ایک چھوٹا سا تحفہ قبول فرمائیں۔“

اس نے ایک مخمل کی ڈبی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت تھی۔“ میں نے مروتاً کہہ کر وہ ڈبی پکڑلی اس نے مجھ سے اجازت لی اور خوش خوش چلا گیا۔ میں نے اسے مزید معلومات کی ضرورت پڑنے پر پھر آنے کا کہا تو اس نے ایک بار پھر سے شکریہ ادا کیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اس ڈبی کو کھول کر دیکھا تو اس میں ایک کالی انگوٹھی پڑی تھی، میں نے اسے اٹھایا مجھے تو عام سی انگوٹھی لگی لیکن وزن اس کا عام انگوٹھیوں سے کچھ زیادہ ہی تھا، میں نے اسے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں پہنا تو بالکل فٹ بیٹھ گئی۔

اس کے کچھ دنوں بعد ایک رات میں اور عابدہ ساتھ بیٹھے ڈنر کررہے تھے کہ اچانک عابدہ نے مجھ سے کہا۔

”ظفر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ دن بدن کمزور ہوتے جارہے ہو آپ کے چہرے منہ سے رونق بھی اڑتی جارہی ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے اور گڑھے سے پڑ گئے ہیں۔“

”نہیں تو تمہیں ویسے ہی لگ رہا ہے، رات کو بھرپور نیند نہ کرسکا اس وجہ سے ہوسکتا ہے لگ رہا ہو۔“ میں نے عابدہ کو جواب دیا تو وہ چپ کرگئی لیکن مطمئن نہ ہوئی، لیکن میں اس کی بات سن کر سنجیدہ ہوگیا تھا میں خود بھی اپنے آپ کو کچھ سست محسوس کررہا تھا۔

دوسرے دن عابدہ نے مجھے شاپ پر نہ جانے دیا اور شہر کے ایک اچھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے میرا سرسری سا چیک اپ کیا۔

”آپ کو اپنا ویٹ پتہ ہے۔“ ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا۔ تو میں نے اپنا ویٹ بتایا۔ ”اٹھاون کلو“ ڈاکٹر کے چہرہ پر الجھن سی نظر آنے لگی، میری بات ختم ہوتے ہی اس نے کلینک میں رکھی ویٹ مشین پر مجھے اپنا وزن چیک

Pakistanipoint.com

کرنے کا کہا۔ ویٹ مشین میں اپنا وزن دیکھتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا کیونکہ کانٹا باون بتا رہا تھا اٹھارہ بیس دنوں ہی میں میرا وزن 6 کلو کم ہو گیا تھا۔

میں مہینہ میں تین چار دفعہ اپنا ویٹ کراتا تھا میری شاپ کے سامنے ہی ایک بچوں کا پارک تھا جس کے چھوٹے سے گیٹ کے کونے پر ایک بوڑھا سا شخص ویٹ مشین اپنے سامنے رکھے بیٹھا رہتا تھا وہ زیادہ تر نیچے ہی دیکھتا رہتا تھا میری طرح بہت سے لوگ ایسے تھے جو اس سے اپنا ویٹ کرواتے اور پانچ روپے کا نوٹ اس کے پاس رکھی باسکٹ میں ڈال دیتے۔

کچھ لوگ تو ایسے بھی تھے جو کہ تقریباً روزانہ ہی ویٹ مشین پر کھڑے نظر آتے مجھے اندازہ تھا کہ یہ لوگ اس بوڑھے کی مدد اس بہانے سے کر دیتے ہوں گے۔

عابدہ کچھ دنوں سے بیمار تھی اسی لئے ناشتہ میں خود بناتا تھا اس لئے شاپ پر آتے ہوئے لیٹ ہو جاتا تھا، اسی وجہ سے اٹھارہ بیس دن سے اپنا ویٹ نہیں دیکھ پایا تھا۔ آج اپنا ویٹ چھ کلو کم اور وہ بھی اٹھارہ بیس دنوں میں کم ہونے پر جھٹکا تو لگنا تھا۔

ڈاکٹر نے مجھ سے میرے معمولات اور کھانے پینے کے بارے میں معلومات لیں اور پھر چند ٹیسٹ لکھ کر دیئے جن کی سہولت اس کے کلینک کی لیبارٹری میں موجود تھی اور ہمیں دوسرے دن رپورٹوں کے ساتھ آنے کا کہا۔

دوسرے دن عابدہ نے مستعدی سے مجھے تیار کرایا جبکہ میں اسے کہتا ہی رہا کہ ''بس رپورٹ ہی لے کر چیک کرانی ہے میں خود چلا جاتا ہوں۔'' لیکن وہ نہ مانی رپورٹیں کلیئر تھیں کسی قسم کی بڑی بیماری نہ تھی بس بلڈ پریشر تھوڑا لو رہنے لگا تھا ڈاکٹر نے کچھ ہدایات دے کر چند دوائیں لکھ دیں اور کھانا ٹائم پر کھانے پھل اور جوس وغیرہ کے مشورے دے کر رخصت کر دیا۔

میں نے ڈاکٹر کی ہدایت پر مکمل عمل کیا۔

''لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔''

کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا، شہر سے باہر دوسرے بڑے شہروں میں غرض جہاں کوئی بتاتا اس ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا، اپنی جمع پونجی اور پھر شاپ تک بک گئی جو کہ میری بیوی کے نام پر تھی، ایک گھر تھا جو کہ میں نے خود بنوایا تھا، میں اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ چلنے پھرنے سے لاچار ہو گیا۔

عابدہ نے ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار کی جاب کر لی اور یوں ہماری زندگی کی گاڑی ہلکے رد ھم میں لیکن رواں دواں ہو گئی۔

عابدہ پر بہت زیادہ ذمہ داریاں آ گری تھیں گھر کا سارا کام کھانا پکانا مجھے سنبھالنا یوٹیلٹی بل گھر کا سودا سلف میری دواؤں کا خیال رکھنا جنہیں سوچ سوچ کر میرا دماغ گھوم جاتا تھا پتہ نہیں عابدہ کیسے یہ سب کر رہی تھی اتنے کاموں کے ہوتے ہوئے بھی میں اس کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا بلکہ وہ ہمیشہ مجھے مسکراتے ہوئے ٹریٹ کرتی خود نماز پڑھتی مجھے بھی وضو کرواتی میں بھی لیٹ کر اشاروں میں نماز پڑھتا اور اللہ سے عافیت و تندرستی کی دعا مانگتا۔ وہ تھوڑا سا وقت ہمارے لئے گزارنا مشکل تھا لیکن ناممکن نہیں۔

پھر ایک دن عابدہ جب اسکول سے واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک سفید ریش بزرگ بھی تھے جنہوں نے جب مجھے میرے نام سے پکارا تو میں نے انہیں پہچان لیا وہ بزرگ وہ تھے جو کہ میری شاپ کے سامنے بچوں کے پارک کے گیٹ کے ایک کونے میں ویٹ مشین لے کر بیٹھے رہتے تھے۔

''ظفر صاحب بہت دن ہوئے آپ کو نہیں دیکھا تو دل بے چین سا ہو گیا آپ کی شاپ پر بھی گیا لیکن وہاں کسی اور آدمی کو دیکھا تو اس سے پوچھنے پر پتا چلا کہ آپ نے شاپ فروخت کر دی یہ سن کر اس وقت تعجب ہوا تھا لیکن اب پتہ چلا کہ آپ نے مجبوری میں وہ چلتا کاروبار بیچا۔ اللہ آپ کو صحت دے۔ آمین۔''

عابدہ میرے بارے میں بزرگ کو سب کچھ بتا چکی تھی۔ جتنی دیر ہم میں باتیں کرتے اتنی دیر میں عابدہ کھانے لے آئی۔

بزرگ نے کھانے سے بہت منع کیا لیکن ہم نے انہیں کھانا کھلا کر ہی چھوڑا جاتے ہوئے انہوں نے ایک

بہت ہی اچھا مشورہ دیا۔ ''ظفر صاحب اگر علاج سے افاقہ نہیں ہو رہا تو کچھ دن کے لیے کسی تفریحی مقام پر چلے جائیں ہوسکتا ہے آب و ہوا بدلنے سے کچھ فرق پڑے۔''

ان کی یہ بات نہ صرف مجھے اچھی لگی بلکہ عابدہ کو بھی بہت پسند آئی اس کے لئے ہمیں کوئی تفریحی مقام ڈھونڈنا بھی نہ پڑتا کیونکہ میرا اپنا علاقہ گلگت ایک بہت ہی خوبصورت اور تفریحی مقامات سے بھرا علاقہ تھا لیکن اپنے علاقہ کا سوچتے ہی میرا دل اداس سا ہوگیا کیونکہ میں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے لاہور شہر کی رونقوں میں کھو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''ظفر بیٹا ہم پہاڑی لوگ ہیں ہمیں یہ پہاڑ اور یہ دلکش وادیاں ہی اپنی زندگی گزارنے کے لئے بہترین پناہ گاہ ہیں۔'' میرے ابو نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سمجھانے کی کوشش کی ان کا ہاتھ مجھے بہت ہی بھاری محسوس ہو رہا تھا کیونکہ اسی ہاتھ نے مجھے میرے بچپن میں بہترین طریقہ سے پالا پوسا اور مجھے ایف اے تک تعلیم دلائی اور اسی تعلیم نے میرے دماغ میں عجیب سی باتیں بھر دیں کہ ان پہاڑی علاقوں میں میرا مستقبل نہیں میرے بھائیوں نے میری ماں نے پوچھی چچا نے سب نے سمجھایا لیکن میں ان لوگوں کی بات سمجھ کر بھی نہ سمجھنا چاہتا تھا۔ میں بارہ جماعت پڑھ کر اپنے آپ کو بہت پڑھا لکھا سمجھنے لگا تھا اور ان پہاڑی علاقوں میں گلہ بانی کرنا بے وقوفی سمجھتا تھا حالانکہ اسی گلہ بانی سے میرے والدین نے مجھے لکھایا پڑھایا جبکہ اس علاقہ میں میری طرح بارہ پڑھے نوجوان انگلیوں پر گنے جاتے تھے۔ مجھ سے بڑے دونوں بھائی پانچ جماعت پڑھ کر والدین کا ہاتھ بٹاتے تھے جب میں اپنا گھر اپنی زمین چھوڑ کر آ رہا تھا تو میری طرف حیرت اور غصہ سے دیکھ رہے تھے جبکہ مجھ کو نہ تو شرمندگی تھی اور نہ جھجک بلکہ ابو نے تو مجھے ایک خطیر رقم بھی دی، میں نے بہت کوشش کی کہ نہ لوں لیکن انہوں نے ماں کو آگے کر دیا اور پھر مجھے وہ رقم لینا پڑی جو کہ لاہور آ کر میرے بہت کام آئی کیونکہ جتنے خواب میں لے کر لاہور آیا تھا وہ سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے گئے اور پھر میری ملاقات عابدہ کے والد سے ہوگئی جو کہ اس واچ شاپ کے مالک تھے پہلے ان کے پاس میں نے ایک ملازم کی حیثیت سے نوکری کی اور پھر ان کو جب ایک پارٹنر کی ضرورت پڑی تو میں نے اپنی رقم جو کہ میرے ابو نے مجھے دی تھی ان کے کاروبار میں لگا دی اور پھر یہ حصہ داری جلد ہی رشتہ داری میں بدل گئی اس کے بعد میرے سسر سعودیہ خادمین میں پوری عمر دینے کے لیے چلے گئے اور ان کی ڈیوٹی خانہ کعبہ میں لگ گئی۔

واپس اپنے علاقے کی طرف جاتے ہوئے یہ تمام سوچیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں لیکن ان میں سب سے بڑی بات جو مجھے بہت بے چین کر رہی تھی وہ تھی میری شادی میں نے شادی کی اجازت لینا تو دور اپنے ماں باپ کو اطلاع دینا بھی ضروری نہ سمجھا لیکن اب میرے ساتھ میری بیوی کو دیکھ کر نہ جانے ان پر کیا گزرے۔

آخر جب میں گھر پہنچا تو میرے سب خدشات بس سوچیں ہی بن کر رہ گئے میرے گھر والوں نے جب میری حالت دیکھی تو وہ سب پچھلی باتیں جیسے بھول گئے اماں ابا تو مجھے یوں بیمار دیکھ کر صدمہ سے خود ہی بیمار پڑ گئے بھائیوں اور بھابیوں نے میری خوب خدمت کی اور میری بیوی کا مان بڑھایا بس چھ ماہ میں، میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا، میری جسمانی صحت آہستہ آہستہ پہلے جیسی ہونے لگی اور پھر میں نے اپنے والدین اور بھائیوں سے اپنا کام شروع کرنے کی سب لوگ میری بات کو سمجھ گئے اور پھر میرے ساتھ کام شروع کرنے میں مدد بھی کی ان پہاڑی علاقوں میں ایک ہی کام زیادہ ہے وہ وہی گلہ بانی یعنی کہ بکریاں اور بھیڑیں پالنا میں پہاڑ کے عین نیچے ابو کے بنائے ہوئے اک گھر میں چلا گیا گھر کا کیا تھا دو بڑے کمرے تھے ایک چھپر سا مکان جو کہ بھیڑ بکریوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اور ساتھ ہی ان کی خوراک رکھنے کے لیے چھوٹا سا گودام بنا تھا اس گھر کی چار دیواری نہ ہونے جیسی تھی بس چھوٹی سی حد الگ کرنے کے لئے دیوار تھی میرے لئے یہ کام مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں کیونکہ بچپن سے اپنے ابو کے ساتھ کبھی کبھی بھیڑ بکریوں کو چرانے اور

سنبھالنے کا کام کرتا رہتا تھا۔

برف باری شروع ہوگئی، پہاڑ آہستہ آہستہ سفید ہونے لگے اور میں اپنے مویشیوں کے لئے چارہ کا انتظام کرنے لگا اس دن موسم صبح ہی سے خراب تھا کالے سیاہ بادلوں نے رات کا سماں بنایا ہوا تھا، عصر سے کچھ پہلے کا وقت تھا میں مویشیوں کی خبر گیری کر کے واپس اپنے کمرہ میں آرہا تھا جہاں عابدہ انگیٹھی گرم کئے میرا انتظار کر رہی تھی میں کمرہ کا دروازہ آہستہ سے کھول کر اندر قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ مجھے کتوں کے بھونکنے کی آواز آنے لگی۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں عصر سے پہلے کتوں کے ساتھ چہل قدمی پر جاتا ہوں اس علاقہ میں کتے رکھنا بہت ہی ضروری ہیں اپنی حفاظت کی غرض سے مال مویشیوں کو سنبھالنے کے لئے اور خطرات سے آگاہی کے لئے میں نے بھی پہاڑی نسل کے دو کتے پال رکھے تھے جن کے ساتھ اس وقت میں چہل قدمی کیا کرتا تھا میں واپس آ گیا لیکن کتے آپس میں مستیاں کرتے کچھ دور نکل گئے تھے۔

ان کتوں کے بھونکنے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی خطرے کو دیکھ کر بھونک رہے ہیں میں جلدی سے اندر گھسا اور رائفل کو جو کہ دروازہ کے پیچھے ہی دیوار پر لٹکی تھی اتار کر تیار کرلیا۔ ''کیا ہوا'' عابدہ جو کہ چولہے کے ساتھ بیٹھی کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھی اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں کتے مسلسل بھونک رہے ہیں اسی لئے دیکھنے چلا ہوں کہ کہیں برفانی بلا تو نہیں آ گئی۔'' میں یہ کہہ کر جلدی سے نکل آیا اب میرا رخ اس طرف تھا جہاں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں، میں کچھ ہی آگے گیا تھا کہ مجھے نظر آ گیا کہ کتے کیوں بھونک رہے تھے۔

میرے آگے ایک نشیبی میدان تھا جس کے درمیان کھڑے میرے دونوں کتے سامنے پہاڑ پر چڑھتے چار لوگوں کو دیکھ کر بھونک رہے تھے وہ چار لوگ کتوں کے بھونکنے کی پروا کئے بغیر پہاڑی پر چڑھ رہے تھے بادلوں کے اندھیرے اور برف کے گرتے گالوں کی وجہ سے میں انہیں ایک متحرک نقطے جیسا ہی دیکھ سکتا تھا میں نے کچھ یاد آتے ہی اپنی جیکٹ کی اندرونی پاکٹ پر ہاتھ مارا تو مجھے اپنا ڈیجیٹل کیمرہ مل گیا جو کہ ہر وقت میری پاکٹ میں رہتا تھا میں نے وہ نکال کر ان لوگوں پر لگایا اور ویڈیو کو زوم کر کے جتنا صاف نزدیک کر سکتا کر کے دیکھنے لگا۔

کیمرہ نائٹ موڈ پر ہی تھا، اسی لئے کیمرہ کی آنکھ سے ان چار آدمیوں کو دیکھتے ہی میں چونک اٹھا ان میں سب سے آگے والا آدمی ایسے چل رہا تھا جیسے وہ بیمار ہو یا پھر نشے کی حالت میں ہو اس کے بعد والا آدمی اس کو چلتے چلتے ہلکا سا دھکا مار دیتا دوسرے آدمی کے اوور کوٹ کے داہنی جانب ابھار سے میں مشکوک ہوگیا مجھے ایسا لگا کہ اس کے پاس کوئی گن وغیرہ ہے اس کے بعد میں نے پچھلے دونوں آدمیوں کا جائزہ لیا ان کے پاس بھی یقیناً ہتھیار تھے جن کے اوپر انہوں نے داہنے ہاتھ رکھے ہوئے تھے تیز ہوا چلنے لگی میری نظر پہلے والے آدمی پر چلی گئی جس کے سر سے اوور کوٹ کی ٹوپی اتر گئی جس کے اندر سے لمبے لمبے بال نظر آتے ہی مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کیونکہ ایک لڑکی ان تین مشکوک آدمی کی تحویل میں آگے بڑھتی جا رہی تھی جب کبھی وہ رکتی تو پیچھے سے اسے دھکے مارے جاتے۔

میرے ذہن میں آیا کہ اس کی مدد کرنی چاہیے اسی وقت وہ سب پہاڑ کی دوسری طرف اتر گئے جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے تو میں نے کیمرہ واپس پاکٹ میں ڈالا اور کتوں کی طرف آہستہ سے دوڑ لگا دی۔ کتے بھی میری موجودگی سے واقف ہو چکے تھے وہ میرے پاس بھاگ کر آئے اور اس پہاڑ کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگے جیسے مجھے ان آدمیوں کے بارے میں بتا رہے ہوں۔ میں نے ان دونوں کی پیٹھ تھپکی اور اشارے سے انہیں خاموش کرنے لگا وہ دونوں میرے اشارے کو سمجھتے ہوئے چپ کر کے ہلکا ہلکا غرانے لگے اور میرے دائیں بائیں ہو کر میرے ساتھ ہی دوڑنے لگے۔

میں اس طرف جا تو رہا تھا لیکن میرے ذہن میں وہاں پیش آنے والی صورت حال سے نمٹنے کے لئے کوئی پلان نہ تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں ان لوگوں کو غلط سمجھ رہا

ہوں لیکن وہ لوگ اصل میں کچھ اور ہوں، میں یہ سب سوچتے ہوئے اس پہاڑ پر چڑھتا جارہا تھا کتے میرے ساتھ ہی تھے وہ پہاڑ پر سونگھتے اور پھر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے آگے تو کبھی پیچھے اچھلتے کودتے بھاگتے انہیں ایک ایکسائٹمنٹ فیل ہورہی تھی شاید۔ لیکن میرے اندر ایک ہیجان سا تھا کیونکہ میں لڑنے بھڑنے والا آدمی نہ تھا رائفل شکار کے لئے تو استعمال کی تھی لیکن انسان کو مارنے کا دم نہ تھا۔

ہم پہاڑ پر چڑھ کر دوسری طرف اتر گئے کچھ ان کے پاؤں کے نشانات تھے اور کچھ کتوں کی سونگھنے کی زبردست حس نے جلد ہی مجھے ایک پہاڑی غار کے دہانے تک پہنچادیا میں دھڑکن پر قابو پاتا اس غار میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا گھستا گیا کتے میرے ساتھ ہی تھے۔ غار نشیبی تھا ہم کچھ ہی آگے گئے تھے کہ کتے تن کر کھڑے ہوگئے آگے سے آدمیوں کی آواز آرہی تھی اس سے پہلے کہ کتے بھونکتے ہوئے اس طرف بھاگتے میں نے ان پر ہاتھ پھیر کر انہیں شانت کیا اب وہ میرے ساتھ آہستہ قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے لیکن ان کا انداز ایسا تھا کہ اچانک کسی پر جھپٹنے کے لیے تیار تھے ہم عین ان لوگوں کے اوپر پہنچ چکے تھے ہمارے کچھ ہی پیچھے ایک کھلی جگہ پر ایک آدمی رسیوں میں جکڑا زمین پر کچھ بیٹھا کچھ لیٹا تھا اس کے سامنے ہی ایک لڑکی بیٹھی تھی جو کہ یقیناً وہ ہی تھی جسے میں نے ان تینوں آدمیوں کے آگے چلتے دیکھا تھا ان دونوں کو چار آدمیوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا جن کے ہاتھوں میں خطرناک گنز پکڑی تھیں۔ ان میں سے ایک اس آدمی کو دھمکا کر کسی چھپی ہوئی دولت کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے دوستوں اب اگر یہ نہیں بتاتا تو اس کی بیٹی تمہارے حوالے اب تم چاہے جو کرو اس کے ساتھ۔'' جب ان لوگوں کو اپنا مطلب حل ہوتا نظر نہ آیا تو اس آدمی نے جس کی شکل ہی سے خباثت ٹپک رہی تھی یہ کہہ کر بھونڈے انداز میں آنکھ ماری اور میرے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی باقی تینوں آدمی قہقہے لگاتے ہوئے اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگے زمین پر پڑا آدمی چیخنے لگا اور اپنے آپ کو رسیوں سے آزاد کروانے کی تگ و دو کرنے لگا لیکن بے سود۔

میں نے کتوں کی طرف دیکھا جن کے جسم کے بال کھڑے ہو چکے تھے یعنی کہ وہ بھرپور غصہ میں تھے میں نے جلدی سے سردار کا نشانہ لیا اور گولی چلادی ادھر گولی چلی ادھر کتے ہوا میں جمپ لگا کر دو آدمیوں پر جا پڑے گولی اس آدمی کو کندھے میں لگی جس سے اس کا دایاں بازو تو مکمل ناکارہ ہو چکا ہوگا ساتھ ہی میں نے ایک چھلانگ لگائی اور تیسرے آدمی کی طرف دوڑ پڑا جو کہ لڑکی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے رائفل کو نال سے پکڑا اور بٹ کا ایک مضبوط وار اس کے سر پر کیا۔ کھوپڑی کے چٹخنے کی آواز آئی اور وہ اک سمت ڈھیر ہوگیا میں نے جلدی سے لڑکی کو اٹھایا اور پلٹ کر اس کے باپ کی طرف اسے رسیوں سے آزاد کرنے کے لئے گھوما تو اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھ کر حیرت سے بت سا بنا بیٹھا رہ گیا۔

اس آدمی کو یوں اچانک اور اس حال میں اپنے سامنے دیکھ کر میرا ذہن لاہور میں اپنی شاپ اور اپنا گھر گھومنے لگا ایک فلم کی طرح میری شہری زندگی میرے سامنے چلنے لگی یہ وہ آدمی تھا جو کہ میری شاپ پر معلومات لینے آیا تھا اور جس نے مجھے اک انگوٹھی گفٹ کی تھی انگوٹھی کا خیال آتے ہی میں نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کی طرف دیکھا لیکن انگوٹھی نہ تھی جانے کب میں بیمار ہو کر کمزور ہوگیا تھا تو وہ انگوٹھی گر گئی تھی لیکن آج اس آدمی کو دیکھ کر وہ انگوٹھی اور شہری زندگی کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔

وہ آدمی بھی مجھے یوں اس سچویشن میں یہاں دیکھ کر حیرت زدہ تھا اور کچھ پریشان سا یا پھر شرمندہ شرمندہ سا تھا میں نے اور اس کی بیٹی نے اسے جلدی جلدی رسیوں سے آزاد کیا دشمن کے دو آدمی تو ناکارہ ہوگئے تھے اور باقی دو کتوں کے نیچے دبے ہوئے تھے ہم نے مل کر ان دونوں کو کتوں سے چھڑایا اور اسی رسی سے باندھ دیا جس سے کہ پہلے اس لڑکی کا باپ بندھا تھا ہم انہیں اسی غار میں چھوڑ کر

وہاں سے نکل آئے میں ان باپ بیٹی کو لے کر اپنے گھر آیا کیونکہ رات ہوگئی تھی اس وقت وہ دونوں کہیں جا نہیں سکتے تھے۔ میں انہیں جب گھر لے گیا اور عابدہ کو پوری بات بتائی تو اس نے ان باپ بیٹی کی خوب آؤ بھگت کی، میری بیوی اور وہ لڑکی نائلہ ایک کمرہ میں سو گئے میں اور اس کا والد زوار دوسرے کمرے میں جو کہ چھوٹا تھا لیکن ہم مرد اس میں ایڈجسٹ ہو گئے۔

ہم دونوں فرش پر بچھی قالین پر بستر لگائے لیٹے تھے اور میں زوار سے اس معاملہ کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین تھا شاید وہ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ مجھے بتائے یا نہیں۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو اس سارے معاملہ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' آخر میں نے خود ہی بات شروع کرنے کی کوشش کی۔

''بات کوئی اتنی بڑی نہیں نہ ہی زیادہ انٹرسٹڈ ہے جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں مختلف ملکوں میں گھومتا رہتا تھا انڈیا میں مجھے گلگت کا ایک بزرگ آدمی ملا جس کی عمر سو سال سے زیادہ تھی ہم میں مختلف موضوع پر کچھ باتیں ہوئیں تو الوداع ہوتے ہوئے اس نے مجھے ایک نقشہ دیا اور بتایا کہ اسی علاقے میں ایک پہاڑی غار میں اس نے کچھ نوادرات چھپائے تھے میں جب واپس پاکستان آیا تو وہ نقشہ مجھ سے گم ہو گیا لیکن وہ نقشہ میں نے اتنی بار پڑھا تھا کہ مجھے وہ ازبر یاد تھا اسی لئے میں نے آتے ہی وہ نوادرات نکال لئے ان نوادرات کی بہت زیادہ تو نہیں لیکن اتنی قیمت مل گئی کہ میں نے اس سے ایک چلتا کاروبار خرید لیا انہیں نوادرات میں وہ انگوٹھی بھی تھی جو کہ میں نے آپ کو تحفہ دی تھی۔ یہ بات کرتے ہوئے اس کا گلہ بیٹھ گیا اور وہ چپ ہو گیا مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ رو رہا ہو۔ اس کی آخری دو باتیں سن کر میں چونک اٹھا ایک تو وہ انگوٹھی اور دوسرا چلتا کاروبار اب میں اس سے ان دونوں چیزوں کے بارے میں مزید سننا چاہتا تھا کیونکہ وہ تو میرے جیسا کاروبار کرنا چاہتا تھا اور اگر اسے چلتا ہوا کاروبار مل گیا تو میں نے یہ سوچتے ہوئے ایک جھرجھری سی لی۔

''آپ رونے کیوں لگے۔'' میں نے زوار کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''ظفر بھائی مجھے معاف کر دو مجھ سے نا سمجھی میں بہت بڑی غلطی ہو گئی۔''

مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے اور وہ کس غلطی کی مجھ سے معافی مانگ رہا ہے۔

''اصل میں میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ انگوٹھی جو کہ میں نے آپ کو دی ہے وہ میں مصر سے لایا تھا..... وہ انگوٹھی مجھے ان ہی نوادرات والے بکس سے ملی تھی جس کے ساتھ ہی ایک عجیب سی کہانی لکھی تھی جس پر مجھے اس وقت یقین نہ آیا میرے پاس کاروبار نہ تھا کوئی اچھا روزگار کا حال نہ تھا اسی لئے میں نے آپ کا چلتا کاروبار دیکھا تو مجھے ایک حسد سی محسوس ہونے لگی پہلے میں سوچتا تھا کہ ایسا ہی صاف ستھرا سا کاروبار میرا ہو لیکن پھر شیطان نے مجھے ایسا وسوسہ ڈالا کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے آپ کا کاروبار ہتھیانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

وہ کاروبار میرا ہو تو گیا لیکن اس کے لئے میرا بہت بڑا نقصان ہو گیا۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے دماغ میں اس کی بات سن کر دھماکے سے ہونے لگے یعنی میری شاپ اس نے خرید لی۔ میں تو اس وقت سخت بیمار تھا اسی لئے درمیان ایک آدمی ڈال کر میں نے اپنی شاپ کا سودا کیا تھا اسی لئے مجھے نہیں پتا تھا کہ میری شاپ زوار نے خریدی ہے لیکن میرا کاروبار ہتھیانے والی جو بات اس نے کی اس کی مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''یہ جس آدمی سے تم مجھے چھڑوا کر لائے ہو یہ انڈیا میں میرے ساتھ ہی ہوٹل کے ایک کمرہ میں تھا ہم دونوں بحری جہاز میں ملے تو پاکستانی اور ایک ہی شہر کے ہونے کی وجہ سے انڈیا میں ایک ہی ہوٹل میں کمرہ لے لیا تاکہ پیسے بچا سکیں اور وہاں اس آدمی نے وہ نقشہ چھپا لیا لیکن نقشہ مجھے یاد تھا اور میں اس سے پہلے واپس آ گیا تھا اسی لئے وہ نوادرات میں نے نکال لئے یہ جب واپس آیا تو اسے اس جگہ کچھ نہ ملا اس کے پاس میرا پتہ تھا یہ میرے پیچھے وہاں

تک اپنے ان غنڈے دوستوں کے ساتھ آ پہنچا اس نے مجھے اٹھوالیا اور تشدد کر کے اس نوادرات والے خزانے کے بارے میں پوچھنے لگا پہلے تو میں اس بات پر ڈٹ گیا کہ وہ نقشہ مجھ سے گم ہو گیا تھا اسی لئے مجھے یاد ہی نہیں کہ وہ خزانہ کہاں تھا لیکن یہ آدمی بہت ڈھیٹ تھا اسے میری بات پر یہ یقین نہ آیا اس نے میری بیوی کو بھی اغوا کر لیا اور پھر میرے سامنے ہی اسے گولی ماردی۔'' اس کی ہچکیوں کی آواز تھی اور سرگوشی نما رونا میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ''آپ نے ان کو پہلے ہی کیوں نہ بتادیا کہ وہ خزانہ آپ نے نکال کر لگادیا ہے۔'' جب اس کی ہچکی بند ہوئی تو میں نے کہا۔

''میرے ذہن میں نہیں تھا کہ وہ میری بیوی کو ماردیں گے..... اور اگر میں انہیں بتادیتا تب بھی انہیں یقین نہ آتا۔ اس کے بعد میں نے پکا اپنی زبان کو سی لیا وہ مجھ پر تشدد کرتے رہے لیکن میں نے ہر تشدد برداشت کیا اور پھر وہ مجھے وہاں سے اٹھا کر اس علاقہ میں اس غار میں لے آئے جہاں سے میں نے خزانہ نکال لیا تھا۔ اس سارے عرصہ میں مجھے بہت ہی افسوس و دکھ ہوتا رہا کہ میں نے آپ کے ساتھ بہت ہی زیادتی کی دھوکہ کیا وہ انگوٹھی ایک سفلی انگوٹھی تھی..... ہاں اس کی کہانی یہ تھی کہ اسے جو پہنتا تھا وہ ایک عجیب سی بیماری میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اس کا وزن گھٹنے لگتا تھا وہ کمزور ہونے لگتا۔ اس کی بات سن کر میں کھڑا ہو گیا مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ وہ انگوٹھی پہننے کے بعد ہی میرے ساتھ ایسا ہی ہوا جیسا کہ زوار بتا رہا تھا میں اس کی طرف بس دیکھے جا رہا تھا وہ اپنی کہانی سنا۔ئے جا رہا تھا میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

''میں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی اسی لئے مجھے اس کی سزا بیوی کی موت کی صورت میں ملی جب میں پھر بھی نہ بولا تو وہ میری بیٹی کو اٹھا کر اسی غار میں لے آئے بیٹی کو دیکھ کر میں کانپ اٹھا اور میں نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتادیا لیکن وہ ماننے کو تیار نہ تھے بس اسی وقت تم لوگ وہاں آ گئے اس سے پہلے کہ وہ میری بیٹی کے ساتھ.....'' وہ اب رونے لگا تھا میں نے بھی اسے رونے دیا تا کہ اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ اس نے انگوٹھی کی جو کہانی بتائی تھی وہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا لیکن جانے کیوں مجھے پھر بھی اس کہانی پر یقین سا نہ تھا۔

زوار نے مجھ سے سچے دل سے معافی مانگی میں نے اسے معاف کر دیا وہ میری شاپ مجھے واپس کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس سے واپس نہ لی ہم لوگ واپس سب کچھ چھوڑ کر لاہور شفٹ ہو گئے لیکن اس دفعہ میں نے اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے اجازت لی تھی ہم لوگ جب واپس اپنے گھر پہنچے تو ہمارے گھر کے اندر ایک بدبو اور تعفن سا پھیلا ہوا تھا جبکہ ہم اپنا گھر اس بزرگ ویٹ مشین والے کے حوالے کر کے گئے تھے گھر کے دروازے کھلے تھے عابدہ اس بو کو برداشت نہ کر سکی اور باہر ہی رک گئی، امی اپنے ناک منہ پر رومال رکھ کر جب گھر کے اندر گیا تو کچن کے ساتھ والے کمرہ سے وہ بو آ رہی تھی جس کا دروازہ ہلکا سا کھلا تھا۔ جب میں دروازے کو چوپٹ کھول کر اندر داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی۔

سامنے ہی بستر پر وہ بزرگ مرے پڑے تھے جانے انہیں مرے کتنے دن ہو گئے تھے جب میں ان کے قریب گیا تو ان کی جسمانی حالت دیکھ کر مجھے شدید حیرت کا جھٹکا لگا مجھے لگا کہ جیسے وہ بھی بہت کمزوری کے بعد مرے ہوں اور پھر بیڈ کے پاس ہی وہ کالی انگوٹھی پڑی مجھے نظر آ گئی، میں نے اسے اٹھا کر جلدی سے جیب میں ڈال لی اس کے بارے میں سوچ کر مجھے چکر آنے لگے تھے اس کے بعد میں نے ریسکیو کو فون کر دیا جو کہ آ کر اس بزرگ کی لاش کو لے گئے پوسٹ مارٹم وغیرہ ہونے کے بعد ہم نے ان کی تدفین کرائی۔

اس کے بعد بغیر کسی تحقیق کے میں نے وہ انگوٹھی راوی میں پھینک دی اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی مجھے یقین سا نہ تھا حالانکہ یہ سب میرے ساتھ اور میرے سامنے ہوا تھا۔ پھر میں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا جو کہ بہت ہی اچھا جا رہا ہے اور اب راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔

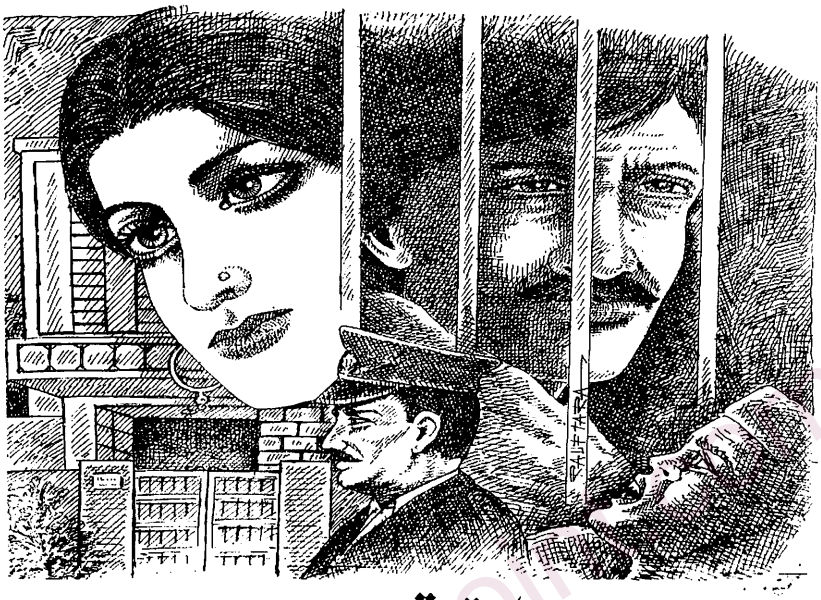

موت کا تعاقب

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

ایک انوکھی حیرتناک اور خوفناک قوت جو کہ اس کا تعاقب کررہی تھی پتھریلی زمین پر کسی کی پراسرار سرسراہٹ اسے صاف سنائی دے رہی تھی لیکن پھر.....

قدم قدم پر لرزاں براندام کرتی رگوں میں خون منجمد کرتی..... حیرت ناک..... کہانی

عظیم سائنسدان کنارڈ کو لوگ اس لئے خبطی سمجھتے تھے کہ اس نے شہر کے خوب صورت علاقے کو چھوڑ کر بھیانک جنگل میں رہنا پسند کیا تھا۔ عوام کے لئے یہ امر تعجب خیز تھا مگر کنارڈ اور اس کے نائب ڈاکٹر اس کی نزیہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے تجربات کے لئے تنہائی اور سکون کتنا اہم ہے۔ ڈاکٹر کنارڈ دراصل کیمیا بنانے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس کا یہ خواب اب شرمندہ تعبیر ہوا ہی چاہتا تھا اپنی زندگی کے تیس سال اس نے نت نئے فارمولے بنانے اور تجربہ کرنے میں ضائع کردیئے تھے اس کی محنت کا پھل اب ملنے والا تھا اور اس کا یہ تجربہ آخری مراحل میں تھا۔

اپنے محنتی رفیق کار ڈاکٹر اس کی نزکو اس نے ایک کاغذ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی نزیہ ہے میری محنتوں کا پھل۔ اب دنیا کی کوئی بھی شے ٹھوس سونے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب ہمارا ملک دنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا ہے۔“

ایک وسیع و عریض میز پر سائنسی آلات بڑی خوب صورتی کے ساتھ سجے ہوئے تھے۔ اسپرٹ لیمپ کے اوپر ایک بہت بڑا شیشے کا برتن رکھا ہوا تھا اور اس برتن میں گہرے سرخ رنگ کی کوئی رقیق شے ابل رہی تھی مختلف گیسوں کے مرتبانوں میں سے لاتعداد شیشے کی نلکیاں نکل کر اس برتن میں پہنچ رہی تھیں۔ ڈاکٹر کنارڈ نے تمام اشیاء کو بہ نظر تحسین دیکھا اور پھر بولا۔

”مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ میں چاہتا

ہوں کہ تم اتنے میں اس تجربہ کی دیکھ بھال کرو میں ایک گھنٹہ بعد واپس آ کر اسے پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔"

"ہاں..... اس کاغذ میں وہی آخری مراحل درج ہیں۔ بہتر ہے آپ جا سکتے ہیں،" اس کی نر نے نہایت ادب سے کہا۔

ڈاکٹر کنارڈ کو گئے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا مگر وہ واپس نہیں آیا۔ خدا جانے کے کیا بات ہوئی؟ تجربہ چونکہ آخری مراحل میں تھا اس لئے اس کی نر نے مجبور ہو کر خود ہی اسے تکمیل تک پہنچانا شروع کر دیا۔ اس کی خوش قسمتی سے ڈاکٹر کنارڈ آخری فارمولے والا کاغذ وہیں بھول گیا تھا اس لئے اس کی نر نے اس فارمولے کی مدد سے اپنا کام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر کنارڈ کا یہ تجربہ اس کی روانگی سے تقریباً پانچ گھنٹے بعد شروع ہوا۔ اس کی نر نے اپنی بھرپور کوشش کر لی۔ وہ چاہتا تھا جو کچھ بھی ہونا ہے جلدی ہو جائے مگر تجربہ مکمل ہونے میں ابھی کئی دن درکار تھے۔ فطرتاً وہ جلدی پسند تھا اس لئے یہ طویل مدت اسے کھل رہی تھی۔ لیکن یہ کوئی معمولی تجربہ تو تھا نہیں کیمیا بنانے کا معاملہ تھا اس لئے اسے صبر کرنا ہی پڑا۔

ڈاکٹر کنارڈ کا اس نے دو دن تک انتظار کیا مگر جب وہ واپس ہی نہ آیا تو اس کی نر نے سوچ لیا کہ وہ جان بوجھ کر کہیں لاپتہ ہو گیا ہے اور شاید اس کی وجہ محض یہ ہو کہ وہ اس کی نر کے ذریعے ہی اس تجربہ کی تکمیل کا خواہشمند ہو!

بڑی بھیانک اور خوفناک رات تھی سفیدے کے لمبے لمبے درخت ڈاکٹر کنارڈ کے مکان کے باہر کفن پوش لاشوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ ہوائیں درختوں کے سوکھے پتوں پر چیختی چلاتی پھر رہی تھیں۔ زمین پر پتوں کی پراسرار سرسراہٹ سے روحوں کے چلنے کا گمان ہوتا تھا۔ ڈاکٹر اس کی نر مکان کے اندر کھڑا ہوا، کھڑکی سے باہر نظر آنے والے اس بھیانک منظر کو دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں پر ایک چمگادڑ اپنے پر پھیلائے بار بار اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور ارواح خبیثہ کا اس کی نر قائل نہیں تھا لیکن اندھیرے سے اسے ضرور دہشت ہوتی تھی کھڑکی سے باہر دور تک سیاہ دھند چھائی ہوئی تھی اور اس دھند میں لپٹی ہوئی اشیاء بڑی ہیبت ناک اور بھیانک نظر آ رہی تھیں۔

اس کی نر اپنی توجہ ان خیالات اور دہشت ناک ماحول سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پھر سے کام میں مصروف ہو گیا! کسی شیشی میں سے ایک ارغوانی محلول اس نے ٹیسٹ ٹیوب میں نکالا اور پھر شیشے کے بڑے برتن کی طرف بڑھا۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے کوئی کمرے میں ہے۔ ایک ہیبت ناک سرسراہٹ، پراسرار سرگوشی اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ گھبرا کر وہ پلٹا اور پھر چلایا۔

"کون ہے..... کون ہے کمرے کے اندر؟"

لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی نر دل ہی دل میں ہنسا کہ ناحق ڈرا جا رہا ہے۔ چونکہ وہ دن رات کام میں مصروف رہا ہے اس لئے تھکاوٹ کے باعث الٹے سیدھے خیالات اس کے دماغ میں آ رہے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔ ٹیسٹ ٹیوب کا محلول برتن میں ڈالتے وقت اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اپنے پراگندہ خیالات کو اس نے ایک مرکز پر پھر سے جمع کیا اور محلول کو شیشے کی نلکی سے ہلانے لگا۔

یکا یک وہی سرسراہٹ اسے پھر سنائی دی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ قوت سامعہ تیز ہو گئی اور پھر جو کچھ اس نے دیکھا وہ اسے حواس باختہ کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک سفید رنگ کا لمبا سا سانپ تجربے کی میز پر رینگتا ہوا آیا اور اپنا پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی لمبی اور پتلی زبان بار بار شعلے کی طرح باہر لپک رہی تھی اس کی مسحور کن آنکھوں سے اس کی نر سحر زدہ ہو گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

سانپ آہستہ آہستہ اس کی طرف آیا تھا۔ جب وہ بہت قریب آ گیا تو اس کی نر چونکا اور پھر اس نے ایک زوردار ہاتھ مار کر اسے نیچے پھینک دیا۔ اسی پر بس نہ کر کے اس نے سانپ کو اپنے لمبے بوٹ سے کچلنے کی کوشش بھی کی مگر

اچانک وہ سانپ غائب ہوگیا۔ پھر اس کی نرنے میزوں، کرسیوں اور چھوٹے بڑے سوراخوں میں ہر جگہ تلاش کر لیا۔ مگر سانپ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھ کر ان باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کے خیال میں یہ ایک اتفاقی بات تھی کہ سانپ اندر آ گیا تھا۔ اور اس طرح پھن اٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ سانپ عموماً دولت یا خزانوں کی رکھوالی کیا کرتے ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں کہ رقیق مادہ ٹھوس سونے میں تبدیل ہونے والا ہو۔ اور سانپ کو پہلے ہی اس کی خبر لگ گئی ہو۔ اس لئے وہ دولت کی نگہبانی کرنے آ گیا ہو!

بہر حال کچھ بھی ہو۔ اب اسے کام کی رفتار تیز کر دینی چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی سے فارمولے کے مطابق دی ہوئی ادویات کے شیلف میں سے ایک خاص محلول نکالنا چاہا۔ لیکن جیسے ہی اس نے مناسب مقدار میں وہ محلول برتن میں ڈالنا چاہا، اچانک ایک زبردست آواز ہوئی اور برتن میں جھاگ ہی جھاگ اٹھنے لگے۔ یہ جھاگ برتن سے کئی فٹ بلند ہو گئے۔ ان جھاگوں کے باعث مادہ نیچے گرنے لگا۔

اس کی نرکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کے خیال کے مطابق تو ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر یقیناً کہیں غلطی ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ شیلف کے پاس جا کر ادویات کی شیشیوں کو پرکھنے لگا۔ مگر یہ کیا؟ جو محلول اسے درحقیقت برتن میں ڈالنا چاہیے تھا وہ تو شیلف میں ہی رکھا ہوا تھا اور اس نے غلطی سے دوسری شیشی اٹھائی تھی! لیکن ایسا کیوں ہوا، کیا اس کے ہاتھ غلط شیشی اٹھا سکتے تھے؟

اس نے پھر یہی سوچا کہ یقیناً یہ سب کام کی زیادتی کے باعث ہوا ہے، وہ اتنی محنت کر رہا ہے کہ اس کے حواس قابو میں نہیں رہے اور وہ غلط سلط باتیں سوچنے لگا ہے، بہتر یہی ہے کہ رات کو خوب اچھی نیند لی جائے اور پھر صبح تازہ دم ہو کر کام میں جٹ جائے اپنا یہ خیال جب اسے بالکل درست معلوم ہوا تو وہ فوراً ہی بستر پر دراز ہو گیا احتیاطاً اس نے سب کھڑکیاں بند کر لیں اور بستر کو اچھی طرح جھاڑ جھٹک کر دیکھ لیا کہ وہ سفید سانپ تو وہاں پہلے سے نہیں آ گیا اور پھر یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا لمبا سانس لیا کہ ایسا نہیں ہے۔

سانپ تو کیا وہاں ایک معمولی سا کیڑا بھی نہیں آ سکتا۔ راستے بند ہیں۔ کھڑکیاں بند ہیں اور فرش بھی پکا ہے، پھر بھلا سانپ کا وہاں کیا کام؟

رات کا آخری وقت تھا جبکہ ایک پراسرار اور بھیانک سرسراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید یہ اس کا وہم تھا یا پھر حقیقت تھی کہ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا کوئی غیر مرئی قوت اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ اسے دیکھ تو نہیں سکتا البتہ محسوس کر سکتا ہے۔ مگر یہ کون ہے جو اس کے تجربے اور آرام میں خلل انداز ہو رہا ہے؟ تکیے کے نیچے رکھا ہوا اپنا پستول نکال کر وہ آہستہ سے کھڑا ہوا اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی بے سود کوشش کرنے کے بعد وہ دبے دبے پاؤں رکھتا ہوا فرش پر چلنے لگا۔

کمرے میں دہشت ناک خاموشی کا تسلط تھا۔ اندھیرا ویسے بھی اسے ناپسند تھا اور پھر اس دن کا اندھیرا خدا کی پناہ..... یوں لگتا تھا جیسے تاریکی نے ہر شے کو نگل لیا ہے، اندھیرے میں اسے کچھ ہیولے چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور غور سے ان ہیولوں کو دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا، اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب اس کا وہم ہے۔ اندھیرے کا خوف چونکہ شروع ہی سے اس پر حاوی تھا۔ اس لئے اوٹ پٹانگ خیالات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ پستول واپس اس نے بستر پر پھینک دیا اور پھر دوبارہ لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہی پراسرار سرسراہٹ پھر سنائی دی۔ اس آواز کے ساتھ ہی اچانک نارنجی رنگ کی روشنی بھی دوسرے کمرے میں پیدا ہوتی ہوئی دکھائی دی۔

اسے بڑا تعجب ہوا..... یہ روشنی کیسی ہے؟ اس نے تو کمرے کی ساری بتیاں بجھا دی تھیں..... پھر یہ روشنی وہ تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا اس کمرے میں پہنچا اور جو کچھ اس نے وہاں دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لئے کافی تھا۔

اس نے دیکھا کہ تجربے کی بڑی میز پر بڑے

برتن کے عین نیچے سپرٹ لیمپ روشن ہے اور برتن میں پڑا ہوا رقیق مادہ گرم ہونے کے بعد ابلنے لگا ہے چونکہ اسے ایک خاص مقدار میں ہی گرمی پہنچائی جاتی تھی اس لئے اب اتنی زیادہ گرمی پاکر ایک طرح سے اس کے عظیم تجربے کا ستیاناس ہوگیا تھا جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے اسپرٹ لیمپ کو بجھا دیا اور پھر یاد کرنے لگا کہ یہ غلطی اس کی ہے جہاں تک اسے یاد ہے سونے سے پہلے اس نے اسپرٹ لیمپ بجھا دیا تھا۔

کرسی پر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کافی دیر کے غور و خوض کے بعد اس نے جھنجلا کر کرسی کے دستے پر مکہ مارا اور پھر فوراً کھڑا ہوگیا اب اسے پکا یقین تھا کہ رات کے آغاز میں اس نے برنر بند کر دیا تھا پھر آخر وہ کون ہے جس نے برنر دوبارہ کھول کر اس کی شب و روز کی محنت کو نقصان پہنچایا ہے! میز کے قریب جا کر اس نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف کے باعث پھٹی کی پھٹی رہ گئیں میز پر جمی ہوئی خاک پر ایک سانپ کے رینگنے کے نشان صاف نظر آرہے تھے!

دہشت کی ایک تھرتھری اس کے جسم میں پیدا ہوئی اور اس نے دانت پر دانت جما کر جیسے خود سے کہا۔

''میں اب سمجھ گیا کہ یہ سب کیا ہے۔ مگر میں بالکل نہیں ڈرتا خواہ کچھ بھی ہو جائے میں اپنا تجربہ ضرور مکمل کروں گا۔''

صبح ہوتے ہی اس نے پرانے کپڑوں اور ردی کاغذوں کی مدد سے دیواروں، فرش اور چھت کا ایک ایک سوراخ بند کر دیا۔ چھوٹی بڑی نالیاں۔ ہوا کے آنے جانے کے راستے اور تمام کھڑکیاں اس نے اس طرح بند کیں کہ سوئی کے برابر بھی کہیں سوراخ نہیں رہا۔ اب اسے مکمل اطمینان ہوگیا تھا اسے یقین تھا کہ وہ منحوس سانپ پھر وہاں ہرگز نہ آسکے گا۔

اس نے پرانا مادہ پھینک دیا اور تجربے کا نئے سرے سے آغاز کیا۔ رات دن اس نے خوب محنت کی فارمولے کے مطابق تجربہ کو اس مقام تک لے آیا جب کہ اس میں ایک دو دن کے کام کی کسر رہ گئی تھی۔ مسرت اور جوش کے باعث اس کا چہرہ ہر وقت تمتماتا رہتا تھا سانپ کے بارے میں اب اسے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ دراصل وہ اس کے وہم کی ہی پیداوار ہے سانپ آیا بے شک تھا مگر اسپرٹ لیمپ وغیرہ کو اس نے ہرگز نہیں چھوا چونکہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ سانپ برنر کی چابی کھول دے جبکہ انسانی ہاتھوں سے وہ مشکل سے کھلتی ہے تو وہ تو پھر سانپ ہے۔ غلطی درحقیقت اسی سے ہوئی تھی اور کوئی خاص بات نہیں۔

تجربہ مکمل ہونے والا تھا صرف ایک دن کی کسر رہ گئی تھی اس کی نرجب رات کو بستر پر آرام کرنے کے لئے لیٹا تو وہ بڑے عجیب منصوبے بنا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ ٹھوس سونے کو بازار میں فروخت کرنے کے بعد وہ اتنی دولت پیدا کر لے گا کہ حکومت کے خزانے میں بھی نہیں ہو گی وہ دنیا کا امیر ترین انسان تھا! امیر ترین انسان کا مطلب ہے طاقتور آدمی۔ اور جب اس کے پاس طاقت ہو گی تو وہ پوری دنیا کو اپنے قدموں پر جھکا لے گا پھر وہ وقت کتنا عجیب ہوگا جبکہ دنیا اس کے تلوے چاٹے گی اور وہ اسے حقارت سے ٹھکرا دے گا۔

''مگر یہ کیا..... یہ آواز کیسی ہے؟''

گھبرا کر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا اور پھر آنکھیں پھاڑ کر ہر سمت دیکھنے لگا اچانک ہی بھیانک قسم کی سرسراہٹ پھر سنائی دی۔ چونکہ وہ اس سرسراہٹ کا معمہ حل کر چکا تھا اس لئے تیر کی طرح اس کمرے میں پہنچا جس میں وہ برتن تھا اور جس میں پڑا ہوا رقیق مادہ کیمیا گری کے باعث سونے میں تبدیل ہونے والا تھا کمرے میں پہنچتے ہی وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ کوئی اور ہوتا تو دہشت کے باعث فوراً بے ہوش ہو جاتا مگر اس کی نر بڑے دل گردے والا آدمی تھا۔

وہ حیرت سے ایک جگہ ہی جم کر رہ گیا اور پھر اس سفید سانپ کو دیکھنے لگا جو اپنے منہ میں ایک چھوٹی سی زرد رنگ کی شیشی دبائے ہوئے رقیق مادے والے برتن کے قریب اس انداز میں جھوم رہا تھا کہ اس کا پھن برتن کے بالکل اوپر تھا۔ اور نیچے اس نے کنڈلی مار رکھی تھی۔

اس کی نر جیسے سحر زدہ ہوگیا اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا بھی مگر اس کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔ چونکا وہ اس وقت جبکہ سانپ نے زرد رنگ کا سفوف برتن میں الٹ دیا

تھا اور اس کے الٹتے ہی ایک زوردار دھماکا ہوا تھا..... اتنا زبردست دھماکا کہ برتن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھر گیا اور کمرے کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔

ارے ظالم یہ کیا کیا تو نے؟ اس کی نر بری طرح دھاڑا۔ اور پھر بیتابی کے عالم میں سانپ کو مارنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ سانپ بھی دھماکے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہوگا اور یقیناً اس کے چیتھڑے اڑ گئے ہوں گے مگر یہ دیکھ کر اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ

سانپ اسی طرح کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اس کی نرکو لگاتار گھورے جا رہا ہے۔ اس کی نر دراصل اسے مارنے کے لئے آگے بڑھا تھا مگر جب اس نے محسوس کیا کہ سانپ اس پر حملہ کرنا چاہ رہا ہے تو وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے جھٹکتے ہی سانپ اس کی طرف لپکا۔ اور اس کی نر کے حواس باختہ ہو گئے۔ اس نے چلا کر کہا۔

''میں جان گیا..... اچھی طرح جان گیا مردود..... مگر میں تیرے ہاتھ ہرگز نہ آؤں گا۔''

اتنا کہہ کر اس نر تیزی سے دروازہ کھولا اور پھر بری طرح باہر کی طرف بھاگا۔ بھاگتے ہوئے وہ دہشت زدہ آواز میں مدد کے لئے چلا رہا تھا۔ مگر اس ویرانے میں بھلا کون اس کی مدد کو آتا! وہ ہانپتا ہوا دوڑتا رہا! بھاگتے ہوئے وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا بھی جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ان دیکھی قوت اس کا تعاقب کر رہی ہے۔

پتھریلی زمین پر کسی کی پراسرار سرسراہٹ اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ سرسراہٹ جلدی ہی قدموں کی چاپ میں تبدیل ہو گئی۔ ایک کھوکھلی آواز اسے اپنے ذہن سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کوئی غمناک لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ ''اس کی نر..... اس کی نر بھاگ کیوں رہے ہو، رک جاؤ۔ رک جاؤ، میرا انتقام ابھی پورا نہیں ہوا.....''

اس کی نر اس آواز کو سنتے ہی خوف زدہ انداز میں اپنی رفتار بڑھا رہا تھا، جلدی ہی وہ کھلی سڑک پر آ گیا۔

دور سے کسی کار کی ہیڈ لائٹس اسے اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخا۔ ''بچاؤ..... مجھے بچاؤ۔''

کار نزدیک آ چکی تھی اور اس کی نر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا کار کے جھٹکے سے وہ نیچے گر پڑا لیکن پھر فوراً ہی اٹھ گیا۔ آنے والے لوگ پولیس کے علاوہ اور کوئی نہ تھے۔ ''کیا بات ہے مسٹر، آپ بوکھلائے ہوئے ہیں؟'' انسپکٹر نے دریافت کیا۔

''مجھے بچایئے انسپکٹر صاحب، خدا کے لئے مجھے بچایئے۔'' اس کی نر بے تابی سے بولا۔

''کس سے بچائیں..... کون آپ کا تعاقب کر رہا ہے؟'' ''وہ..... وہی ظالم سانپ.....''

''سانپ! کیا کہہ رہے ہیں آپ..... کہیں آپ نشہ میں تو نہیں ہیں؟''

''میں نشہ میں نہیں ہوں انسپکٹر صاحب..... میں سچ کہہ رہا ہوں وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔'' اس کی نر نے بے تابی سے کہا۔ ''کون پیچھا کر رہا ہے؟'' انسپکٹر نے پھر پوچھا۔

''کنارڈ..... ڈاکٹر کنارڈ انسپکٹر صاحب..... وہ سانپ کے روپ میں میرا تعاقب کر رہا ہے خدا کے لئے مجھے بچا لیجئے۔'' اس کی نر نے بھیانک لہجے میں پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے جب مزید تحقیقات کی تو اس راز کا انکشاف ہوا کہ اس کی نر نے ڈاکٹر کنارڈ کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے جنگل کے اندر دفن کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فارمولے کی بدولت کیمیا گری میں ماہر ہو جائے گا اور اسی لئے اس نے اس بھیانک جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا تھا اس اعتراف کے ساتھ ہی انسپکٹر نے اس کی نر کی مدد کرنے کی بجائے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

اس کی نر پولیس کار میں دبکا ہوا سڑک کو دیکھ رہا تھا، جس کے کنارے سفید سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا اور مستی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ اس کی تیز اور چمکیلی آنکھیں اس آستین کے سانپ پر مرکوز تھیں جو اب پولیس کار میں بیٹھا ہوا آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

جہنمی دروازہ

راشد نذیر طاہر

قسط نمبر:1

قدم قدم پر حیرت و خوف کے لمحات میں لپٹی ہوئی پراسرار داستان اس دروازے کی کہانی جو کہ عرصہ دراز سے بند تھا کیونکہ اگر وہ کھل جاتا تو..... دروازہ کیوں نہیں کھلتا تھا جس کا راز کہانی میں پنہاں ہے

رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

کافی عجیب اور قدرے حیران کن بات تھی کہ انہیں وہ خواب مسلسل دکھائی دے رہا تھا۔

اسے مسلسل ہی کہا جائے گا کہ وہ ہفتے بھر میں کم از کم دوبارہ اپنے آباؤ اجداد سے منسوب اس حویلی کو دیکھ رہے تھے۔

''ہاں..... وہی حویلی..... جہاں نواب انور میاں نے آنکھ کھولی اور پھر وہیں ہوش سنبھالا تھا..... یہ اور بات ہے کہ پھر یہ ہوش مندی کی علامت انہیں اس چھوٹے سے قصبے سے نکال لائی تھی۔

اس قصبے میں نہ جانے کیوں انور میاں کا دل نہیں لگتا تھا، بڑے شہر کی چکا چوند زندگی انہیں اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوگئی.....!!

انور میاں کے خیالات اور طرز زندگی گزارنے کا سلیقہ دوسروں سے ذرا مختلف تھا، چنانچہ وہ شہر میں اپنی خالہ کے گھر میں سکونت پذیر ہوگئے۔

نواب انور میاں کے دو بھائی اور بھی تھے اور ماں باپ کے ساتھ ساتھ ان کی ایک بہن اور بھی تھی..... یہ سب لوگ اسی قصبے میں اپنے آباؤ اجداد کی حویلی میں اپنی زندگی کو پرانی طرز پر گزار رہے تھے.....!!

اس دور میں نواب انور میاں کے جسم و جاں میں جیسے برق سی دوڑتی تھی..... خون جب جوش مارتا تھا، تو وہ اپنے قصبے کا رخ ضرور کرتے تھے.....!! لیکن صرف چند روزہ..... وہاں ان کا دل ہی کہاں لگتا تھا.....!!

وقت کا پرندہ مسلسل اُڑان پر تھا..... چنانچہ سنِ بلوغت سے جوانی طے کرنے کا سفر جیسے آنکھ میچ کر طے ہوگیا.....!!''

ہاں.....!! اس دوران کچھ اتار چڑھاؤ بھی آئے..... کچھ اپنے تھے، جو بچھڑ گئے..... اور پھر ایسا بھی ہوا کہ نواب انور میاں کی اپنی زندگی میں بھی بدلاؤ آ گیا..... نادرہ کسی بہار کے جھونکے کی طرح ان کی زندگی میں داخل ہوگئی.....!! نواب انور نے شہر میں ہی پڑھائی مکمل کرنے کے بعد نوکری بھی تلاش کرلی تھی.....!!

اور پھر..... شادی بھی ہوگئی.....!! جس میں ان کی طرف سے صرف ان کے والدین ہی شریک ہوئے تھے..... بہن بھائیوں میں سے ایک بھائی کا تو انتقال ہوگیا تھا..... باقی دونوں انور صاحب سے اپنا تعلق ہی ختم ہو چکے تھے.....!!''

بہر حال، انور صاحب کو کسی کی ذات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ پھر قدرت کی طرف سے انہیں ایک

RAUF TARA

بیٹا عطا ہوا..... جس کا نام نادر رکھا گیا.....!!

نادر کے جوان ہونے تک نواب انور کے والدین اور پھر بقیہ بہن بھائی بھی دنیا سے رخصت ہو گئے.....!!

آخر کار حویلی میں صرف خدمت گزار ہی رہ گئے..... اور یہ بھی خود انور صاحب کی ایماں پر ہوا تھا..... وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے آباؤ اجداد کی اس آخری یادگار کو تالہ لگے.....!!!

یہ زمیندار خاندان تھا، جن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی.....!!

شہر میں انور صاحب نے صرف اپنی ضد پر نوکری کی تھی، ورنہ انہیں اس کی قطعی ضرورت نہیں تھی.....!!

ان کے والد نے انہیں شہر میں کافی اچھا اور بڑا گھر خرید کر دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ انور صاحب کو بے حد چاہتے تھے اور یہ ان کی چاہت ہی تھی کہ بیٹے کی خواہش کو انہوں نے ہر طرح سے پورا کیا.....!!

''نادر کی بھی شادی ہو گئی..... اور اس کے دو سال بعد جب نادرہ کا انتقال ہوا، تو گویا ان کی زندگی میں بھونچال سا آ گیا.....!!

سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا..... زندگی کا ہم سفر جدا ہو گیا تھا..... اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ماں باپ کے دنیا سے گزر جانے کے بعد انہیں یہ دکھ سب سے زیادہ اندوہناک لگا تھا.....!!

ان کی محبت..... اب اس دنیا میں نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

نادر ایک کمپنی میں اچھی پوسٹ پر جاب کر رہا تھا۔ اس کی شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا، لیکن ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی، شام کے وقت وہ گھر میں اپنی بیوی سیما کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ انور صاحب گھر میں موجود نہیں تھے۔

سیما نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے.....!!''

''ہاں..... بولو.....!!'' نادر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

سیما نے اس کی طرف دیکھا اور پھر قدرے ہچکچا کر بولی۔

''آج صبح امی آئی تھیں.....!!''

''اوہ..... اچھا..... پھر.....؟'' نادر نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

وہ غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں.....!! انہوں نے کچھ کہا ہے مجھ سے.....!!''

''ارے تو بتاؤ نا.....!!'' نادر جھنجھلا سا گیا: ''تم تو قسطوں میں بات کر رہی ہو.....!!''

''بتا رہی ہوں۔'' سیما قدرے مسکرائی: ''بس ڈر یہ ہے کہ کہیں آپ کو غصہ نہ آ جائے.....!!''

''اوہو.....!!'' وہ چونکا: ''ایسی بھی کیا بات ہے.....؟''

سیما پھر کچھ نہ بولی تو نادر نے کہا۔

''تم خاموش کیوں ہو.....؟''

''بات یہ ہے کہ.....'' سیما نے طویل سانس لی۔ ''امی نے ایک بابا جی کا پتا بتایا ہے..... وہ بے اولاد جوڑوں پر دم کرتے ہیں اور تعویذ وغیرہ دیتے ہیں..... سنا ہے کہ ایسے لوگوں کی گود بھر جاتی ہے.....!!''

''ابے یار.....!!'' نادر ہنس پڑا۔ ''اس میں غصہ کرنے والی کیا بات ہے.....''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کے پاس جانے کے لئے تیار ہیں؟'' سیما نے چونک کر کہا۔

''یہ میں نے کب کہا؟''

''میں سمجھی نہیں.....!!''

''ارے نادان لڑکی.....!! تمہاری امی نے جو مناسب سمجھا وہ کہہ ڈالا، اب اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا تو ہمارا کام ہے نا.....!! تم جانتی ہو کہ میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا، اور نہ ہی ان چیزوں پر میرا اعتقاد ہے.....!! اپنی امی سے یہ سب کچھ مت کہنا.....!!''

''اچھا..... تو پھر.....!!''

''بس ان سے کہہ دینا کہ کسی دن چلے جائیں گے۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

سیما خاموش رہی، پھر تھوڑے سے توقف کے بعد وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

''اچھا چھوڑیں، اس بات کو ختم کریں..... کوئی اور بات کرتے ہیں.....!!''

''ہاں..... بولو.....!!''

''مجھ سے آپ کے ابو کی تنہائی اور اکیلا پن نہیں دیکھا جاتا.....!!''

''ایں..... نادر چونکا: ''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

یہ سن کر سیما نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''بتادوں گی.....!! آپ پریشان نہ ہوں.....!!''

نادر اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

نواب انور کی آنکھ ہڑبڑا کر کھل گئی تھی۔

جلد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ آج پھر وہی حویلی انہیں خواب میں دکھائی دی تھی۔ لیکن آج..... انہیں خواب دیکھتے ہوئے بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جیتے جاگتے سے عالم میں حویلی کے اندر چہل قدمی کر رہے ہوں۔

اور پھر اچانک ہی کسی نے ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اف خدایا..... کس قدر بھاری ہاتھ تھا وہ.....!!

وہ چونک کر پلٹے تھے، دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کے کندھے پر اس قدر بھاری بھرکم ہاتھ کس کا رکھا ہوا تھا، اور پھر اچانک ہی ان کی آنکھ کھل گئی.....!!

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے..... حلق میں کانٹے سے پڑنے لگے تھے..... اس کے ساتھ ہی انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے کندھوں میں درد سا اٹھ رہا تھا..... بے اختیار ان کا دوسرا ہاتھ اسی کندھے کو سہلانے لگا تھا۔

''اوہ.....'' وہ بڑبڑائے: ''ایک خواب کا اتنا گہرا اثر..... خوب.....!!''

سر ہلا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے..... گھر کا ملازم شرفو بھی اس وقت خواب خرگوش کے مزے اڑا رہا تھا.....!!

انہوں نے اٹھ کر گلاس بھر کر پانی پیا اور پھر اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔

کھلے صحن میں چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

پائیں باغ میں لگے ہوئے درخت اور پودوں پر بھی خاموشی طاری تھی۔ شاید وہ بھی اس وقت نیند کی چھاؤں میں اونگھ رہے تھے۔

نواب انور نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور پھر زیر لب بڑبڑائے۔

ہاں..... !! مجھے جانا ہی ہوگا۔ حویلی مجھے بلا رہی ہے۔''

☆.....☆.....☆

اسی وقت سیما کی بھی آنکھ کھل گئی تھی۔ دروازے کے دوسری جانب اسے کسی قسم کی آہٹ سنائی دی تھی۔

نائٹ بلب کی روشنی میں اس نے نادر کی طرف گردن گھمائی۔ وہ گھوڑے اور تمام گدھے بیچ کر سو رہا تھا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والے ہلکے ہلکے خراٹے اب سیما کو اپنے کانوں میں چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''افوہ.....!!'' وہ بھنا گئی: ''خواہ مخواہ میری آنکھ کھلی..... اب ان خراٹوں کی نشریات سننا پڑے گی.....!!''

پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر کھڑکی کی جانب دیکھا اور کچھ سوچ کر بیڈ سے اتری اور کھڑکی کی جانب بڑھ گئی۔

اس نے پردہ ایک طرف کھسکایا اور پھر توقع کے عین مطابق اسے انور صاحب دکھائی دیئے۔ وہ صحن میں ٹہل لگا رہے تھے۔

سیما نے پردہ برابر کیا۔ اس کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

کچھ دیر بیڈ کے کونے پر بیٹھی رہی۔ پھر اس نے نادر کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

''کک..... کک..... کیا.....!!'' نادر ہونقوں کی طرح ہڑبڑا کر بولا: ''کیا ہے..... کون ہے.....؟''

''آپ کے ابو جان.....!!'' سیما نے لقمہ دیا:

''اور کون ہوگا.....!!''

''اپنے کمرے میں؟'' نادر بوکھلا کر بولا۔

''ارے نہیں.....!!'' وہ ہنسی: ''وہ تو بے چارے باہر ٹہل لگا رہے ہیں۔''

''کیوں.....؟ وہ کیوں ٹہل رہے ہیں.....؟''

''آپ کی نیند تو پکی ہوتی ہے، ورنہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے ابو جان اکثر رات کے اس پہر گھر میں چہل قدمی کرتے ہیں.....!!''

''اچھا.....!!''

''ہاں.....!!'' وہ طویل سانس لے کر بولی: ''اور مجھ سے ان کی تنہائی اور اکیلا پن نہیں دیکھا جاتا.....!! امی جان کے انتقال کو 2 سال کا عرصہ گزر چکا ہے.....!! بس ان کی یہ تنہائی ختم ہونی چاہیے۔''

''ت..... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' نادر نے اسے گھورا۔

''شادی.....!! ابو جان کو اب شادی کر لینی چاہیے.....!!''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے.....؟'' نادر کی آنکھیں پھٹ گئیں: ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اب اس عمر میں وہ یہ کام کریں گے؟''

''وہ ابھی بوڑھے تو نہیں ہوئے.....!!'' سیما منہ بنا کر بولی۔

''ہاں..... میں جانتا ہوں کہ صحت اور جسمانی لحاظ سے اب بھی وہ جوانوں کو مات کرتے ہیں۔ لیکن.....!!''

''لیکن ویکن کچھ نہیں.....!!'' سیما نے اس کی بات کاٹی: ''بس اب ابو جان کی شادی ہونی چاہیے..... وہ کسی بھی زاویے سے اتنی زیادہ عمر کے لوگوں میں شمار نہیں ہوتے..... یوں بھی آپ نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کم عمری میں ہی شادی کر ڈالی تھی۔''

''ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے.....!!''

''تو پھر کیا مسئلہ ہے.....؟''

''ارے بھئی..... وہ اب ہرگز شادی نہیں کریں گے.....!!''

''کیوں.....؟ ایسا کیا ہے.....؟''

''وہ امی سے بہت پیار کرتے تھے.....!!''

''میں مانتی ہوں.....!!'' وہ سر ہلا کر بولی: ''لیکن اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہے کہ اب بقیہ زندگی صرف ان کی یادوں میں ہی گزار دی جائے..... اس طرح تو ان کی روح بھی افسردہ رہے گی.....!! البتہ وہ شادی کر لیں گے تو یہ ضرور خوشی کی بات ہوگی.....!!''

''اچھا.....!! تو اب یہ بتاؤ کہ ان کی کہاں شادی کرنی ہے؟'' گویا تنگ آ کر نادر نے پوچھا تھا۔

یہ سن کر سیما کی آنکھوں میں انجانی سی چمک ابھر آئی، پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ایک رشتہ تو ہے میرے پاس.....!!''

''ایں.....!!'' وہ چونکا: ''کون سا رشتہ.....؟''

''قصبے سے وحیدہ نامی ایک عورت آئی تھی.....!! سیما آہستہ سے بولی۔

''اور یہ بات پچھلے ہفتے کی ہے.....!!''

''اچھا..... تو پھر.....؟ کیا تم اس سے ابو جان کی شادی کرواؤ گی؟'' نادر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے نہیں بھئی.....!!'' وہ جلدی سے نفی میں سر ہلا کر بولی: ''وحیدہ تو کافی عمر رسیدہ خاتون تھیں..... البتہ انہوں نے اپنی بیٹی زرینہ کا ذکر کیا تھا..... وہ جوان ہے اور بیوہ بھی ہے..... وحیدہ آنٹی کے خیال کے مطابق زرینہ کافی خوب صورت بھی ہے..... میرا خیال ہے کہ ابو جان سے اس کی شادی کروا دی جائے.....!! انہیں کافی اچھا اور زندگی کا ساتھی مل جائے گا.....!!

''تم پاگل ہوگئی ہو کیا؟''

''نہیں..... میں بالکل ہوش میں ہوں.....!!''

وہ تنک کر بولی تھی: ''میں صرف اور صرف ابو جان کا اچھا چاہتی ہوں..... کیا جانوں، وہ راتوں کو کس طرح گھر میں بھٹک رہے ہوتے ہیں..... میں انہیں اکثر دیکھتی ہوں.....!!''

''نادر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور سیما کی طرف دیکھ کر بولا:

''چلو..... میں تمہاری بات مان لیتا ہوں، اور تمہارے خیالات سے اتفاق کرتا ہوں..... لیکن اب یہ بتاؤ کہ ان سے شادی کی بات کرے گا کون؟''

یہ سن کر سیما کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی، وہ بولی۔

''ہاں..... یہ مسئلہ کافی کٹھن ہے.....!! اس کا حل سوچنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے.....!!'' نادر بستر پر لڑھک گیا:

''میں اب سو رہا ہوں، تم حل نکال لو، تو مجھے اٹھا دینا..... شب بخیر.....!!''

''ارے..... ارے..... بات تو سنیں.....!!''

سیما اس کی طرف لپکی، لیکن فوراً ہی نادر کے خراٹے گونجنے لگے..... جو یقیناً مصنوعی تھے۔

سیما نے نادر کی طرف دیکھا اور پھر زیر لب بڑبڑا کر بولی:

''میں ضرور کوئی حل نکال لوں گی..... ہاں.....!!''

☆.....☆.....☆

نواب انور میاں نے ایک طویل سانس لی اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھے..... ان کے سامنے رکھی ہوئی میز پر پرانے اور یادگار تصویروں کے البم رکھے ہوئے تھے.....!!

وہ کافی دیر سے ان ہی تصویروں سے دل بہلا رہے تھے..... ان پرانی یادگاروں میں ان کے وہ تمام عزیز اور قریبی رشتے دار موجود تھے..... جو کہ اب اس دنیا میں نہیں تھے.....!!

نواب انور نے ایک بار پھر وہ البم اٹھالیا تھا.....!! عین اسی وقت نادر اور سیما ان کے کمرے میں داخل ہوئی:

''کیا ہو رہا ہے ابو جان.....؟'' سیما نے لپک کر پوچھا تھا.....!!

نادر کے مقابلے میں وہ انور صاحب سے کافی بے تکلفی سے باتیں کر لیتی تھی اور توقع کے برخلاف وہ اس کی کسی بات کا برا بھی نہیں مانتے تھے۔

اس کی بات سن کر انور صاحب مسکرا دیئے اور بولے:

''گزرے ہوئے وقت کی دھول کو سمیٹ رہا ہوں۔''

سیما ان کے مقابل ہی صوفے پر دراز ہوگئی اور بولی: ''بات تو ٹھیک ہے کہ انسان اکثر اپنی یادوں میں ہی سکون اور طمانیت محسوس کرتا ہے، ہر گزرجانے والا لمحہ اچھا ہوتا ہے..... لیکن ابو جان..... ایک بات اور بھی ہے.....!!''

''وہ کیا.....؟''

''حال کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔'' وہ بولی: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی تو اپنی جگہ اٹل ہے، لیکن آج کا حال بھی کل ہمارے لئے کافی ماضی بن جائے گا۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو.....؟'' انہوں نے بہ غور اس کی طرف دیکھا۔

سیما بوکھلا سی گئی، پھر قدرے سنبھلتے ہوئے بولی۔

''آپ اپنے بارے میں بھی سوچیں.....!! ہم لوگ آپ کے لئے بہت فکر مند رہتے ہیں.....!!''

''بھئی میں تم ہی لوگوں کے درمیان تو ہوں.....'' انہوں نے جواب دیا: ''اب اور کیا سوچنا ہے؟''

سیما نے مدد طلب نگاہوں سے نادر کی طرف دیکھا۔ جواباً نادر نے منہ پھیر کر ایک طویل سانس لی تھی۔

مطلب یہ تھا کہ اب اگر سیما نے بات چھیڑی

ہے، تو وہ خود ہی کوئی بات نکالے.....!!

''آپ اپنی کوئی مصروفیت ڈھونڈ لیں۔'' سیما کچھ سوچ کر بولی: ''جس سے آپ کا وقت اچھا گزرے.....!! اب یہ مصروفیت کسی بھی قسم کی ہو، تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا.....!!''

''میں اس بارے میں غور تو کر رہا ہوں.....!!'' وہ سر ہلا کر بولے۔

''اچھا..... کیا.....؟'' سیما نے جلدی سے پوچھا۔

جواباً نواب انور نے ایک طویل سانس لی اور پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولے:

''میں اب قصبے میں رہنا چاہتا ہوں..... اسی حویلی میں جو میرے آباؤ اجداد کی نشانی ہے..... میں اب اپنی بقیہ زندگی وہاں گزارنا چاہتا ہوں..... ہاں!!''

سیما نے کن انکھیوں سے نادر کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی اس نے نادر کو اشارہ بھی کیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اسے نواب انور کی یہ بات اچھی لگی ہے۔

پھر اس نے کنکھارتے ہوئے گلہ صاف کیا اور بولی:

''یہ تو کافی بہتر ہے..... کیا ہم لوگوں کو بھی آپ کے ساتھ چلنا ہوگا؟''

''نواب انور مسکرائے اور نفی میں سر ہلا کر بولے:

''نہیں..... کیونکہ نادر کے بارے میں تو شاید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اپنے نسلی خون کی بدولت وہاں قیام کر سکتا ہے..... لیکن تم وہاں کے ماحول میں نہیں رہ سکو گی.....!!''

''تو پھر.....؟'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی: ''کیا آپ وہاں اکیلے رہیں گے.....؟''

''ظاہر ہے.....!!'' وہ طویل سانس لے کر بولے: ''البتہ میرے گرد اس حویلی کے ملازم ہوں گے۔''

''وہ بات تو نہیں ہوگی ابو جان.....!!'' سیما نے غور سے ان کی طرف دیکھا: ''اپنے تو پھر اپنے ہی ہوتے ہیں.....!!''

''تو پھر..... مجھے کیا کرنا چاہیے.....؟'' انہوں نے سیما کو گھورا۔

وہ گڑبڑا سی گئی اور پھر جلدی سے بولی:

''خیر..... آپ وہاں جائیں..... پھر ہم دونوں کچھ کرتے ہیں.....!!''

''کیا کرو گے.....؟''

''سیما کا یہ مطلب ہے ابو.....!!'' نادر بول اٹھا: کہ ممکن ہے ہم بھی اسی قصبے میں آ جائیں.....!!''

ساتھ ہی اس نے سیما کو گھور کر دیکھا تھا۔ نواب انور نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا، وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

پھر کافی دیر بعد ان کی آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا تھا:

''میں شاید اگلے ہفتے روانہ ہو جاؤں گا..... ہاں.....!!''

☆.....☆.....☆

یہ بھی محض اتفاق تھا کہ اس وقت بھی سیما گھر میں اکیلی تھی، جب شرفو نے آ کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا: ''بی بی جی.....!! وہی بڑی بی آئی ہیں.....!!''

''کون.....؟'' سیما نے چونک کر پوچھا۔

''جو اس دن آئی تھیں.....!!'' شرفو سر ہلا کر بولا: ''میری معلومات کے مطابق وہ قصبہ جلال پور سے آئی تھیں.....!!''

''اوہ.....!! وحیدہ آنٹی.....؟''

''جی ہاں.....!!''

''ارے تو انہیں اندر بلاؤ.....'' وہ چونک کر بولی: ''انہیں باہر کیوں کھڑا کر رکھا ہے.....!!''

''جی ہاں.....!!'' شرفو نے کہا اور الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔

جلد ہی وحیدہ بی بی کی شکل دکھائی دی، وہ حسب روایت سادہ سے کپڑوں میں ملبوس تھیں۔

سیما انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی، شرفو کو اس نے چائے بنانے کے لئے کچن میں بھیج دیا تھا۔

وحیدہ بی بی نے مسکراتے ہوئے اس کی خیریت

پوچھی اور پھر بولیں: ''میں آج بھی شہر میں ایک کام سے آئی تھی، سوچا کہ آپ سے بھی ملتی چلوں۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا.....!!'' سیما بولی: ''میں بھی آپ کو یاد ہی کر رہی تھیں۔''

''اچھا.....کیا واقعی.....؟'' وحیدہ بی بی کے منہ سے نکلا۔

سیما کا یہ جملہ اس کے لئے شاید طمانیت کا باعث ثابت ہوا تھا:

''ہاں.....بالکل.....!!'' وہ بولی: ''مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی تھیں.....!!''

اتنی دیر میں شرفو آ گیا اور سیما خاموش ہوگئی.....

''ارے بیٹی.....!! یہ تکلیف کیوں کی.....؟''

''میں تو آج آپ کو جانے بھی نہیں دوں گی۔'' وہ بولی۔ ''کم از کم ایک دن تو مجھے مہمان نوازی کا موقع دیں.....!!''

''نہیں میری بچی.....!!'' وحیدہ بی بی اپنائیت سے بولیں: ''میں رک نہیں سکتی، میری بیٹی میرا انتظار کرے گی اور پریشان ہوگی.....میں پھر کسی دن اسے بتا کر آجاؤں گی.....!!''

''ٹھیک ہے.....!!'' سیما بولی: ''میں دراصل آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا نواب صاحب آپ سے واقف ہیں؟''

''نہیں.....'' وہ بولیں: ''انہوں نے مجھے سرسری ہی دیکھا ہوگا.....!!''

''اوہ.....اچھا.....!!''

''کیوں.....کیا بات ہے؟''

''میں آپ کی پیشکش پر غور کر رہی ہوں.....!!'' سیما نے کہا: ''اور میں اسی وجہ سے آپ کو یاد کر رہی تھی۔''

بوڑھی وحیدہ بی بی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرائی تھی، پھر وہ پہلو بدل کر بولیں:

''واقعی بیٹی.....تم نواب صاحب کے لئے دل سے مخلص ہو.....ورنہ آج کل کی بہوئیں اپنے ساس اور سسر کے لئے کہاں اتنا سوچتی ہیں.....میں نواب انور کو ان کی عمر کے اس حصے سے جانتی ہوں، جب وہ قصبے کی گلیوں میں کھیلتے پھرتے تھے.....!!''

''اوہ.....!! اچھا.....!!''

''ہاں.....پھر انہوں نے قصبے کو خیر باد کہہ دیا۔'' وحیدہ نے طویل سانس لی: ''لیکن وہ جب بھی وہاں آتے تھے.....میں ان سے ملاقات ضرور کرتی تھی.....!!''

سیما نے چائے کا کپ ان کی طرف بڑھا دیا، لیکن وحیدہ بی بی فوراً ہی بول اٹھیں:

''نہیں بیٹی.....میں نہ کچھ کھاؤں گی اور نہ ہی چائے پیوں گی۔''

''کیوں.....؟'' سیما چونکی۔

وحیدہ بی بی کے ہونٹوں پر ایک شرمندگی آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ آہستہ سے بولیں:

''میں اپنے بھائی کے گھر اس شہر میں آتی ہوں.....وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے.....فوراً ہی میری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا.....تم محسوس مت کرنا.....گھر سے نکلتے نکلتے اس نے مجھے شربت پلا دیا تھا.....اور اب اس عمر میں زیادہ کھانا پینا بھی ٹھیک نہیں.....!!''

''اوہ.....!!'' سیما کے منہ سے نکلا: ''تھوڑی سی تو پی لیتیں.....!!''

''نہیں بیٹی.....پھر کبھی سہی.....!!''

''اچھا.....!!'' سیما نے سر ہلایا، پھر وہ بولی: ''کیا آپ کی بیٹی زرینہ بھی آئی ہے؟''

''نہیں.....!!'' وہ بولیں۔ ''وہ نہ کہیں آتی ہے اور نہ جاتی ہے.....!! وہ تو قصبے سے تکلف ہی گوارا نہیں کرتی.....!! جب سے وہ بیوہ ہوئی ہے تو بے چاری گھر کی چہار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی ہے.....!!''

''اوہ.....!!'' سیما کے منہ سے نکلا: ''اس کی کوئی تصویر ہے آپ کے پاس؟''

یہ سن کر وحیدہ بی بی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے اپنے کپڑوں میں

ہاتھ ڈال دیا.....!!!

اور پھر ایک تصویر اس نے سیما کی طرف بڑھادی، سیما نے جھٹ سے اس چھوٹی سی تصویر کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

ایک مسکراتی ہوئی لڑکی اس کے سامنے تھی، جس کا ناک نقشہ کافی اچھا تھا.....!! سیما کو پہلی نظر میں ہی زرینہ بھا گئی.....!!

وحیدہ بی بی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی:

''یہ چند سال قبل کی تصویر ہے.....!! زرینہ کے شوہر کا انتقال صرف چار سال پہلے ہوا ہے.....!!''

واقعی..... زرینہ اب بھی جوان ہی ہوگی.....!! سیما نے سوچا۔

پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور بولی:

''ابو جان کے بارے میں آپ کو ایک خبر دینا چاہتی ہوں.....!!''

''کیا.....؟''

''وہ قصبے میں جانے کا ارادہ کررہے ہیں.....!!'' سیما بولی: ''ان کا کہنا ہے کہ اب وہ اپنی بقیہ زندگی وہیں گزاریں گے.....!!''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' وہ خوش ہوگئیں۔

''ہاں.....!!'' سیما نے گردن ہلائی: ''جب وہ حویلی میں آجائیں تو آپ کسی صورت سے زرینہ کو ان کے سامنے لے آئیں.....!! ہوسکتا ہے کہ نواب صاحب کے دل میں زرینہ کی کوئی جگہ بن جائے.....!!''

''ٹھیک ہے.....'' وہ بولیں: ''میں حویلی میں زرینہ کو بھیج دوں گی.....!! وہ حویلی کے دیگر خدمت گزاروں میں شامل ہوجائے گی.....!! کیا کہتی ہو.....!!''

جواباً سیما نے پسندیدگی کے عالم میں سر ہلا دیا اور بولی: ''یہ بہترین ترکیب رہے گی.....!!''

''دراصل میں خود بھی کسی زمانے میں اس حویلی کے خدمت گزاروں میں شامل رہ چکی ہوں.....!!'' وہ بولی۔

پھر وحیدہ بی بی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی:

''میں اب جارہی ہوں..... میں قصبے میں اب نواب انور کا انتظار کروں گی..... اپنی بیٹی کے مستقبل کے لئے..... ہاں.....!!''

☆.....☆.....☆

نادر کافی غور سے زرینہ کی تصویر کو دیکھ رہا تھا، پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور سیما کی طرف متوجہ ہوگیا:

''یہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو.....!! اگر ابو جان کو معلوم ہوگیا تو کہیں ان کا نزلہ تم پر نہ گر جائے.....!!''

''ایسا نہیں ہوگا.....!!'' وہ مسکرائی: ''یوں بھی میں کوئی غلط کام تو نہیں کررہی..... جب اس نیک کام کے لئے لڑکی کی اماں راضی ہے، تو یقیناً لڑکی خود بھی راضی ہوگی.....!! اس میں برائی کیا ہے.....''

''کیا ابو جان یہ سب کچھ ذہنی طور پر قبول کرلیں گے.....؟'' نادر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے بڑی بی سے ساری بات کرلی ہے۔'' سیما بولی۔ ''جب ابو جان قصبے میں اپنی حویلی چلے جائیں گے۔ تو کسی بہانے سے ذریعہ کو بھی وہاں بھیج دیا جائے گا.....!! ہوسکتا ہے کہ اس طرح ان دونوں کے درمیان خود ہی کوئی سلسلہ بن جائے.....''

''خوب.....!! اور اگر ایسا نہ ہوا؟''

''تو کوئی بات نہیں۔'' وہ لاپروائی سے بولی: ''اگر وہاں کچھ نہ ہوا تو پھر میں خود میدان عمل میں اتروں گی.....!!''

''مطلب.....؟''

جواباً سیما مسکرائی اور ڈرامائی انداز میں بولی:

''اس صورت میں مجھے زرینہ کی سرپرست بن کر ابو جان کے سامنے آنا ہوگا..... یہ شادی تو ہو کر رہے گی..... ہاں..... کسی بھی صورت سے.....!!''

☆.....☆.....☆

نواب انور کے ساتھ ساتھ شرفو نے بھی قصبے کا

رخ کرنے کا اعلان کر دیا۔

سیما کو پتا چلا تو اس نے شرفو کو آڑے ہاتھ لیا تھا اور بولی:

''تم کہاں فرار ہونے کے چکر میں ہو؟ میں تمہیں تو ہرگز نہیں جانے دوں گی۔''

''ارے وہ کیوں؟'' شرفو نے منہ بنایا۔ ''جب نواب صاحب ہی نہیں ہوں گے تو میں کیا یہاں مکھیاں ماروں گا؟''

''ہاں..... وہی مار لینا.....!! سیما بولی: ''لیکن میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتی کہ تم جاؤ.....!! ہاں.....!!''

''میں چھوٹے صاحب سے سفارش لگوادوں گا۔'' شرفو ہنسا۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ اس گھر میں کسی گھر ہی کے فرد کی طرح رہتا تھا..... ایمان دار اور محنتی تھا۔ اسے یہاں ملازمت کرتے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔

اس کے ہوتے ہوئے سیما کو صرف کچن دیکھنا ہوتا تھا، اتنے بڑے گھر کا بقیہ سارا کام شرفو خود ہی کرتا تھا۔

''میں تو خود ابو جان کی سفارش بھی رد کر دوں گی۔'' سیما اکڑتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم نے یہاں سے باہر قدم نکالا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا.....!!''

شرفو کا منہ لٹک گیا، پھر اچانک ہی کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سیما اسے غور سے دیکھ رہی تھی:

''اب کیا ہوا.....؟''

''میں آپ کے سامنے ایک درمیانہ راستہ رکھنا چاہتا ہوں.....!!''

''کیا مطلب.....؟''

اسی وقت نادر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ شرفو فوراً ہی اس کی طرف لپکا:

''دیکھو چھوٹے صاحب.....!! بی بی جی مجھے جانے نہیں دے رہیں.....!!''

''کہاں.....؟'' نادر نے حیرت سے پوچھا۔

''جلال پور.....!!''

''ارے..... کیوں.....؟'' نادر نے حیرت سے شرفو کو دیکھا۔

''بس صاحب..... میرا دل چاہ رہا ہے۔'' وہ بھولپن سے بولا: ''بڑے صاحب چلے جائیں گے تو پھر میرا دل بھی یہاں نہیں لگے گا.....!!''

یہ بات ٹھیک بھی تھی، کیونکہ شرفو نواب انور سے ہی زیادہ مانوس تھا..... اور اکثر ان ہی کی محبت میں فارغ اوقات گزارا کرتا تھا۔

نادر نے ایک نظر سیما کی طرف دیکھا اور پھر ایک طویل سانس لے کر بولا: ''اس معاملے میں تو میں بھی سیما کا ہم خیال ہوں۔''

''لو..... مر گئے.....!!'' شرفو نے سر پر دو ہتھڑ مارا۔

''لیکن میں ایک تجویز ضرور پیش کر سکتا ہوں۔'' نادر مسکرایا۔

''وہ کیا.....؟'' سیما نے اسے گھورا۔

''وہ یہ کہ شرفو ابو جان کے ساتھ ہی جائے گا.....!!''

''چھوٹے صاحب..... زندہ باد.....!!'' شرفو نے نعرہ لگا دیا۔

''ایک منٹ.....!! نادر نے ہاتھ اٹھایا: ''میری بات تو پوری ہونے دو..... تم ان کے ساتھ ضرور جاؤ گے..... لیکن ایک ہفتے کے اندر تمہاری واپسی ہوگی.....!! یوں سمجھ لو کہ میں تمہیں ایک ہفتے کے لئے گھومنے پھرنے کی چھٹی دے رہا ہوں۔''

''اوہ.....!!'' شرفو کے منہ سے نکلا۔

''ہاں.....!!'' نادر بولا: ''میرے اس فیصلے سے تمہاری بات بھی رہ گئی اور تمہاری بیگم صاحبہ کی بھی..... بس اب اس فیصلے میں کوئی ردو بدل نہیں ہوگا..... تم بھی جانے کی تیاری کر لو.....!!''

☆.....☆.....☆

قصبہ جلال پور کی تیاری مکمل ہو چکی تھی..... نواب انور سے بھی زیادہ شرفو اس سفر کے لئے پرجوش دکھائی

دے رہا تھا.....!!''

نادر نے ٹرین کی ٹکٹیں بھی بک کروادی تھیں اور نواب انور کی خواہش کے مطابق اس نے لوکل کمپارٹمنٹ کی بکنگ کروائی تھی۔

اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نواب صاحب ذرا ہنگامہ پرور اور پررونق ماحول میں سفر طے کرنا چاہتے تھے..... بہرحال نادر نے اس سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

نادر کے ساتھ ساتھ سیما نے بھی انہیں ریلوے اسٹیشن تک آ کر الوداع کہا تھا۔

اور پھر نواب صاحب اور شرفو کو ٹرین میں بٹھانے اور گاڑی کے روانہ ہونے تک یہ دونوں ان کے ساتھ ساتھ تھے۔

ٹرین نے وسل دی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے آخرکار ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سیما اور نادر کافی دیر تک گویا گم صم سے انداز میں نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی گاڑی کو دیکھتے رہے۔

پھر نادر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر مڑی: ''ارے بھئی..... کہاں کھو گئیں.....!!''

''کہیں نہیں.....'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ ''اب یوں لگ رہا ہے جیسے ہمارے گھر کی رونق چلی گئی۔''

''یہ تو ہے.....!!'' نادر فوراً ہی بولا: ''اور تم نے تو خاص طور پر انہیں وہاں بھیجا ہے.....!!''

''لیکن اس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ یہ میری دلی آرزو تھی۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ ''بلکہ میں تو ان کی نئی زندگی کے آغاز کی خواہاں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ حویلی میں وحیدہ بی بی کی بیٹی زرینہ ضرور ان کی توجہ حاصل کرلے گی.....!! اور پھر ابو جان کو امنگوں اور نئی خوشیوں کا موقع مل جائے گا.....!! میں ان کی بھلائی اور اچھائی چاہتی ہوں.....!!''

''لیکن گھر تو اداس ہو جائے گا.....!!'' نادر نے طویل سانس لی۔

''ہاں..... لیکن کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''اچھا..... تم ایسا کرنا کہ کچھ دنوں کے لئے اپنی امی یا بہن کو گھر پر بلا لینا.....!!''

''ابو کی طبیعت کی وجہ سے امی کا آنا تو مشکل ہے۔'' سیما نے جواب دیا: ''میں سارہ سے بولتی ہوں..... اگر وہ آنے کو آمادہ ہوگئی تو آپ اسے لے آیئے گا۔''

''ٹھیک ہے..... چلو اب..... واپس چلتے ہیں۔''

☆.....☆.....☆

ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے اپنے سفر کی طرف گامزن تھی.....!!

ہر ایک مسافر کو اپنی من چاہی منزل کی تمنا تھی..... اور وہ شدت سے اس فاصلے کے طے ہو جانے کا متمنی تھا۔

خود نواب انور کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا..... نہ جانے کیوں اب انہیں اپنے اس آبائی قصبے کی یاد ستا رہی تھی..... بہت شدت سے وہ گلیاں انہیں پکار رہی تھیں، جہاں انہوں نے اپنے بچپن اور کھلنڈرے پن کا آغاز کیا تھا.....!!

انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ انہوں نے چھوٹی عمر سے ہی شہر کی چکاچوند کردینے والی ہنگامہ پرور زندگی کے خواب دیکھ لئے تھے۔ قصبے کی سادہ زندگی اور چھوٹی چھوٹی گلیاں انہیں اپنے وجود پر کافی تنگ ہوتی محسوس ہوئی تھیں.....!!

چنانچہ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خواہش کسی کونپل سے تن آور درخت میں تبدیل ہوگئی.....!!

ان کی خالہ نے انہیں بہت پیار اور توجہ سے تربیت کے مرحلے سے گزارا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ ذہنی طور پر اپنے قریبی اور خونی رشتوں سے دور ہوتے چلے گئے.....!!

چند مخصوص رسومات اور حادثات میں ان کی

خوفناک کہانیاں

جو کہ پڑھنے والوں پر کپکپی طاری کر دیں گی

جسم و جاں کو خوف کے شکنجے میں جکڑ لیں گی

اپنی نوعیت کی دل دہلاتی خوف کے گرداب میں غوطہ زن،

خونچکاں بھونچکاں اپنی مثال آپ کہانیاں

ڈرڈائجسٹ کے مشہور و معروف رائٹروں کی دہشت ناک اور تحیر انگیز کہانیاں

جسے پڑھنے والے اچنبھے میں پڑ جائیں گے اور تھرا جائیں گے۔

ضخیم صفحات

دیدہ زیب آفسٹ پرنٹنگ

اور چار کلر سے مزین ٹائٹل

اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں۔

قیمت صرف -/300 روپے

ڈرپبلی کیشنز

رابطہ نمبر:

0333-2384517

021-32744391

نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی

شرکت لازمی رہی، لیکن وہ بھی صرف واجبی سے وقت کے لئے.....

اب انہیں احساس ہورہا تھا کہ اپنے والدین اور دیگر گھر کے افراد کو انہوں نے واقعی زیادہ وقت نہیں دیا تھا..... گویا وہ شہر کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئے تھے.....!!

انہوں نے ایک طویل سانس لی اور شرفو کی طرف بے خیالی کے سے عالم میں دیکھنے لگے۔ جو سیٹ سے ٹیک لگائے اوراونگھ رہا تھا۔

اب نواب انور نے کمپارٹمنٹ میں سرسری سی نگاہ ڈالی۔ کافی رونق کی آماجگاہ تھی.....!!

عین اسی وقت نواب انور نے محسوس کیا جیسے کوئی انہیں دیکھ رہا ہے.....

یہ ایک عجیب سا احساس تھا۔ وگرنہ اتنے لوگوں میں یہ بات تو عام سی تھی کہ ایک دوسرے پر نگاہیں اٹھتی رہتی ہیں۔

بہر حال اپنے اس احساس کے پیش نظر انہوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

اور پھر ان کے اس خیال کو گویا یقین کی منزل مل گئی..... ہاں..... وہ سیاہ برقعے میں ملبوس کوئی عورت تھی..... اس کے چہرے پر بھی نقاب لگا ہوا تھا۔

نواب انور کی نظریں جیسے ہی اس کے چہرے کی طرف اٹھیں۔ نقاب کے اوپری حصے سے جھانکنے والی آنکھوں نے چند لمحوں کے لیے انہیں جیسے ساکت کر دیا۔

''اف..... اس میں واقعی کوئی شک نہیں تھا کہ ایسی آنکھیں شاید انہوں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں.....!!

گھنی پلکیں، سبز رنگ کی حسین پتلیاں اوران سحر انگیز آنکھوں کی زمین میں تیرنے والے گلابی ڈورے گویا مثل قیامت تھے.....

بلاشبہ یہ آنکھیں کسی بھی شاعر مزاج شخص کو کسی خوب صورت غزل کا قطعہ یاد دلا سکتی تھیں۔

چند لمحے مبہوت ہونے کے بعد ہی نواب انور کو جیسے ہوش آ گیا، اور انہوں نے اس نقاب پوش عورت سے نگاہیں چرالیں.....!!

اس کے باوجود انہیں محسوس ہورہا تھا کہ وہ حسین آنکھیں اب بھی ان کا جائزہ لے رہی تھیں.....!!

بڑی عجیب سی بات تھی.....!!

☆.....☆.....☆

رات کافی ہو چکی تھی.....!! کمپارٹمنٹ میں کافی لوگ نیند کی آغوش میں گم ہو چکے تھے.....!!

شرفو بھی ایک جانب لڑھکا ہوا تھا..... وہ بے سدھ ہو کر سو رہا تھا.....!!

لیکن نواب انور کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی.....!! وہ نہ جانے کیوں کمپارٹمنٹ میں چاروں طرف متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

دراصل انہوں نے سفر کے دوران تمام وقت محسوس کیا تھا کہ وہ نقاب پوش عورت بار بار ان کی طرف دیکھے جارہی تھی.....!!

کئی بار انہیں ایسا بھی لگا کہ جیسے وہ ان سے مخاطب ہونے کے لئے کوئی مناسب موقع یا پھر شاید اپنے اندر ہمت بندھا رہی ہے.....!! لیکن پھر شاید وہ اپنے اس ارادے کو پورا نہ کر سکی.....!!

نواب انور نے اسے تنہا ہی ایک سیٹ پر بیٹھا ہوا دیکھا تھا، یقیناً وہ تنہا ہی سفر کر رہی تھی۔

لیکن پھر نواب صاحب کا دھیان کسی اور طرف چلا گیا تھا اور پھر وہ نقاب پوش انہیں کمپارٹمنٹ میں کہیں بھی دکھائی نہ دی۔

اور اب تک وہ لاپتہ ہی تھی.....!! اس ڈبے میں لوگوں کی کافی تعداد موجود تھی..... اب اگر اس عورت کا نقاب اتر گیا تھا تو جب بھی اس کی آنکھوں سے اسے شناخت کر لینا زیادہ مشکل کام نہیں تھا.....!!

آہستہ آہستہ ٹرین کی رفتار میں کمی ہونے لگی..... نواب انور نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔

کوئی اسٹیشن آنے والا تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ ٹرین کی رفتار سست روی کا شکار ہونے لگی تھی.....!!

آخر کار ٹرین..... رک گئی۔ بہت سے لوگ نیند سے بیدار ہو گئے۔ ان میں شرفو بھی شامل تھا۔

اس نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ نواب انور پر نظر پڑتے ہی وہ بوکھلا کر بولا:

''ارے..... آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں.....!!''

''ہاں.....!!'' انہوں نے سر ہلایا: ''میرے حصے کی نیند بھی تم نے ہی لے لی۔''

''اوہ.....!!'' وہ کھسیا گیا۔ پھر جلدی سے بولا۔ ''کوئی اسٹیشن آ گیا؟''

''شاید.....!!'' نواب انور نے سر ہلایا۔

''یقیناً برخوردار.....!!'' قریب میں موجود ایک عمر رسیدہ بزرگ کی آواز ابھری: ''یہ شاملی گڑھ کا مشہور اسٹیشن ہے۔ یہاں گاڑی کم از کم ایک گھنٹے تک رکتی ہے۔''

''ارے.....!!! ایک گھنٹہ؟'' شرفو حیرت سے بولا۔

''بالکل..... وقت زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔'' بزرگ نے سر ہلایا۔ ''کیا تم دونوں نے پہلی بار سفر کیا ہے؟''

''میں نے کبھی نہیں کہا.....!!'' شرفو بول اٹھا: ''بڑے صاحب تو کبھی کبھار جلال پور چلے جاتے ہیں.....!!''

''خیر.....!!'' بزرگ بولے: ''اگر بھوک لگی ہو تو یہ وقت کافی اچھا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد گاڑی سیدھی جلال پور میں ہی رکے گی۔''

''اطلاع دینے کا شکریہ.....!!'' نواب انور نے سر ہلایا: ''شرفو.....!! تم کچھ کھاؤ گے؟''

وہ اس کی طرف مڑے:

''نہیں صاحب.....!!'' وہ بولا: ''میرے تو پیٹ میں گڑبڑ سی ہو رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے.....'' نواب انور اٹھ کھڑے ہوئے: ''میں آتا ہوں۔''

اور پھر وہ ٹرین سے باہر نکل آئے۔ کئی دوسرے مسافر بھی اترے تھے۔ شاملی گڑھ کا یہ اسٹیشن رات کے اس سمے بھی پر رونق تھا.....!!

کئی جگہوں پر کھانے پینے کے اسٹال لگے ہوئے تھے..... نواب انور نے چند قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ ایک آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی: ''بات سنیں.....!!''

''یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں مخاطب کیا گیا ہو۔

وہ بے ساختہ گھوم گئے اور پھر حیرت زدہ رہ گئے..... وہی نقاب پوش عورت ان کے سامنے موجود تھی۔

کتنے لمحے تو اسی گم صم سی کیفیت میں گزر گئے۔ وہ ساکت سے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے۔

پھر اس کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

''آپ..... اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''ت..... تم کون ہو؟''

''میرا نام زرینہ ہے.....!!'' اس کی آواز بھی بے حد دلکش تھی: ''اور میں آپ سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

''زرینہ.....؟'' نواب انور کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی.....!!'' وہ سر ہلا کر بولی: ''میں اپنی والدہ کے ساتھ جلال پور جا رہی ہوں.....!!''

''اوہ..... میں سمجھا کہ تم اکیلی ہو۔'' ان کے منہ سے نکلا: ''اچھا..... اب یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟''

''آپ کو کون نہیں جانتا۔'' وہ بولی۔ ''نواب خاندان سے تو قصبے کا بچہ بچہ واقف ہے.....!!! ویسے مجھے تو میری والدہ نے آپ کے بارے میں بتایا ہے.....!!!''

''اوہ..... اچھا.....!!''

''جی ہاں.....!!''

''بولو..... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

یہ سن کر زرینہ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

''مجھے حویلی میں ملازمت کرنی ہے.....!!

کیونکہ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی، جہاں میری والدہ رہتی ہیں۔''

''کیوں.....؟''

''دراصل انہوں نے دوسری شادی کرلی ہے.....اور میرا سوتیلا باپ کچھ اچھا آدمی نہیں ہے.....!! آپ سمجھ سکتے ہیں۔''

''اوہ اچھا.....!!''

''جی ہاں.....!!'' وہ سر ہلا کر بولی: ''میں حویلی میں رہوں گی اور حویلی کے کام محنت اور لگن سے کروں گی..... برائے مہربانی آپ مجھے وہاں ملازمت دلوادیں.....!!''

''ہوں.....ٹھیک ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولے: ''تم وہاں رہ سکتی ہو۔ میں حویلی پہنچ کر تمہیں بلوالوں گا۔''

''بلوانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولی: ''میں خود ہی آجاؤں گی.....بس آپ مجھے بھولئے گا مت..... میں جلدی ہی وہاں آؤں گی۔ اپنا وعدہ یاد رکھئے گا.....!!''

یہ کہہ کر وہ مڑی اور ٹرین کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ نواب انور وہیں کھڑے رہے۔

اور پھر وہ رات کے اندھیرے میں گم ہو کر ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

یہ بھی عجیب ہی بات تھی کہ پھر نواب انور کو بھوک کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

زرینہ نامی اس لڑکی نے اپنی کہانی نہایت مختصر سے الفاظ میں بیان کی تھی۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ نواب انور سے واقف تھی.....اگر وہ قصبے میں رہتی تھی، تو نواب انور سے اس کی واقفیت کافی حیرت انگیز تھی..... کیونکہ اس قصبے میں ان کی آمد و رفت تو نہ ہونے کے برابر ہی تھی۔

بہرحال وہ ٹرین کے سفر میں ان ہی کی طرف متوجہ رہی تھی.....اور اب اس نے نواب انور سے گفتگو بھی کرلی تھی۔

انہوں نے ایک طویل سانس لی اور پھر اسی طرف متوجہ ہوگئے کہ جہاں زرینہ گئی تھی۔ لیکن اب وہ نگاہوں کی دسترس سے دور تھی۔

وہ کچھ دیر تک بے وجہ ہی ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے، پھر انہوں نے بھی واپس کمپارٹمنٹ کی طرف قدم بڑھادیئے۔

شرفو جاگ رہا تھا، انہیں دیکھتے ہی اس نے اپنے ڈھیلے جسم کو سنبھالا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

نواب انور کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میں تو سمجھا کہ تم سو رہے ہوگے۔''

''کہاں صاحب.....!!'' شرفو منہ بسور کر بولا: ''جب سے ٹرین رکی ہے، نیند ہی غارت ہوگئی ہے۔''

''ہاں.....!! تمہاری لوری بند ہوگئی.....!!'' وہ ہنسے۔

عین اسی وقت برابر میں بیٹھے ہوئے بڑے میاں نے دخل دیا: ''بھئی کچھ بات چیت ہوجائے.....!!'' وقت ہی گزرے گا۔''

''ضرور..... ضرور جناب۔'' نواب انور فوراً بولے۔

''کیا میں اپنے دل کی کوئی بات کہہ سکتا ہوں؟'' اب وہ بزرگ نزدیک آگئے تھے۔

''جی ہاں.....ضرور.....!!''

اب انہوں نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک طویل سانس لی اور بولے: ''میں نے زمانے کے کئی رنگ دیکھے.....اچھے برے دور بھی دیکھے.....!!

میرا نام ارسلان بیگ ہے.....اور میری عمر اس وقت 80 سال ہے۔''

''ماشاء اللہ.....!!'' شرفو نے سر ہلا کر لقمہ دیا: ''صحت تو بہت ہی عمدہ ہے آپ کی.....!!''

''ہاں.....!! بس یہ پروردگار کا کرم ہے۔'' وہ مسکرائے: ''اور ان بزرگوں کی دعا ہے کہ جن کے ساتھ میں نے محبت رکھی.....!!''

''بزرگ.....؟؟''

''ہاں بیٹا.....!!'' وہ سر ہلا کر بولے: ''میں فقیری لائن کے لوگوں میں بہت رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت ایک خاص بات محسوس کر رہا ہوں اور اسی بارے میں بتانے کے لیے میں بے چین ہوں۔''

شرفو نے انہیں غور سے دیکھا اور پھر بولا:

''کیا آپ کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہیں.....؟''

''ہاں..... میں.....!!'' ارسلان بیگ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ عین اسی وقت کمپارٹمنٹ میں اندھیرا چھا گیا۔

''ارے.....!! ارے.....!!'' کئی آوازیں ابھریں: ''یہ کیا ہوا؟''

اور پھر ایک تیز قسم کی کراہ گونجی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی شخص کسی چیز سے اندھیرے کی وجہ سے ٹکرا گیا ہو۔

''ارے بھئی..... لائٹ کو کیا ہوا.....؟'' کسی نے گھبرا کر کہا تھا۔

بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگیں، اس اچانک افتاد سے ہر کوئی پریشان تھا۔

اور پھر کمپارٹمنٹ میں روشنی پھیل گئی..... بلب جل اٹھے تھے.....!!

اس وقت سب نے ہی ایک حیرت انگیز منظر دیکھا..... ارسلان بیگ اپنی جگہ پر بے سدھ پڑے تھے، ان کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہہ رہا تھا۔

کافی تشویش ناک صورت حال تھی، ان کی لمبی لمبی سانسوں کی آواز کافی بلند تھی۔

سر کے حصے سے بہنے والا خون اب چہرے پر پھیلنے لگا تھا، لوگ بوکھلا کر کھڑے ہو گئے..... ان میں نواب انور اور شرفو سب سے زیادہ نمایاں تھا:

''ارے..... انہیں کیا ہوا؟

''پتا نہیں صاحب.....!!'' نواب انور کے منہ سے نکلا، وہ بے خیالی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے: ''میرا خیال ہے کہ..... خیر..... وہ تو بعد کی بات ہے..... فی الحال تو ان کے لئے کچھ کرنا ہوگا.....''

''ہاں..... بے چارے نہ جانے کہاں جا رہے ہیں.....!!''

''یہ مکمل طور پر بے ہوش ہیں.....!!''

یہ کہہ کر انور نے کسی خیال کے تحت ارسلان بیگ کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

ان کا ہاتھ باہر آیا تو کئی چیزوں کے ساتھ شناختی کارڈ بھی برآمد ہوا، جس پر ان کا پتا درج تھا.....!!

''ایک سو دس، گل ریز مارکیٹ، اورنگ آباد.....!!'' نواب انور بڑبڑائے۔

پھر انہوں نے اسے ارسلان بیگ کی جیب میں واپس ڈال دیا۔ شرفو کے ساتھ کئی دوسرے لوگوں نے اپنے طور پر ان کا معائنہ کیا۔

لیکن ان کی بے ہوشی ختم نہ ہو سکی، گو کہ خون بہنا بند ہو چکا تھا.....!!''

تھوڑی دیر میں ہی عملہ آ گیا۔ انہیں اطلاع دے دی گئی تھی۔ چنانچہ ارسلان بیگ کو اسٹریچر پر ڈال کر کمپارٹمنٹ سے اتار لیا گیا۔

نواب انور کو معلوم کرنے پر عملے کے ایک آدمی نے کہا: ''انہیں تو چوٹ لگی ہے۔'' اس کے انداز میں تشویش تھی: ''یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی چیز ان کے سر پر ماری گئی ہو۔''

''ہم لوگ تو خود حیران ہیں۔'' نواب انور بولے: ''یہ ہم سے ہی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے..... اچانک ہی سارے بلب بند ہو گئے اور اندھیرا چھا گیا۔ اسی وقت ہمارے کانوں نے ایک تیز کراہ سنی تھی: ''اوہ..... اچھا.....!!''

عملے کے آدمی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟''

''بس پھر لائٹ آ گئی۔'' شرفو بول اٹھا: ''یہ بزرگوار بے ہوش پڑے تھے اور اسی حالت میں ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔''

''خیر..... قریب میں ایک ہاسپٹل ہے.....

انہیں وہاں لے جاتے ہیں..... میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر ہی انہیں ہوش میں لاسکیں گے۔''

''کیا ہم بھی چلیں؟'' نواب انور نے پوچھا۔

''آپ ان کے رشتے دار ہیں؟''

''نہیں.....!!''

''بات دراصل یہ ہے کہ ٹرین اب روانہ ہونے والی ہے، اور اس کے بعد آنے والی ٹرین میں چار گھنٹے کا وقفہ ہوگا.....!! ہم انہیں لے جاتے ہیں..... اگر خدانخواستہ کوئی گھمبیر مسئلہ ہوا تو ان کے اعزہ کو بلالیں گے.....!! آپ بھی ذرا اپنے پتے سے آگاہ کردیں.....!!''

نواب انور نے اپنی حویلی کا ایڈریس دے دیا..... فوراً ہی اسٹریچر منگوایا گیا اور ارسلان بیگ کو اس پر لٹا کر کمپارٹمنٹ سے اتار لیا گیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ ٹرین نے روانگی کی وسل دے دی۔ کمپارٹمنٹ میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ہر کسی کی زبان پر ارسلان بیگ کا ہی تذکرہ تھا۔

شرفو بولا:

''نہ جانے وہ کیا بات تھی، جو بے چارے ہم سے کہنا چاہتے تھے.....!! اس اچانک افتاد نے انہیں موقع ہی نہ دیا۔''

''ہاں.....!!'' نواب انور نے طویل سانس لی:

''میرا خیال ہے کہ.....''

وہ بولتے بولتے رک گئے۔ شرفو ان کی شکل دیکھ رہا تھا، پھر وہ خاموش ہی رہے تو اس سے رہا نہ گیا۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے صاحب جی.....!!''

''آں..... ہاں.....'' وہ چونکے: ''مجھے یقین ہے کہ اس کمپارٹمنٹ میں ان کا کوئی دشمن موجود ہے.....!!! جس نے موقع دیکھ کر ان پر وار کیا تھا.....!! لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اندھیرا کیسے ہوا.....؟''

☆.....☆.....☆

جلال پور..... کافی پرانا قصبہ..... جو آج بھی اسی طرح قائم تھا، کہ جب اس کی سنگ بنیاد رکھی گئی تھی۔

وہی لال اینٹوں سے بنے ہوئے گھر اور قصبے کا اپنا مخصوص ماحول اب بھی اسی حالت میں تھا.....!!

نواب انور اکثر کہتے تھے کہ زمانہ بدل گیا، لیکن جلال پور نہ تو کبھی بدلا ہے اور نہ ہی بدلے گا.....!!''

ان کی آمد کی اطلاع حویلی میں دی جاچکی تھی..... یہی وجہ تھی کہ ''اورنگ محل'' صاف ستھرا اور چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

ہاں..... نواب انور کے آباؤ اجداد نے اس حویلی کا یہی نام رکھا تھا اور عرصہ دراز جانے کے باوجود بھی کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ حویلی کو کسی اور نام سے منسوب کرسکے.....!!

تو اورنگ محل واقعی اس وقت اپنی شان و شوکت کے ساتھ نواب انور کے استقبال کے لئے تیار تھا۔

اس حویلی کے 2 پرانے خدمت گار تو ریلوے اسٹیشن ہی پہنچ گئے تھے..... نواب انور اور شرفو کا پرتپاک استقبال ہوا تھا۔

دلاور اور ادھیڑ عمر کرم دین نے ان کا سامان اپنے ہاتھوں پر رکھ لیا تھا۔

ایک گاڑی میں یہ چھوٹا سا قافلہ حویلی کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستے میں نواب انور نے کرم دین سے چند رسمی جملے کہنے کے بعد پوچھا۔

''سناؤ کرم دین.....!! حویلی کے کیا حال احوال ہیں.....!!''

''آپ نے برسوں پہلے اسے دیکھا تھا۔'' کرم دین مسکرایا: ''جنابِ عالی وہ اب بھی اسی حال میں ہے۔''

''اچھا.....!!'' نواب انور بولے: ''یہ بتاؤ تم نے شادی وادی کی کہ اب بھی تم خود حویلی کی طرح ہو.....!!''

یہ سن کر کرم دین ہنسا اور بولا:

''جی جناب.....!! میری شادی کو اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ میری بیٹی اب جوان ہوچکی ہے.....!!''

''خوب.....!!'' نواب انور نے طویل سانس لی: ''واقعی وقت گزرتے پتا ہی نہیں چلتا.....!!''

''جی ہاں.....!!''

''تمہارے بیوی بچے حویلی میں ہی رہتے ہوں گے؟''

''نہیں جناب.....!!'' اس کے چہرے پر تغیر سا نمودار ہوگیا: ''وہ حویلی میں نہیں رہتے..... میں خود حویلی میں رہتا ہوں.....!! مجھے جب ان کی یاد ستاتی ہے تو میں ان لوگوں سے مل آتا ہوں۔''

''یہ کیوں.....؟'' نواب انور حیرت سے بولے:

''بھئی حویلی میں تو کافی جگہ موجود ہے..... وہاں رہنے والے ملازم اپنی فیملی کے ساتھ وہاں رہ سکتے ہیں۔ پھر تم انہیں وہاں کیوں لے کر نہیں آئے۔''

کرم دین خاموش ہی رہا تھا۔ البتہ اس کا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔

نواب انور غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے، پھر وہ آہستہ سے بولے:

''کس سوچ میں پڑ گئے.....؟ کیا ہوا.....؟؟''

کرم دین نے طویل سانس لی اور پھر بولا:

''حویلی کی مرضی نہیں ہے جناب.....!! کوئی کیا کر سکتا ہے.....''

نواب انور کے ساتھ ساتھ شرفو نے بھی اسے حیرت بھرے انداز میں دیکھا تھا۔

پھر نواب انور بولے:

''بھلا یہ کیا بات ہوئی.....؟''

''حویلی آ گئی ہے جناب.....!!'' کرم دین نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا: ''اور بہت سے لوگ آپ کے منتظر ہیں۔''

نواب انور نے سر اٹھایا۔ واقعی:..... حویلی کی قدیم عمارت سامنے موجود تھی۔

ڈرائیور نے گاڑی کو بریک لگا دیئے۔ عین اسی وقت کچھ ملازم آگے بڑھے اور انہوں نے نواب صاحب اور شرفو پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر دیں۔

یہ محبت تھی، والہانہ عقیدت تھی..... نواب انور کے دل میں عجیب سا سرور رقص کرنے لگا۔ وہ اس محبت سے کتنا دور تھے.....!! یہ بات نہیں تھی کہ ان کی اولاد نے انہیں محبت نہیں دی تھی..... یقیناً گھر کی طرف سے وہ کسی قسم کی کمتری کا شکار نہیں ہوئے تھے..... انہیں تو بہو بھی چاہنے والی ملی تھی.....!!

بس دل و دماغ میں اپنی پرانی روایات اور رسومات کو زندہ کرنے اور ان ہی میں گم ہو کر اپنے ماضی کے دکھ اور رنج بھلانے کے لئے وہ یہاں چلے آئے تھے.....!!

اور پھر ان ہی پھولوں کی چھاؤں میں وہ حویلی کے دروازے کے اندر داخل ہو گئے۔

شرفو ان کے شانہ بشانہ چل رہا تھا.....!! حویلی کا اندرونی حصہ اس طرح صاف ستھرا تھا جیسے اب بھی نواب انور کا خاندان یہاں آباد ہو.....!!

نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں نمی سی تیرنے لگی..... ان کا زادِ سفر یہاں کے ملازموں نے شرفو کو بھی نہیں اٹھانے دیا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی نواب انور کا ملازم تھا۔

لیکن یہاں وہ اس حویلی کا مہمان تھا..... یہی وجہ تھی کہ اسے بھی عزت اور احترام سے نوازا گیا تھا۔

کرم دین انہیں مہمان خانے میں لے آیا تھا، ساتھ ہی اس نے دوسرے ملازموں کو ہدایت کی تھی کہ وہ دسترخوان لگائیں۔

پرانا ملازم دلاور ان کمروں کی طرف نکل گیا تھا، جہاں ان خاص مہمانوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔

اب نواب انور نے کرم دین سے پوچھا۔

''ہاں کرم دین..... اب بتاؤ کہ تم نے کس وجہ سے اپنے گھر والوں کو یہاں ٹھہرانے سے باز رکھا؟''

یہ سن کر کرم دین کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ بولا:

''نواب صاحب.....!! بہت سی باتیں ہیں، جو میں خود بھی آپ سے اب کرنا چاہتا ہوں.....!! اگر آپ برا نہ مانیں اور مجھے اجازت دیں تو کھانے کے بعد میں سکون اور اطمینان سے بیٹھ کر آپ سے وہ باتیں کروں.....''

نواب انور نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا کوئی خاص معاملہ ہے؟''

کرم دن نے طویل سانس لے کر چاروں طرف دیکھا اور پھر سر ہلا کر بولا: ''جی نواب صاحب.....!! اس حویلی سے بہت کچھ منسوب تھا اور اب بھی وہ سب کچھ یہاں موجود ہے..... آپ اطمینان سے نہا دھو کر تازہ دم ہو جائیں..... میں کھانے کے بعد خود ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا.....!!''

☆.....☆.....☆

دستر خوان حسبِ روایت دری پر ہی بچھایا گیا تھا..... اور کھانا اس قدر پر تکلف اور ذائقے دار تھا کہ شرفو کا تو ہاتھ ہی نہیں رک رہا تھا۔

نواب انور اپنے مخصوص اور باوقار انداز میں دستر خوان سے انصاف کرتے رہے۔

کھانے کے بعد گرم گرم اور پر لطف قہوے کا دور چلا گیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو کرم دین وہاں وارد ہو گیا۔

وہ ان کے سامنے ہی دری پر دوزانو بیٹھ گیا تھا۔

نواب انور غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''پھر کرم دین کے ہونٹ ہلے:

''نواب صاحب..... اب بتائیں.....''

''بھئی..... تم مجھے اسی بات کا جواب دو.....!!''

تم اپنی فیملی کو یہاں لے کر کیوں نہیں آئے.....؟''

کرم دین نے بے خیالی کے سے عالم میں شرفو کی طرف دیکھا اور پھر بولا:

''کیا میں کھل کر بات چیت کر سکتا ہوں.....؟''

''بالکل.....!!'' وہ فوراً ہی بولے: ''مجھے بابا جی کا کمرہ بھی دیکھنا ہے.....!!''

''یہ تو اچھی بات ہے.....!!'' کرم دین نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ کو وہیں ساری باتیں کھل کر بیان کر دوں گا.....!!''

کچھ سوچ کر نواب انور اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

یہ کمرہ کافی وسیع تھا، جس میں نواب انور کے والد اور دادا جی کی کچھ یادگاریں برس ہا برس سے اپنی مخصوص جگہوں پر موجود تھیں۔

وہ اپنے والد کو بابا جی کے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے۔ کچھ دیر کے لئے کرم دین کی طرف سے ان کا ذہن ہٹ کر گزرے ہوئے ماضی میں کود پڑا۔

اس کمرے میں آتش دان بھی موجود تھا، جس کے اوپری حصے میں دادا جان اور ان کے والد کی جوانی کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

ان تصویروں کے ساتھ ہی دیوار میں ایک پرانی اور بھاری بھرکم تلوار ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں دونالی والی ایک بندوق بھی موجود تھی۔

یہاں تیر کمان بھی موجود تھے.....!!! گویا ایک چھوٹا سا عجائب گھر تھا۔ جو اس کمرے کے کونے میں موجود تھا۔

تیر کمان اور تلوار کا شوق دادا جی کی یادگار تھا جب کہ بندوق ان کے والد کے استعمال میں رہتی تھی۔

ان دونوں کو ہی ہرن کے شکار کا جنون کی حد تک شوق تھا..... اس قصبے سے چند کوس کے فاصلے پر چنار نامی جنگل موجود تھا.....!! جس میں ہرن اور بارہ سنگھے با کثرت موجود تھے.....!!! اسی جنگل میں شکار کھیلا جاتا تھا.....!!

نواب انور ان ہی یادگاروں میں گم تھے کہ کرم دین کی آواز انہیں حسب حال میں لے آئی:

''میں آپ سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں.....!! لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری کوئی بات آپ کو بری نہ لگ جائے.....!!''

نواب انور چونک کر اس کی طرف گھومے اور پھر ہنس کر بولے: ''شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں اب اس ویران اور خالی حویلی میں کیا کرنے آیا ہوں.....!! اب کیا ہے یہاں.....؟ سب کچھ تو ختم ہو چکا۔''

''نہیں نواب صاحب جی.....!!'' کرم دین تڑپ اٹھا: ''میں یہ جرأت کس طرح کر سکتا ہوں.....!! بلکہ میں تو اس بات پر خوش ہوں کہ.....''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اچانک ہی

ملازم دلاور دروازے پر نمودار ہوا اس کے چہرے پر شدید غصے کے آثار تھے۔

وہ کرم دین کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں بولا:

''یہ تم کیا کر رہے ہو.....؟ میں نے تمہیں سختی سے منع کیا تھا نا کہ تم الٹی سیدھی کوئی بات مت کرنا.....!!''

نواب انور حیرت سے دلاور کی شکل دیکھنے لگے۔ فوراً ہی دلاور نے خود کو سنبھالا اور قدرے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

''معاف کیجیے گا نواب صاحب.....!! دراصل کرم دین کا دماغ تھوڑا سا کھسک گیا ہے.....!! یہ آپ کا بے وجہ دماغ کھائے گا اور فالتو باتوں سے آپ کا وقت ضائع کرے گا.....!!''

''یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر کرم دین کی طرف گھوما، جس کی شاید سٹی ہی گم ہوگئی تھی۔''

دلاور اس سے مخاطب ہوا:

''چلو.....!! تم اپنی دوا کھاؤ.....!! تمہارے سونے کا بھی وقت ہو رہا ہے.....ورنہ رات بھر چلا چلا کہ سب کو پریشان کرو گے۔''

کرم دین کچھ نہ بولا، اس کا چہرہ ست گیا تھا..... پھر اس نے نواب انور اور شرفو کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور کمرے سے نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

چند لمحے خاموشی کے عالم میں گزر گئے..... نواب انور کے ساتھ شرفو بھی حیرت زدہ تھا۔

پھر نواب انور نے دلاور کو مخاطب کیا:

''یہ تم نے کیا حرکت کی ہے.....؟ کیوں ڈانٹا بے چارے کرم دین کو؟''

''ارے صاحب وہ بے وجہ فالتو باتیں کرتا ہے.....!!'' دلاور جلدی سے بولا: ''آپ ہمارے مہمان ہیں.....!! وہ اپنی باتوں سے آپ کے ذہن کو پراگندہ کرتا.....!! اسی لئے میں نے اسے یہاں سے چلتا کر دیا..... ''میں اب اسی حویلی میں رہوں گا.....!!''

میں فیصلہ کر کے آیا ہوں.....!!''

''اوہ.....!!'' دلاور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ جلدی سے بولا: ''یہ بھی باعث مسرت ہے نواب صاحب .....!! خوشی کی بات ہے کہ اب حویلی آباد ہو جائے گی.....!! کیا میں ایک بار پھر آپ کے لئے قہوہ تیار کرواؤں.....؟''

''ہاں.....!! میں ضرورت محسوس کر رہا ہوں.....!!''

''جو حکم.....!! میں ابھی حاضر ہوا.....!!''

دلاور چلا گیا..... شرفو کسی سوچ میں گم تھا، پھر اس کے ہونٹ ہلے:

''نواب صاحب.....!!''

''ہاں شرفو.....!! بولو.....!!''

''میں کچھ محسوس کر رہا ہوں.....!!''

''کیا.....؟''

''یا تو آپ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے..... یا پھر اس حویلی کے مکین باطنی طور پر آپ کی آمد سے خوش نہیں ہیں.....!! میں کچھ عجیب قسم کا ماحول دیکھ رہا ہوں.....!!''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے.....!!'' نواب انور کا لہجہ سوچ میں گم تھا: ''خیر.....!! اب تو مجھے یہاں رہنا ہی ہے..... میں دیکھتا ہوں.....!!

اتنی دیر میں دلاور آ گیا، اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی، جس میں قہوے کی پیالیاں رکھی ہوئی تھیں.....!!

اس نے بڑے احترام سے ان دونوں کو قہوہ پیش کیا اور سیدھا کھڑا ہو کر بولا۔

''میں تھوڑی دیر میں آ کر آپ کو ان کمروں میں لے جاؤں گا، جہاں آپ آرام کریں گے.....!!''

''کمرے ہمیں کرم دین نے دکھا دیئے.....!!''

تو اب انور نے ہاتھ اٹھا کر کہا: ''تم جاؤ..... اب تم بھی آرام کرو.....!!''

دلاور نے سر کو خم کیا اور بولا:

''جو حکم جناب کا.....!! میں صبح سویرے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا.....!!''

''ٹھیک ہے.....!!''

''آپ کب آرام فرمائیں گے؟''

''ابھی تو جاگ رہا ہوں!!'' وہ بولے: ''ہو سکتا ہے کہ میں حویلی میں ذرا ٹہل لگاؤں.....!!''

''اوہ.....!!'' دلاور کے منہ سے نکلا تھا۔

وہ کسی سوچ میں گم ہو گیا، پھر خود ہی سر ہلا کر بولا:

''اگر میری ضرورت ہو تو میں آپ کے ساتھ ہوں.....!!''

''نہیں.....تم آرام کرو.....!!''

''آپ کو ضرورت رہے گی..... میں کرم دین کو بھیج دیتا ہوں.....!!''

''نواب انور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ دلاور تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا..... وہ اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

پھر وہ دونوں بھی وہاں نہیں رکے تھے، نواب انور کے ساتھ شرفو بھی باہر نکل آیا تھا.....!!

صحن میں سے گزر رہے تھے کہ رات کے پھیلے ہوئے ملگجے اندھیرے میں انہیں دو سائے دائیں جانب سے آتے ہوئے دکھائی دیئے.....!!

ان میں سے ایک کہہ رہا تھا:

''بس.....تم اپنی زبان کو لگام دے کر رکھنا.....!! فالتو باتیں منہ سے نکالنے کی ضرورت ہی نہیں ہے.....''

یہ یقیناً دلاور کی آواز تھی..... بے ساختہ انہوں نے شرفو کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف دبک گئے۔

شرفو نے بھی ایک کونے میں خود کو سمٹا لیا تھا۔

''یہ فالتو باتیں ہیں.....؟'' یہ کرم دین تھا.....جو اب وہیں رک کر دلاور کی شکل دیکھ رہا تھا۔

جواباً دلاور خاموش رہا، پھر کرم دین کی ہی آواز ابھری تھی۔

''وہ ابھی جاگ رہے ہیں.....!! رات میں چہل قدمی کے دوران اگر انہوں نے جہنمی دروازہ کھولا دیا.....تو کیا ہوگا.....؟''

یہ بات سن کر شاید دلاور سناٹے میں آ گیا تھا.....!! پھر وہ آہستہ سے بولا۔

''میں اس بات کو سمجھتا ہوں.....!! لیکن پہلے دن ہی انہیں اس طرح کی باتوں سے ہراساں کرنے سے کیا فائدہ؟''

''تو کیا لاعلمی خطرناک ثابت نہیں ہوگی.....؟''

کرم دین نے جرح کے انداز میں پوچھا: ''وہ اب یہاں کے مہمان نہیں، بلکہ مستقل مکین بن کر آئے ہیں.....کیا ہم ان سے حقیقت کو چھپا سکیں گے؟''

''تو پھر.....کیا کریں.....؟'' دلاور قدرے جھنجھلا کر بولا: ''دراصل میں نے تمہیں اس لئے وہاں سے اس وقت ہٹا دیا تھا کہ نواب صاحب پریشان نہ ہو جائیں..... بے چاروں کا آج یہاں پہلا دن ہی تو ہے.....!!''

''تم بھی اپنی جگہ درست سوچ رہے ہو.....!! اور میں بھی غلط نہیں ہوں.....!! کرم دین بولا: ''ہم لوگ اس حویلی کے نمک خوار ہیں اور حویلی کے اس آخری بچ جانے والے سرپرست کی حفاظت ہمارا فرضِ عین ہے.....!!''

''تو پھر اب کیا کریں.....!!''

''تم ہی مشورہ دو.....!!''

''فی الحال تو انہیں کچھ بتانے سے گریز کرو.....!!'' دلاور شاید کچھ سوچ کر بولا تھا: ''وہ ابھی جاگ رہے ہیں.....شاید وہ رات میں حویلی میں گھومیں پھریں.....!! تم اس دوران ان کا خیال رکھنا اور جہنمی دروازے سے انہیں دور ہی رہنے کا کوئی طریقہ نکالنا۔''

''ہونہہ.....!!'' کرم دین کی نفرت زدہ آواز گونجی:

''جہنمی دروازہ..... منحوس..... حویلی کا داغ.....!!''

''ارے.....کیا کر رہے ہو.....؟'' دلاور کے

لہجے میں خوف کا عنصر شامل تھا: ''کیوں ایسی باتیں منہ سے نکال رہے ہو.....؟ جاؤ.....اب تم کمرے میں چلے جاؤ.....وہ لوگ اب باہر نہ آجائیں.....!!''

اور پھر وہ دونوں ان کے قریب سے گزرتے چلے گئے.....نواب انور اور شرفو تھوڑا اور اندر کی طرف آڑ میں دبک گئے تھے.....!!

تھوڑی دیر بعد میدان صاف تھا.....نواب انور نے شرفو کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا:

''یہ کوئی گہرا چکر لگتا ہے.....آؤ.....اب کمرے کی طرف چلیں.....!!''

☆.....☆.....☆

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو کرم دین ان کا ہی منتظر تھا:

''صاحب جی.....!! آپ کہاں چلے گئے تھے.....؟''

''واش روم.....!!'' شرفو بول اٹھا.....!!

''اوہ.....اچھا.....!!''

نواب نور آرام سے ایک کرسی پر دراز ہوگئے اور کرم دین کی طرف غور سے دیکھ کر بولے:

''تمہیں دلاور نے بھیجا ہے.....؟''

''جی سرکار.....!!''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بولے: ''تم آرام کرو.....میں بارہا اس حویلی کو دیکھ چکا ہوں.....!! میں یہاں کے تمام راستوں سے بہ خوبی واقف ہوں.....!!''

''جی سرکار.....!! یہ بات تو میں جانتا ہوں۔'' وہ سر ہلا کر بولا: ''ظاہر ہے کہ آپ سے زیادہ کون اس حویلی کو جان سکتا ہے.....!!''

''بس تو پھر تم اپنی نیند خراب مت کرو.....!!'' وہ بولے: ''تم جا کر سو جاؤ.....!''

''نہیں سرکار.....!!'' وہ جلدی سے بولا: ''یہ بات ہمارے لئے باعث شرمندگی ہوگی کہ آپ اکیلے ہی حویلی میں چہل قدمی کریں.....!! اگر میں سو جاؤں تو یہ بات میرے لئے ممکن نہیں.....!!''

''تم کیوں پریشان ہوگئے.....!!'' شرفو بول اٹھا: ''جاؤ.....جب نواب صاحب کہہ رہے ہیں، تو جا کر سو جاؤ.....!!''

''نہیں برادرم.....!!'' کرم دین بضد تھا: ''یہ مجھے گوارا نہ ہوگا، اگر میں نہ ہوتا تو یہ دلاور کا فرض تھا کہ وہ آپ لوگوں کی خدمت گزاری کے لئے حاضر ہوتا.....اسی نے یہ کام میرے ذمے لگایا ہے.....!!''

''اچھا بھائی.....!!'' شرفو نے گویا ہاتھ جوڑ دیئے: ''تم چلو ہمارے ساتھ، تم تو قسم کھا کر آئے ہو.....!!''

جواباً کرم دین پھیکے سے انداز میں ہنس دیا اور پھر وہ تینوں باہر نکل آئے تھے.....!!

برآمدے سے باہر نکلے تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ان کے چہروں سے ٹکرائے.....!!

سامنے ہی کھلا صحن تھا، جس کے کنارے پر باغیچہ تھا..... رات کے اس پہر اس باغیچے میں موجود گھنے درخت اپنی شاخوں کے ساتھ جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اس ویران سناٹے میں عجیب سا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں طرف سکون تھا، ویرانی تھی اور حویلی کسی خوابناک مخمل کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔

اسی کھلے ہوئے صحن میں وہ کنواں بھی موجود تھا، جس کا پانی اب بھی حویلی کے مکینوں کو ''زیرِ آب'' کر رہا تھا.....!!

کرم دین نے ہاتھ میں دبی ہوئی ٹارچ روشن کردی، یہ ٹارچ وہ اپنے ساتھ ہی لے کر آیا تھا۔

روشنی کا دائرہ آگے کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا.....!! ''شرفو.....!!'' نواب انور نے ہانک لگائی۔

''جی صاحب جی.....!!'' وہ فوراً آگے بڑھ آیا۔

''یہ اندھا کنواں ہے.....!!'' وہ بولے: ''یہ اس قدر گہرا ہے کہ اس میں جھانکنے کے بعد کچھ بھی دکھائی

نہیں دیتا.....!!''

''اوہ.....اسی لئے یہ اندھا ہے؟'' شرفو کے منہ سے نکلا۔

''ہاں.....!!''

''لیکن اس میں کنوئیں کا کیا قصور ہے صاحب جی.....!!'' شرفو بول اٹھا: ''قصور تو دیکھنے والی آنکھ کا ہوا.....!! اور بے وجہ اس بے چارے کنوئیں کو اندھا بنایا گیا.....!!''

''بات تو ٹھیک ہے.....!!'' نواب انور سر ہلا کر بولے: ''لیکن اب تو اس کا یہی نام رہے گا.....کیونکہ یہ روزِ اول سے ہی اندھا کنواں مشہور ہو چکا ہے.....!!''

شرفو چپ چاپ اس کنوئیں کا معائنہ کرنے لگا۔

عین اسی وقت نواب انور نے ایک زوردار جماہی لی اور بولے:

''بھئی اس حویلی کا ماحول مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے.....سب لوگ سو چکے ہیں تو مجھے بھی اب نیند آنے لگی ہے.....میرا خیال ہے کہ اپنے کمرے میں چلتے ہیں.....!! کل صبح حویلی میں گھومیں گے.....کیا خیال ہے کرم دین.....؟''

''جیسے آپ کی مرضی.....!!'' وہ سر ہلا کر بولا:

''آئیں.....میں آپ کو کمرے تک پہنچا دوں.....!!''

''ہاں.....!! چلو.....!!''

نواب انور واپسی کے لئے گھومے اور پھر باقی دونوں بھی پلٹ گئے.....!!

چند قدم طے کرنے کے بعد اچانک ہی نواب انور نے کرم دین کو مخاطب کیا:

''تم نے اب تک وہ بات نہیں بتائی.....!!''

''کون سی بات سرکار.....؟'' کرم دین چونکا۔

''تم نے اپنے گھر والوں کو یہاں کیوں نہیں رکھا.....؟''

''کرم دین کو چپ سی لگ گئی.....پھر وہ کافی دیر بعد گویا ہوا:

''کیا جواب دوں سرکار.....!!''

''کیوں.....؟ تمہیں جواب دینے میں کوئی مسئلہ درپیش ہے؟''

''بس یوں سمجھ لیں کہ ان لوگوں کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے.....''

''کیا وجہ ہے.....؟''

''دراصل میرے گھر میں میری بیوی ہے اور ایک بیٹی ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر بولا: ''اب مسئلہ یہ ہے کہ حویلی میں سارے کے سارے مرد حضرات ہیں.....!!''

''یہ بات تو ہے.....!!'' نواب انور نے سر ہلایا۔

''بس سرکار.....!! میں اسی وجہ سے انہیں یہاں لے کر نہیں آیا کہ یہاں کوئی اور عورت نہیں ہے.....!! مردوں کی خصلت سے تو آپ واقف ہیں.....کسی اونچ نیچ کے ڈر سے میں نے انہیں خود سے الگ رکھا ہوا ہے.....!!''

''خوب.....!! نواب انور مسکرائے: ''دلیل تو تم نے بہت مضبوط دی ہے.....چلو فی الحال میں تمہاری بات تسلیم کر لیتا ہوں.....اب تم مجھے ایک بات اور بتاؤ.....لیکن میں وہ بات بالکل سچ سننا چاہتا ہوں.....!!''

کرم دین نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بولا کچھ نہیں تھا۔ ''بولا.....!!'' نواب انور نے پھر کہا: ''جو میں پوچھوں گا وہ تم سچ بتاؤ گے.....؟''

''ضرور سرکار.....!! آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں.....؟'' اس نے ٹٹولنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''جہنمی دروازہ کہاں ہے.....؟'' انہوں نے یک دم ہی پوچھا۔

کرم دین کے قریب جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہو، نواب انور کے جملے نے اس پر ایسا ہی اثر کیا تھا۔

وہ حیرت زدہ انداز میں زور سے اچھلا اور بے ساختہ اس کے ہاتھ سے ٹارچ نکل کر دور جا گری۔

وہ اب پھٹی پھٹی خوف زدہ آنکھوں سے نواب انور کی شکل دیکھ رہا تھا۔

(جاری ہے)

پراسرار وادی

فیصل مشتاق-قبولہ شریف

رات کا اندھیرا چھاتے ہی عجیب سحر انگیز آواز سنائی دیتی اور پھر اس آواز کے زیر اثر حسین ترین لڑکی اپنا جیون ہارگئی لیکن اس سے اگلا جو واقعہ ہوا اس نے دھلا کر رکھ دیا۔

ایک بہت ہی..... اچھوتی کہانی شاید ہی کسی نے اس سے..... پہلے پڑھی..... ہو

جارج اور ڈیزی نے کالج میں ایک دوسرے کو پسند کیا اور پھر جھٹ پسند کی شادی ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ڈیزی فطرتاً ایک ایڈونچر لور تھی اسے ہمیشہ مختلف جگہوں پر جانے کا شوق تھا جبکہ جارج کو ایسا کچھ پسند نہ تھا۔ ڈیزی کو بچپن سے ہی پر فضا مقام اور وادیاں دیکھنے کا شوق تھا۔ اس لیے اس نے ہنی مون کا پلان بھی کسی نئی جگہ یعنی کسی وادی میں ہنی مون منانے جائیں گے۔ جارج ڈیزی سے بہت محبت کرتا تھا اس لئے وہ اس کی کسی بات سے بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈیزی کے پلان کے مطابق وہ دونوں ہنی مون منانے ایک پر فضا مقام پر پہنچ چکے تھے۔

یہ مقام خوبصورت تو تھا مگر عجیب بھی.....

ڈیزی نے دور جنگلات کے پار اسے ڈھونڈا تھا، یہ جنگلات کے ساتھ منسلک خوبصورت وادی تھی

جہاں بہت عجیب سحر تھا، ہر طرف سفید دھوئیں کے بادل تھے، سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔ ایسا لگتا کہ جیسے ہر طرف سفید دھواں ہی دھواں ہے۔ وہ جگہ دیکھنے کو تو ایسی نظر آ رہی تھی کہ صدیوں سے یہاں کوئی نہ آیا ہو۔ چپے چپے پر عجیب پراسراریت تھی کبھی لگتا وہاں کوئی ہے...... مگر کون؟

یہ سوال اس جگہ کے قدم قدم پر چھپا ہوا تھا۔

ڈیزی اس پرفضا مقام پر آ کر بہت خوش تھی۔

مانو جیسے اسے دنیا کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہو۔

''جارج تم جانتے ہو تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی۔''

اس نے جارج کے سینے پر سر رکھ کر کہا۔

''آئی...... لو...... یو ڈیزی۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے۔''

ڈیزی سنتے ہی مسکرا اٹھی۔

جارج اور ڈیزی نے اس پرفضا مقام کے قریب ہی خیمہ لگا لیا۔ ضروریات کی تمام چیزیں وہ اپنے ساتھ لے آئے تھے، دونوں بہت خوش تھے اور انجوائے کر رہے تھے۔

رفتہ رفتہ دن ڈھلتا جا رہا تھا اور رات کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ ڈیزی نے ابھی ابھی پاستہ کھانا شروع ہی کیا تھا کہ اسے باہر سے کچھ آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ پہلے تو اس نے اپنا ذہن جھٹک دیا اور سوچا ہو سکتا ہے کہ یہ اس کا وہم ہو مگر جب دوسری بار وہی آواز دوبارہ سنائی دی تو وہ چونک گئی۔

''جارج...... سنو...... یہ آواز......''

''کیسی آواز......؟''

''یہ آواز جو کہیں دور سے آ رہی ہے۔''

تم کونسی آواز کی بات کر رہی ہو۔ مجھے صرف تمہاری آواز آ رہی ہے۔''

''جارج میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں پلیز......''

جارج اس کی باتوں پر ہنس دیا پھر اس نے بھی اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا پھر دونوں نے لمبی نیند کے لئے لیٹ گئے اور نیند کی وادی میں پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح جارج اور ڈیزی کے لئے نیا سورج طلوع ہوا۔ ڈیزی نے اپنے بیگ میں کچھ اشیاء رکھیں اور جارج کے ساتھ سیر کے لئے چل پڑی۔

''جارج میں یہ پورا علاقہ گھومنا چاہتی ہوں اور ان سنہرے پلوں اور مناظر کو کیمرے میں قید بھی کرنا چاہتی ہوں۔''

ڈیزی نے کہا تو وہ مسکرایا۔

ڈیزی اور جارج اس پرفضا مقام پر آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ ڈیزی نے کیمرہ سے تمام مناظر کی تصویریں بنا لیں۔ وہ تصویریں بناتی بھی کیسے ناں...... وہ تھی ہی اس موڈ مزاج کی اسے نئی نئی قدرتی اشیاء اور مناظر دیکھنے کا دل و جان سے شوق تھا۔ تصویریں بناتے بناتے وہ کب جارج سے دور ہو گئی اسے خبر تک نہ ہوئی وہ مختلف مقامات کی تصویریں بناتی رہی پھر کچھ دیر بعد وہ تھک گئی اور دوزانو ہو کر بیٹھ گئی اور اس پرفضا مقام کو دیکھتی رہی۔

''واہ...... کیا منظر ہے!'' سرسبز وادی کے قریب ٹھنڈے پانی کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ ہر طرف دلکش سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ڈیزی نے گہرا سانس لیا اور اپنی آنکھیں موند لیں۔ کچھ ہی دیر بعد اس کو محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی آواز سنی ہو مگر یہ آواز تو نہ تھی۔ میوزک......!!

اسے ایسا لگا جیسے بہت سارے لوگ مل کر میوزک بجا رہے ہوں اور اسے پکار بھی رہے ہوں، اس نے گہری سانس لی اور میوزک کو سنتی رہی۔ ''واہ کیا راحت تھی اس میوزک میں......''

وہ کوئی گانا نہیں تھا بلکہ صرف کچھ سروں کا ملاپ تھا جس میں بلا کا سکون تھا۔ اس میوزک میں اتنا سکون کیسے ہو سکتا ہے۔'' ڈیزی حیران تھی۔

مگر ان سروں کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ ان میں عجیب پراسراریت بھی تھی جیسے بہت سارے لوگوں کا ہجوم ڈیزی کو اپنی طرف بلا رہا ہو۔

''غم بھلا دو...... آنکھیں موند لو۔ گہرا سانس

لو.....اور اپنی روح کو ہمارے حوالے کردو۔''

ڈیزی نے آخر میں کچھ ایسی آوازیں سنی تو وہ چونک گئی جھٹ سے اس کی آنکھیں کھل گئی۔

''یہ..... یہ کیا تھا.....؟'' وہ پریشان ہوگئی۔

اسے تمام سروں کے ملاپ کا میوزک اچھا لگ رہا تھا۔ اسے سکون مل رہا تھا ایسا سکون اسے پہلے کبھی نہ ملا تھا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی مگر کسی منزل پر نہ پہنچ پائی۔ اتنی دیر میں جارج بھاگتا ہوا ڈیزی کے پاس آیا اس کی سانس پھول چکی تھی۔

''ڈیزی.....'' اس کی سانس پھول چکی تھی۔

''جارج..... یہ کہاں سے اتنی ورزش کر کے آرہے ہو.....؟''

''ورزش..... اوہ..... میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ اور تم فوٹو گرافی کرتے کرتے اتنی دور تک نکل آئی ہو۔''

''اوہ سوری جارج.....'' وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

''مجھے بہت بھوک لگی ہے ڈیزی یہ سوری تب ہی قابل قبول ہوگی جب تم کاٹیج واپس چل کر میرے لئے کھانا بناؤں گی اور جلد پیار سے کھلاؤ گی۔''

جارج کی اس بات پر ڈیزی کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے لذیذ کیک تیار کیے جارج کا فیورٹ آلمنڈ کیک بنایا اور پھر بستر پر لیٹ گئی۔

وہ صبح ہونے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہی تھی پھر اس نے کیمرہ اٹھا کر ایک ایک کر کے تمام تصاویر دیکھنی شروع کردی۔

''ارے واہ کیا مقام ہے جی چاہتا ہے کبھی دور نہ جاؤں..... ایسا لگتا ہے جیسے میرا اس مقام سے کوئی تعلق ہے برسوں پرانا۔''

وہ تمام تصاویر کو یکے بعد دیگرے دیکھ رہی تھی کہ اسے پھر سے وہی آوازیں آنے لگیں، امن کے یہ سر پھر بجنے لگے کیسا میوزک تھا، یہ کیسے سر ہیں جن میں بلا کا سکون ہے، وہ مدہوش سی ہوتی بستر سے اٹھی اور باہر کو آگئی۔

وہ جوں جوں آگے بڑھتی سروں کی آواز بڑھنے لگتی اسے بے حد سکون مل رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک کھائی کے کنارے آبیٹھی..... اسے ایسا سکون مل رہا تھا کہ وہ اپنے اردگرد سے انجان ہوگئی تھی۔ وہ مزے سے سروں کو سن رہی تھی۔

جب اسے اپنے کاندھے پر ہلکا سا وزن محسوس ہوا تو اس نے مڑ کر دیکھا مگر کوئی موجود نہ تھا۔ خوف کی لہر ڈیزی کے من میں دوڑی ماحول بھی پراسرار سا ہوگیا تھا۔

اچانک ڈیزی کو گھوڑے کے تیز بھاگنے کی آواز آئی اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔

اسے تجسس ہو رہا تھا کہ وہ دیکھے کہ آکر یہ گھوڑے کی آواز کہاں سے آئی اس نے ہاتھ کا چھجا بنا کر بغور دیکھا تو اسے دور سے ایک گھوڑا بھاگتا ہوا نظر آیا۔

''واہ..... کیا حسین گھوڑا تھا۔ بالکل سفید رنگ، سفید بال، کالی آنکھیں دلکش خدوخال۔ ڈیزی نے اسے گھوڑے صرف گوگل پر ہی دیکھے تھے۔ گھوڑا کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ڈیزی گھوڑے کی طرف بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے وہ بالآخر گھوڑے تک پہنچ گئی۔ ڈیزی نے کبھی گھڑسواری نہ کی تھی مگر اس وقت اسکا جی چاہا کہ وہ اس گھوڑے پر بیٹھ کر پوری دنیا گھوم لے۔ وہ جھٹ سے گھوڑے کے اوپر بیٹھ گئی۔ ''بہت خوبصورت..... تم بہت خوبصورت ہو۔'' اس نے گھوڑے کی گردن پر موجود خوبصورت سفید بالوں کو چھوا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گھوڑا ڈیزی کا مطیع و فرمانبردار ہو، اسے برسوں سے جانتا ہو۔

ابھی وہ یہ عمل کر ہی رہی تھی کہ اچانک سے وہی سروں کی آواز سنائی دی۔

جوں ہی سروں کی آواز آئی ڈیزی کو سکون آنا شروع ہوگیا۔ مگر اس سے زیادہ حیرانگی کی بات یہ تھی کہ جوں ہی سروں کی آواز آئی گھوڑے نے برق رفتاری سے بھاگنا شروع کردیا۔

ڈیزی ان سروں کے خمار میں اس قدر مگن تھی کہ

کوئی ہوش نہ رہا سفید گھوڑا برق رفتاری سے بھاگتا گیا وہ سرسبز و شاداب جنگل سے ہوتا ہوا حسین آبشاروں کے پاس پہنچا۔ جیسے ہی ایک آبشار قریب آئی گھوڑا وہیں ساکن ہوگیا۔

ڈیزی کے لبوں پر مسکراہٹ سجی تھی یہاں جو منظر ڈیزی نے دیکھا شاید وہ جنت سے کم نہ تھا۔

اس حسین وادی سے پانی کا چشمہ پھوٹ رہا تھا جس سے کئی چھوٹی چھوٹی نہریں نکل رہی تھیں۔

چاند اپنی پوری چمک کے ساتھ چمک کر نیلے پانی میں اپنی خوبصورتی اور حسن کا ثبوت دے رہا تھا۔ آسمان تھا کہ تاروں سے جگ مگ کر رہا تھا۔ ڈیزی پھر چشمے کی طرف چل دی۔ اس نے چشمے کے پانی کو چھوا اور پھر چلو میں لے کر گھونٹ گھونٹ اپنے حلق میں اتار لیے۔ پانی پیتے ہی اسے ایسا لگا جیسے اس میں عجیب سی قوت آگئی وہ خوشی سے جھوم رہی تھی اس سے قبل ایسی حسین وادی ڈیزی نے کبھی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ ٹھنڈے پانی کا شور اسے سنائی دے رہا تھا وہ خوشی سے جھوم رہی تھی۔ کب اسے نیند آگئی پتہ بھی نہ چلا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اٹھی تو سر میں ہلکا سا درد تھا وہ اٹھی اور دیکھا تو جارج ناشتہ بنا رہا تھا۔

''جارج یہ تم کیا کر رہے ہو.....؟''

''تم دیکھ تو رہی ہو..... ناشتہ بنا رہا ہوں۔''

جارج مسکراتے ہوئے بولا۔

'Oh Thank You' جارج تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو۔''

وہ اٹھی اور آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی تو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ حسین ہو چکی تھی۔ اس کا رنگ چمک اٹھا تھا چہرے پر عجیب تازگی چھا چکی تھی وہ اچانک خود کو خوبصورت ہونے کا راز نہ جان سکی فقط ایک ہی خیال آیا کہ شاید وہ اس پرفضا مقام پر آکر بہت خوش ہے۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا تو اسے رات کا سارا منظر یاد آگیا جب وہ اس حسین وادی میں تھی۔

وہ خوشی سے جارج کی طرف مڑی اور اسے رات کے واقعے کے بارے میں بتانے لگی تو جارج قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ڈیزی مجھے معلوم ہے تمہیں بچپن سے پرفضا مقام دیکھنے کا شوق ہے مگر اتنی حد تک ہے..... کہ تمہیں دن رات خوابوں میں بھی یہی سب نظر آتا ہے معلوم نہ تھا.....؟''

''کیا مطلب جارج میں سچ کہہ رہی ہوں رات میں نے گھوڑے پر بیٹھ کر اس دلکش وادی کی سیر کی ہے میں نے اس آبشار کا ٹھنڈا پانی پیا ہے۔''

''واہ..... لیکن تم رات سے یہیں پر ہو۔ میں تم سے پہلے اٹھ گیا دیکھا تو محترمہ خراٹے لے رہی تھیں تو سوچا کہ خود ناشتہ بنا لوں۔ پریشان مت ہو..... تم نے یقیناً کوئی حسین خواب دیکھا ہوگا۔''

''خواب.....!'' اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا پھر اس کے دماغ سے جواب آیا۔

''مگر وہ تو حقیقت ہے۔ ہاں حقیقت۔''

اب وہ جارج کو کیسے بتاتی کہ یہ سب حقیقت تھی نا کہ کوئی اچھا خواب لیکن وہ یہ بات سوچ کر پریشان تھی کہ وہ صبح کا بیچ تک کیسے پہنچی جب کہ وہ تو رات کے وقت اس حسین وادی میں موجود تھی۔

جلد ہی جارج نے اس کے سامنے ناشتہ رکھ دیا تو تمام خیالات اس کے ذہن سے نکل گئے۔ اس نے تمام دن جارج کے ساتھ انجوائے کیا اور رات ہوئی تو وہ بستر پر لیٹ گئی۔

جوں ہی وہ لیٹی تو حسین سروں کی آوازیں اسے اپنے سحر میں جکڑنے آگئیں وہ مدہوش ہو کر باہر آئی سفید گھوڑا اس کے انتظار میں کھڑا تھا وہ مدہوشی کے عالم میں گھوڑے پر سوار ہوئی اور مدہوشی کے عالم میں حسین وادی میں پہنچ گئی۔

جب وہ حسین وادی میں پہنچی تو سروں کی آوازیں اور گہری ہونے لگیں۔ اور اس کی روح کو سکون

ملنے لگتا وہ انہی مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اچانک سروں کی آواز گم ہو گئی تو اسے لگا کہ جیسے کوئی اس کے پیچھے ہے مڑ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔

ابھی وہ اپنے ہوش سنبھال ہی رہی تھی کہ چند منٹ دوری پر ایک آسمانی رنگ کے فراک میں ملبوس حسین لڑکی نظر آئی اس کی آنکھیں سبز تھیں جب کہ گولڈن بال اس کے کاندھوں تک آئے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ کسی معصوم بچے جیسا تھا وہ بلا کی حسین تھی، مانو آسمان سے کوئی پری اتر آئی ہو۔ اس سبز آنکھوں والی لڑکی نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے ڈیزی کو بلایا اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

عجب بات یہ تھی کہ اب میوزک کی آواز مزید تیز ہوتی جا رہی تھی اور آسمانی رنگ کے خوبصورت گاؤن ٹائپ کھلے فراک میں ملبوس وہ مغربی لڑکی آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر حسین مسکراہٹ تھی۔ ڈیزی بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

کچھ ہی لمحوں بعد وہ لڑکی کہیں غائب ہو گئی۔

ابھی ڈیزی کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ وہی حسین لڑکی سفید گھوڑے پر سوار کبھی ہواؤں میں اڑ رہی تھی تو کبھی زمین پر گھوڑے پر بیٹھی تیز رفتار سے جاتی۔

ڈیزی یہ منظر دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ اسے خوف سا بھی محسوس ہونے لگا۔ وہ اس لڑکی کے تعاقت میں کافی دور نکل آئی تو شاید یہ جنگل کا کوئی علاقہ تھا، جنگلات کے آگے کھائی تھی وہ بھاگتے ہوئے کھائی کی طرف پہنچی جہاں اس نے دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔

وہ لڑکی کھائی کے ایک کنارے پر کھڑی تھی اس کھائی کے نیچے بہت بڑا دریا تھا ایسا گہرا اور بڑا دریا بھی ڈیزی نے اپنی زندگی میں نہ دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس لڑکی نے اس دریا میں چھلانگ لگا دی۔

''رکو.....'' ڈیزی کے منہ سے آواز نکلی جبکہ تب تک وہ لڑکی چھلانگ لگا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ حسینہ پانی میں ڈوب کر مر چکی تھی۔ اب اس کی لاش پانی کے اوپر تیر رہی تھی بڑی بڑی چیلیں اور گدھ اس کے جسم پر آ کر بیٹھ گئے اور اسے نوچ نوچ کر گوشت نگل گئے اب وہ ایک ڈھانچا تھا جو کہیں پانی میں غرق ہو گیا۔

فضا میں عجیب پراسراریت پھیل گئی۔ ڈیزی یہ دل دہلا دینے والا منظر دیکھنے کے بعد بری طرح ڈر گئی اس کے جسم کے انگ، انگ سے ڈر جھلک رہا تھا اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا جسم پسینے سے شرابور تھا وہ بھاگنے لگی، تبھی اسے سروں کی آواز سنائی دی۔

گہرا سانس لو۔ آنکھیں موند لو۔

سنو ہمیں سنو۔

جواہرات

☆ اللہ کو بھلا کر زندگی میں کبھی سکون نہیں مل سکتا۔

☆ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بغیر ایمان نامکمل ہے۔

☆ والدین کی خدمت کر کے ہم اپنی دنیا و آخرت سنوار سکتے ہیں۔

☆ محبت وہ اکسیر ہے جو انسان کو فرشتوں سے بھی بڑھا دیتی ہے۔

☆ حسن عمل کا نور پیدا کرو، دیا خود بخود جھک جائے گی۔

☆ بڑا انسان وہ ہے جس کے سامنے کسی کو چھوٹا پن محسوس نہ ہو۔

☆ سخت کلامی کا شعلہ ہمیشہ کے لیے داغ چھوڑ جاتا ہے۔

☆ الفاظ احتیاط سے استعمال کرو کہ ان کی واپسی نہیں ہے۔

☆ خود کو بدل دو..... قسمت خود بخود بدل جائے گی۔

☆ اولیاء اللہ کی صحبت ہر فتنہ سے بچنے کا موثر حل ہے۔

(ایس حبیب خان، کراچی)

اپنی روح کو ہمارے حوالے کردو۔

اسے چاروں کونوں سے یہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اس کے بعد خوفناک قہقہے بلند ہوئے تو ڈیزی نے بری طرح بھاگنا شروع کردیا۔

''تمہاری روح ہماری ہے..... آنکھیں موندو سنواور آؤ۔'' آوازیں متواتر آرہی تھیں۔

ڈیزی بری طرح بھاگتی گئی۔ اس نے بھاگتے ہوئے دیکھا وہی سبز آنکھوں والی لڑکی سفید گھوڑے پر سوار فضا میں بلند ہورہی تھی۔ وہ ڈیزی کی طرف دیکھ کر خوفناک ہنسی ہنسی۔ ڈیزی کا خوف حدود کو چھوگیا اور بالآخر وہ بے ہوش ہوکر گرگئی۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے سامنے جارج کے ساتھ ایک بڑھیا کو پایا۔ بڑھیا کی عمر قریباً 70 برس کے قریب تھی وہ دیکھنے میں کوئی مغربی ہی لگ رہی تھی اس نے گلے میں کچھ تسبیحات اور لاکٹس موجود تھے۔ جس کے اوپر انسانی کھوپڑیوں کے نمونے موجود تھے۔ ڈیزی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اٹھ نہ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل گئے۔

''جارج..... تم جانتے ہو..... میرے ساتھ کیا ہوا..... جارج .....!! وہ لڑکی..... اس کی موت ہو گئی.....!!''

جارج نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میں سب جانتا ہوں.....'' جارج بولا۔

پھر ڈیزی نے جارج سے بڑھیا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کل رات کو تمہیں یہاں لے کر آئی ہیں۔

''اوہ..... اچھا..... میں آپ کی احسان مند ہوں..... میں نے بہت خوفناک مناظر دیکھے ہیں..... آخر یہ سب کیا ہے وہ سروں کا میوزک یہ سب واقعات.....؟؟ ایسا کیوں ہورہا ہے.....؟''

وہ پریشانی سے بڑھیا کی طرف دیکھنے لگی۔

بڑھیا نے جواباً اسے تسلی دی کہ وہ سب ٹھیک کر دے گی۔ بقول بڑھیا کے وہ پچھلے چالیس سال سے اس مقام پر موجود ہے۔ 40 سال قبل اسے یوگا کا شوق ہوا تو وہ اس پرفضا مقام پر آگئی۔ اسے شروع سے ہی تنہائی پسند تھی اسے پرفضا مقام پر اکیلا رہنا پسند تھا۔ وہ کچھ دن کے لئے اس پرفضا مقام پر یوگا کرنے آئی تھی مگر رفتہ رفتہ وہ اس ماحول سے ایسی مانوس ہوگئی کہ وہ ہمیشہ یہیں رہنے لگ گئی۔

''ڈیزی..... آج رات تمہیں پھر وہ بلائے گی..... مگر آج تم اس کامیج سے باہر نہیں جاؤ گی ورنہ سب تباہ ہوجائے گا۔'' وہ بولی۔

کک..... ک..... کون.....؟'' ڈیزی نے پریشان ہوکر دھڑکتے دل سے کہا۔

''آپ کس کی بات کررہی ہیں محترمہ؟'' جارج نے پوچھا۔

''کیا تم جاننا چاہتے ہو.....؟''

''تمہاری ڈیزی، ہیلن کے پراسرار سروں میں گرفتار ہوگئی ہے۔''

''میوزک، سر..... یہ کیسی باتیں کررہی ہیں آپ.....؟'' جارج بولا۔

''پوچھو اپنی بیوی سے۔''

''ہاں..... جارج یہ سچ کہہ رہی ہیں میں نے تمہیں بتایا تھا مگر تم نے یقین نہیں کیا۔ مجھے ہر رات یہ پراسراریت بھرا میوزک سنائی دیتا ہے۔ مگر جب سے تم نے یقین کرنا چھوڑ دیا۔ مجھے امید نہ رہی اور مجھے اس میوزک سے عجیب سکون ملتا ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''خاموش لڑکی۔''

ڈیزی بول ہی رہی تھی کہ بڑھیا نے اسے غصے سے گھورا۔

''کیا تم مرنا پسند کروگی.....؟'' بڑھیا نے کہا۔

نے..... ن..... نہیں؟'' ڈیزی گھبرا گئی

''کیسی باتیں کررہی ہیں آپ.....؟'' جارج غصے سے بولا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں تمہاری بیوی ہیلن کے پراسرار سروں میں گرفتار ہوگئی ہے۔''

''پلیز مجھے بچالیں کون ہے ہیلن اور یہ سر مجھے کیوں سکون دیتے ہیں۔ پلیز بتایئے۔''

''جاننا چاہتی ہو.....؟''

بڑھیا نے آنکھیں پھیرتے ہوئے کہا اور خوفناک ہنسی ہنسی۔

''ہاں..... مجھے بتایئے۔''

ابھی بڑھیا کچھ بولنے ہی لگی تھی کہ پھر سے سروں کی آواز آنے لگی۔

گہرا سانس لو۔ آنکھیں موندلو۔

اپنی روح کو ہمارے حوالے کردو۔''

ڈیزی کے کانوں میں سرگوشی ہوئی۔ وہ ایک بار پھر سے مدہوش ہوکر باہر کی طرف چلی دی۔

بڑھیا نے ڈیزی کو باہر جانے سے منع کیا تھا مگر وہ جانتی تھی اگر ڈیزی باہر نہ گئی تو اندر کس قدر خطرہ ہوسکتا ہے۔

''محترمہ آپ نے ڈیزی کو روکا کیوں نہیں..... آپ ہمیں بچانا چاہتی ہیں یا تباہ کرنا چاہتی ہیں۔''

جارج نے غصے سے کہا۔

''صبر رکھو لڑکے..... اسے جانا ہی تھا اگر میں اسے روکتی تو بہت برا ہوتا.....''

''مگر ایسا کیوں.....؟''

''یہ سب کیا ہے.....؟ یہ کیا میوزک ہے جو صرف ڈیزی کو سنائی دیتا ہے.....؟''

بڑھیا پھر خوفناک ہنسی ہنسی۔

''سنو گے.....؟ کیا تمہارے اندر سننے کی ہمت ہے؟'' بڑھیا جیسے چلائی۔

''ہیلن.....!! حسن کے پیکر کا نمونہ۔ وہ سبز آنکھوں والی نیلی لہلہاتی فراک والی خوبصورت دوشیزہ۔ جو اس وادی کی ملکہ تھی۔ وہ یہیں رہتی تھی یہ وادی صرف اس کی تھی صرف اس کی۔

اور اس کا وہ سفید گھوڑا جس پر وہ ہمیشہ گھومتی تھی وہ تمام مناظر سے لطف اندوز ہوتی۔ اسے خاموشی پسند تھی اس کے دوست، اس کے ساتھی فقط چرند پرند تھے وہ اپنی ایک تالی کی آواز پر تمام پرندوں کو وادی میں اکٹھا کر لیتی تھی۔

وہ جانے کتنے سالوں سے یہاں تنہا رہ رہی تھی۔

پھر ایک دن سحر زدہ سروں کے ساتھ ایک آدمی اس پرفضا مقام میں داخل ہوا۔ وہ گھنٹوں اپنے سر بجاتا رہتا ایسے سر ہیلن کو بہت متاثر کرتے وہ آنکھیں موند لیتی تھی اور سکون سے ان سروں کو سنتی تھی۔ وہ آدمی کوئی عام آدمی نہ تھا بلکہ اس کے سروں میں جادو تھا۔ اسے اس تنہائی بھرے پرفضا مقام پر سروں کو بجانے کا بہت مزہ آتا۔

جلد ہی ہیلن اور اس کی ملاقات ہوگئی۔ ہیلن اس کے سروں کے سحر میں جکڑتی گئی اور اس سے محبت کر بیٹھی۔ آدمی بھی تنہائی پسند تھا اسے ہیلن سے شادی نہ کرنی تھی بلکہ اسکا اصل مقصد اس جگہ کو اپنی ملکیت بنانا تھا۔

وہ آدھی رات کو سر بجاتا تو ہیلن اپنے سفید گھوڑے پر بھاگتے اس کے سر سننے آجاتی اور کبھی کبھی اس کی بانہوں میں سر رکھ کر سو جاتی سبز آنکھوں والی وہ حسین دوشیزہ اس جگہ کی خوبصورتی سے بھی قدرے خوبصورت تھی۔

مگر وہ دن..... منحوس دن..... جس دن سب چرند پرند دور جا بسے سب طوطے موت کی نیند سو گئے۔ اس ظالم نے اس پرفضا وادی کو حاصل کرنے کے لئے ایسا سحر زدہ میوزک تیار کیا جسے سن کر ہیلن پاگل سی ہو گئی۔ وہ روز ہی میوزک سنتی تھی۔

آخر کار چاند کی وہ رات آ گئی۔ پورا چاند نکل چکا تھا رات کے آخری پہر میں چاند اپنی خوبصورتی کا ثبوت نیلی آبشاروں میں چمک کر دے رہا تھا۔

آخر اس دن وہ کامیاب ہوگیا۔ اس نے ہیلن کو میوزک کے طلسم میں گرفتار کرلیا ہیلن اٹھی میوزک سنتے ہوئے وادی کے آخری حصے والی گہری کھائی تک جا پہنچی اس نے آنکھیں موندلیں، اور اپنے تن من اور روح کو ان سروں کے حوالے کر دیا اور پھر گہری کھائی کے نیچے گہرے دریا میں چھلانگ لگا کر جان دے دی۔

مگر اس کی روح ہمیشہ کے لئے اس وادی کی ہو کر رہ گئی۔ اس نے آدمی کو غرق کر دیا مگر سروں کی دیوانی تھی اب اس کی روح کو سکون اسی سے ملتا ہے۔''

بڑھیا نے سارا قصہ بتایا تو جارج کے چہرے کے رنگ اڑ گئے۔ اسے یقین نہ آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن جب سے جارج نے ڈیزی کی یہ حالت دیکھی تھی اسے یقین ہو گیا کہ بڑھیا سچ کہہ رہی ہے۔

''مگر..... یہ سب میں مانتا ہوں۔ ایسا ہو گا۔ مگر میری ڈیزی، میری ڈیزی، کے ساتھ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اس کا کیا قصور ہے پلیز اسے بچا لیجئے۔''

بڑھیا نے خوفناک قہقہہ لگایا۔

''نہیں بچے گی ڈیزی۔ کبھی نہیں۔''

''بکواس مت کرو۔''

''لڑکے ڈیزی کا کوئی قصور ہو یا نہ ہو اس کی قسمت اسے یہاں لے آئی ہے..... اس کی سب عادات اور ستارے ہیلن سے ملتے ہیں۔ اس سے قبل کوئی نوجوان لڑکی یہاں نہیں آئی جو بالکل ہیلن کی طبیعت کے مطابق ہو..... ہاں مگر ڈیزی بالکل ہیلن کی طبیعت کے مطابق ہے بالکل اسی جیسی وہ ہیلن کے گھوڑے پر سفر کر چکی ہے۔ اس کی وادی کی آبشاروں سے پانی پی چکی ہے۔ اسے سر پسند ہیں اسے سکون چاہیے۔

نہ وہ تمہارے ساتھ کبھی واپس جائے گی اور نہ تم کوئی کوشش کر پاؤ گے۔ تمہیں چاہیے تھا ڈیزی کو ایسے مقام پہ نہ لاتے اور اس کا خیال رکھتے اس نے روح کی تمام اشیاء سے وابستگی قائم کر لی پھر ان سروں کی ملکہ بھی ہیلن ہے۔ گھبراؤ مت وہ ڈیزی کو سکون دینا چاہتی ہے۔''

''اپنی بکواس بند کرو میں ڈیزی کو بچا کر رہوں گا۔'' جارج غصے سے اٹھا اور کاٹیج سے باہر نکل آیا۔

اس نے ڈیزی کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔

''گہرا سانس لو

آنکھیں موند لو

اپنی روح کو ہمارے حوالے کر دو۔''

ڈیزی کے کانوں میں بار بار یہی آواز گردش کر رہی تھی۔

ڈیزی اسی کھائی کے کنارے پر پہنچ چکی تھی جہاں سبز آنکھوں والی ہیلن نے دریا میں کود کر جان دی تھی اور روح کو سروں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کی روح فنا نہ ہوئی تھی۔

بلکہ اس کی روح سکون میں تھی۔

جارج بھاگتا ہوا بالآخر مطلوبہ جگہ پہنچ گیا وہ ڈیزی کے قریب پہنچا اور دیکھ کر حیران رہ گیا ڈیزی گہرے دریا میں چھلانگ لگانے کو تیار تھی۔

جارج نے ڈیزی کو ہٹانے کی کوشش کی مگر بے سود میوزک کی آواز تیز ہو گئی۔ اب تمام سر چاروں کونوں کے گوشوں سے نکل کر آ رہے تھے۔

سبز آنکھوں والی ہیلن دریا کے قریب کھڑی پکار رہی تھی۔

''آ وَ ڈیزی..... اپنی روح کو سکون دو۔

آنکھیں موند لو۔ گہرا سانس لو۔

اپنی روح کو ہمارے حوالے کر دو۔''

بالآخر ڈیزی نے آنکھیں موند لیں۔ جارج نے کتنی بار چلا چلا کر ڈیزی کو روکنا چاہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ڈیزی کو اس کی کوئی بات سنائی نہ دی۔ ڈیزی نے یکدم دریا میں چھلانگ لگا دی۔

جارج کے حواس بحال نہ رہے، وہ اپنی ڈیزی سے ایک منٹ بھی دور نہ رہ سکتا تھا۔ اس نے بھی ڈیزی کی تقلید میں چھلانگ لگا دی۔

اور اب شاید ان دونوں کی روحیں موت کی وادی میں سفر کر رہی تھیں۔ اب ڈیزی اور جارج دونوں کی روحیں اس مقام پر ہمیشہ کے لئے بس گئیں، یہ موت کی پراسرار وادی تھی یہاں موت تھی ان دونوں کی قسمت میں موت تھی، وہ جتنی بھی کوشش کرتے کبھی بچ نہ پاتے کیونکہ اس پراسرار وادی میں جو بھی تنہائی پسند آتا اس کی روح ہیلن کے حوالے ہو جاتی تھی۔

منحوس ڈھانچہ

شہزاد خان-صادق آباد

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ڈھانچہ ایک مہ جبیں کے زلفوں کا اسیر ہوگیا تھا، اس سے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن ایک دن.....

دنیائے حیرت کی ایک عجیب کارستانی جس نے لوگوں کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کردیا تھا

بائیالوجی کے فرسٹ ائیر کے پیپر میں اس کے نمبر کلاس میں سب سے زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن بن گئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس امتحان میں بھی وہ ٹاپ پر رہی تھی۔ تعلیم کے ساتھ اس کی لگن اور محنت کو دیکھتے ہوئے اس کے سارے ٹیچرز حضرات اس کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے پیش آتے تھے۔ ظاہر ہے ایک اچھے اسٹوڈنٹ کی وجہ سے ٹیچرز کی بھی عزت بڑھتی ہے اور نالائق اسٹوڈنٹس اپنے اچھے ٹیچرز کے لئے بھی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ غرض اس کے اور تمام ٹیچرز کے درمیان ایک احترام کا رشتہ بھی بن چکا تھا جو دوسرے نالائق بچوں کو بہت کھٹکتا تھا۔ اور ایسا تقریباً ہر جگہ اور ہر اسکول میں ہوتا آیا ہے کہ ذہین اور لائق بچوں سے نالائق بچے ہمیشہ نالاں رہتے ہیں۔ کالج کے بہت سے ٹیچرز حضرات بخوبی جانتے تھے کہ نالائق بچے ہر وقت ذہین بچوں کو کوئی نہ کوئی تکلیف

پہنچانے کے لئے تیار رہتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ٹیچرز کو ذہین بچوں کی شکائتیں لگا کر انہیں ٹیچرز کی نگاہوں میں شرمندہ کروا سکیں۔ لیکن اس بات سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکے گا کہ "عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے"۔

☆.....☆.....☆

ثناء سیکنڈ ائیر کی ہونہار اسٹوڈنٹ تھی اس کے والد کا ایک چھوٹا سا بزنس تھا جس کی وجہ سے انہیں کاروباری معاملات کے لئے اکثر شہر سے باہر جانا پڑتا تھا۔ ثناء پرائمری سے کالج تک ہمیشہ اچھی پوزیشن ہولڈر رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ احباب کے ساتھ ساتھ دیگر دوستوں میں بھی بہت مقبول تھی..... سب لوگ اسے اس کی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے بہت پسند کرتے تھے۔ اسکول سے کالج میں ایڈمیشن لینے کے بعد ثناء نے وہاں بھی خود کو منوالیا تھا اور بہت کم عرصے میں کالج کے ذہین اسٹوڈنٹس میں اس کا شمار ہونے لگا تھا۔ ٹیچرز حضرات اسے بہت قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اس کی قابلیت اور محنت کا ذکر اکثر اسٹاف روم میں کرتے رہتے تھے۔

فرسٹ ائیر میں اچھے نمبروں کے ساتھ ساتھ اس نے بائیالوجی کے پیپر میں تمام سیکشنوں میں سب سے اچھے نمبر لے کر ٹاپ کیا تھا اور اس سلسلے میں کالج انتظامیہ نے ایک چھوٹا سا فنکشن کر کے اسے ایک بڑی ٹرافی اور تعریفی اسناد سے نوازا تھا۔ ثناء کے گھر میں اس کے کمرے میں اس قدر ٹرافیاں جمع ہوگئی تھیں کہ اب تو ان کے رکھنے کے لئے بھی کوئی جگہ باقی نہ بچی تھی کیونکہ وہ تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہتی تھی اور اکثر جیتنے کی وجہ سے اسے وہاں سے بھی ٹرافیاں ملتی تھیں اور اس طرح اس کے پاس ٹرافیوں کا اچھا خاصہ خزانہ بن گیا تھا۔

ابو کا اچھا بزنس ہونے کی وجہ سے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی اس لئے اس کی ہر خواہش دم توڑنے سے پہلے پوری ہو جاتی تھی۔ غرض وہ ایک اچھی اور آسودہ زندگی گزار رہی تھی۔ لیکن اتنی آسائشوں کے باوجود اس میں غرور نام کی کوئی بات نہیں تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اچھی ذہانت کے ساتھ ساتھ اچھی شکل سے بھی نوازا تھا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھنے والا دوبارہ پلٹ کر اسے ضرور دیکھتا تھا۔ گوری رنگت، ستواں ناک، کالی کالی بڑی اور جھیل جیسی آنکھوں میں جیسے ہر وقت نشہ اترا رہتا تھا۔ قدرت نے اس کی آنکھوں میں ایسا حسن دیا تھا کہ وہ بغیر سرمہ لگائے ہر وقت سرگیں دکھائی دیتی تھیں۔ باریک باریک گلابی ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ طاری رہتی تھی۔ اس سے ملنے کے بعد ہر کوئی اس سے دوبارہ ملنے کی تمنا کرتا تھا۔ لمبا اور پتلا جسم ہونے کی وجہ سے یوں لگتا تھا جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے کسی بہترین سانچے میں ڈھال کر بنایا ہو۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جب اللہ حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ اور یہ بات اس پر بالکل فٹ بیٹھتی تھی وہ چلتی تھی۔

اس کے حسن کی وجہ سے خاندان بھر سے اس کے لئے بہت سے رشتے آئے لیکن اس کی پڑھائی کے شوق نے سب کے منہ بند کر دیئے۔ اس کے ابو نے اس کے کہنے پر اسے شہر کے سب سے مہنگے اور اچھے کالج میں داخلہ لے دیا تھا۔ اور اس کے کالج آنے جانے کے لئے اسے ایک ڈرائیور رکھ دیا تھا جو روز اسے کالج چھوڑ آتا تھا اور چھٹی کے بعد کالج سے واپس لے آتا تھا۔

گھر میں اس کی امی کے علاوہ اس کی ایک پانچ سالہ چھوٹی بہن فاطمہ تھی اور ایک چھوٹا بھائی تو قیر جس کی عمر ابھی دو سال ہی تھی رہتا تھا۔ ایک مختصر فیملی تھی والد کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر ہی رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے گھر میں دو تین نوکر اور کام کاج کے لئے ایک ملازمہ رکھ دی تھی جن کی وجہ سے گھر میں خوب رونق جمی رہتی تھی۔ ان لوگوں کے اچھے سلوک کی وجہ سے سارے گھر کے ملازمین ان کی عزت کرتے تھے اور کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ ان میں سے جب کسی کو کسی دوسرے گھر سے اچھی تنخواہ کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے انکار کر دیا وہ اس گھر کو چھوڑ کر کسی اور گھر میں جانے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔

اور یہ بات سچ بھی تھی کہ ثناء کے والدین نے انہیں ہمیشہ گھر کے فرد کی جگہ ہی سمجھا تھا اور ہر خوشی کے

موقعہ پر یا عید تہوار پر انہیں نئے کپڑے دینے کے ساتھ ساتھ نئے جوتے بھی خرید کر دیئے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عیدی کی صورت میں نقد روپے بھی انہیں دے کر اپنی خوشیوں میں شریک کرتے تھے۔

☆.....☆.....☆

سیکنڈ ائیر کے امتحانات سر پر تھے چونکہ ابھی ان کے شروع ہونے میں ایک مہینہ تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسے موقعہ پر دنوں کو پر لگ جاتے ہیں اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیسے گزر جاتے ہیں اس لئے وہ ابھی سے ہی امتحانات کی تیاری میں لگ گئی۔

کالج سے واپسی پر یونیفارم تبدیل کرنے کے بعد وہ کھانا کھاتی اور پھر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد کالج کا کام لے کر بیٹھ جاتی۔ وہ روزانہ کی بنیاد پر کالج کے کام کو دوبارہ سمجھ کر پڑھتی اور پھر اچھی طرح یاد کر کے دیگر کام کرتی تھی۔ وہ آج کا کام کل پر نہ چھوڑتی اور اس کی اسی عادت کی وجہ سے اسے اکثر کلاس میں دوسرے بچوں کی طرح شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ ہی ٹیچرز سے جھوٹ بولنا پڑتا تھا۔

آج بھی حسبِ معمول اس نے روزانہ کی طرح تمام کام سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنی کتابیں الماری میں رکھ کر دوسرے روز کالج میں کئے جانے والے کاموں کی لسٹ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دی جو اس نے صبح کالج جاتے ہوئے لیجانے کے ارادے سے رکھی تھی۔ دوسری صبح کالج کے لئے نکلتے وقت اس نے وہی لسٹ اٹھا کر اپنے یونیفارم کی جیب میں رکھ لی اور ڈرائیور کے ساتھ کالج پہنچ گئی۔

آج بائیالوجی کا پریکٹیکل تمام پیریڈز کے آخر میں رکھا گیا تھا اس لئے کالج کی چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے انہیں پریکٹیکل ہال میں پہنچنے کا پیغام کالج کے چپراسی کے ذریعے موصول ہوا..... اس کی آواز سنتے ہی وہ سب اس طرف چل پڑے جس طرف کالج کا واحد پریکٹیکل ہال واقع تھا۔ ہال میں پہنچتے ہی سامنے بیٹھے ٹیچر نے سب کی حاضری لگھی اور انہیں ایک تجربہ کے متعلق کچھ آگاہی دینے لگا۔ وہ سب اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔

تھیوری کے ساتھ ساتھ وہ انہیں چند پریکٹیکل بھی کر کے دکھانے لگا۔ اس کے بعد اس نے باری باری تمام بچوں سے تجربات کروائے جن بچوں کو سمجھ نہ آئی تھی انہیں مزید پریکٹس کرنے کا کہہ کر ہال سے باہر نکل گیا۔ لیکن جاتے جاتے یہ کہہ کر گیا کہ وہ واپس نہیں آئے گا بلکہ سیدھا گھر جا رہا ہے۔ اس کے کلاس سے نکلتے ہی سب نے ایک لمبا سانس لیا اور سب گروپس کی صورت میں اپنے اپنے تجربات کو دوبارہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔

شاء کو سمجھ تو آ گئی تھی لیکن وہ اپنے ایک تجربہ کو دوبارہ کرنے کی خواہش رکھتی تھی۔ فرسٹ ائیر کی طرح وہ اس سال بھی پوزیشن لینے کی کوشش کر رہی تھی وہ چاہتی تھی کہ وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اپنی پوزیشن برقرار رکھے.....

☆.....☆.....☆

جس جگہ کالج کی بلڈنگ تعمیر کی گئی تھی وہ کسی زمانے میں ایک پرانا قبرستان تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ کس طرح لوگوں نے پورے قبرستان پر قبضہ کر کے وہاں قبروں کی جگہ اپنے مکانات تعمیر کر لئے۔ بات ماننے والی تو نہیں تھی لیکن یہ حقیقت اس وقت موجود تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک بڑے کالج کی بلڈنگ بھی وجود میں آ گئی۔ مفت کی زمین کا فائدہ اٹھانے کے چکر میں کالج انتظامیہ نے قبرستان کی اچھی خاصی زمین پر قبضہ جما لیا تھا۔ محکمہ اوقاف والے اس لئے کچھ نہیں کہتے تھے کیونکہ انہوں نے خود ناجائز قبضہ کر کے وہاں اپنے مختلف دفاتر بنا لئے تھے۔ غرض عجیب قصہ تھا کہ جیسے "اندھیر نگری چوپٹ راج"۔

کالج کی بلڈنگ تقریباً چار ایکڑ پر مشتمل تھی اور اس میں بہت سے کلاس رومز اور ایک بڑا پریکٹیکل ہال تھا جس میں بچوں کے تعلیمی نصاب کے لئے اور تجربات میں استعمال ہونے والا سامان پڑا رہتا تھا۔ بائیالوجی کے لئے مختلف جار میں پرندوں اور بہت سے موذی جانوروں کے اجسام حنوط کئے موجود تھے جو بچوں کی تعلیمی آگاہی کے

لئے رکھے گئے تھے۔ان میں ایک درمیانے قد کا انسانی ڈھانچہ بھی ایک جانب فریم میں لٹکایا گیا تھا۔ڈھانچے کا رنگ پیوروائٹ تھا اور اس کے جسم پر تقریباً تمام ہڈیاں مکمل طور پر موجود تھیں۔ظاہر ہے ادھورا ڈھانچہ ان کے کس کام کا۔ یہ ڈھانچہ بھی بچوں کی معلومات کے لئے ہی رکھا گیا تھا۔تمام گروپس پریکٹس کرنے کے بعد آہستہ آہستہ ہال سے کب نکل گئے یہ تو ثناء کو پتہ ہی نہ چلا۔وہ اپنے پریکٹیکل میں اس قدر غرق تھی کہ اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ اس وقت وہ اکیلی ہال میں موجود تھی۔

گاڑی کے ڈرائیور کو اس نے پہلے سے ہی بتادیا تھا کہ آج اسے دیر ہوجائے گی اس لئے جب وہ فارغ ہوگی تو اسے فون کر کے بلالے گی۔کالج کا بوڑھا چوکیدار اسے ہال میں مصروف دیکھ گیا تھا اور اس وقت تمام کلاسوں کا ایک چکر لگانے میں مصروف تھا۔اسے معلوم تھا کہ ثناء ایک ہونہار بچی ہے اور بغیر ضرورت کبھی کالج میں نہیں رکتی لیکن آج جب اس نے دیگر بچوں کو پریکٹیکل ہال سے نکل کر کالج سے باہر جاتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ سب ہال میں اپنا کام نپٹانے میں مصروف تھے۔ثناء اپنے کام میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ کس وقت اس کے پیچھے وہی ڈھانچہ آن کھڑا ہوا تھا جو ایک کونے میں فریم میں لٹکا ہوا تھا۔ثناء کو محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کڑکڑاتی ہوئی چیز اس کے پیچھے موجود ہے اس نے ہلکا سا پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا تو اس کے منہ سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ ایک ڈھانچہ خود چل کر کیسے اس کے پیچھے آسکتا ہے؟ اس کی چیخ سن کر جیسے ہال میں بھونچال آگیا .....دوسرے لمحے اس نے جاگتی آنکھوں سے اسی ڈھانچے کو بڑی تیزی سے واپس اپنی جگہ کی جانب لڑکھڑاتے ہوئے جاتے دیکھا۔اور دوسرے لمحے وہ ایک جمپ لگا کر دوبارہ فریم میں لٹکا دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن دوسری طرف اس کی چیخ کی بازگشت ختم ہوتے ہی بوڑھا چوکیدار ہال کے دروازے پر نمودار ہوا وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اس نے اوپر سے ہی ہال کی طرف سے آنے والی چیخ کو سن لیا تھا اور تیزی سے بھاگتا ہوا نیچے پہنچ گیا تھا۔ثناء اس کے سامنے تھی لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھی خوف سے اس کا رنگ پیلا ہورہا تھا۔اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس نے کوئی بہت ہی انہونی یا ڈراؤنی شے دیکھ لی ہو....."

"کیا ہوا ثناء بیٹا.....؟ تم ٹھیک تو ہو.....؟"

چوکیدار نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا اور ساتھ ہی دائیں ہاتھ سے اس کے کندھے کو ہلایا۔وہ چونکہ پرانا چوکیدار تھا اس لئے کالج کے ہر بچے کے نام سے بخوبی واقف تھا۔"وہ.....وہ.....بابا.....وہ ڈھانچہ۔۔ابھی کچھ دیر پہلے میرے پیچھے کھڑا تھا"۔ثناء نے خوفزدہ نظروں سے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا جہاں دور سے ہی وہی منحوس ڈھانچہ فریم میں اپنی جگہ یوں لٹکا ہوا تھا جیسے کبھی اسے وہاں سے ہلایا تک نہ گیا ہو....."یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹا تم.....وہ تو ایک بے جان اور بے ضرر ڈھانچہ ہے جو بہت عرصے سے اسی جگہ موجود ہے۔اور کئی بار تو میں کسی مجبوری کی وجہ سے اس ہال میں بھی سویا ہوں لیکن مجھے تو کبھی ایسا نہیں لگا کہ اس ڈھانچے نے اپنی جگہ تبدیل کی ہو....."۔چوکیدار نے لمبی تمہید باندھتے ہوئے اسے جواب دیا۔....."لیکن بابا میں قسم سے کہہ رہی ہوں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ میرے بالکل نزدیک کھڑا تھا اور میرے چیخنے پر وہ لڑکھڑاتا ہوا واپس اپنی جگہ پر جا کر لٹک گیا....."۔ثناء نے تھوک نگلتے ہوئے اپنی سچائی کا یقین دلایا۔

بوڑھا چوکیدار اس کو حیرت سے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے لگا کہ وہ کسی وجہ سے اپنی ذہنی حالت کھو چکی ہے۔وہ اسے ہال سے باہر لے آیا اور پھر مختلف برآمدوں سے ہوتا ہوا باہر لان میں تازہ ہوا میں لے آیا۔بیچارا اپنی سمجھ کے مطابق شاید یہ سمجھا تھا کہ شاید ہال میں مختلف کیمیکلز یا حنوط شدہ جانوروں کی بو وغیرہ کی بھی سے اس کے دماغ پر کوئی اثر ہوگیا ہوگا اس لئے اپنے تئیں وہ اسے باہر لا کر فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔لیکن ثناء اس دوران ایک روبوٹ کی مانند چلتی ہوئی باہر نکل آئی تھی اور باہر آکر کچھ دیر تک کھوئی کھوئی نگاہوں

سے ہوا میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اچانک دوبارہ چوکیدار کے مخاطب کرنے پر چونک کر اسے دیکھنے لگی جو اس سے اس کے گھر کا فون نمبر مانگ رہا تھا۔ ثناء کی حالت اب قدرے بہتر تھی شاید وہ اب خوف کی کیفیت سے نکل آئی تھی اس نے اسے نمبر دینے کی بجائے موبائل پر خود ہی اپنے ڈرائیور کو کالج پہنچنے کی تاکید کردی۔ چوکیدار اس دوران اس کے لئے بھاگ کر ایک گلاس پانی لے آیا تھا۔ جو اس نے اسے موبائل واپس رکھتے دیکھ کر پکڑا دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی گاڑی پہنچ گئی وہ ڈرائیور کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گئی۔

چوکیدار اس کے ساتھ کالج کے گیٹ تک اسے چھوڑنے آیا تھا اس نے اس کے ڈرائیور کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ کہیں اس کے گھر کے افراد خوفزدہ ہوکر کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں کیونکہ ابھی تک اسے بھی اصل حقیقت کا پتہ نہیں چلا تھا کہ ہال میں ثناء کے ساتھ دراصل کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس لئے اس نے خاموشی کو ہی بہتر جانا۔

☆.....☆.....☆

گھر پہنچ کر ثناء خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور روزانہ کے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد رات کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹنے کے لئے چلی گئی۔ اس کا کمرہ باقی کمروں سے ذرا ہٹ کر واقع تھا ایسا اس نے اس لئے کیا تھا تاکہ شور شرابے سے بچ کر سکون کے ساتھ اپنی پڑھائی کرسکے۔ جو ملازمین ان کے ہاں کام کرتے تھے ان کے بچے بھی اکثر گھر میں ہی کھیلتے کودتے رہتے تھے جس سے گھر میں ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔ لیکن اس نے الگ تھلگ کمرہ لے کر کسی قدر شور سے جان چھڑالی تھی۔ اپنا ہوم ورک مکمل کرکے اس نے لائٹ آف کی اور اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ اور تھوڑی دیر میں اس کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے۔

رات کا نہ جانے کونسا پہر ہوگا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے بالوں میں اپنا ہاتھ پھیر رہا ہو۔ اور اس کے بکھرے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کررہا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ایسا کیوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے جو انگلیاں اس کے بالوں میں گردش کررہی تھیں ان میں سختی آتی جارہی تھی اور پھر تکلیف اس قدر بڑھی کہ اس نے گھبرا کر اپنی پوری آنکھیں کھول دیں۔.....اُف خدایا.....یہ کیا تھا.....؟ اس کے بالکل سامنے وہی منحوس ڈھانچہ اس کے جسم پر آدھا جھکا ہوا اپنے استخوانی ہاتھ کی انگلیوں سے اس کے چہرے سے بال ہٹانے میں مصروف تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی عاشق اپنے بہت ہی عزیز محبوب کے چہرے سے اس کی زلفوں کو ہٹانے کی کوشش کررہا ہو.....

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا جبڑا ابھی یوں ہل رہا تھا جیسے وہ ساتھ ساتھ کچھ کہنے کی کوشش بھی کررہا ہو۔ ثناء آنکھیں کھولے کچھ لمحوں تک لاشعوری کیفیت میں لیٹی رہی اور پھر جیسے ہی اس کے شعور نے اصل حقیقت دکھائی اس کی چیخ سے کمرہ گونج اٹھا.....رات کا پہر.....ایک بند کمرہ.....اور پھر ایک زوردار چیخ.....گھر میں بھونچال لانے کے لئے کافی تھی۔ اس کی چیخ کی بازگشت ابھی کمرے میں گونج ہی رہی تھی کہ اس کی امی اور ابو بھاگتے ہوئے کمرے کے سامنے پہنچے اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر کمرے سے ثناء کے چیخنے کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ باہر سے مسلسل دروازہ پیٹنے کی آوازیں بڑھتی جارہی تھیں اور پھر اس شور سے گھر کے تمام نوکر ثناء کے کمرے کے سامنے اکٹھے ہوگئے۔

کچھ دیر تک دروازہ نہ کھلنے پر باہر سے دروازہ توڑ دیا گیا اور یہ دیکھ کر اس کے والدین کی حالت غیر ہوگئی کہ کمرے میں موجود بیڈ الٹا ہوا پڑا تھا ہر چیز اپنی جگہ پر موجود نہ تھی۔ ثناء کمرے کے وسط میں ایسی حالت میں پڑی تھی جیسے کسی نے زمین پر پٹخ دیا ہو۔ ایک کونے میں ایک ہڈی موجود تھی جو دیکھنے میں ایک انسانی ہاتھی کی چھوٹی انگلی کی لگ رہی تھی۔ انہوں نے ثناء کو جلدی سے بیڈ پر لٹایا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے دوبارہ چیخیں نکلنے لگیں۔ وہ ابھی تک اسی کیفیت میں تھی جو اس پر طاری ہوچکی تھی۔ وہاں موجود سب لو

گ اس کی یہ حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شام کو تو بالکل ٹھیک تھی پھر اسی وقت اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا.....؟ ثناء کے ابو نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اپنے ایک دوست ڈاکٹر کو فون کردیا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ اس وقت کمرے میں موجود ثناء کو ایک انجکشن دے چکا تھا۔ اس نے اس کی حالت دیکھ کر یہ بتایا کہ اس نے رات کو شاید کوئی بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا اور شاید اس کا اثر اس وقت اس کے دماغ پر ہوگیا ہے اس لئے کچھ دیر آرام کرے گی تو بالکل ٹھیک ہوجائے گی اور اس وقت نیند کا انجکشن دینے سے یہ رات بھر آرام سے سوتی رہے گی اور انشاء اللہ صبح بالکل ٹھیک کالج جائے گی۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر اجازت لے کر واپس چلا گیا۔ وہ رات ثناء کے امی ابو نے اس کے کمرے میں ہی گزاری۔ لیکن رات بھر وہ سکون سے سوئی رہی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے روز اس کی طبیعت کافی بہتر تھی لیکن وہ کالج نہیں گئی۔ اور دن بھر اپنے کمرے میں آرام کرتی رہی اس دوران اس کی امی اس کے ساتھ ہی موجود تھیں۔ وہ اس سے رات پیش آنے والے واقعہ کے متعلق پوچھ چکی تھیں لیکن ثناء نے جو کچھ بتایا تھا اسے سن کر انہیں یہی لگا تھا کہ ڈاکٹر نے سچ کہا تھا کہ اس نے رات کو سوتے میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا اس لئے ڈر گئی ہوگی۔

لیکن ان کے اپنے دل میں ایک خلش سے تھی کہ کمرے کے کونے میں موجود جو انسانی انگلی کی ہڈی انہیں ملی تھی اس کا کیا بھید ہے؟ یہ بات انہوں نے ڈاکٹر سے بھی چھپالی تھی کیونکہ یہ بچی کا معاملہ تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ بات پورے محلے میں پھیل جائے کہ ان کی بیٹی کے ساتھ ایسا کوئی عجیب وغریب واقعہ پیش آچکا ہے۔ جس کے نتیجے میں ان کی بیٹی کو کالج اور محلے میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لئے وہ خاموشی سے اس بات کو دبا چکے تھے۔

دن گزرتے رہے۔ ثناء اب پہلے سے بہتر تھی اور کالج جانے لگی تھی۔ لیکن وہ پوری کوشش کرتی تھی کہ پریکٹیکل ہال میں کبھی بھی تنہا نہ جائے وہ گروپس کے ساتھ ہی ہال میں جاتی تھی۔ چوکیدار بھی اس بات کو بھول چکا تھا اور اس نے بھی کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ سیکنڈ ائیر کے امتحانات کی ڈیٹ آگئی تھی اس لئے کام بڑھ گیا تھا۔ ثناء کو اب کافی دیر تک راتوں کو جاگ کر تیاری کرنی پڑ رہی تھی لیکن اس کے لئے اس نے اپنی امی کو اپنے کمرے میں سلانے کے لئے انتظام کرلیا تھا۔ وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی پڑھتی رہتی تھی اور اس کی امی رات کے کچھ وقت تک جاگتی رہتی تھیں پھر دن بھر کے کاموں اور گھر کی دیکھ بھال میں تھک جانے کی وجہ سے سوجاتی تھیں۔ لیکن ثناء دیر تک پڑھتی رہتی تھی اسے کم از کم کمرے میں اکیلے پن کا احساس تو نہ ہوتا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ رات کے تقریباً سوا ایک بجے کا وقت ہوگا جب کالج کے پریکٹیکل ہال میں فریم پر لٹکے اس ڈھانچے کے جسم میں ہلچل ہوئی اور دوسرے لمحے وہ یوں فریم سے اچھل کر زمین پر آگیا جیسے کوئی جیتا جاگتا شخص ہو۔ پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اور اپنی ہڈیوں کو کڑکڑاتا ہوا ہال کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا اس کے چلنے کا انداز یوں تھا جیسے کوئی پولیو کا مریض بمشکل چلنے کی کوشش کررہا ہو۔ ہال کا دروازہ بند تھا.....لیکن وہ یوں اس کی جانب بڑھ رہا تھا جیسے اس کے نزدیک پہنچتے ہی کوئی باہر سے اس کے لئے دروازہ کھول دے گا لیکن دوسرا لمحہ بہت حیرت ناک تھا کہ وہ اس دروازے میں سے یوں نکل گیا جیسے وہ دروازہ نہ بلکہ کوئی ریشمی پردہ ہو جسے ہٹا کر وہ باہر نکل گیا ہو۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ باہر لان میں پہنچا اور پھر اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کردیا۔

اس کے ہاتھ میں چار انگلیاں تھیں اور چھوٹی انگلی غائب تھی۔ ہوا میں ہاتھ بلند ہوتے ہی جیسے اس کا جسم اوپر اٹھنا شروع ہوگیا اور پھر ایک حد تک پہنچ کر فضا میں پرواز کرنے لگا۔ انسانی نگاہوں سے زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے وہ زمین پر موجود دوسرے لوگوں کی نظروں سے محفوظ تھا اور ویسے بھی اس وقت رات کا سوا ایک بج رہا تھا

اور کسی کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ وہ بغور آسمان کی جانب دیکھ کر اپنا وقت ضائع کرتا۔ ویسے بھی رات کے وقت ہر کوئی آرام کی غرض سے نیند میں کھویا ہوتا ہے۔ ڈھانچہ فضا میں پرواز کرتا تیزی سے ایک جانب اڑتا جارہا تھا اس کی رفتار درمیانی تھی اس فضا میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو یوں چلا رہا تھا جیسے ماہی گیر اپنی کشتی کو چپوؤں کی مدد سے پانی پر دھکیلتے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی انسانی آنکھ یہ منظر دیکھ لیتی تو شاید ڈر کے مارے اس کا سانس رک جاتا۔ بڑا ہی ڈراؤنا اور خوفزدہ کردینے والا منظر تھا۔

رات کے پہر..... سفید رنگ کا ایک انسانی ڈھانچہ..... فضا میں تیرتا ہوا جارہا تھا..... یہ منظر دیکھ کر اچھا بھلا انسان پریشان ہوسکتا تھا۔ لیکن رات کی تاریکی میں لوگ ایسا منظر دیکھنے سے محروم رہ گئے تھے۔ ڈھانچہ تیزی سے تیرتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا جس طرف ثناء کا گھر تھا۔ اُف میرے خدایا..... یہ کیا تھا.....؟ وہ ڈھانچہ سیدھا ثناء کے گھر کے دالان میں اتر چکا تھا۔ گھر میں کوئی کتا وغیرہ نہ تھا ورنہ شاید وہ اس کی موجودگی سب پر آشکار کرچکا ہوتا۔ تمام ملازمین اپنے اپنے کوارٹروں میں آرام کررہے تھے۔ اور ثناء کے ابو بھی اپنے کمرے میں تنہا سوئے ہوئے تھے کیونکہ ثناء کی امی اس کے کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ ڈھانچہ زمین پر لڑکھڑاتے ہوئے اس طرف بڑھنے لگا جس طرف ثناء کا کمرہ موجود تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ پہلے بھی اس کے کمرے کی طرف جاچکا ہو۔

☆.....☆.....☆

رات کے پونے دو بج چکے تھے۔ ثناء کو اب نیند آنے لگی تھی اس نے تمام کتابوں کو ایک جگہ ترتیب سے رکھا اور پھر لیٹنے کے لئے اپنی امی کے ساتھ بیڈ پر جاکر لیٹ گئی۔ اس کی امی گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھیں۔ ثناء کو بھی اپنی آنکھیں بوجھل محسوس ہونے لگیں اور دوسرے لمحے وہ بھی نیند کی وادیوں میں کھوچکی تھی۔ نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ کھلی تو اسے پیاس محسوس ہوئی اس نے ساتھ رکھی تپائی پر پانی کے جگ کو دیکھا تو وہ خالی تھا شاید اس کی امی کو جگ بھر کر لانا یاد نہ رہا تھا..... پیاس سے اس کا حلق خشک ہورہا تھا اس نے اپنی امی کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور خود جگ اٹھا کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ کمرے سے باہر نکل کر اسے کچھ خوف سا محسوس ہوا جیسے کوئی اسے اپنی آنکھوں سے گھور رہا ہو۔ لیکن دور دور تک کوئی بھی موجود نہ تھا۔ اس لئے وہ جگ ہاتھ میں لئے کچن کے اندر داخل ہوگئی۔ کچن کی ایک کھڑکی باہر دالان کی جانب بھی کھلتی تھی اسے اچانک ایسا لگا جیسے کوئی ایک دم کھڑکی کے پاس سے گزرا ہو۔ صرف سفید رنگ کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے جگ رکھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا تو دور تک کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس نے اپنا وہم سمجھتے ہوئے سر کو جھٹکا اور دوبارہ جگ اٹھانے ہی لگی تھی کہ جیسے کسی نے اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔

یوں لگا جیسے کوئی بڑے پیار سے اس کا نام لے کر پکار رہا ہو۔ گو کہ آواز بہت ہلکی تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے آواز جھنکار والے اسپیکروں سے آرہی ہو اس میں ایک ہلکی سی گونج تھی۔ وہ حیران ہوکر بڑے غور سے اس آواز کو سننے لگی جو باہر کھڑکی کی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے ہلکا سا کھڑکی کا دروازہ کھول کر باہر جھانکنا چاہا تو دوسرے لمحے بڑے زور سے کھڑکی کا پٹ بند ہوا اور وہ اچھل کر گرتے گرتے بچی۔ وہ کچن سے باہر نکلنے کے لئے دروازے کی جانب بھاگی لیکن وہ پتہ نہیں کس وقت بند ہوچکا تھا۔

دوسرے لمحے کچن کی لائٹ بند ہوگئی اور صرف کھڑکی سے چاند کی روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ خوفزدہ ہوکر چیخنے لگی لیکن اسے یوں لگا جیسے آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی ہو۔ دوسرا لمحہ اس کے لئے مزید بھاری تھا جب اس نے کھڑکی کے باہر اسی ڈھانچے کو موجود پایا اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ڈھانچہ اس کھڑکی کے راستے یوں اندر داخل ہوگیا جیسے وہ کسی پردے کے پیچھے سے داخل ہوا ہو۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پیر چلانے لگی لیکن اسی اثناء میں وہ منحوس ڈھانچہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

دوسرے لمحے اس ڈھانچے نے اسے بڑی مضبوطی سے دبوچ لیا اور اس کی کمر کے اردگرد اپنا استخوانی

ہاتھ لپیٹ لیا۔ ثناء کا دم گھٹنے لگا اس نے خود کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کا جسم کسی شکنجہ میں کس دیا ہو۔ دوسرے لمحے اس ڈھانچے نے اس کے خوبصورت بالوں کو کچر کچر چبانا شروع کر دیا..... وہ انسانی بالوں کو یوں کھا رہا تھا جیسے کوئی سویاں یا شیر خورمہ کھا رہا ہو..... ثناء تکلیف سے چیخ رہی تھی لیکن اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بالوں میں کھنچاؤ کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ بڑی بے بسی سے اپنے بال چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس ڈھانچے نے اسے بڑی مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔

جب انسان کی جان پر بنی ہو تو وہ آخری لمحے تک کوشش کرتا ہے اور یہی سوچ کر ثناء نے خود کو اس ڈھانچے سے آزاد کروانے کے لئے اپنا ایک ہاتھ کسی نہ کسی طرح اس کی گرفت سے چھڑایا اور ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر مار دیا۔

ڈھانچہ شاید اس کے لئے تیار نہ تھا اور ثناء کے مکے نے اس کا جبڑا دوسری جانب گھما دیا اور اس کے منہ سے ثناء کے بال نکل گئے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی گرفت کچھ ڈھیلی ہوئی تو ثناء کو مزید موقعہ مل گیا اور اس نے پے در پے مکوں اور ٹانگوں سے اس پر ہلا بول دیا۔ اب اس کا خوف کچھ کسی قدر دور ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے دوبارہ چیخنے کی بجائے اس ڈھانچے پر مکوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ ڈھانچہ کا علم شاید بند کمرے میں بے بس ہو جاتا تھا اس لئے وہ بھی خاموشی سے مار کھا رہا تھا۔

ثناء پر تو ایک وحشت طاری ہو چکی تھی اسے اس بات کا بھی ہوش نہ رہا تھا کہ وہ رات کے وقت ایک ہڈیوں کے ڈھانچے پر حملہ آور ہے ورنہ اس بات کا تصور ہی لرزا دینے والا ہوتا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اسے کچھ ہوش آیا تو دیکھا کہ اس کے سامنے وہی منحوس ڈھانچہ ایک ہڈیوں کے ڈھیر کی صورت میں اس کے سامنے پڑا تھا۔ کچھ ہڈیوں کا برادہ بن چکا تھا۔ مکمل ہوش میں آتے ہی اس نے کچن کا دروازہ کھولنا چاہا تو وہ با آسانی کھل گیا شاید وہ بھی اس ڈھانچے کے زیر اثر تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ اس واقعہ میں گھر کا کوئی بھی فرد یہ نہ جان سکا تھا کہ رات کے اس پہر اس گھر میں کیا انہونی ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ ثناء کے ابو اور امی بھی اپنے کمروں میں بے سدھ سوتے رہے۔ ثناء کچن سے نکل کر سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور خاموشی سے اپنی امی کے ساتھ لیٹ گئی۔ چونکہ اب اس کا تمام ڈر ختم ہو چکا تھا اس لئے اس نے کچن کا دروازہ باہر سے بند کر کے اس ڈھانچے کی ہڈیوں کو وہیں پڑا رہنے دیا تھا تاکہ صبح سب لوگوں کو ڈھانچے کا یہ انجام دکھا کر اپنی بہادری اور سچائی کا یقین دلا سکے۔

اس سارے واقعہ کو گزرے چند سال ہو گئے ہیں لیکن اب بھی کبھی کبھی جب ثناء کو وہ خوفناک رات اور وہ منحوس ڈھانچہ یاد آتا ہے تو وہ خوف سے ایک جھرجھری لے کر اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوتی ہے جس نے اسے اس وقت اتنی ہمت دے دی تھی کہ وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ورنہ وہ ڈھانچہ اس کے بالوں کے ساتھ ساتھ اس کا سر بھی چبا جاتا۔ لیکن اس سارے واقعہ سے اس کے سارے خاندان کے افراد اس کی بہادری کے قائل ہو گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے پولیس کی مدد سے اس سارے واقعہ کو خاموشی سے دبا دیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں یا محلے میں کسی قسم کی خوف کی فضا قائم ہو جائے اور لوگ خوفزدہ ہو کر افراتفری کا شکار ہوں۔ اس میں چونکہ پولیس والوں کا بھی فائدہ تھا اس لئے انہوں نے بھی خاموشی کو ہی بہتر جانا۔ کالج کی انتظامیہ آج تک حیران تھی کہ آخر ان کے پریکٹیکل ہال میں موجود وہ ڈھانچہ کہاں غائب ہو گیا۔ شاید اسے کوئی چرا کر لے گیا یا زمین کھا گئی۔ چونکہ وہ اتنا زیادہ مہنگا نہیں تھا کہ اس کے لئے سالوں پولیس کو کالج کے چکر لگوائے جاتے اس لئے انتظامیہ نے صبر کر کے دوسرا ڈھانچہ منگوا کر اسی فریم میں لٹکا دیا۔ صرف کالج میں بوڑھا چوکیدار ہی جانتا تھا کہ وہ ڈھانچہ آخر کہاں گیا.....؟؟ لیکن چونکہ وہ اب کالج سے ریٹائر ہو چکا تھا اس لئے اس نے بھی اپنے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا لی تھی۔

کالا عمل

افشاں رمضان- پنڈ دادنخان

ارشاد باری تعالیٰ ھے کہ ایمان والی عورتوں کو کھہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو (محرم کے علاوہ کسی پر) ظاھر نہ کرو۔ (سورہ نور آیت نمبر 30-31)

سبق آموز اور ایمان افروز حقیقت جسے پڑھنے والے برسوں نہ بھول پائیں گے

میں اپنی روٹین سے بہت خوش تھا۔ میرے الٹر دوست مجھے ٹوکتے تھے کیونکہ میں ان کے ساتھ شام میں چہل قدمی پر جانا پسند نہیں کرتا تھا بلکہ مجھے تو آدھی رات یا رات کے آخری پہر میں جوگنگ کرنا بے حد پسند تھا۔

ہاہاہا..... بات تو حیرانگی کی ہے ناں لیکن حقیقت یہی ہے۔ اور اس لحاظ سے میں خوش قسمت ثابت ہوا۔ پہلے شہر میں نوکری کرتا رہا جس کی وجہ سے رات کے وقت با آسانی پارک میں جا کر جاگنگ کرتا اور اب ٹرانسفر کے بعد شہر سے تھوڑی دور ایک گاؤں میں چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ مجھے لگا کہ گاؤں کے دقیانوسی لوگ میری جاگنگ پر اعتراض کریں گے لیکن مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ میری جاگنگ سے خوش تھے۔ خیر میری زندگی کا سفر تو یونہی چلتا رہا۔ صبح دفتر جاتا واپسی پر کھانا لیتا اور گھر آ کر نوش فرمانا اس کے بعد

باقی کام..... اور پھر.....

☆.....☆.....☆

''ارے واہ..... واٹس دا گریٹ..... سرپرائز.....'' ضامن کے ہاتھ میں انگیجمنٹ رنگ دیکھ کر کزا حیران رہ گئی۔

''میڈم کنٹرول کریں سب سے بڑا سرپرائز ابھی رہتا ہے۔'' ضامن نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ کیا ہے.....'' کزا نے بے چینی سے پوچھا۔

''اور وہ ہے کہ ماما اور بابا اگلے ہفتے لاہور آرہے ہیں..... تمہارا ہاتھ مانگنے میرے لئے۔'' ضامن نے فخریہ انداز میں کالر اٹھایا۔

''اوہ..... گاڈ تھینک یو سو مچ..... مجھے تو یہ سب ایک خواب لگ رہا ہے۔'' کزا خوشی سے نہال ہو چکی تھی۔

''آج سے ہی شاپنگ اسٹارٹ کردو..... رشتے کے ساتھ ساتھ شادی کی تاریخ بھی طے کرنی ہے۔'' ضامن نے سوپ کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''اتنی جلدی کیوں.....؟'' کزا کی آنکھیں ابل پڑیں۔

کیونکہ ماما بابا نے واپس بھی جانا ہے محترمہ اور تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ ضامن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں چلو ٹھیک ہے.....'' کزا ابھی سمجھ چکی تھی۔ اچھا خیر۔ ''چلو بریک ختم ہونے والی ہے۔'' ضامن نے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا تو کزا بھی اپنا پرس لے کر کھڑی ہوگئی اور دونوں کینٹین سے نکل کر اپنے اپنے کیبن کی طرح چل پڑے۔ کزا اور ضامن ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے کولیگ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے دوست اور اب میاں بیوی بننے جارہے تھے۔ اس لئے وہ دونوں ہی اپنی میریج لائف سے مطمئن تھے۔ دفتر سے چھٹی ہونے کے بعد کزا اپنے گھر جانے لگی۔

''گھر جارہی ہو.....؟'' کزا کو گاڑی نکالتا دیکھ کر ضامن نے پوچھا۔

''ہاں..... ماما کو گریٹ نیوز بھی تو دینی ہے کہ فائنلی ضامن کے گھر والے آرہے ہیں۔'' کزا کی بات پر ضامن مسکرادیا۔

''کیوں کوئی کام تھا.....؟'' ضامن کو وہیں کھڑا دیکھ کر کزا نے پوچھا۔

''ہاں..... میں نے سوچا تھا۔ آج تمہیں اپنے گھر لے چلوں۔ پھر سیٹنگ بھی تو کرنی ہے۔'' ضامن نے بائیک کا اسٹینڈ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''آئیڈیا تو بہت اچھا ہے۔ ویٹ ویٹ..... میں ماما کو فون پر بول دیتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور گاڑی ڈرائیور لے جائے گا۔'' کزا نے کار لاک کی اور ضامن کی بائیک پر آکر بیٹھ گئی۔

ضامن نے بائیک اسٹارٹ کی اور شہر سے دور گاؤں کی طرف دوڑادی۔ کچھ دیر مسافت کے بعد ضامن اپنے مکان کے بالکل سامنے تھا۔

کزا اور ضامن مکان میں داخل ہوئے چھوٹے سے مکان کو ضامن نے بڑی سلیقہ مندی سے سجایا ہوا تھا جس پر کزا تعریف کئے بنا رہ نہ سکی۔ ضامن نے جلدی سے چائے بنائی اور ساتھ ہی بسکٹ بھی چائے کے ساتھ کزا کے سامنے رکھا تو کزا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

شام ہونے والی تھی ضامن کزا کو گھر چھوڑنے جانے لگا۔ ''سیٹنگ کرلو گی نا.....'' ضامن نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں جی..... بڑے آرام سے۔ ضامن ایک بات تو بتائیں۔'' کزا نے ضامن سے کہا۔ جس پر ضامن نے ہاں میں گردن ہلادی۔

''یار یہ گاؤں والے مجھے اتنی حیرانگی سے کیوں دیکھ رہے تھے۔''

''یار اصل میں اس گاؤں میں ایک بات ہے وہ یہ کہ اس گاؤں میں لڑکیاں نہیں ہیں۔

مطلب کنواری لڑکیاں نہیں ہیں بلکہ میرے تو خیال میں شادی شدہ بھی بہت بڑی عمر کی ہیں، غرضیکہ یہاں پندرہ سے پچیس سال کی کوئی لڑکی نہیں ہے۔''

''ایسا کیوں ضامن.....؟'' کزا نے اچنبھے

سے پوچھا۔

''پتہ نہیں کزا..... میں جب یہاں آیا تو ایک گاؤں والے نے بتایا تھا۔ بس میرا لینا دینا نہیں تھا اس لئے میں نے گہرائی میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔''

ضامن نے کزا کے گھر کے سامنے بائیک روکی تو کزا بائیک سے اتری اور خدا حافظ کہتے ہوئے گھر میں چلی گئی اور پھر ضامن نے بھی واپسی کی راہ لی۔

☆.....☆.....☆

معمول کے مطابق ضامن رات کے تین بجے بیدار ہوا اور جاگنگ پر جانے کے لیے جاگرز پہنے۔ گھر کو لاک کیا اور ہاتھ جیکٹ میں ڈال کر گاؤں کی گلیوں میں دوڑنے لگا۔ سردی کی راتوں میں جاگنگ کرنا اسے حد سے زیادہ پسند تھا۔ وہ دوڑتا ہوا ٹیوب ویل کے قریب پہنچ گیا۔ ٹیوب ویل پر پہنچ کر وہ پانچ منٹ کے بریک کے لیے رک گیا۔ اپنے ٹراؤزر سے گرم پانی کی بوتل نکال کر پینے لگا کہ اچانک اس کی نظر ایک آدمی پر پڑی، وہ آدمی ہاتھ میں بیلچہ اٹھائے کہیں جا رہا تھا۔

''اس وقت..... کون ہو سکتا ہے..... پہلے تو کبھی نہیں دیکھا اس کو۔'' ضامن نے بوتل کا ڈھکن بند کرتے ہوئے سوچا۔ پھر اس نے بوتل جیب میں رکھی اور اس آدمی کے پیچھے پیچھے دبے قدموں فاصلہ رکھ کر چلنے لگا۔

وہ آدمی ضامن سے بہت فاصلے پر تھا۔ ضامن آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ایک درخت کے قریب پہنچ کر اس آدمی نے بیلچے سے زمین کھودنا شروع کی۔ ضامن ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس آدمی نے بہت بڑا گڑھا کھود لیا تھا پھر اس نے بیلچہ سائیڈ پر رکھ دیا اور اپنی قمیض کی جیب سے کوئی پڑیا نکال کر گڑھے میں دفنانے لگا۔

ضامن بڑے غور سے اس کی سرگرمیاں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس آدمی نے گڑھا بھرنا شروع کیا۔ گڑھا بھر جانے کے بعد اس نے سوکھی گھاس گڑھے پر رکھ دی وہ آدمی بڑی صفائی سے سارا کام کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنا بیلچہ اٹھا کر واپس چل پڑا۔

صامن بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ ضامن نے جاگرز پہنے تھے جس کی وجہ سے ضامن کی پیر کی چاپ سنائی نہ دے رہی تھی۔

وہ آدمی گلیوں سے ہوتا ہوا ایک ٹوٹے ہوئے مکان پر جا کر رک گیا۔ ضامن جلدی سے ایک طرف چھپ گیا کیونکہ وہ آدمی چاروں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اس مکان مین داخل ہو گیا اور اندر سے کنڈی لگا لی۔

ضامن آگے کو بڑھا تا کہ اس کا مکان دیکھ سکے۔ دروازے پر پہنچ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ وہ مکان ایک بڑھیا کا تھا اور اس مکان میں ساٹھ سالہ بڑھیا کے علاوہ کوئی نہیں رہتا تھا۔ ضامن اسی سوچ میں گم اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

☆.....☆.....☆

''آج چھٹی کیوں کی.....؟'' ضامن نے نوڈلز پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''بس یار طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... بوجھل بوجھل سا جسم ہو رہا تھا اور سر میں بھی درد ہے۔'' کزا نے کروٹ لیتے ہوئے موبائل بائیں کان سے لگایا۔

''اچھا..... میڈیسن لی.....؟''

''ہاں لی ہے۔''

''چلو تم آرام کرو..... میں کھانا کھا لوں.....''

ضامن نے کزا کو خدا حافظ کہا اور لنچ کرنے لگا۔ آج کزا آفس سے چھٹی پر تھی اس لئے ضامن بھی ہاف ڈے لے کر آ گیا۔ کھانا کھا کر وہ بور ہونے لگا اس لئے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

وہ بڑھیا کے مکان کے پاس پہنچ گیا تو یک دم رک گیا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ اپنے اکلوتے دوست کے گھر گیا۔

''ٹھک ٹھک.....'' ضامن نے لکڑی کے دروازے پر دستک دی۔

''کون.....؟''

''ضامن ہوں..... سانول ہے؟'' ضامن نے

پوچھا۔تھوڑی دیر بعد سانول دروازہ کھول کر باہر آ گیا تو ضامن اور سانول چائے پینے ڈھابے پر چلے گئے۔

''سانول۔مکان نمبر 13 میں کون رہتا ہے۔''

ضامن نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے پوچھا۔

''مکان نمبر 13.....ایک مائی رہتی ہے.....''

سانول نے سر کھجا کر کہا۔

''اور کون رہتا ہے.....؟'' ضامن نے سوال سے پوچھا۔

''بس.....''

''یار ایک بات نہیں سمجھ آ رہی.....کل رات میں نے اس مائی کے گھر ایک آدمی جاتے دیکھا تھا بلکہ.....'' ضامن نے رات والا سارا واقعہ سانول کو سنا دیا۔''میں اماں سے کہوں گا وہ جا کر پوچھے گی بلکہ کیوں نا ہم وہ گڑھا جا کر دیکھیں۔'' سانول کی بات سن کر ضامن نے رضامندی کا اظہار کیا۔

اور وہ دونوں جلدی سے اس گڑھے تک پہنچ گئے۔سانول نے ایک نوکیلی لکڑی کی مدد سے گڑھے میں سوراخ کیا۔پھر آہستہ آہستہ انہوں نے گڑھے کو گہرا کھود دیا۔لیکن وہ تو بالکل خالی تھا اس میں مٹی کے سوا کچھ نہیں تھا۔تھک ہار کر ضامن اور سانول وہیں بیٹھ گئے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے یار میں نے خود دیکھا تھا وہ آدمی اس گڑھے میں کچھ چھپا رہا تھا'' ضامن نے گڑھے کی طرف اشارہ کیا کہ اتنے میں ضامن کا فون بج گیا تو وہ سانول سے اجازت لے کر گھر آ گیا اور بستر پر لیٹ گیا پھر کب اس کی آنکھ لگی کچھ پتہ ہی نہ چلا پھر موبائل کی رنگ ٹون نے ضامن کو جگایا۔

کزا کی 16 مس کالز آ چکی تھیں۔ضامن آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے،ضامن جلدی سے اٹھا منہ ہاتھ دھویا اور بیٹھ کر کزا کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''ہیلو.....السلام علیکم.....'' ضامن نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔کزا کی فرینڈ بات کر رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے انجانی سی آواز آئی۔

''او کے.....کزا کہاں ہے۔''

''کزا.....تمہیں نہیں پتہ کیا۔''

''کیا نہیں پتہ۔'' ضامن نے ناسمجھی سے کہا۔

''کزا کی ڈیتھ ہو گئی ہے ابھی چھ گھنٹے پہلے جنازہ تھا اس کا۔'' کزا کی سہیلی کے الفاظ ضامن پر بم کی طرح گرے،ضامن کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا اور وہ تیورا کر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

''صبر کر یار.....خدا کو یہ ہی منظور تھا۔'' سانول نے ضامن کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا پر ضامن کے آنسو تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''اس لڑکی نے کبھی اعتراض نہیں کیا کہ میں غریب ہوں وہ امیر ہے.....بلکہ وہ میرے کرائے کے مکان کو جنت بنانے کا کہتی تھی۔کزا نے وعدہ خلافی کی ہے ساتھ مرنے کی قسم توڑی ہے میں کبھی معاف نہیں کروں گا کزا کو۔'' ضامن دھاڑیں مارنے لگا۔''اس بیچاری کو کیا کہتے ہو۔قصور تو اصل میں تمہارا ہے۔''

''میرا قصور.....؟'' ضامن آنسو صاف کر کے سانول کو دیکھنے لگا۔

ہاں.....لوگوں کا کہنا ہے کہ اس گاؤں میں کوئی کنواری لڑکی نہیں رہ سکتی۔تم پھر بھی کزا کو یہاں لے آئے.....یہ گاؤں آسیبی ہے سانول کے رویے میں سختی آ گئی تھی۔

''میں سمجھا نہیں.....''

''ضامن 9 سال سے اس گاؤں سے ہر لڑکی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ہر لڑکی پراسرار طور پر مر جاتی ہے جیسے کزا فوت ہوئی۔جب مولوی صاحب نے عمل کیا تو پتہ چلا کہ یہ گاؤں آسیبی ہے ایک زبردست آسیب یہاں مسلط ہو گیا ہے۔تب سے یا تو لوگ اپنی بیٹیوں کو رشتے داروں کے گھر بھیج دیتے ہیں یا پھر بہت جلدی شادی کر دیتے ہیں۔غرضیکہ کنواری لڑکی ایک منٹ بھی یہاں

نہیں رہ پاتی۔'' سانول نے تفصیل سے بتایا جس پر ضامن کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر سانول اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا اور ضامن کرسی پر رکھے کزا کے کیچر دیکھنے لگا۔ اسے یاد ہے جب کزا نے کنگھی کرنے کے لیے کیچر اتارا تھا کیونکہ بائیک پر اس کے بال بکھر گئے تھے۔ واپسی پر وہ جلدی میں کیچر کرسی پر بھول گئی تھی۔ ضامن وہ کیچر اٹھا کر رونے لگا۔

کزا کی باتیں اسے بری طرح تڑپا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر یونہی آنسو بہانے کے بعد وہ کیچر جیب میں رکھ کر گلیوں میں نکل گیا۔ وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر گھومنے لگا۔ گھڑی پر نظر دوڑائی تو رات کا دوسرا پہر شروع ہونے والا تھا۔

ضامن اسی ٹیوب ویل کے کنارے آ کر بیٹھ گیا۔ الو اور چمگادڑوں کی ملی جلی آوازیں ضامن کے کانوں میں پڑیں تو اس نے سر اٹھا کر چاروں اطراف دیکھا کہ اچانک اسے جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی تو اس نے ہمت کی اور جھاڑیوں کی جانب چل پڑا جھاڑیوں میں عجیب سی حرکات ہو رہی تھیں۔ ضامن نے آگے بڑھ کر فوراً ہی جھاڑیاں ہٹائیں تو وہاں کوئی عورت بیٹھی کچھ کھا رہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' ضامن نے اس عورت سے پوچھا۔ جو ضامن کو دیکھ کر اٹھ کر جانے لگی تھی۔ اس عورت نے ایک نظر ضامن کو دیکھا اور پھرتی سے اٹھ کر ایک طرف کو بھاگنے لگی۔ ضامن کو دال میں کچھ کالا لگا تو وہ بھی اس عورت کے پیچھے ہولیا۔ وہ عورت تقریباً بوڑھی سی لگ رہی تھی وہ کمر جھکا کر تیزی سے ایک مکان میں گھس گئی۔

ضامن کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ وہ مکان نمبر 13 تھا۔ وہ آنکھیں پھٹرائے وہیں کھڑا رہا، پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے واپس مڑا اور جھاڑیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔

ضامن نے جھاڑیاں ہٹا کر دیکھا تو وہاں خون پڑا تھا۔ ضامن نے غور کیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک گوشت کا لوتھڑا ہے۔ یک دم اس کو قے محسوس ہوئی لیکن خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے وہ لوتھڑا اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا اور سانول کے گھر آ گیا۔

سانول اور ضامن موٹر سائیکل پر سوار ہو کر شہر روانہ ہوئے ضامن چاہتا تھا کہ اس بڑھیا کا راز جان سکے۔ شہر میں سرکاری اسپتال کھلا ہوا تھا۔ ضامن جلدی سے لیبارٹری گیا اور وہ گوشت کا لوتھڑا لیب کے حوالے کیا۔ سانول اور ضامن ویٹنگ ایریا میں بیٹھ کر رپورٹ کا انتظار کرنے لگے۔

''ڈاکٹر آپ کو بلا رہے ہیں۔'' نرس نے ضامن سے کہا اور وہ دونوں فوراً ڈاکٹر کے آفس میں چلے گئے۔

''یہ آپ کو کہاں سے ملا۔'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''ہمارے گاؤں میں سڑک کنارے پڑا تھا۔ کیوں کیا ہوا ڈاکٹر۔'' ضامن نے ڈاکٹر کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن آپ کو اتنی دلچسپی کیوں ہوئی اس لوتھڑے سے۔'' ضامن نے پوچھا۔

ڈاکٹر تفصیل سے بات کرنے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔ اس لیے چیئر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''سر اصل میں..... میں نے ایک عورت کو یہ لوتھڑا کھاتے ہوئے دیکھا تو بس اس حقیقت کو جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔'' ضامن نے سرسری سی جان کاری دی۔

''آر یو آؤٹ آف یور مائنڈ..... کوئی انسان بھلا یہ کیسے کھا سکتا ہے۔'' ڈاکٹر بولا۔

''کیوں یہ کیا ہے؟'' ضامن نے پر تجسس انداز میں پوچھا۔

''مسٹر ضامن یہ انسانی کلیجہ ہے اور یہ انسان باون گھنٹے پہلے ہی مرا ہے۔''

ڈاکٹر کی بات سن کر ضامن اور سانول دونوں کو شدید حیرت ہوئی۔ ضامن کچھ دیر سوچتا رہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر اور کیا کہہ رہا ہے..... اس کے دماغ میں تو بس ایک ہی بات گردش کر رہی تھی اور وہ یہ کہ کزا

کی موت باون گھنٹے پہلے ہوئی تھی۔ ''کہیں یہ کزا کا کلیجہ تو نہیں.....'' ضامن کے دماغ میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا اور کزا کے پاپا کا نمبر ملایا۔

''انکل میں ضامن بات کر رہا ہوں۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ کزا کی موت کیسے ہوئی۔''

''ضامن..... تم ہوتے کون ہو میری بیٹی کا پوچھنے والے..... تم اس کے ساتھ سیریس بھی تھے یا نہیں۔ اس کے جنازے میں شرکت کی تو فیق نہیں کی۔ تم نے بعد میں بھی افسوس کا اظہار تک نہیں کیا۔''

''انکل پلیز یہ میرے لئے جاننا بے حد ضروری ہے۔ پلیز انکل۔''

''ہارٹ اٹیک ہوا تھا..... اسپتال جانے سے پہلے ہی فوت ہوگئی۔'' کزا کے پاپا نے افسردگی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

ضامن نے ایک ہاتھ سے چہرے سے پسینے صاف کئے اور سانول کو لے کر واپس چلنے لگا۔

''اب کیا سوچ رہے ہو ضامن.....'' سانول نے بائیک چلاتے ہوئے ضامن سے پوچھا۔

''سانول ہم سیدھا اس بڑھیا کے گھر جائیں گے۔ چلو اگر وہ کلیجہ کزا کا نہیں ہے تو پھر بھی اس بڑھیا نے کسی انسان کو قتل تو کیا ہے ناں۔ ہمیں اسے سزا دلانی چاہیے۔'' ضامن نے سانول سے کہا اور وہ دونوں گاؤں پہنچے۔

ضامن نے اس بڑھیا کے گھر کے سامنے بائیک روکی۔ ''دروازہ کھولو مائی.....'' سانول نے دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ دروازہ پٹنے پر بھی جب نہ کھلا تو ضامن نے دھکے مارنے شروع کر دیئے تاکہ دروازہ ٹوٹ جائے۔

''کیا ہو رہا ہے بیٹا.....'' شور سن کر پاس پڑوس کے کئی افراد اپنے اپنے گھروں سے باہر آ گئے۔ ضامن نے تمام واقعات لوگوں کے گوش گزار کر دیئے اور ضامن کی باتیں سنتے ہی گاؤں کے لوگ آگ کی طرح بھڑک اٹھے اور دروازہ پیٹنے لگے۔

اچانک دروازہ کھلا اور ایک بہت ہی خوب صورت دوشیزہ باہر آئی جسے دیکھتے ہی تمام لوگ مبہوت ہوگئے وہ انتہائی خوبصورت اور دلوں کو گرمانے والی دوشیزہ تھی۔ کالے لمبے گھنے بال..... دودھ جیسی رنگت..... مدہوش کرتی آنکھ جو کہ سبز ہیرے کی طرح چمک رہی تھی۔ دراز قد..... ''جی فرمایئے.....'' کوئل جیسی آواز سے وہ دوشیزہ بولی۔

''مائی کہاں ہے.....؟'' سانول کو اچنبھے میں کھویا دیکھ کر ضامن نے دوشیزہ سے خود سوال کیا۔

ضامن کی باتیں سن کر وہ دوشیزہ ہنسنے لگی ایسے لگ رہا تھا جیسے گھنگھرو چھنک رہے ہوں۔ ''مائی..... ضامن بیٹا میں ہی تو ہوں وہ بڑھیا جس نے تیری کزا کو قتل کیا ہے۔'' دوشیزہ کی بات سن کر ضامن نے حیرت سے سانول کو دیکھا لیکن سانول تمام گاؤں والوں سمیت سکتے کی حالت میں کھڑا تھا۔

''ہاہاہا..... ان کو کیا دیکھ رہے ہو..... ارے پگلے وہ تو میرے جادو کے اثر میں ہیں۔ تمہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔'' وہ دوشیزہ لوگوں کے بیچ سے چلتی ہوئی ضامن کے پاس آ کر رک گئی۔

''کون ہو تم.....'' ضامن ہمت کر کے بولا۔

سائرہ..... اس گاؤں کی حسین ترین لڑکی میری خوبصورتی کے سامنے کائنات کی ہر چیز ماند پڑتی ہے۔''

''یہ تو اندازہ ہو رہا ہے..... مائی کی کیا لگتی ہو اور مائی کو کہاں چھپایا ہے۔'' ضامن بڑھیا کے مکان میں داخل ہوگیا اور تلاشی لینے لگا۔

''یہاں ہے.....'' دوشیزہ نے پیچھے سے آواز دی تو ضامن نے مڑ کر دوشیزہ کی طرف دیکھا تو ضامن کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکی کبھی بڑھیا کا روپ دھار رہی تھی اور کبھی دوشیزہ بن جاتی، اس کا آدھا چہرہ جھریوں والا نحیف اور آدھا خوبصورت جوان تھا آدھی کمر میں خم تھا اور آدھی تنی ہوئی تھی۔

ضامن دوڑ کر سانول کے پاس آیا پر وہ سب

لوگ بت بنے ہوئے تھے۔ ضامن نے سرپٹ دوڑ لگادی۔

وہ لڑکی نما بڑھیا بھی ضامن کے پیچھے آنے لگی۔

''رک جا ضامن..... کزا کے خون کا حساب نہیں لے گا مجھ سے۔'' ضامن کے دوڑتے قدم یک دم رک گئے۔

''تم نے مارا ہے کزا کو..... کیوں مارا اس بیچاری کو۔'' ضامن نے مڑ کر اس دوشیزہ سے پوچھا۔

''تاکہ میں سدا جوان رہوں اور جوانی حاصل کرسکوں..... میں نے ہر کنواری لڑکی کو مار کر اس کا کلیجہ کھایا ہے اور اس میں میری غلطی نہیں ہے لڑکیاں خود موت کو دعوت دیتی ہیں۔ میں نے تو عمل آزمایا۔''

''کون سا عمل۔'' ضامن کی آنکھیں نم تھیں۔

''کالا عمل..... لڑکیاں اپنے بالوں میں کنگھی کرنے کے بعد ٹوٹے ہوئے بال باہر پھینک دیتی تھیں، میں تو بس ان بالوں کو زمین میں دفن کرکے عمل کرتی اور پھر اس لڑکی کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی، میں اپنی جوانی برقرار رکھنے کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہوں۔'' اور پھر دوشیزہ قہقہے لگانے لگی۔

''تو بہت غلیظ ہے..... تم نے اپنی خوبصورتی کے لئے معصوم لڑکیوں کی جان لے لی۔'' ضامن روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس دوشیزہ سے انتقام لینا بے حد مشکل ہے کیونکہ وہ بہت طاقتور تھی اور اس کا مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ضامن بے بس ہوچکا تھا، دوشیزہ کے فلک شگاف قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی۔

اچانک ہی ضامن کو اپنے اوپر پانی کی بوندیں گرتی محسوس ہوئیں تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو آسمان کالے بادلوں سے ڈھک چکا تھا، بجلی کڑک رہی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہوگئی تو ضامن وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر کی طرف جانے لگا کہ اتنے میں زبردست طوفان آیا اور اس دوشیزہ کے بال دھاگوں کی طرح اُڑنے لگے، اس کے بال ٹوٹ رہے تھے، وہ شیر کی طرح دھاڑ مارنے لگی۔

خدا کی لاٹھی آچکی تھی اور اب کوئی بھی کالا عمل خدا سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ بڑھیا کئی حصوں میں تقسیم ہوچکی تھی اس کے بال زمین پر بکھر چکے تھے اس کا جسم لوتھڑوں کی شکل میں بٹ گیا تھا۔ تیز ہواؤں نے اس دوشیزہ کو تہس نہس کردیا تھا اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ موسم کی شدت کا اثر صرف دوشیزہ پر ہورہا تھا۔

ضامن کو ہوا کا احساس تک نہ ہوا۔ دوشیزہ کی چیخوں سے سارا گاؤں دہلنے لگا تھا کہ پھر تھوڑی دیر بعد فضا میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ دوشیزہ کا خاتمہ ہوچکا تھا۔

ضامن نے تشکر بھرے انداز سے آسمان کی طرف دیکھا اور واپس چل پڑا۔ جہاں سانول سمیت سبھی گاؤں والے مکان نمبر 13 کے سامنے کھڑے تھے اور دروازہ پیٹ رہے تھے۔

''مائی باہر آ.....'' سانول کی بات پر ضامن سمجھ گیا کہ یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔

''چلو سانول یہاں کھڑے رہنا اب فضول ہے۔'' ضامن نے سانول کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

میں نے اگلے دن ہی سانول اور اس کے گھر والوں کی منتیں کرکے سانول کی بہن جو کہ 19 سال کی تھی، گاؤں بلوالیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب یہ گاؤں کالے عمل سے پاک ہوچکا ہے اور ایسا ہی ہوا، سانول کی بہن ماشاء اللہ اپنی عمر بہ خیریت گزارنے لگی۔ گاؤں میں ایک بار پھر خوشیاں آگئیں۔

لیکن میں تمام خواتین سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی ذاتی کوئی بھی چیز باہر نہ پھینکیں۔ اس لئے نہیں کہ جادو بھی ہوسکتا ہے بلکہ اس لئے کہ رب العالمین نے منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''ایمان والی عورتوں کو کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو (محرم کے علاوہ کسی پر) ظاہر نہ کرو۔'' (سورہ نور آیت نمبر 31,30)

خطرناک وحشی

ایم الیاس

دلکش اور خوبرو حسینہ کے جسم میں جان نہیں رہی تھی کہ اس کے جسم کا سارا خون خشک ہو کر رہ گیا تھا۔ اوہ! بھگوان اس نے اپنے جاننے والے کو گھر بلا کر کتنی بڑی غلطی کی تھی، ایسی حماقت سرزد ہوئی تھی کہ فرار کی کوئی راہ نہیں رہی تھی، کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہ گئی تھی لیکن پھر بھی.....

خوفناک دہشتناک اور خونچکاں بھونچکاں کہانیوں کے متلاشی قارئین کیلئے خونی کہانی

"**سر** بھگوان کے لیے اب یہ بحث نہ چھیڑیں۔ میں ایسے کاموں کا ماہر نہیں، آپ کو بتا چکا ہوں۔" شاستری بولا۔ "میں مسٹر گوتم کے بنگلے کے قریب کسی درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاؤں گا اور رتنا دیو کے نکلنے کا انتظار کروں گا۔ آپ سے وائرلیس پر رابطہ قائم رکھوں گا۔ وہ مجھے جیسے ہی نظر آئے گا، میں اسے نشانہ بنا دوں گا۔ ذرا بھی تامل نہیں کروں گا۔"

"مگر شاستری.....!" انسپکٹر سنگارا نے قدرے تذبذب سے کہا کہ "یہ غیر قانونی ہوگا؟ ماورائے قتل کا الزام ہمارے سر آجائے گا۔"

"آپ کی بات درست ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرسکتا..... لیکن سر! کون اس بات کی گواہی دے گا کہ فائرنگ کرنے میں اس نے نہیں ہم نے پہل کی تھی۔ بس اب ایسا کریں مجھے شاہراہ پر اس جگہ چھوڑ دیں جہاں سے پکی سڑک دریا کی طرف جاتی ہے..... اس کے بعد میں جانوں اور میرا کام..... میں دیکھتا ہوں کہ وہ میرے ہاتھ سے کیسے بچتا ہے؟"

☆.....☆.....☆

اس وقت بیلا ہوٹل سے نکل کر ایک اسپورٹس اسٹور کی طرف روانہ ہوئی۔ اس نے اسٹور پہنچ کر مدراسی مالک سبرانیم سے کہا۔ "میں مسز گوتم نائیکے ہوں..... آپ میرے شوہر سے ضرور واقف ہوں گے؟"

"مسز گوتم..... آیئے..... آیئے میں آپ کے شوہر سے اچھی طرح واقف ہوں۔ نہ صرف میں بلکہ پورا سری لنکا ان کے نام سے واقف ہے۔ وہ کافی عرصہ سے ادھر نہیں آئے۔" سبرانیم نے بصد احترام سے کہا۔ "فرمایئے کیا خدمت کروں؟"

"میں ایسے ملبوسات چاہتی ہوں جو یہاں کے موسم کے مطابق ہوں۔" بیلا بولی۔ "گوتم اپنے بنگلے پر ہیں اور میں ان سے ملنے جارہی ہوں۔ آپ مجھے بتایئے کہ مجھے کیا خریدنا چاہیے، عین نوازش ہوگی؟"

"کیا آپ کو ماہی گیری کا سامنا چاہیے.....؟" سبرانیم نے پوچھا۔ "ویسے مون سون میں فشنگ ذرا مشکل ہے۔"

"نہیں صرف دو ایک جوڑے..... ویسے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میرے شوہر کا بنگلہ کہاں ہے.....؟" بیلا نے پوچھا۔

"کیا.....؟ میرا خیال تھا کہ وہ خود آپ کو لینے آئے ہوں گے؟" وہ متعجب لہجے میں بولا۔

"نہیں..... میں اچانک پہنچ کر انہیں حیران

کر دینا چاہتی ہوں۔'' بیلا نے اسے بتایا۔ ''بلکہ ہو سکے تو میرے لئے گاڑی کا بندوبست کر دیجئے۔''

''انتظام تو میں کر دوں گا..... لیکن ادھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ بہرحال میں آپ کو جیپ سے وہاں بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔''

''نہیں..... میں تنہا جاؤں گی۔'' بیلا نے کہا۔

''جیپ میں نہایت آسانی سے چلا سکتی ہوں۔''

''جی..... جیسی آپ کی مرضی۔'' سبرا نیم نے مسکرا کر کہا۔

''آپ میرے لباس اور جیپ میرے ہوٹل میں بھیج دیجئے گا۔'' اس نے پرس کھولتے ہوئے کہا۔ ''بل کتنے کا ہوگا؟''

☆.....☆.....☆

ادھر بنگلے میں گوتم کی آنکھ اگرچہ آٹھ بجے ہی کھل گئی تھی لیکن اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس لئے وہ نہا دھو کر بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ دس بجے کے قریب دروازے کے تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی۔ کھنہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

''میری ذرا دیر سے آنکھ کھلی..... آج کئی دنوں کے بعد آرام سے سونے کو ملا تھا۔ دل بستر چھوڑنے کو نہیں چاہ رہا تھا..... بہرحال ناشتہ تیار ہے..... تمہیں بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہوگی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور بڑھ کر بستر کے قریب میز پر سے فریم اٹھا لیا جس میں بیلا کی تصویر سجی تھی۔

''کیا یہ تمہاری گرل فرینڈ ہے.....؟'' اس نے سوال کیا۔ ''یہ بہت خوبصورت اور پرکشش ہے۔''

''یہ میری بیوی ہے.....''

''بیوی..... بہت خوش قسمت ہو گوتم..... بیوی کے معاملے میں مجھے آج تک ایسی کوئی عورت نہیں ملی جس سے شادی کر سکتا۔''

''تم نے کوئی کوشش نہیں کی ہوگی..... ورنہ ہندوستان اور سری لنکا میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے، ایک ڈھونڈو سینکڑوں مل جائیں گی۔ غربت و افلاس کی ماری لڑکیاں جو والدین پر بوجھ ہیں۔'' گوتم نے کہا۔

''ہاں..... تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ خیر نیچے آ جاؤ۔ ناشتہ تیار ہے؟''

گوتم اور کھنہ آگے پیچھے پہنچ گئے۔ ناشتہ میز پر چنا ہوا تھا۔

''تمہاری زندگی بڑی شاندار اور خواب ناک معلوم ہوتی ہے؟'' کھنہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''دولت انسان کو سب کچھ دے سکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ممبئی میں تمہارا مکان اس سے بھی شاندار اور زبردست ہوگا؟''

''بس زندگی گزر رہی ہے۔ میں باندرہ میں رہتا ہوں۔'' گوتم نے اسے بتایا۔

''یہ سب دولت کے کرشمے ہیں..... ایک میں ہوں..... میں اس دنیا میں جب سے آیا ہوں دھکے کھا رہا ہوں..... میں چاہتا ہوں کہ میرا بھی ایک گھر ہو..... ایک بیوی ہو..... لیکن نہ گھر ہے نہ بیوی میں نے بچپن میں بس ایک تنگ و تاریک کمرہ دیکھا تھا جس میں اپنے باپ کے ساتھ رہتا تھا..... کیا وہ کوئی زندگی تھی.....؟'' اس کے لہجے میں تلخی اور احساس محرومی تھا۔

''ویسے تم یہاں کب تک رہنا چاہتے ہو؟'' گوتم نے اس کے فلسفہ حیات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''جب تک یہ ہنگامہ ختم نہیں ہوگا..... پولیس اب بھی میری تلاش میں ہے..... میں نے ابھی ابھی ریڈیو سنا تھا..... ہاں ایک بات اور..... تمہیں، مجھے کچھ رقم دینا ہوگی۔ مجھے دس ہزار روپے چاہئیں۔'' کھنہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے.....'' گوتم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ویسے تم جاؤ گے کہاں.....؟''

''میری فکر نہ کرو۔ میں کسی بھی طرف نکل جاؤں گا.....'' کھنہ نے جواب دیا۔ ''یہ دنیا بہت بڑی ہے۔''

''آخر تم کب تک بھاگتے رہو گے کھنہ! یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ تم حقائق کو تسلیم کر لو۔ اسے جھٹلا کر خود کو فریب نہ دو..... کیا تم یہ بات نہیں جانتے کہ قانون کے ہاتھ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔ میرا مخلصانہ مشورہ

ہے کہ تم خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردو..... جلد یا بدیر بالآخر پولیس تمہیں پکڑ لے گی۔ خود کو قانون کے حوالے کرنے سے سزا میں کمی ہو جاتی ہے اور رعایت بھی دی جاتی ہے۔'' گوتم نے اسے سمجھایا۔

''اس وقت تم کسی پادری یا پنڈت کی طرح بات کر رہے ہو..... میں خود کو پولیس کے حوالے کردوں؟ تاکہ ساری عمر جیل میں سڑتا رہوں؟''

''نہیں گوتم نہیں..... میری مت نہیں ماری گئی ہے اور نہ ہی میری عقل..... یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ مجھے کوئی زندہ نہیں پکڑ سکتا..... میں مرنے سے پہلے کئی کو مار کر مروں گا۔''

گوتم نے اس کی بات پر کوئی رائے زنی نہیں کی۔ وہ ایک ضدی اور سرکش انسان تھا۔ اس کی واقعی مت ماری گئی تھی اور عقل بھی ٹھکانے پر نہیں تھی۔ ورنہ وہ ایسی بات نہ کرتا۔ اسے بڑی خوش فہمی تھی اپنے بارے میں۔

گوتم نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔ پھر اس نے کہا۔

''کھنہ تم نے بہت اچھا ناشتہ کیا..... تم یہاں سے فرار ہو کر ہندوستان، ملائیشیا یا انڈونیشیا جا کر کسی فائیو اسٹار ز ہوٹل میں شیف کی ملازمت کر لینا۔ تمہارا مستقبل بن جائے گا۔''

''سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اب دیکھنا یہ ہے کہ قسمت ساتھ دیتی ہے یا نہیں؟''

''اچھا کھنہ.....! اب میں اپنا کام کروں گا..... میں فلم کی کہانی لکھنے یہاں آیا تھا..... تم بتاؤ کیا کرو گے؟''

''تم میری فکر نہ کرو..... تم اپنا کام کرو۔'' کھنہ نے بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔

وہ اپنے لکھنے کی میز پر آ بیٹھا۔ اس کے ذہن میں ایک سنسنی خیز، تحیر انگیز اور ہولناک کہانی کا خاکہ ترتیب پا چکا تھا۔ یہ کہانی انہی واقعات سے مرتب ہوئی تھی جن سے وہ گزرا تھا۔ اب اس کہانی میں لوازمات ڈالنے تھے۔ یہ اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ تمام جزئیات اس کے سامنے تھیں اور پھر وہ کہنہ مشق فلمی کہانی نویس تھا۔ اس فن میں طاق تھا۔

وہ اپنے کام میں منہمک تھا۔ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا تھا۔ کہانی نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی، وہ لکھتے لکھتے اس میں کھو گیا تھا۔

کوئی ایک بجے کے قریب کھنہ نے آ کر کہا۔ ''لنچ تیار ہے، کھانے کی میز پر آ جاؤ۔''

☆.....☆.....☆

شاستری اس وقت گوتم کے بنگلے کے سامنے ایک گھنے درخت پر بیٹھا تھا۔

اس کی آنکھوں سے دوربین لگی تھی اور وہ بڑے انہماک سے بنگلے کا جائزہ لے رہا تھا۔ تمام کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہاں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی نظر نہیں ہٹائی تھی۔ وہ بڑی ذمہ داری اور فرض شناسی سے نگرانی کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ مفرور قاتل اس بنگلے میں موجود نہیں ہے.....!

اسے یقین تھا کہ وہ خون آشام بھیڑیا بنگلے میں موجود ہے۔ اس نے ٹیلی فون کے تار اکھڑے ہوئے دیکھے تھے۔ جو اس بات کا ثبوت تھے، اس کے اندازے کے مطابق اس جنونی قاتل نے گوتم کو قیدی بنا رکھا تھا۔ اس لئے گوتم کی صورت بھی اسے اب تک نظر نہیں آئی تھی۔

ایک مرتبہ پھر اس نے بنگلے کا جائزہ لیا۔ وہ تب سے اس درخت پر مورچہ بنائے ہوئے تھا، کئی بار بنگلے کا جائزہ لے چکا تھا۔ پھر اس نے وائی ٹاکی پر انسپکٹر سنگارا سے رابطہ قائم کر کے اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔

جواب میں انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''جب میری ضرورت محسوس ہو بتا دینا۔ میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔ میں اپنے دفتر میں ہوں۔''

وائی ٹاکی بند کر کے اس نے پہلو بدلا۔ شاخوں کے درمیان درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب اسے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔ انسپکٹر سنگارا نے اسے نہ صرف سینڈوچز ایک تھیلے میں رکھ کر دیئے تھے بلکہ ایک فلاسک میں کافی بھی..... اسے لمحے کا شدومد سے انتظار تھا جب رتنا دیو (کھنہ) بنگلے سے نکلتا، اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ

رتنا دیو کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک پل بھی ضائع نہیں کرے گا۔

وقت گزرتا رہا۔ اس کا جسم ایک جگہ بیٹھے بیٹھے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے جسم میں خون کی روانی تیز کرنے کے لئے پہلو بدلا۔ اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ وہ بنگلے کے عقبی حصے سے اندر جھانکے؟ پھر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے خدشہ ہوا کہ وہ درندہ بالائی منزل کے کمرے سے اس کی حرکات وسکنات نہ دیکھ لے۔ رات کا وقت ہوتا تو اس پر عمل کیا جاسکتا تھا۔

انسپکٹر سنگارا سے بات کئے ایک گھنٹہ گزرا تھا کہ اس نے ایک جیپ کو بڑی تیزی سے بنگلے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

شاستری نے فوراً اپنی رائفل سنبھالی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے دوربین آنکھوں سے لگائی..... وہ چوکس ہو گیا تھا۔ جیپ بنگلے کے سامنے پہنچ کر رکی جیپ سے گہرے سیاہ بالوں والی ایک نوجوان لڑکی اتر کر بنگلے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

شاستری کو وہ لڑکی اتنی حسین اور پرکشش لگی کہ ایک لمحے کے لیے اس کے سحر میں کھو گیا۔ اس نے شاستری کے خوابیدہ سپنوں کو جگا دیا تھا، وہ کوئی بلا تھی جو اس کے دل و دماغ پر پرانی شراب کے خمار کی طرح چھا گئی تھی۔ اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

اس کے باوجود کہ وہ اس طرح دار لڑکی کے سحر میں کھو گیا تھا کہ اس نے خود کو سنبھالا اور فوراً اس شعلہ مجسم کے سحر سے نکلا۔ اس لڑکی کے آنے سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ لڑکی کون ہے.....؟ وہ انتہائی خراب موسم میں یہاں پہنچ چکی تھی۔ کیا رتنا دیو نے ٹیلی فون کا کنکشن بحال کر کے اس لڑکی کو کولمبو سے تو نہیں بلایا..... شاید یہ لڑکی اس کی ساتھی ہو؟

اس حسین بلا نے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں اور پھر وہ مڑ کر اندر چلی گئی۔

شاستری نے فوراً ہی وہ وا کی ٹاکی پر انسپکٹر سنگارا سے رابطہ کیا۔ اسے نئی صورتحال سے آگاہ کیا پھر بتایا۔

''وہ لڑکی جیپ میں آئی ہے وہ ہوائی اڈے کی عمارت کے باہر جو سبرا نیم کا اسٹور ہے، وہاں سے کرائے پر لی ہے۔ سبرا نیم سے فون پر رابطہ کر کے اس لڑکی کے بارے میں معلوم کریں۔''

''میں اس سے بات کر کے پانچ منٹ میں بتاتا ہوں۔'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔

''تھوڑی دیر بعد انسپکٹر شاستری کو وا کی ٹاکی پر بتا رہا تھا۔

''وہ لڑکی مسٹر گوتم کی بیوی ہے..... وہ ایک ڈیڑھ ہفتہ وہاں رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ تم واپس آجاؤ۔ کیوں کہ وہاں رتنا دیو نہیں ہے۔''

''سر! میں ابھی واپس نہیں آؤں گا۔'' شاستری نے جواب دیا۔

''وہ کس لیے.....؟'' انسپکٹر سنگارا نے حیرت سے سوال کیا۔

''سر! بات یہ ہے کہ مسز گوتم کے یہاں آنے کا مطلب یہ نہیں کہ رتنا دیو بنگلے میں نہیں ہے.....؟'' شاستری نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے مسز گوتم پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت یہاں آئی ہوں اور انہیں اس بات کا احساس نہ ہو کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتی ہیں؟ اگر انہیں اس بات کا ذرہ بھر بھی علم ہوتا کہ ان کے شوہر کو ایک درندے نے یرغمال بنا رکھا ہے تو وہ بنگلے پر جانے کے بجائے پولیس کے پاس پہنچتیں۔ ہم یہ بھی تو یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ رتنا دیو ہمارے علاقے سے نکل گیا ہے..... سر! اس لئے میں یہیں انتظار کروں گا..... اب دیکھنا یہ ہے کہ مسز گوتم کے آنے سے کیا صورتحال پیدا ہوتی ہے۔''

ٹھیک..... اس وقت پنچ ناتھ نے ٹیلی فون پر ممبئی ملنگا تری کی سیکریٹری کو بیلا کی غیر متوقع آمد اور اس کے اپنے شوہر کے پاس جانے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''آپ مسٹر ملنگا تری کو بیلا کے بارے میں فوری طور پر مطلع کر دیں۔''

☆.....☆.....☆

جب بیلا نے دروازے پر دستک دی تو وہ اس بات سے سرشار تھی کہ آخر وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئی تھی۔ وہ اسے اپنی نظروں کے سامنے پا کر حیرت زدہ رہ جائے۔ اسے کتنی دیر تک یقین نہیں آئے گا۔ پھر وہ جذباتی ہوجائے گا۔ کیوں کہ ایک چھت تلے رہنے کے باوجود وہ اجنبی مسافروں کی طرح رہ رہے تھے۔ ایک بستر پر سوتے ہوئے بھی ان کے درمیان ایک خلیج قائم ہوگئی تھی۔ وہ اسے یہ خلیج پاٹنے نہیں دیتی تھی۔ تین ماہ قبل جب وہ رات کے وقت وہ شب خوابی کے لباس میں جوالا مکھی بنی ہوئی تھی تو گوتم اس کی قربت کا متمنی ہوا تھا لیکن اس نے بری طرح دھتکار دیا تھا۔

اس روز کے روز گوتم نے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ وہ اسے چھونا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

بیلا یہ بات بھول جاتی تھی کہ وہ اس کا شوہر ہے..... اس کی رازدار سہیلی نے اسے کہا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ایسا اہانت آمیز سلوک نہ کرے، وہ اس کا قانونی پتی ہے..... وہ یہ بات مت بھولے کہ گوتم کے پرستاروں میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی اکثریت ہے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ وہ تمہیں دودھ میں گری ہوئی مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتا ہے..... تب تم کیا کروگی؟ لیکن اس پر اپنے مال دار دوستوں کی محبت کا ایسا نشہ تھا کہ اس نے لاجونتی کی باتوں پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے شادی کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے؟ لاجونتی نے جواب میں کہا تھا کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جی بہلانے والے شادی کریں۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب تمہارے قرب کے رسیا ہیں، بھونرے ہیں۔''

جب جگ موہن چلا گیا تھا تو بیلا نے گوتم کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا، اس نے اپنے دوستوں کو آزمانے کے لیے فون کیا اور کہا کہ اس نے گوتم سے طلاق لے لی ہے.....؟ کیا وہ اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہیں..... ایک نے کہا کہ اس کی ماں نے ایک لڑکی سے رشتہ طے کردیا ہے، وہ آئندہ ماہ امریکہ سے آرہی ہے۔

دوسرے نے کہا کہ صاف بات یہ ہے کہ تم نے اپنے شوہر سے طلاق لے کر بڑی سنگین غلطی کی ہے، تمہیں شادی کی کیا ضرورت ہے..... ہم دونوں ایک فلیٹ کرائے پر لے کر میاں بیوی کی طرح رہ سکتے ہیں..... میں شام سے رات گیارہ بجے تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہیں ہر ماہ جیب خرچ کے لئے معقول رقم دے دیا کروں گا۔ آزاد زندگی بڑی حسین ہوتی ہے۔

تیسرے نے کہا کہ سچی بات یہ ہے کہ میں کبھی شادی کا قائل نہیں رہا۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ تم فلمی دنیا میں چلی جاؤ۔ وہاں تمہیں ہیروئن کا چانس مل جائے گا۔ اس وقت فلمی دنیا میں تم جیسی حسین لڑکی کوئی نہیں ہے۔ ہم دوست ہیں۔ دوست رہیں گے۔

وہ راستہ بھول گئی تھی۔ لیکن وہ یہ بات جانتی تھی کہ اس کی بدسلوکی، بے اعتنائی اور سرد مہری کے باوجود گوتم اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اگر نفرت کرتا تو اسے جیب خرچ کرنے اور شاپنگ کے لیے منہ مانگی رقم نہ دیتا اور اسے کب کا طلاق دے چکا ہوتا..... وہ صبح کا ''بھولا'' تھی۔ شام لوٹ آئی تھی۔ اس نے طے کرلیا کہ دروازے کے کھلتے ہی وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈال دے گی۔ پھر اس کے چرنوں میں گر کر معافی مانگ لے گی۔ وہ اسے صدق دل سے معاف کردے گا۔ خوش ہوجائے گا۔

تھوڑی دیر بعد جب دروازہ کھلا تو اس نے جو سپنا دیکھا تھا وہ کرچیوں میں بدل گیا تھا۔ گوتم دروازے میں کھڑا تھا۔

یہ وہ شخص تھا جس سے ملنے کے لیے وہ شدید بے چین تھی..... وہ اس کا جیون ساتھی تھا۔ اسے دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے اس کے چہرے پر کشیدگی کے آثار پیدا ہوئے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اندر کوئی لڑکی ہو..... یا شاید اس لئے تیج ناتھ نے اسے اپنے شوہر سے نہ ملنے اور واپس جانے کے لیے کہہ دیا ہو۔ وہ بیلا کو اس طرح دیکھ رہا تھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

اوہ..... بھگوان! بیلا تم.....! آخر تم یہاں کیوں

آ ئی ہو......! کیا کر رہی ہو تم یہاں......؟ گوتم کی آواز مرتعش تھی۔

بیلا کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا...... گوتم کے چہرے پر خوف و دہشت کے آثار تھے۔

''میری جان کو گوتم......!'' وہ بے اختیار اس کے گلے میں جھول گئی۔ ''میں جانتی ہوں کہ مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا لیکن میں کیا کرتی مجبور تھی۔''

اس وقت بیلا کی نظر کھنہ پر پڑی جو گوتم کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور چہرے پر سفاک مسکراہٹ۔

گوتم کو اپنے شانے پر کھنہ کی انگلیاں گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اور پھر اگلے ہی لمحے بے پناہ قوت سے اسے ایک طرف دھکیل دیا گیا۔

گوتم اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ بیلا کے ساتھ ہی فرش پر گر پڑا اور کھنہ نے پیر سے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ اس نے پستول ہولسٹر میں رکھ لیا اور بڑی گہری نظروں سے ان دونوں کو فرش سے اٹھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''آخر یہ سب کیا ہے......'' بیلا نے اپنا لباس درست کرتے ہوئے غصے سے کہا۔ ''یہ غنڈہ کون ہے......؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

گوتم نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ کہیں بیلا کی زبان سے مغلظات کا فوارہ نہ ابل پڑے۔

''جانم!'' گوتم نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا کر جلدی سے کہا۔ ''ذرا صبر و تحمل اور احتیاط سے کام لو۔ یہ شخص بہت خطرناک ہے؟''

''الو کے بچے...... یہ تمہاری بیوی ہے۔'' کھنہ نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ ''اس نے بلا وجہ ایسے معاملات میں ٹانگ اڑائی ہے جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب ہوشیار رہنا...... کوئی چالا کی نہ کرنا...... ورنہ تم دونوں کو ایک ساتھ ٹھکانے لگانے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کروں گا۔ یہ بات اپنی اس کتیا کو کہہ دو۔''

گوتم نے بہ مشکل تمام اپنا غصہ ضبط کیا۔ اس شیطان نے بیلا کو کتیا کہہ کر اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی، اس کے جی میں آیا کہہ دے کہ کتیا تو تمہاری ماں تھی جو بھاگ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ گری ہوئی بات کہنا اسے زیب نہیں دیتی۔ اس نے بہ وقت تمام کہا۔ ''کھنہ...... تم بے فکر رہو۔ کوئی چالا کی نہیں کریں گے ہم لوگ...... تمہاری ہر بات منظور ہے۔''

کھنہ نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ''مجھے تمہاری یہی بات پسند ہے۔ تم ایک دور اندیش...... سمجھ دار اور معقول آدمی ہو...... جاؤ...... اپنی بیوی کو کمرے میں لے جا کر اسے سب کچھ بتا دو۔ میں کچن میں جا رہا ہوں۔ کھانا تیار کرتا ہوں۔''

''آخر یہ سب کیا ہے......؟ یہ شخص کون ہے......؟'' بیلا دہاڑی۔ ''اس نے تمہیں کتنے زور سے دھکا دے کر گرا دیا۔ لیکن خاموش رہے۔''

''اندر چل کر بیٹھو۔'' سکون و اطمینان کا سانس لو۔'' گوتم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ غصہ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

''میرے ساتھ اس طرح کی بات نہ کرو...... میں کوئی بچی نہیں ہوں...... مجھے بتاؤ کہ یہ کون شخص ہے جو اپنے باپ کا گھر سمجھ کر حکم چلا رہا ہے...... اس شخص سے ابھی اور اسی وقت پیچھا چھڑاؤ...... میں تمہارے ساتھ تنہا رہنا چاہتی ہوں۔ اس کی گردن پکڑ کر نکال باہر کرو......'' بیلا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، اس ذلیل شخص کے ساتھ۔

کھنہ نہایت درندگی کے ساتھ بڑے زور کا قہقہہ لگاتا اور پھر سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اندازہ نہ تھا کہ تمہاری بیوی اتنی احمق ہوگی...... میں نے سنا تھا کہ عورت جتنی حسین ہوتی ہے اتنی ہی احمق...... اس کی کھوپڑی میں عقل نہیں بھوسا بھرا ہوتا ہے۔ آج یہ بات تمہاری اس خوبصورت چڑیل کو دیکھ کر سچ ثابت ہو گئی۔ اسے اندر لے جا کر سمجھا دو...... حد سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہ تمہاری بیوی نہ ہوتی تو میں اس کا

Pakistanipoint.com

دماغ ٹھکانے لگا دیتا۔''

کھنہ کے لہجے کی درندگی سے بیلا سہم گئی تھی۔ پر وہ خاموشی کے ساتھ گوتم کے ہمراہ کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کھنہ بھی ان کے پیچھے تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو کھنہ نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں تنبیہ کر رہا ہوں..... میں نہیں چاہتا کہ تم میرے ساتھ کوئی چالاکی کرو۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک دھماکے سے دروازہ بند کیا اور کچن کی طرف بڑھ گیا۔

''گوتم..... آخر یہ سب کیا ہے؟'' بیلا نے پریشان ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''مجھے سچ سچ بتادو۔'' ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔''

''میری بات غور اور تحمل سے سنو۔'' گوتم سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ''اس نے مجھے یرغمال بنا رکھا ہے..... اب جب کہ تم یہاں آ گئی ہو تو خود کو بھی میری طرح یرغمال سمجھو..... پولیس اس شخص کی تلاش میں ہے۔''

کیا یہ کوئی مفرور مجرم ہے جس نے یہاں پناہ لے کر تمہیں یرغمال بنالیا ہے؟'' بیلا نے پوچھا۔

''ہاں..... میں اتنا بتائے دیتا ہوں کہ یہ بہت خطرناک قاتل ہے۔ یہ ایک رات میں چھ افراد کو بڑی سفاکی اور درندگی سے قتل کر چکا ہے، جن میں ایک جوان عورت اور ان کی نوجوان بیٹی ہے..... لڑکی کا باپ بھی اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ وہ کوبرا کی طرح خطرناک ہے۔'' گوتم نے اسے بتایا۔

''ایک رات میں اس نے چھ آدمیوں کو قتل کر دیا.....؟ بیلا نے حیرت سے کہا اور اس کے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔

''ہاں.....! یہ مجھے نفسیاتی مریض معلوم ہوتا ہے..... اس سے نمٹنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس سے حتی الامکان نرمی سے پیش آیا جائے تاکہ یہ شخص غصے میں نہ آئے۔ ہتھے سے نہ اکھڑ جائے۔ تم میری بات سمجھیں۔'' گوتم نے رک رک کر کہا۔ ''کیا تم واقعی یہی کہنا چاہتے ہو۔'' بیلا نے غیر یقینی سے کہا۔

''ہاں بیلا.....!'' گوتم نے بڑے پریشان کن لہجے میں کہا۔ یہ بہت خطرناک اور سنگین صورتحال ہے اور اس کا اندازہ مجھے اچھی طرح ہے اور اب تمہیں بھی ہو رہا ہوگا..... اگر ہم نے ذرا سی بھی بے احتیاطی کی، وہ ہم دونوں کو قتل کر دیگا..... بھگوان کے لئے اپنی زبان کو قابو میں رکھنا..... آخر تم یہاں آئی کیوں؟''

''میں تمہارے پاس اس لئے آئی تھی کہ میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی..... میں اپنے آپ سے تنگ آ گئی ہوں۔'' اس نے قدرے جذباتی ہو کر کہا۔ ''میں تمہیں بہت کچھ بتانا چاہتی ہوں تاکہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔''

''اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمیں اس خطرناک قاتل کو اپنے قابو میں رکھنا ہے، ورنہ یہ ہمیں موت کے گھاٹ اتارے گا۔ یہ شخص یہ بات پسند نہیں کرتا ہے کہ کوئی اس پر حکم چلائے۔''

گوتم..... بیلا کو سمجھاتا رہا۔ مغز پاشی کرتا رہا۔ کیوں کہ بیلا کی سوچ کا انداز مختلف اور جارحانہ تھا۔ وہ کس کو خاطر میں لانا نہیں جانتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد کھنہ پھر وہاں آ گیا۔ اور اُکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''گوتم! کیا تم نے اپنی بیوی کو سب کچھ بتادیا۔''

''ہاں بتادیا۔'' گوتم نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

بیلا نے غور سے کھنہ کو دیکھا..... وہ مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس کے شانے چوڑے تھے۔ بازو بھرے بھرے تھے۔ اس کے بڑے اور چوڑے ہاتھ خوفناک اور بھدے لگ رہے تھے۔ بیلا اس سے اب خوفزدہ نہیں تھی۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

''اپنی پیاری، حسین مگر احمق بیوی سے کہہ دو کہ وہ کوئی حماقت نہ کرے، یہی ہم سب کے لئے اچھا ہے۔''

بیلا نے اثبات میں اس طرح سے سر ہلا دیا۔ جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئی ہو۔

''اور ہاں گوتم! تم ابھی اور اسی وقت بینک روانہ ہو جاؤ۔'' کھنہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہاں سے تم دس ہزار روپے لاؤ گے۔ تم دوسرا کام یہ کرو گے کہ وہاں کچھ

لوگوں سے بات کر کے معلومات حاصل کرنا ہے کہ میرے سلسلے میں پولیس کیا کارروائی کر رہی ہے؟''

گوتم اس طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے اسے کھنہ نے بجلی کا شاک لگایا ہو۔ ''نہیں..... میں اپنی بیوی کو تمہارے ساتھ تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتا..... میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔'' اس نے بے خوفی سے کہا۔

''یہ تمہارا کہنا ہے..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں ہر صورت جانا ہوگا۔'' اس کے لہجے میں دھمکی صاف ظاہر تھی۔

گوتم ان سنی کر کے کھڑا رہا۔ اس نے نہ جانے کا جیسے تہیہ کر لیا تھا۔

یہ دیکھ کر کھنہ میز کی طرف بڑھا۔ ''دیکھ رہے ہو.....'' اس نے میز سے دھات کی بنی ہوئی ایش ٹرے اٹھالی یہ ذرا غور سے دیکھو۔''

اس نے ایش ٹرے کو اپنے ایک ہاتھ میں دبایا۔ ذرا سی دیر میں ایش ٹرے کو اس طرح سے پچکا دیا جیسے وہ ٹین کی بنی ہوئی تھی اور پھر اس نے اسے کرکٹ کی گیند کی طرح گوتم کی طرف پھینک دیا اور سرد لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں ایک اور بات بتا دوں یہ دو برس پہلے کی بات ہے۔ میں پال کیلے کے بازار حسن میں گیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی مجھے پسند آ گئی۔ میں نے اس سے معاملات طے کر لئے کہ ایک لمبا تڑنگا امریکی سیاح آ گیا۔ اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے اس لڑکی سے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ تب اس نے جیب سے سوڈالر کا ایک نوٹ نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا۔ یہ بہت بڑی رقم تھی۔ میں نے اس سفید فام سے کہا کہ یہ لڑکی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ تم کوئی اور لڑکی پسند کر لو..... اس نے میرا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اور کہا کہ دفع ہو جا..... میں نے تمہیں بتایا ہے کہ جب بھی کوئی مجھ سے اس طرح بات کرتا ہے تو میری کھوپڑی الٹ جاتی ہے۔ میں نے اس کی گردن توڑ دی۔ وہ لڑکی چیخنے لگی۔ اس نے مجھے کوسا اور گالیاں دیں تو میں نے اس کا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پچکا دیا۔''

پھر اس نے بیلا کی طرف دیکھا اور سابقہ لہجے میں کہا۔ ''تم یہ بات غور سے سنو..... میں نے اس کا سر ہاتھوں میں لے کر کسی لیموں کی طرح نچوڑ دیا..... اس کا بھیجا اس کے کانوں اور ناک سے بہہ نکلا تھا۔''

بیلا سر سے پیر تک کپکپا کر رہ گئی۔

''ہاں گوتم! میں نے یہ واقعہ تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ اب کبھی حماقت کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔ تمہیں ہر کام اس طرح کرنا ہے جیسے میں کہوں گا۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہاری بیوی کے سر کو کسی گلی نارنگی کی طرح پچکا کر رکھ دوں گا۔''

''گوتم.....!'' بیلا نے لرزیدہ سی آواز میں کہا۔ ''یہ جیسے کہتا ہے ویسا کرو۔''

گوتم نے مایوسی کے عالم میں اور غصے سے مغلوب ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھا جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے۔ چشم زدن میں اس نے میز سے شیشے کا پیالہ اٹھایا اور اچھل کر کھنہ پر جا پڑا۔

کھنہ نے جھکائی دے کر اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ اگلے لمحے اس نے الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ مارا۔ گوتم توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ صوفے پر گر پڑا، شیشے کا پیالہ فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔

''تم نے بڑی اچھی کوشش کی تھی گوتم لیکن اگلی مرتبہ پھر ایسی حماقت کی تو میں مکا جڑ دوں گا..... تب تمہیں معلوم ہوگا کہ مجھ سے الجھنا کس قدر خطرناک ہے..... اب یہ بتاؤ کہ تم سیدھی طرح جا رہے ہو یا پھر تمہاری گردن توڑ دوں اور تمہاری بیوی کے چہرے کا جغرافیہ ایسا بگاڑ دوں کہ اسے اس کی ماں بھی نہ پہچان سکے۔''

گوتم نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔ کھنہ کے تھپڑ نے اس کا سر چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا تھا۔ اس کی طاقت کا گوتم کو پہلی مرتبہ اندازہ ہوا تھا اور اس کے دل میں ہیبت بیٹھ گئی۔

''سنو گوتم! دراصل تمہیں یہ خوف ہے کہ تمہارے جانے کے بعد میں تمہاری بیوی کے ساتھ کوئی زیادتی

کروں گا..... اس تنہائی سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اگر میری ایسی نیت ہوتی تو تمہاری موجودگی میں یہ سب کر گزرتا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میرے ساتھ ایمانداری سے پیش آؤ اور میں تمہارے ساتھ اسی طرح پیش آؤں گا۔ تم مجھ پر اندھا بھروسہ کر سکتے ہو..... جاؤ جا کر بینک سے رقم لے آؤ اور یہ بھی معلوم کرو کہ پولیس کیا کر رہی ہے؟ کیا اب بھی وہ مجھے سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے..... اپنی حسین اور نوجوان بیوی کی طرف سے بے فکر رہو، یہ میرا وعدہ ہے کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

''تو گویا..... تم وعدہ کرتے ہو کہ تم بیلا سے کچھ نہیں کہو گے؟ اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے؟'' گوتم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''جب تک تمہاری بیوی خاموش بیٹھی رہی رہے گی میں اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا..... لیکن اگر وہ مجھ سے الجھی اور اس نے چالاک بننے کی کوشش کی تو میں اسے تھپڑ ضرور ماروں گا..... کیوں ٹھیک ہے نا؟'' کھنہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

گوتم نے محسوس کیا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے، اس کی بات پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، اس نے بیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جانم! میں بینک جا رہا ہوں، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ دس ہزار روپے دوں گا..... مجھے کھنہ پر بھروسہ ہے۔ وہ واقعی اپنے وعدے کا پکا ہے۔ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائے گا..... بس تم بھگوان کے لئے وہی کرنا جو کھنہ تم سے کہے، میں دو گھنٹے کے اندر اندر واپس آ جاؤں گا۔''

''جیپ سے اپنی بیوی کا سامان تو لے اؤ۔'' کھنہ نے کہا۔ ''یہ میں تو جا کر لانے سے رہا۔''

گوتم نے جلدی سے جیپ سے بیلا کا سامان نکال کر اوپر بیڈ روم میں پہنچا دیا۔ اب وہ باہر جانے کے لئے تیار تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا تو کھنہ نے کہا۔

''واپس آؤ تو انڈے اور پیاز بھی لیتے آنا اور ہاں جیپ لے کر جانا۔ واپسی میں اس کی ٹنکی بھی فل کر کے لے آنا کیونکہ میں یہاں سے جیپ کے ذریعے جاؤں گا، اس لئے کہ وہ گاڑی کے مقابلے میں ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے۔''

جب گوتم گھر سے نمودار ہوا تو درخت پر بیٹھے ہوئے شاستری نے انسپکٹر سنگارا کو وائی ٹاکی پر اطلاع دی۔

''سر! مسٹر گوتم ابھی ابھی جیپ سے کولبوشہر کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ ان کی بیوی بنگلے میں ہی ہیں..... کیا اندازہ ہے آپ کا؟''

''میرا خیال ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہی ہے۔'' انسپکٹر سنگارا نے جواب دیا۔ ''اس کی جیپ میرے گھر کے سامنے سے ہی گزرے گی، میں اس کا تعاقب کروں گا اور اس سے مل کر تمہیں بتاؤں گا۔''

''میرا خیال اب بھی یہی ہے سر! یعنی رتنا دیو بنگلے میں موجود ہے اور اس نے اب مسز گوتم کو یرغمال بنا رکھا ہے..... بہرحال میں اب بھی اپنے مورچے پر ڈٹا ہوا ہوں۔'' شاستری نے جواب دیا۔

☆.....☆.....☆

جونہی گوتم کی جیپ روانہ ہوئی تو بیلا نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا اصل نام کیا ہے..... رتنا دیو یا کھنہ؟''

''جب تمہارے شوہر نے مجھے لفٹ دی تھی تب میں نے اسے اپنا نام کھنہ بتایا تھا تاکہ وہ مجھے شناخت نہ کر سکے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میرا نام رتنا دیو ہے، یہ اس کے علم میں آ چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ مجھے کھنہ کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔''

''جس نے بھی تمہارا نام رتنا دیو دیکھا ہے سو فیصد صحیح رکھا ہے۔'' بیلا مسکرائی۔

''کیا مطلب؟'' اس نے گھور کر بیلا کی طرف دیکھا۔

''تم واقعی کسی دیو کی مانند ہو..... تمہارا نام صرف دیو ہونا چاہئے تھا۔'' وہ بولی۔

''اگر تم مجھے صرف دیو کہنا چاہتی ہو تو اس کی اجازت ہے؟'' کھنہ نے کہا۔ ''مجھے کسی بھی نام سے پکارو میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''اگر تمہاری اجازت ہو تو میں جا کر نہا لوں؟'' بیلا

نے اس کی طرف دیکھا۔

کھنہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا پھر وہ مطمئن ہوکر بولا۔ ''جاؤ..... لیکن کوئی حماقت نہ کرنا۔''

وہ تیزی سے اُٹھی اور تقریباً لپکتی ہوئی اوپر اپنے کمرے میں پہنچ گئی، اس وقت اس کی حالت پاگلوں کی سی تھی۔ وہ چند لمحوں میں نہا کر باہر آ گئی۔ پھر اس نے خوب صورت لباس پہنا اور دروزاے کے پاس آ کر بلند آواز سے کہا۔ ''کھنہ! ذرا میرا سوٹ کیس کھول دو..... مجھ سے نہیں کھل رہا۔''

کھنہ! اوپر آ گیا۔ بیلا کے لباس کو دیکھ کر وہ جھجکا اور واپس جانے کے لئے پلٹ گیا۔

''کھنہ ادھر آؤ۔'' بیلا نے رسیلی آواز میں بڑی لگاوٹ سے کہا۔ وہ پلٹا، اس کی آنکھوں میں نفرت تھی۔ اس نے خشونت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سنو غور سے سن لو..... تم شاید بہری ہو یا شاید تم نے سنا نہیں تھا کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ میں نے اس سے جو وعدہ کیا ہے اس پر قائم ہوں اور میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں..... میرے لئے تم کسی بازاری عورت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں میری نظر میں تمہاری حیثیت سڑک پر پھرنے والی کسی کتیا سے زیادہ نہیں..... میں نے اگر تم سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو تب بھی میں تمہیں ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتا۔'' اتنا کہہ کر اس کی بات سنے بغیر وہ تیزی سے واپس چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

سہہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ جب گوتم بینک میں داخل ہوا، وہ سیدھا بینک منیجر کے پاس پہنچا، بینک منیجر اسے دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔ نہایت پرجوش انداز سے اس کا استقبال کیا۔

''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ آپ کافی عرصہ بعد آئے؟

''میں نہایت عجلت میں ہوں مسٹر دلشان۔ مجھے فوری طور پر کچھ رقم چاہیے؟''

''جی ہم لوگ آپ جیسے لوگوں کی سیوا کے لیے بیٹھے ہیں، مسٹر گوتم! کتنی رقم درکار ہے آپ کو؟''

دس ہزار ہندوستانی کرنسی..... سوسو کے نوٹوں کی شکل میں۔'' گوتم نے جواب دیا۔

''مگر مسٹر گوتم! آپ کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم موجود نہیں ہے۔'' دلشان نے آنکھیں جھپکائیں۔

گوتم کو یاد آیا کہ اس کے اکاؤنٹ میں شاید دو ایک ہزار روپے پڑے ہیں، اس نے بمشکل تمام خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ میں آتے ہوئے زیادہ رقم نہ لاسکا۔ آپ ممبئی اپنے ہیڈ آفس فون کرلیں، وہاں میرا اکاؤنٹ ہے۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔ ان سے کہیں کہ آپ کی برانچ میں بیس ہزار روپے میرے یہاں کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردیں۔''

دلشان..... گوتم کے لہجے میں حیران ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جناب! میں سوسو کے نوٹوں کی شکل میں انتظام کرتا ہوں۔''

''آپ رقم کا انتظام کرکے رکھیں، مجھے کچھ شاپنگ کرنی ہے، پندرہ منٹ کے بعد واپس آؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ بینک سے باہر آ گیا۔

گوتم کے باہر جاتے ہی انسپکٹر سنگارا بینک میں داخل ہوا اور سیدھا منیجر کی طرف گیا۔

''مسٹر دلشان! کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ مسٹر گوتم کیوں آئے تھے؟''

''میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہیے۔ بینک آدمی لین دین کے لیے آتا ہے، ان کا اکاؤنٹ ہمارے بینک میں ہے..... بہرحال آپ کسی وجہ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو سنیے..... انہوں نے دس ہزار روپے مانگے ہیں سوسو کے نوٹوں کی صورت میں۔''

''کیا ایسا ممکن ہے آپ انہیں رقم نہ دیں؟'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔

''میں نے وعدہ کرلیا ہے، گو کہ ان کے پاس چیک بک نہیں تھی لیکن وہ ہمارے معزز گاہک ہیں۔ ممبئی میں ہیڈ آفس میں ان کی لاکھوں کی رقم موجود ہے..... یہ کیسے ممکن ہے، انہیں دس ہزار روپے نہ دیئے جائیں،

کیوں؟ کیا کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''نہیں..... آپ نے وعدہ کرلیا ہے تو رقم دے دیں، مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ انہوں نے اتنی کم رقم کیوں طلب کی..... وہ تو لاکھوں میں کھیلنے والوں میں سے ہیں۔'' پھر انسپکٹر سنگارا منیجر سے ہاتھ ملا کر باہر نکلا۔

''گوتم اسٹور سے انڈے اور پیاز خرید کر نکلا ہی تھا کہ پریشان ہوگیا کیونکہ انسپکٹر سنگارا بڑے پرسکون انداز میں ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھا، پھر اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو مسٹر گوتم! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

گوتم کو کھنہ کی ہدایت یاد آ گئی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ پولیس کیا کر رہی ہے اور اب تک کیا پیش رفت ہوئی ہے۔

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک ضروری کام سے بینک آنا پڑ گیا، مجھے کافی کی بڑی طلب ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے ایک کافی کیوں نہ پی لی جائے، آپ کے پاس وقت ہوگا؟''

''ضرور، ضرور۔'' انسپکٹر سنگارا نے سر ہلایا۔

چند لمحوں کے بعد وہ دونوں ایک ریسٹورنٹ کے گوشے میں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل تھے، میز کی طرف بڑھتے ہوئے انسپکٹر کافی کا آرڈر دے چکا تھا۔ گوتم نے فوراً ہی کہا۔ ''انسپکٹر! میں آپ کو زیادہ وقت دے نہ سکوں گا، میری بیوی بیلا بنگلے میں اکیلی ہے، میں اسے زیادہ دیر تک نہیں چھوڑ سکتا۔''

''ٹھیک ہے، ذرا دیر کی یہ رفاقت میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''بہت بہت شکریہ اس عزت افزائی کا..... آپ کے اس درندہ صفت قاتل نے مجھے ایک عمدہ اور زبردست خیال دیا ہے، میرا خیال ہے کہ کہانی بڑی شاندار لکھی جائے گی۔ ویسے کیا ہوا اس قاتل کا وہ پکڑا گیا کہ نہیں؟''

''ابھی تک تو وہ پکڑا نہیں جا سکا، بڑے پیمانے پر اور بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش جاری ہے۔ پولیس کا خیال ہے وہ پال کیلے میں موجود ہے، وہ کہیں بھی روپوش ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ کب تک روپوش اور قانون کے ہاتھوں سے بچا رہے گا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' گوتم نے کہا۔ ''قانون سے کوئی مجرم بچ نہیں سکتا۔''

وہ انسپکٹر کو اعتماد میں لے کر تمام حالات سے آگاہ کر دینا چاہتا تھا، لیکن حالات ایسے تھے کہ وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی پولیس کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔ اس کی بیوی بیلا قاتل کے قبضے میں تھی اور وہ بیلا کی زندگی کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

''اچھا آپ جو کہانی لکھیں گے تو اس کے تانے بانے آپ کس طرح بنیں گے؟'' انسپکٹر سنگارا نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''میں اپنی فلمی کہانی کو اس طرح آگے بڑھا رہا ہوں کہ ایک خطرناک قاتل دندناتا ہوا علاقے میں گھوم رہا ہے، پولیس بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں ہے۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا جب آپ اور آپ کا ماتحت میرے بنگلے پر آئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر واقعی صورتحال ایسی ہوتی کہ وہ قاتل میرے بنگلے میں موجود ہو اور اس نے مجھے اپنی پستول کی زد میں لے رکھا ہو تو میرا ردعمل کیا ہوتا؟ اس پلاٹ پر میں نے اپنی کہانی کی بنیاد رکھی، اس کے بعد کہانی خود بنتی جائے گی۔''

''ظاہر ہے مسٹر گوتم! آپ جیسے کہانی نویسوں کے لیے بس ایک خیال ہی کافی ہوتا ہے۔'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''پھر اس خیال پر زبردست کہانی بن دیتے ہیں..... یہی کمال ہے آپ جیسے قلم کاروں کا۔''

''بات یہ ہے انسپکٹر سنگارا!'' گوتم ٹھہر ٹھہر کے، کافی کی چسکیوں کے درمیان بولا۔ ''ایسی صورت حال فلموں کے لیے بہت اچھی سمجھی جاتی ہے، آپ ذرا سوچئے کہ ایک قاتل نے ایک لکھاری کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ اس کے بعد اس لکھاری کی بیوی بھی اچانک اور غیر متوقع طور پر وہاں آ جاتی ہے، اب قاتل نے دونوں کو یرغمال بنا لیا ہے۔ یہاں سے کہانی میں ایک نئی جان پڑ جاتی ہے۔ اس میں تیزی، سسپنس اور سنسنی خیز پیدا

ہوجاتی ہے۔ تماشائیوں کے لیے قدم قدم پر تجسس ہوگا کہ اب کیا ہوگا.....؟ قاتل ان دونوں میاں بیوی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟ کیا انہیں زندہ چھوڑ دے گا..... اس کے بعد کہانی میں وہ تمام چیزیں ایک جگہ جمع ہوجاتی ہیں جو فلم کی کامیابی کے ضامن ہوتے ہیں۔''

''کہانی بہت اچھی ہے۔'' انسپکٹر سنگارا نے سراہتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی تمام فلمیں دیکھی ہیں۔ آپ کی فلمیں سری لنکا میں بھی اسی طرح مقبول ہیں جس طرح ہندوستان، بنگلہ دیش اور نیپال وغیرہ میں..... آپ کی کہانیوں میں ہمیشہ ایک نیا اور انوکھا موضوع رہا ہے۔ آپ نے جہاں معاشرتی مسائل کی بڑی خوب صورت عکاسی کی ہے لیکن یہ فلم سابقہ موضوعات سے ہٹ کر ایک نئے موضوع پر ہوگی، بھگوان نے چاہا تو آپ کی یہ نئی فلم بھی بہت کامیاب رہے گی۔''

''بہت بہت شکریہ انسپکٹر سنگارا آپ میرے بارے میں اتنی اچھی رائے رکھتے ہیں۔'' گوتم نے کہا۔ ''میں اس کہانی.....''

''میں آپ سے قطعی کلامی کی معافی چاہتا ہوں۔'' انسپکٹر سنگارا نے درمیان میں کہا۔ ''کیا میں اس کہانی کے موضوع کے بارے میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟''

کچھ نہیں..... بلکہ بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔'' گوتم نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے ہمیشہ دوسروں کی رائے اور مشوروں کو اہمیت دی ہے۔ ان کے تبصرے، کہانی نویس کی بڑی رہنمائی کرتے ہیں جس سے کئی نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔''

''آپ یہ نئی فلم جرم وسزا، جاسوسی، خون ریزی اور مار دھاڑ کے موضوع پر کیوں بنا رہے ہیں؟'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''جب کوئی رومانی، سماجی اور گھریلو مسائل پر مبنی فلمیں لوگ بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اب یکسانیت سے اُکتا گئے ہیں۔ وہ تبدیلی چاہتے ہیں۔ اب ان کا رجحان بدلتا جارہا ہے۔'' گوتم نے جواب دیا۔ ''لہٰذا میرے فلم ساز نے کہا کہ لوگوں کی مانگ کا خیال رکھا جائے۔ اس لئے میں نے اس موضوع کو منتخب کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فلم کو کس طرح نہایت مہارت سے اختتام تک پہنچایا جائے..... آپ دیکھئے کہ قاتل نے میاں بیوی کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ اگر پولیس آتی ہے تو قاتل انہیں مار ڈالے گا..... آپ جانتے ہیں کہ قاتل کس قدر شقی القلب، سفاک اور درندہ صفت ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی لہو پانی سے بھی ارزاں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک پولیس سے مقابلہ کرے گا، تاوقتیکہ وہ مر نہیں جاتا..... لیکن میں اپنی فلم کی کہانی کو اس انداز سے مکمل کرنا نہیں چاہتا۔ پھر یہ عام سی فلم ہوکر رہ جائے گی اور اس کی کہانی بری طرح فلاپ ہوجائے گی۔ چوں کہ یہ بہت بڑا پروجیکٹ ہے، اس لئے کہانی کو نیا موڑ دینا ہوگا۔ اب تک ہندوستانی فلم میں اس موضوع پر کوئی فلم نہیں بنی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ فلم سپرہٹ ہوگی۔''

انسپکٹر سنگارا کو اب گوتم کی فلمی کہانی کا پلاٹ سن کر پکا یقین ہوگیا تھا کہ رتنا دیو..... گوتم کے بنگلے ہی میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن اس نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ تمام حقائق سے آگاہ ہوگیا ہے۔ گوتم نے اپنی کہانی کے بہانے اسے ساری باتیں بتادی تھیں۔ اب وہ اس بات سے خوف زدہ تھا کہ پولیس ایکشن، میاں بیوی کی موت کا باعث بن سکتا ہے۔

''آپ نے جو کہانی سنائی ہے وہ بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے، شاید اس سے کہانی مزید بہتر ہوجائے۔ اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو ناچیز ایک مشورہ دے؟''

''ضرور..... ضرور.....'' گوتم نے خوش ہوکر کہا۔ ''میرے لئے یہ بڑی رہنمائی کی بات ہوگی۔''

''فرض کریں کہ دونوں پولیس افسر کہانی کار سے بات کرکے باہر چلے جاتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک نوجوان پولیس افسر فوج میں رہ چکا ہے، یہ ایک ماہر نوجوان پولیس افسر فوج میں رہ چکا ہے، یہ ایک ماہر اور بڑا اچھا نشانہ باز ہے۔ اسے شبہ ہوجاتا ہے کہ قاتل کہانی کار کے گھر میں چھپا ہوا ہے۔'' چنانچہ وہ واپس جاکر ایک

درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے گھر کی نگرانی کرتا ہے۔ وہ قاتل کے باہر نکلنے کا انتظار کرتا ہے۔'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''اگر کہانی میں یہ واقعہ شامل کیا جائے تو کیسا رہے گا.....؟ کیا اس منظر کو شائقین پسند کریں گے.....؟''

گوتم نے ایک گہرا سانس لیا۔ وہ اس کی بات کی تہہ میں پہنچ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ انسپکٹر سنگارا کو اس بات کا علم ہوگیا ہے کہ رتنا دیو اس کے بنگلے میں چھپا ہوا ہے۔ اس نے شاستری کے بارے میں سوچا، وہ واقعی ہر اعتبار سے فوجی معلوم ہوتا تھا۔

''خیال اچھا ہے۔'' گوتم نے بھاری آواز میں کہا۔ ''اس سے کہانی میں ایک نیا موڑ آئے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ کہانی کو اس لائن پر بڑی خوب صورتی سے آگے بڑھا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہانی بنانا آپ کا کام ہے، آپ کا ذہن تخلیقی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ اس سے بہتر کوئی اور خیال لے آئیں۔''

''دیکھئے کیا ہوتا ہے۔'' گوتم بولا۔ ''جب لکھنے بیٹھوں گا تو آپ کا مشورہ سامنے رکھوں گا۔''

''ویسے ایک اور ترکیب بھی ہوسکتی ہے..... کہانی میں یہ کام کوئی آپ کا کردار ہی کرسکتا ہے..... اگر وہ کسی بہانے سے اس قاتل کو بنگلے سے باہر بھیج دے تو درخت پر بیٹھا ہوا پولیس افسر اسے آسانی سے نشانہ بنا سکتا ہے لیکن اس کے لئے آپ کو پہلے یہ بتانا ہوگا کہ یہ پولیس افسر نہایت ہی عمدہ نشانہ باز ہے..... ورنہ اگر پولیس افسر نے فائر کیا اور اس کا نشانہ خطا ہوگیا تو قاتل فوراً ہی چھلانگ لگا کر اندر چلا جائے گا اور پھر وہ دونوں میاں بیوی کو طیش میں آکر گولیوں سے بھون دے گا۔''

انسپکٹر سنگارا نے اپنی بات ختم کرکے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''گوتم نے اس تجویز پر غور کیا جو نہایت معقول اور قابل عمل تھی..... قاتل کو کسی بھی حیلے بہانے سے باہر بھیجا جاسکتا تھا لیکن اس کے لیے ایسا عمدہ بہانہ ہونا چاہیے تھا کہ قاتل کو ذرا برابر بھی شک نہ ہو۔

''اچھا انسپکٹر سنگارا۔ میں اس پر غور کروں گا۔'' وہ بولا۔ ''مجھے اجازت دیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے اور مہیلا بھی پریشان ہو رہی ہوگی کہ میں اب تک کیوں نہیں آیا۔''

☆.....☆.....☆

سوا چار بج رہے تھے۔ شاستری درخت پر کسی پرندے کی طرح بسیرا کئے ہوئے تھا۔ اس کے سارے جسم میں درد ہونے لگا تھا۔ مچھروں نے کاٹ کاٹ کر اس کی تکلیف میں اور اضافہ کردیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سورج جلدی سے غروب ہوجائے تو وہ کچھ دیر کے لیے درخت سے اتر کے ٹانگیں سیدھی کرے۔

اسی اثناء میں وا کی ٹا کی میں ہلکی سی آواز آئی۔ اس نے بٹن دبا کر کہا۔ ''ہیلو سر!''

''سنو شاستری.....! میں نے ابھی ابھی گوتم سے بات کی ہے..... مجھے پورا یقین ہے کہ رتنا دیو بنگلے میں ہی موجود ہے۔ گوتم اس بات کی کوشش کرے گا کہ رتنا دیو کسی نہ کسی طرح باہر آجائے۔ اس کے بعد تمہارا کام ہے اسے نشانہ بنا دو۔ اس کا جسم چھلنی کرکے رکھ دو..... ویسے میں تیشنل گارڈز کو بھی بلا سکتا ہوں لیکن پھر ہم مسٹر اینڈ مسز گوتم کو موت کے منہ میں جانے سے بچا نہیں سکیں گے۔'' اتنا بتا کر اس نے گوتم سے ملاقات اور گفتگو کا احوال تفصیل سے سنا دیا۔

اس وقت شاستری نے جیپ کو بنگلے کے سامنے رکتے دیکھا تو اس نے انسپکٹر سنگارا کو بتایا۔ ''سر! مسٹر گوتم واپس آچکے ہیں۔ جیپ کو پارک کررہے ہیں۔'' پھر اس نے وا کی ٹا کی بند کرکے رائفل اٹھالی۔

یہ گوتم اندر داخل ہوا۔ کھنے کے چہرے پر روشنی اور کرختگی کے آثار تھے اور پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''گوتم! دروازہ بند کرکے چٹخنی لگا دو۔ تھیلا دروازے کے ساتھ رکھ دو..... اور دروازے کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ۔ زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔''

''میری بیوی کہاں ہے؟'' اس نے متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اوپر ہے۔ شاید سو رہی ہوگی..... میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے ساتھ ایمان داری سے کام لوگے تو

میں بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی سلوک کروں گا۔'' اس نے پستول ہولسٹر میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور ہاں..... نئی تازہ خبر کیا ہے۔''

گوتم اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے جواب دیا۔ ''میں تمہارے لئے دس ہزار روپے ہندوستانی کرنسی لایا ہوں۔''

''واقعی.....'' وہ خوش ہوگیا۔ ''تم نے واقعی میرے لئے بہت بڑا کام کیا۔ اور ہاں۔ تم نے بتایا نہیں کہ پولیس کیا کر رہی ہے؟''

''پولیس کا خیال ہے کہ تم کینڈی یا پال کیلے مضافات کی طرف نکل گئے ہو۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو.....؟'' کھنہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے جو بات سچ تھی وہ بتادی۔'' گوتم بولا۔

''کہیں تم پولیس کے پاس تو نہیں پہنچ گئے تھے.....؟'' کھنہ نے مشکوک ہوکر سختی سے پوچھا۔

''اگر میں پولیس کے پاس گیا ہوتا تو کیا اکیلا ہوتا۔'' گوتم نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''بہر حال..... تمہاری اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پولیس اب اس علاقے میں میری تلاش میں نہیں ہے.....؟'' کھنہ نے پوچھا۔

''یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ آئندہ کیا کرے گی..... بہر حال اتنا جانتا ہوں کہ پولیس کا خیال ہے کہ تم اس علاقے سے بھاگ نکلے ہو اور یہاں تمہیں تلاش نہیں کیا جارہا ہے؟'' گوتم نے جواب دیا۔

''اچھا رقم کہاں ہے.....؟'' کھنہ نے کہا۔ ''لاؤ دے دو تاکہ میں اپنے پاس رکھ لوں۔''

''رقم کا لفافہ میں نے گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیا تھا اسے لانا بھول گیا۔'' گوتم نے کہا۔

''جاؤ جا کر جیپ سے لے آؤ۔'' کھنہ نے کہا۔

گوتم نے یہ سوچ کر رقم جیپ میں چھوڑی تھی کہ رقم کا نام سن کر کھنہ فوراً رقم لینے باہر جائے گا۔ اس طرح شاستری اسے نشانہ بنالے گا لیکن وہ ایک نمبر کا کائیاں تھا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''جاؤ..... جا کر رقم کا لفافہ جیپ سے لے آؤ۔ سنا نہیں۔'' وہ سختی سے بولا۔

گوتم باہر چلا گیا اور جیپ سے خاکی لفافہ لے آیا۔ شاستری سمجھ گیا تھا کہ گوتم نے دانستہ لفافہ جیپ میں چھوڑ دیا تھا کہ رتنا دیو اسے لینے باہر نکلے گا لیکن وہ نہیں نکلا۔

شاستری پھر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی کامیابی کی یہی ایک صورت ہے کہ وہ یہاں خاموشی سے ساکت و جامد بیٹھا رہے..... اور رتنا دیو کے باہر آنے کا انتظار کرے۔ ہر صورت تکلیف برداشت کرنی تھی۔ سب سے زیادہ اس کے لیے پریشانی کا سبب مچھر تھے۔ جنہوں نے اس کا کاٹ کاٹ کر برا حال کر دیا تھا۔ اس کے بعد سگریٹ کی طلب تھی۔ وہ یہاں بیٹھ کر سگریٹ نہیں پی سکتا۔ اس لئے کہ اس کی موجودگی کا راز دشمن پر افشاں ہوجاتا۔

وقت گزرتا رہا۔

اور پھر وہ کچھ ہوا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ وہ پریشان ہوگیا۔

نیچے گھاس میں اس نے سرسراہٹ کی آواز سنی تو پہلے تو یہ سمجھا کہ کوئی بڑا سا موذی سانپ گزر رہا ہے لیکن دوسرے لمحے یہ خیال غلط نکلا۔ ایک کتے نے بھونکنا شروع کر دیا۔ شاستری نے نیچے دیکھا لیکن گھاس اتنی گھنی تھی وہ نیچے کچھ نہیں دیکھ سکا۔ کتاب درخت کے تنے پر نیچے رکھے، سر اوپر اٹھائے بری طرح بھونک رہا تھا، پھر اس نے ایک آواز سنی۔

''جیکو..... چلو ادھر آؤ..... چلو۔''

شاستری کی شاخ سے چپک کر بیٹھ گیا۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک پستہ قد، بھاری بھرکم شخص ہاتھ میں مچھلی پکڑنے کی چھڑی اٹھائے درخت کی طرف دیکھ رہا تھا، کتا بھونک بھونک کر آسمان پر سر اٹھائے ہوئے تھا۔

''جیکو! چلو..... ادھر آؤ۔'' اس شخص نے چیخ کر

کتے کو آواز دی۔

کتے نے ایک دو مرتبہ آواز نکالی۔ پھر اپنے مالک کے پیچھے چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

گوتم جونہی رقم کا لفافہ لے کر اندر پہنچا۔ کھنہ نے زور سے دروازہ بند کردای اور پھر گوتم سے لفافہ لے لیا۔

''تم واقعی بہت اچھے آدمی ہو گوتم! تم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔

''اب میں اپنی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' گوتم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ تم رقم گن لو۔''

''بیوی سے بات کرنے کے لئے تمہارے پاس ابھی عمر پڑی ہے گوتم! میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر تم نے مجھ سے دھوکا نہ کیا تو میں، میں تم سے دھوکا نہیں کروں گا..... میں نے اپنا وعدہ نبھایا کچھ دیر یہاں بیٹھو..... مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔'' اس کا لہجہ پراسرار تھا۔

گوتم جانتا تھا کہ اس وقت اس سے بحث میں الجھنا خطرناک ہوسکتا ہے وہ خاموشی سے بستر پر بیٹھ گیا۔ کھنہ نے لفافے کو میز پر الٹ دیا۔ نوٹ باہر نکل آئے۔

''میں نے اتنی بڑی رقم اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔ تم واقعی با اصول اور اچھے آدمی ہو۔'' اس نے نوٹوں کی گڈی کو اٹھا کر اسے حریصانہ نظروں سے دیکھا، اسے تھپ تھپایا اور پھر اس طرح چوم لیا جیسے وہ اس کے نزدیک بہت مقدس ہو۔

''میں اپنی بیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' گوتم نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''میں نے تمہارا مطالبہ پورا کر دیا ہے۔''

''یہ بات تم پہلے بھی کہہ چکے ہو..... اور کتنی مرتبہ کہو گے..... پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے خیال میں پولیس کو معلوم ہے کہ میں اس علاقے میں نہیں ہوں؟''

''میں نے لوگوں سے بات کی ہے..... ان کا یہی خیال ہے..... بلکہ ہر شخص مطمئن ہے کہ تم اس علاقے سے چلے گئے ہو۔''

''ان کا خیال ہے کہ میں پال کیلے یا کینڈی چلا گیا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر بڑے زور سے ہنسا۔

اس وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ کھنہ نے چونک کر کہا۔ ''گوتم! بات کرو۔ لیکن کوئی حماقت نہ کرنا۔''

گوتم نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو..... میں گوتم بول رہا ہوں۔''

''میں تیج ناتھ بول ہا ہوں..... تمہارا فون خراب تھا۔ کیا حال ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں..... تمہارا کیا حال ہے۔'' گوتم نے جواب دیا۔ کھنہ ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ ''کھنہ کہاں سے بول رہے ہو۔''

''میں کولمبو میں ہوں۔ میرے پاس ایک معاہدہ ہے۔ تمہیں اس پر دستخط کرنے ہیں..... کہو تو میں آجاؤں تمہارے پاس یا تم میرے پاس آؤ گے؟'' تیج ناتھ نے کہا۔

''تیج ناتھ! تم نے اس وقت فون کر کے میرا موڈ خراب کر دیا ہے..... میں اسکرپٹ کو آخری شکل دے رہا ہوں۔ اس مرحلے پر میں اسکرپٹ کو چھوڑ نہیں سکتا۔ معاہدے پر بعد میں بھی دستخط ہو جائیں گے۔ میں کہاں بھاگا جا رہا ہوں۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں سمجھتا ہوں گوتم.....! لیکن میں کیا کروں.....؟ مسٹر ملنگا تری چاہتا ہے کہ معاہدے پر جلد از جلد دستخط ہو جائیں..... تم اس کی فطرت سے مجھ سے زیادہ واقف ہو، اسے کون سمجھائے۔'' تیج ناتھ نے کہا۔ ''اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں۔''

''اس وقت نہیں۔'' گوتم نے کہا۔ ''تم اس سے کہہ دو کہ چوں کہ میں اسکرپٹ کو آخری شکل دے رہا ہوں۔ بے حد مصروف ہوں۔ فی الحال میں کسی معاہدے پر دستخط نہیں کروں گا۔''

''تمہاری بیوی سے ملاقات ہوئی تھی۔ کولمبو ایئرپورٹ پر..... کیا وہ اس وقت تمہارے ساتھ ہے؟'' تیج ناتھ نے پوچھا۔

''ہاں.....'' گوتم نے کہا۔ ''میرے ساتھ ہی ہے اور کہاں ہوگی؟'' تم کیوں پوچھ رہے ہو؟

''اس لئے کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرے

گا..... تمہاری بیوی تمہارے کام میں حارج ہو۔''

''سنو بیچ ناتھ.....! میں ملنگا تری کے لیے کہانیاں ضرور لکھتا ہوں..... لیکن میں کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری نجی زندگی میں دخل دے..... میں کوئی زرخرید غلام نہیں ہوں۔ اگر وہ زیادہ پھیلے تو اس سے صاف صاف کہہ دینا کہ تمام معاملات جہنم میں ڈالو..... میرے پاس کام کی کمی نہیں..... اچھا پھر تم سے بعد میں ملاقات ہوگی۔'' گوتم کا لہجہ سفاک، سردار اور تلخ ہوگیا۔

''تم نے بہت اچھا جواب دیا گوتم.....!'' کھنہ نے کہا۔ ''اس کی طبیعت صاف ہوگئی ہوگی۔ یہ تھا کون.....؟''

''یہ ایک وکیل اور بہت بڑا بزنس میں ہے۔'' گوتم نے جواب دیا۔ ''یہ کوئی معمولی وکیل نہیں..... ہندوستان کے اس نامور وکیلوں میں سے ایک ہے جو صرف مشورے کی فیس پچاس ہزار روپے لیتا ہے اور ایک پیشی کے دو لاکھ روپے..... اس کا بزنس نہ صرف ہندوستان بلکہ سری لنکا میں ہے..... خیر وہ ہوگا اپنے گھر کا بڑا..... اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم نے رقم لی ہے تو میں جا کر اپنی بیوی سے مل آؤں۔''

''ضرور..... ویسے میرا خیال ہے کہ تمہاری بیوی تمہارے اعصاب پر کسی آسیب کی طرح سوار ہے۔ بھئی آخر کیوں نہ ہو۔ وہ ہزاروں بلکہ لاکھوں میں ایک ہے۔ میں تمہیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں کہ آج جیسے ہی اندھیرا ہوگا میں یہاں سے جیپ میں روانہ ہو جاؤں گا۔ آج تک کوئی پولیس والا مجھے پکڑ سکا ہے اور نہ پکڑ سکے گا۔''

''میں یہ نہیں کہوں گا کہ تمہارے جانے سے مجھے کوئی افسوس ہوگا۔'' گوتم نے کہا۔ ''میرے لئے زندگی میں یہ انوکھا تجربہ ہے جو ناقابل فراموش رہے گا۔''

''میں جانتا ہوں..... ایک بات اور سنو..... میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تم نے مجھے اب تک دھوکا نہیں دیا ہے بلکہ میری مدد کی ہے..... اور شاید تم پہلے آدمی ہو جس نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے..... اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں، حالانکہ اس معاملے میں میرا کوئی تعلق نہیں..... سنو گوتم! تم اپنی بیوی پر کڑی نظر رکھو..... تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ وہ کیسی عورت ہے۔ وہ بہت آوارہ اور بدچلن عورت ہے۔ اس کے برعکس تم ایک سیدھے سادے شخص ہو۔ اگر وہ میری بیوی ہوتی تو میں اس کا بھرتا بنا چکا ہوتا۔ اس کا حلیہ ایسا بگاڑ دیتا کہ کوئی مرد اس کی طرف دیکھنا ہی پسند نہیں کرتا..... معلوم نہیں تم کیوں اس بازاری عورت کے ساتھ نباہ کر رہے ہو..... کیا اس لئے کہ وہ شعلہ بدن ہے؟''

☆.....☆.....☆

نفرت، حقارت اور غصے کے مارے بیلا کا برا عالم تھا۔ اس کی آنکھیں چنگاریاں برسا رہی تھیں۔

کھنہ کے الفاظ نہ صرف اس کے کانوں میں گرم گرم سیسہ بن کر پگھل رہے تھے بلکہ اس کے ذہن میں الاؤ بن کر دہک رہے تھے۔ ایک گھٹیا درندہ صفت قاتل اور آوارہ گرد شخص نے اسے اس قدر ذلیل کیا تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اسے اپنے آپ سے..... اپنے وجود سے..... اپنے جسم کے اندر چھپی ہوئی عورت سے نفرت ہوگئی تھی۔

کھنہ کو جب اس نے سوٹ کیس کھولنے کے بہانے بلایا تھا تو اس نے ٹھکرا کر اس کے حسن کی اہانت کی تھی، ذلیل کیا تھا۔ اسے امید نہ تھی کہ ایک سفاک قاتل جس نے ایک رات میں درندگی سے چھ افراد کو قتل کیا ہو، وہ اس کے ساتھ بے رخی اور نفرت سے پیش آئے گا۔ اس نے ذلت کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ کھنہ نے اسے بازاری عورت کہا تھا، آوارہ کہا تھا۔ وہ غصے سے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

''میں تجھے جان سے مار ڈالوں گی سور کے بچے.....! تیرا خون پی جاؤں گی، کسی چڑیل کی مانند!'' وہ مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑائی۔

وہ بستر پر دراز منصوبے بنا رہی تھی۔ کھنہ کو جان سے مارنے کی ترکیبیں سوچ رہی تھی۔ اسے ٹیلی فون کا خیال آیا لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ کھنہ کو ہر قیمت پر مار دینا چاہتی تھی، اس کے

ہاتھوں ہلاک نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ٹیلی فون کے پاس جانا موت کو دعوت دینا تھا، ایک طرح خودکشی کے مترادف تھا۔

وہ سوچتی رہی، سوچتی رہی اور اچانک اسے ایک راہ سوجھ گئی جس پر عمل ہوسکتا تھا۔

اس کے پاس گوتم کا ریوالور تھا۔ اس ریوالور کو وہ بھول ہی گئی تھی مگر..... مگر اس نے وہ ریوالور کو وہ بھول ہی گئی تھی مگر..... مگر اس نے وہ ریوالور تو وینٹی بیگ میں رکھا تھا۔

اسے یاد آیا کہ وینٹی بیگ جیپ میں رکھا ہوا تھا اور جیپ باہر کھڑی تھی۔ گوتم ابھی ابھی جیپ سے واپس آیا تھا۔

وہ مطمئن ہوگئی۔ اسے جلدی نہیں تھی، مناسب وقت کا انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

ادھر شاستری نے واکی ٹاکی پر انسپکٹر سنگارا سے رابطہ قائم کرکے اسے کتے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''سر! میرا خیال ہے کہ رتنا دیو کو شاید علم ہوگیا ہے کہ میں اس درخت پر بیٹھا ہوں اس لئے اندھیرا ہوتے ہی میں اس درخت سے دوسرے درخت پر منتقل ہوجاؤں گا۔''

''اگر ایسی بات ہے تو بولو، میں آجاؤں.....؟'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔

''نہیں سر! نہیں..... میں فوج میں رہ چکا ہوں، میں اس سے خود نمٹ لوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

شاستری کی نگاہیں بنگلے پر لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکیوں کے پردوں کے پیچھے روشنی ہوگئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ بنگلے میں اس وقت کیا ہوگیا ہوگا۔ اس نے ایک نظر اس درخت کا بھی جائزہ لیا جس پر وہ منتقل ہونا چاہتا تھا۔ اس پر چڑھنا آسان تھا لیکن اس درخت سے بنگلے کا منظر زیادہ واضح نہیں تھا۔ اس نے رائفل پر ہاتھ پھیرا اور درخت تبدیل کرنے کا ارادہ حتمی طور پر بدل دیا۔

☆.....☆.....☆

کتے کے بھونکنے کی آواز جونہی بنگلے میں سنائی دی تو کھنہ پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور پستول ہاتھ میں تھامے کھڑکی کے پاس پہنچا۔

ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کی دستیابی

مہران نیوز ایجنسی
حیدرآباد
0222-780128

الفتح نیوز ایجنسی
مہران مرکز سکھر
071-5613548

احمد نیوز ایجنسی
شاہی بازار بہاولپور
0300-6836902

الشیخ نیوز ایجنسی
اخبار مارکیٹ ملتان
0300-7388662

انصاری بک اسٹال
پرنس روڈ کوئٹہ
0333-7842310

اقبال پرویز نیوز ایجنسی
گجرانوالہ سٹی
0333-8103489

اشرف بک ایجنسی
کمیٹی چوک راولپنڈی
051-5531610

گوتم اس کی تیزی اور پھرتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے ایک لمحے کے لئے یقین نہیں آیا۔ گوتم کو اب بھی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ کتے نے شاید انسپکٹر سنگارا کے ماتحت کو درخت پر دیکھ لیا ہے۔ کتا چند لمحوں تک زور زور سے بھونکتا رہا تھا پھر ایک آدمی کی آواز ابھری۔ اس نے کتے کو چپ کرایا پھر خاموشی چھا گئی۔

گوتم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔

کیا اس درخت میں چھپے ہوئے شخص کی مدد کرنی چاہئے.....؟ پھر اس نے اس پولیس افسر کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''کھنہ.....! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... کتے یہاں بھونکا ہی کرتے ہیں..... یہ آوارہ کتے ہوتے ہیں جو کبھی کبھی خوراک کی تلاش میں نکل آتے ہیں۔'' اس نے اپنے لہجے کو معمول پر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ''کتے ویرانے میں زیادہ آتے ہیں۔''

کھنہ نے پردے برابر کر کے پلٹ کر غور سے گوتم کو شعلہ بار نگاہوں سے گھورا۔

''کیا مطلب.....؟'' وہ سانپ کی مانند پھنکارا۔

''کتے نے درخت میں چھپے ہوئے سپاہی کو دیکھ لیا ہے، سمجھے.....! کیا تم سمجھتے ہو میں احمق ہوں، گدھا ہوں؟''

گوتم ہنسا۔ ''نہیں کھنہ.....! درخت پر کوئی اپوسم چڑھ گیا ہوگا..... کتا اس پر بھونک رہا ہوگا۔''

''کیا چڑھ گیا درخت پر.....؟'' کھنہ نے حیرانی سے پوچھا۔

''اپوسم.....! یہ ایک ایسا جانور ہے جس کے کتے جانی دشمن ہوتے ہیں۔'' گوتم نے جھوٹ بولا۔ اس لئے کہ کھنہ کا شک نہ صرف دور کرنا تھا بلکہ اس پولیس والے کو بھی قتل ہونے سے بچانا تھا۔ اس نے اپنا لہجہ قابو میں رکھا۔ ''چونکہ تمہارے ذہن پر پولیس آسیب کی طرح مسلط ہو چکی ہے اس لئے تم یہ سمجھتے ہو کہ کوئی پولیس والا درخت پر ہوگا..... اپوسم بڑے اور موٹے چوہے ہوتے ہیں، گھونس کی طرح..... مچھلیاں اور انڈے کھاتے ہیں، تم نے اس کے بارے میں سنا ہوگا!''

''ہاں سنا ہے۔'' کھنہ نے کہا اور کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے پھر پستول ہولسٹر میں ڈال لیا تھا لیکن اس کے چہرے کے عضلات میں کشیدگی اور آنکھوں میں انگاروں کی سی چمک برقرار تھی۔

''تو تمہارا خیال ہے کہ درخت پر کوئی سپاہی موجود نہیں ہے.....؟''

''ہاں.....! میرا خیال یہی ہے۔'' گوتم نے کہا۔ ''میں نے دو گھنٹے پہلے انسپکٹر اور اس کے ماتحت کو کرشل مارکیٹ ایریا میں دیکھا تھا، اس وقت میں شراب پی رہا تھا، وہ منی مارٹ سے شاید سوداسلف لینے آیا تھا، بھگوان کے لئے اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔''

کھنہ کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ اسے مشکوک نظروں سے گھورنے لگا اور پھر سخت لہجے میں بولا۔

''ہو سکتا ہے اسے تم جیپ میں بٹھا کر یہاں لے آؤ..... یہ امکان بھی ہے کہ تم صریحاً جھوٹ بول رہے ہو۔''

''میں تمہارے خدشات کو سمجھ رہا ہوں کھنہ! تمہارے سوچنے کا انداز بھی درست ہے..... اگر کوئی اور تمہاری جگہ ہوتا تو وہ بھی اس انداز سے سوچتا.....! میری فلم کی کہانی کے لئے یہ بہت اچھی سچویشن بنے گی۔''

''تمہاری کہانی کی ایسی کی تیسی.....!'' وہ بری طرح بگڑ گیا۔ ''مجھے بتاؤ تم جھوٹ بول رہے ہو یا نہیں؟''

''نہیں کھنہ! میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، میں تمہارا شک کیسے دور کروں۔'' گوتم نے کہا۔

''تو کیا تمہارا خیال ہے کہ کتا اسی اپوسم پر بھونک رہا تھا؟'' وہ الجھ کر بولا۔

''ہاں.....!'' گوتم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ ''کیا میں اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہوں؟''

اس نے ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ اب اندھیرا تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے گوتم! تم جا سکتے ہو لیکن دیکھو..... کوئی

چالاکی مت کرنا، میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں، تم نے اب تک میری مدد کی ہے، میرے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا..... دنیا میں آج تک کسی نے میرے ساتھ ایسا اچھا اور مخلصانہ سلوک نہیں کیا، میرے سگے بھائی نے بھی مجھ سے کبھی خلوص نہیں برتا، میری ماں بھی یہی کہتے کہتے بھاگ گئی کہ میں پیدا نہ ہوا ہوتا اچھا تھا، میرے ساتھ ہر وقت رہنے والے بدمعاش ساتھی بھی دل میں مجھ سے نفرت کرتے تھے۔'' وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں درشتی نہیں تھی جس کا گوتم عادی تھا۔ یہ ایک معصوم بچے کی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ یہ اس اعتماد کا اظہار تھا جو کھنہ نے اس پر کیا تھا۔ اس وقت گوتم کو خود پر شرم آئی۔

''ٹھیک ہے گوتم! جاؤ اپنی بیوی سے بات کرو، میں جا کر کھانا تیار کرتا ہوں۔''

گوتم کھڑا ہو گیا اور اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کھنہ! تم تو آج رات جا رہے ہو؟''

''ہاں..... ! رات کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی میں یہاں سے چل دوں گا، سیدھا کولمبو جاؤں گا اور انسانوں کے ہجوم میں کھو جاؤں گا..... وہ مجھے وہاں پکڑ نہیں سکیں گے کیونکہ ان کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئے گی۔''

☆.....☆.....☆

گوتم، بیلا کو دلاسا دیتا رہا۔ اسے پیار سے سمجھاتا رہا۔

''اس نے کہا ہے کہ وہ اندھیرا گہرا ہوتے ہی یہاں سے چلا جائے گا۔'' گوتم نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لے جا کر سرگوشی کی۔

''کیا وہ واقعی جا رہا ہے.....؟'' بیلا نے پوچھا۔

''کیا تمہیں اس کی بات کا یقین آ گیا؟''

''ہاں..... اس نے ابھی ابھی بتایا ہے، وہ جیپ سے کولمبو جائے گا۔'' گوتم نے پھر سرگوشی کی۔

بیلا کے جسم میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ وہ ہر قیمت پر کھنہ کو جان سے مار دینا چاہتی تھی۔ کھنہ کے الفاظ اب بھی اس کے ذہن میں الاؤ بنے ہوئے تھے، کسی زہریلے بچھو کی طرح اس کے وجود میں ڈنک مار رہے تھے۔ اگر یہ سفاک اور درندہ صفت قاتل قانون کے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا تو اپنے دوستوں کو ہنس ہنس کر بتائے گا کہ اس نے کیا کچھ کیا تھا، اس کی پیش قدمی کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ تڑپ کر رہ گئی۔ کیا اس طرح اس خونی نے اس کی تذلیل نہیں کی تھی.....! ایک عورت اپنی توہین کیسے برداشت کر سکتی ہے۔

''ہوں..... تو وہ واقعی جا رہا ہے۔'' بیلا نے خوابیدہ سے لہجے میں کہا۔

''ہاں..... ! اس کے بعد ہم اس خوفناک خواب سے بیدار ہو جائیں گے۔'' اس نے خوش ہو کر بیلا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہاں اطمینان سے رہیں گے کل سے ہم ایک نئی اور خوبصورت زندگی کا آغاز کریں گے۔''

''کیا کہہ رہے ہو گوتم.....! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اس کے بعد ہماری زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی.....؟'' بیلا کی آنکھوں میں بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔

گوتم نے چونک کر اسے دیکھا۔ بیلا کے چہرے کے تاثرات کا اسے یقین نہیں آیا۔ وہ محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ''کیوں.....؟ کیا تمہیں اس میں کوئی شبہ ہے.....؟ بیلا! مجھے تم سے محبت ہے، میں نے تمہیں ہمیشہ چاہا ہے، میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں..... کاش! میں اپنا سینہ چیر کر دکھا سکتا۔''

''یہ مکالمہ تم اپنی فلم کے لئے محفوظ رکھو..... یہ مکالمہ ہر ہندوستانی فلم میں ہوتا ہے۔'' بیلا نے سخت لہجے میں کہا۔

''بیلا.....!'' گوتم اس طرح سے تڑپ گیا جیسے اسے آگ میں جھونک دیا گیا ہو۔

''آئی ایم سوری گوتم! شاید مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا..... بات یہ ہے کہ میں ذہنی طور پر بے حد پریشان ہوں..... تم اپنی نئی زندگی کے بارے میں کل بات کریں گے..... جب یہ وحشی بن مانس بنگلے میں نہیں ہوگا..... گوتم! تم میرا وینٹی بیگ جیپ میں بھول گئے ہو، مجھے میرا وینٹی بیگ لا دو۔'' بیلا نے کہا۔

''وہ مجھے باہر نہیں جانے دے گا۔'' گوتم نے کہا۔

''تم کوشش تو کرو، اس سے کہو کہ میں بیوی کا پرس لانا چاہتا ہوں جو جیپ کے خانے میں رکھا ہے۔'' وہ منہ بنا کر بولی۔ ''عجیب مصیبت ہے، ہمیں اپنی چیز بھی لانے کے لئے اس سے اجازت لینا ضروری ہے؟''

''آخر تم اس کے لئے اتنی بضد کیوں ہو.....؟''

گوتم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بیلا خود پر اور اپنی زبان پر قابو نہ پا سکی۔ غیر اختیاری طور پر اس کی زبان سے نکل گیا۔ وہ جھلا کر بولی۔ ''میں.....! میں اس ذلیل اور وحشی کو قتل کرنا چاہتی ہوں گوتم! میرے وینٹی بیگ میں ریوالور ہے۔''

کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی لیکن اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے یہ بات کیوں کہہ دی لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

اس کی بات سن کر گوتم اچھل پڑا۔ اسے جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟'' میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس ریوالور نہیں ہے۔''

''وہ تمہارا ریوالور ہے..... میں نے وہ ریوالور سیف سے نکالا تھا..... جاؤ میرا وینٹی بیگ لا دو۔''

''تمہیں آخر میرا ریوالور نکالنے کی کیا ضرورت آ پڑی تھی؟'' وہ سخت لہجے میں بولا۔

''تم اگر جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو.....!'' بیلا نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں انگارے دہکنے لگے۔ ''میں تمہیں بتاتی ہوں، وہ جو تمہارا باس ہے ملنگا تری.....! اس نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کو میری نگرانی پر لگا رکھا تا، سنا تم نے.....! اس نے مجھے بلیک میل کرنا چاہا تھا، میں نے سیف سے ریوالور نکال کر اس پر گولی چلا دی..... کمینہ.....! وہ پستول لے کر آیا تھا تا کہ اس کے زور پر تنہائی سے فائدہ اٹھا سکے لیکن وہ بزدل بھاگ نکلا..... مجھے حیرت ہے کہ وہ بچ کیسے نکلا..... اسے مجھے ہر صورت مار ڈالنا چاہئے تھا، اب میں اس وحشی درندے کہنہ کو بھی مار ڈالنا چاہتی ہوں، خون پی جانا چاہتی ہوں اس کا.....!''

''آخر اس کا قصور کیا ہے..... کیا اس نے میری عدم موجودگی میں تم سے کوئی زیادتی کی.....؟''

''قصور کیا ہے، یہ میں بعد میں بتاؤں گی، پہلے اسے ختم کر دوں۔'' وہ غرائی۔

گوتم اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس نے خاموشی سے سب کچھ سنا تھا۔ اسے یاد آیا ملنگا تری نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کی بیوی کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسے ملنگا تری کی ایک ایک بات یاد آ گئی۔ نفرت کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے ملنگا تری کی بات سننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ملنگا تری نے جو کچھ کہا ہے، وہ صحیح ہے لیکن وہ اس تلخ حقیقت کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

''ٹھیک ہے بیلا! ہم اس موضوع پر بعد میں گفتگو کریں گے، اس وقت اس پر گفتگو مناسب نہیں۔'' گوتم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم مجھے جلا کیوں رہے ہو.....؟'' وہ تنک کر بولی۔ ''جلدی سے جا کر میرا وینٹی بیگ لے آؤ۔''

''تمہیں اصل صورتحال کا اندازہ نہیں یا پھر تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ ہم کیسے حالات سے گزر رہے ہیں، یقین کرو بیلا! یہ شخص پاگل ہے، جنونی ہے..... خون سوار ہے اس کے سر پر..... میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہماری خیریت اسی میں ہے کہ ہم وہی کریں جو وہ کہہ رہا ہے..... اگر اس وقت میں نے اسے بیگ لانے کے لئے کہا تو وہ شک میں مبتلا ہو جائے گا..... وہ یقیناً پوچھے کہ اس بیگ کی کیا ضرورت پڑ گئی..... تمہی بتاؤ میں اسے کیا جواب دوں گا؟ کیا اس سے کہوں گا کہ تمہیں لپ اسٹک کی ضرورت ہے..... وہ پاگل نہیں ہے..... وہ بہت چالاک اور عیار ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ بیگ میرے ہاتھ سے چھین لے اور اس پھر اس میں ریوالور دیکھ کر اس کا دماغ چل جائے..... وہ ایک دو نہیں پورے چھ افراد قتل کر چکا ہے، ہمیں بھی مار دے گا، ہمیں ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہئے بیلا! ہمیں انتظار کرنا چاہئے کیونکہ

اندھیرا گہرا ہوتے ہی وہ چلا جائے گا۔''

اسی وقت کھنہ کی آواز ابھری۔ ''کھانا تیار ہے گوتم! نیچے آجاؤ۔''

''چلو بیلا! ہمیں اسے جھلاہٹ میں مبتلا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' گوتم نے کہا۔

''تم بزدل ہو گوتم! اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھاؤں گی۔''

گوتم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تکرار و بحث کر کے ماحول پراگندہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ شانے جھٹک کر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کھنہ کو ٹھنڈا رکھنا بے حد ضروری ہے۔ اس نے نیچے جا کر کھانے کی میز دیکھی، کھانا میز پر چنا ہوا تھا۔

''میری بیوی کھانا نہیں کھائے گی، اسے بھوک نہیں ہے، وہ بستر پر لیٹ گئی ہے۔''

''چلو کوئی پرواہ نہیں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہم دونوں اس کے حصے کا کھانا بھی ڈٹ کر کھائیں گے۔''

وہ دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھنہ بڑے مزے لے لے کر کھانا کھا رہا تھا اور زندگی کے واقعات بھی سنا رہا تھا۔ بیشتر باتیں اس کے باپ اور اس کی ماں کے بارے میں ہی تھیں۔ اس نے اچانک محسوس کیا کہ گوتم کھانا نہیں کھا رہا ہے جیسے کھانا بدمزا ہو، حالانکہ ایسی بات نہ تھی۔ اس نے کھانا بڑی محنت سے بنایا تھا، اسے لذیذ اور ذائقہ بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

''کیا بات ہے گوتم! تم کھانا زہر مار کر رہے ہو اور چہرے سے لگ رہا ہے کہ پریشان ہو؟'' کھنہ نے ہاتھ روک کر کہا۔

''بس یہی سوچ رہا ہوں کہ کاش! میری بیوی یہاں نہ آئی ہوتی۔'' گوتم نے بے جان سے لہجے میں کہا۔ ''اس کے آنے سے پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں، وہ بڑی تیزی اور بدمزاج عورت ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ کوئی حماقت نہیں کرے گی۔''

کھنہ ہنسا۔ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم اپوسم کے بارے میں پریشان ہو۔''

گوتم کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس کا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ کہیں اس کم بخت کو اصل حقیقت کا علم تو نہیں ہو گیا۔

''اپوسم..... ارے وہ.....! مجھے اس کے بارے میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے..... جانے وہ تھا بھی یا نہیں.....! بس ایک خیال آیا تو میں نے کہہ دیا..... نہیں.....! میں اپنی بیوی کے بارے میں پریشان ہوں۔'' گوتم نے فکرمندی سے کہا۔

کھنہ پھر اپنے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ ''اب میرے پاس دس ہزار کی رقم ہے، چند دن خوب آرام سے گزریں گے، میں اس رقم کو کنجوسوں کی طرح خرچ نہیں کروں گا..... میں اس رقم سے زندگی کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا چاہتا ہوں کیونکہ بار بار اتنی بڑی رقم ہاتھ لگنے سے رہی، شاید لگ بھی جائے، اس کا انحصار حالات پر ہے..... گوتم! بس میں یہی سوچ رہا ہوں کہ اس رقم کو کس طرح خرچ کروں، میں نے زندگی میں کچھ بھی تو نہیں پایا، اتنی محرومیاں ہیں کہ ان سب کی تکمیل مشکل لگتی ہے لیکن میں نے پھر بھی پروگرام بنا لیا ہے کہ یہاں سے جا کر مجھے کیا کرنا ہے، میں زندگی کا زیادہ سے زیادہ لطف اٹھانا چاہتا ہوں، اس لئے کہ زندگی چار دن کی چاندنی کی طرح ہوتی ہے، پھر اندھیری رات.....!''

''تم نے واقعی بہت سخت زندگی گزار دی ہے۔'' گوتم نے اظہار افسوس کیا۔

''گوتم.....! زندگی کہاں گزاری ہے.....؟ آوارہ کتوں کی کیا زندگی ہوتی ہے؟ نہ کوئی ٹھکانہ نہ رات کو سونے کو گھر..... ایسا لگتا ہے کہ گھر میری قسمت میں ہے ہی نہیں لیکن خیر اب میں یہاں سے ایک گھنٹے کے اندر اندر چل دوں گا، میرا خیال ہے کہ یہ بہترین موقع ہے، بس کولمبو پہنچ جاؤں، پھر پولیس کے باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتے..... اچھا اب تم اپنی بیوی کے پاس جاؤ تاکہ می برتن دھو کر تیاری کر سکوں۔''

''برتنوں کی فکر نہ کرو، وہ دھل جائیں گے۔'' گوتم نے کہا۔ ''آخر عورت کس لئے ہوتی ہے؟''

''نہیں گوتم.....! ہر چیز کو صاف رکھنا میری عادت ہے، بچپن سے ہی میرے پتا جی نے تعلیم دی تھی کہ ہر چیز سلیقے سے رکھنا چاہیے، اس لئے میں اس کا عادی ہو چکا ہوں، چلو جاؤ اپنی بیوی کے پاس.....!''

گوتم اٹھ کھڑا ہوا۔ کھنہ اس کے پیچھے تھا۔ گوتم اپنے کمرے میں داخل ہوا تو کھنہ نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور گوتم نے تالے میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔

☆.....☆.....☆

اسی لمحے درخت پر گھات میں بیٹھے ہوئے شاستری نے انسپکٹر سنگارا سے رابطہ قائم کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''چاند ابھر آیا ہے، انسپکٹر! دس منٹ کے اندر بنگلہ بھی چاندنی میں نہا جائے گا..... میں نے ارادہ بدل دیا ہے، اس وقت درخت تبدیل کرنا خطرناک ہوگا، اگر رتنا دیو کو شبہ بھی ہو گیا ہے کہ میں یہاں ہوں تب بھی یہ جگہ میرے لئے زیادہ محفوظ ہے، میرا خیال ہے کہ وہ چاندنی میں لاؤنج سے باہر آنے کا خطرہ مول نہیں لے گا، اس وقت حالات میرے حق میں ہیں، اگر وہ باہر نکلا تو مجھ سے بچ نہ سکے گا..... بنگلے سے درخت تک ہموار زندگی کا خاصا بڑا قطعہ ہے۔'' ''میرا خیال ہے کہ میں بھی آ جاؤں؟'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''اس سے تمہیں تقویت ملے گی، میں بہت احتیاط سے آؤں گا۔''

''نہیں سر.....! آپ میری پروا نہ کریں، میں ایسے معاملات سے خوب نمٹنا جانتا ہوں..... یہ ایک ہی آدمی کا کام ہے، اگر آپ ادھر آئے اور میں نے چاپ سنی تو میں فیصلہ نہیں کر پاؤں گا کہ چاپ کی آواز اپ کی ہے یا رتنا دیو کی.....! یہ میرے لیے مناسب نہ ہوگا..... پلیز سر! آپ مجھے کشمکش میں مبتلا نہ کریں۔

''ٹھیک ہے شاستری! اب تم ہر دس منٹ کے بعد رابطہ قائم کرنا، یہ میرا حکم ہے۔'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔

☆.....☆.....☆

کھنہ اس وقت کچن میں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک شیطانی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

''ہوں اپوسم.....!'' اس نے بڑبڑا کر کہا۔

اسے یقین تھا کہ چالاک انسپکٹر سنگارا اس وقت درخت پر موجود تھا۔ وہ انسپکٹر سنگارا کو پہلی ہی نظر میں بھانپ گیا تھا۔ انسپکٹر کے مقابلے میں اس کا ماتحت زیادہ ہوشیار دکھائی دیتا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ شاستری رائفل لئے درخت پر اس کی گھات میں بیٹھا ہے، وہ روانگی سے قبل اسے شکار کرنا چاہتا ہے۔

چند منٹ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا، اپنا لائحہ عمل ذہن میں مرتب کرتا رہا۔ ہولسٹر سے پستول نکالا، پھر اس نے کچن کی بتیاں بجھائیں اور کھڑکی کی طرف گیا۔ کھڑکی کے پاس جا کر اس نے باہر جھانکا۔ اس کی نگاہیں تھوڑے فاصلے پر اگی ہوئی جھاڑیوں پر مرکوز تھیں۔ باہر چاندنی پھیلی ہوئی تھی لیکن چاند ابھی نیچے تھے اور اس کی روشنی بنگلے کے سامنے والے حصے پر پڑ رہی تھی، عقبی حصہ ابھی تک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس کے حرکت میں آنے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس نے مہم پر جانے کی تیاری مکمل کر لی تھی۔

کھنہ نے کھڑکی کھولی اور باہر اتر گیا۔ پھر وہ زمین پر لیٹ گیا۔ نم زمین سے اس نے اپنے لباس کو نم محسوس کیا۔ دیوار کے ساتھ زمین پر لیٹے ہوئے اسے چند لمحات بیت گئے۔

پھر وہ سانپ کی سی تیزی کے ساتھ سینے کے بل رینگا ہوا تیزی سے بنگلے کے عقب میں پھیلی ہوئی جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ لمبا چکر کاٹ کر اس درخت تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں اس کے خیال میں انسپکٹر کا ماتحت شاستری اس کی گھات میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے قتل کرنے یا پکڑنے کے خواب دیکھ رہا تھا جبکہ شاستری کو بالکل خبر نہیں تھی کہ خون آشام بھیڑیا اس کی طرف دبے پاؤں آ رہا ہے۔

کھنہ کھسکتا ہوا چکر کاٹ کر اب درخت کی دائیں طرف آ گیا تھا۔ یہاں سے وہ درخت سے پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔

کھنہ نے غور سے درخت کو دیکھا۔ چاندنی کے باوجود اسے درختوں کے پتوں کے جھنڈ کے سوا کچھ نظر نہ

آیا۔ اس نے سر کو جنبش دی۔ ''کمینے نے جگہ بہ اچھی منتخب کی ہے۔'' اس نے سوچا اور پھر درخت لگا کر کھسکنے لگا۔

☆.....☆.....☆

شاستری نے آہستہ سے پہلو بدلا۔ اس کی کمر پھوڑے کی طرح دکھنے لگی تھی اور ٹانگوں میں خون کی گردش جیسے رک گئی تھی۔ کمر کو کمان کی طرح اکڑ کر اس نے گھڑی دیکھی۔ انسپکٹر کو فون کئے دس منٹ گزر چکے تھے۔ اس نے وا کی ٹا کی کا بٹن دبایا۔

''ہاں سر! مجھے یقین ہے کہ وہ اب کسی بھی وقت بنگلے سے باہر آجائے گا..... میری فکر نہ کریں سر! آپ پریشان نہ ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں، اسے بچ کر نکلنے کا کوئی موقع نہیں دوں گا۔''

''شاستری! تم مجھے میری جان کی طرح عزیز ہو..... ہوشیار رہنا، وہ بہت خطرناک ہی نہیں عیار بھی ہے۔''

''شکریہ سر!'' وہ ممنونیت سے بولا۔ ''میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''پھر دس منٹ بعد مجھے اطلاع دینا..... میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔''

شاستری نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس وقت تک کھنہ درخت کے عقب میں پہنچ چکا تھا اور اس نے اس کی گھنتگوسن لی تھی۔

چند لمحے ٹھہر کر سانس درست کر کے وہ پھر آگے کھسکنے لگا۔ اب اس کی رفتار بہت سست تھی اور وہ کچھوے کی سی چال چل رہا تھا۔ درخت سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر پہنچ کر اس نے سر اٹھا کر درخت کی طرف غور سے دیکھا۔

شاخوں اور پتوں کے جھنڈ کے سوا اب بھی وہ کچھ نہ دیکھ پایا تھا۔ وہ چند گز اور آگے کھسک آیا اور ایک جگہ ٹھہر کر انتظار کرنے لگا۔ اسے کوئی جلدی تھی اور نہ ہی وہ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا۔

شاستری کی ٹانگوں میں جیسے آگ لگ گئی تھی۔ ایک ہی انداز میں بیٹھے بیٹھے اس کے لئے بیٹھے رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فون کاٹ دیا گیا ہے اور رتنا دیو کسی وقت بھی باہر آسکتا ہے۔ اس نے بنگلے پر نظریں جمائیں اور دکھتے جسم کو آرام دینے کے لئے پہلو بدلا۔

ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ یہی حرکت اس کے لئے ہلاکت آفریں ثابت ہوئی۔ کھنہ کے چہرے پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری اور پھر اس نے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔

☆.....☆.....☆

دروازہ بند ہوتے اور باہر سے مقفل ہوتے ہی بیلا ناگن کی طرح بپھر گئی۔

''اب کیا ہے.....؟ اس کمینے نے باہر سے دروازہ کیوں مقفل کیا؟''

''وہ یہاں سے جانے کے لئے تیار ہو رہا ہے۔'' گوتم نے جواب دیا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہم اس صورتحال سے نکل جائیں گے، ہمیں نجات مل جائے گی۔'' اس نے توقف کیا۔ ''ایک طرح سے یہ ہم پر بھگوان کی کرپا ہوگی۔''

''لیکن میرا خیال ہے کہ یہ واقعات تمہیں بہت پسند آئے ہوں گے.....؟'' بیلا نے استہزائیہ انداز سے کہا۔ ''تمہیں اپنی کہانی کے لئے ایک سنسنی خیز اور اچھا پلاٹ مل گیا ہوگا، اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں.....!''

''بھگوان کے لئے بیلا.....!'' گوتم نے جیسے احتجاج کیا۔ ''کیا تم اپنے بارے میں اور میرے بارے میں..... ہم دونوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچ سکتیں.....؟ اپنے دماغ کو فضول باتوں سے خراب نہ کرو۔''

''مجھے یہ بکواس قطعی پسند نہیں۔'' وہ تنک کر کہنے لگی۔ ''اس دوران جب تم اس درندے کے ساتھ پیٹ بھرنے میں مصروف تھے، وہ اپنی کامرانیوں اور فتوحات کی کہانیاں سنا رہا تھا..... وہ بکواس کر رہا تھا..... جھوٹ بول رہا تھا ایک تو تم ویسے ہی احمق ہو پھر وہ تمہیں اپنی لن ترانیوں سے احمق بنا رہا تھا..... جس وقت تم اس سور کے ساتھ ندیدوں کی طرح کھانا کھا رہے تھے، تب میں نے تمام حالات پر غور کیا..... میں اس نتیجے پر پہنچی کہ تمہارے لئے میری زندگی میں کوئی گنجائش نہیں ہے..... تمہیں ہر

وقت بس اپنی فلمی کہانیوں کا ہی خیال رہتا ہے، میں تمہارے لئے بس تمہارے گھر کی زینت کی ایک چیز ہوں اور تمہیں بس دولت کمانے سے غرض ہے۔"

گوتم اس کی باتیں سنتے سنتے تھک کر دروازے سے ہٹ گیا پھر وہ بستر پر بیٹھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "بیلا میری جان.....! یہ وقت اس قسم کی باتوں کے لئے مناسب نہیں..... تم حد سے زیادہ جذباتی ہو رہی ہو اور نفرت اور غصے کی حالت میں ہو، تم وقت کی نزاکت کا احساس کرو، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم اب بھی سخت خطرے میں ہیں، اس کے رحم و کرم پر ہیں..... کھنہ جانے کی تیاریاں کر رہا ہے..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اوپر آ کر ہم دونوں کو مار ڈالے..... میں نے اپنے تئیں پوری کوشش کی ہے کہ اس کے دماغ کو ٹھنڈا رکھوں، اسے غصے میں آنے کا موقع نہ دوں..... ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں بند کر کے چلا جائے لیکن جب تک وہ چلا نہیں جاتا ہم خطرے میں ہی ہوں گے۔"

"کچھ بھی ہو گوتم.....! میں فیصلہ کیا ہے کہ اس صورتحال سے نکلتے ہی تم سے طلاق لے لوں گی۔" اس نے برہمی سے کہا۔ "میں اب تمہارے ساتھ ایک دن کیا ایک گھنٹہ بھی نہیں رہ سکتی..... میں اب آزادی چاہتی ہوں..... مجھے تم سے زیادہ اچھے اور مالدار آدمی مل جائیں گے..... میرے پرستاروں اور امیدواروں کی کوئی کمی نہیں ہے سمجھے.....؟"

گوتم نے اسے غور سے دیکھا۔ اس عورت کے ساتھ وہ دو برس سے زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے خیال میں اس نے اپنی زندگی میں جو سب سے بڑی فاش غلطی کی تھی وہ اس سے شادی کر کے.....! یہ دو برس اس کی زندگی یک بدترین اور منحوس ترین دن تھے..... بیلا نے اس کی زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دیا تھا اور پھر اس نے بیوی جیسی وفاداری بھی تو نہیں نبھائی تھی..... وہ بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی..... بیلا نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا..... اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی تھی..... اس کے باوجود اسے وہ بڑی اذیت اور کرب سے برداشت کرتا رہا تھا..... اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ اسے طلاق دے دیتا یا پھر قتل کر دیتا۔ اب وہ خود اس سے علیحدہ ہونے کی بات کر رہی تھی۔ وہ اس سے بیزار تھی لیکن وہ اب تک بیزار نہیں ہوا تھا جب کہ اسے بیزار اور متنفر ہو جانا چاہئے تھا۔

"ٹھیک ہے بیلا.....!" گوتم نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تم نے علیحدگی کا واقعی فیصلہ کر لیا ہے تو یہی سہی.....! حالانکہ یہ فیصلہ مجھے تمہاری آوارگی کو دیکھتے ہوئے کرنا چاہئے تھا لیکن چونکہ میں تم سے محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں، اس لئے میں نے کوئی قدم نہیں اٹھایا..... ویسے تمہیں اپنے حسن و شباب پر بڑا ناز ہے..... تم بھول رہی ہو کہ یہ حسن چار دن کی چاندنی ہوتا ہے خیر.....! اب جبکہ تم نے علیحدگی کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں..... چلو یہی سہی.....! میں اس کا انتظام کر دوں گا، میری کوشش ہو گی کہ طلاق کے بعد تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔"

بیلا نے حیرانی سے دیکھا۔ "گوتم! پریشانی دور کرنے کا انتظام میں خود کر لوں گی..... میں نے یہ دو برس تمہارے ساتھ یونہی ضائع نہیں کئے ہیں اس مدت کی پوری قیمت وصول کر کے رہوں گی۔"

"کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو.....؟ چلو ٹھیک ہے، اس پر ہم بعد میں بھی باتیں کر سکتے ہیں، تم اس وقت اس میں اپنا ذہن مت الجھاؤ، اگر تم بھگوان پر یقین رکھتی ہو تو اس سے اپنے پاپ شما کرنے کی التجا کرو، ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ہی موت کی نیند سو جائیں۔" گوتم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم شاید اپنی فلمی کہانی کے مکالمے بننے کی مشق کر رہے ہو..... اب معلوم ہوا کہ تم کہانی نویس ہی نہیں ایک اداکار بھی ہو..... میں نے طے کر لیا ہے کہ اس وحشی کے جاتے ہی میں بھی چلی جاؤں گی تم رہنا یہاں.....! اس بے ہودہ اور کھنڈر نما ویران بنگلے میں۔" بیلا کے لہجے میں تلخی اور نفرت بھری تھی۔ یہ نفرت اس کے چہرے پر بھی چھا گئی۔

"جو چاہے کرنا، میں نے تمہیں روکا نہیں ہے اور

نہ ہی روکنے کی کوشش کروں گا۔''

''تم مجھے بلاوجہ ڈرانے کی کوشش کررہے ہو..... تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں اتنی آسانی سے تمہاری باتوں کے فریب میں نہیں آؤں گی۔''

''میں تمہیں ڈرانے کی کوشش نہیں کررہا..... حالات تمہارے سامنے ہیں۔'' گوتم نے کہا۔

بیلا اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ایک دم چونک پڑی، گوتم بھی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''یہ کیا تھا.....؟ بیلا نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''فائر کی آواز تھی۔'' گوتم نے جواب دیا۔

اس نے بڑھ کر روشنی گل کردی اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔اس کی نظریں درخت پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔درخت چاندنی میں نہایا ہوا تھا اور پھر اس نے درخت سے ایک بھاری بوجھ زمین پر گرتا دیکھا، اس کے بعد رائفل زمین پر گری۔ گوتم کو یقین ہوگیا کہ کھنہ نے انسپکٹر سنگارا کے ماتحت کو نشانہ بنایا ہے۔ پھر وہ کھڑکی سے ہٹ آیا۔

''کھنہ نے انسپکٹر سنگارا کے ماتحت کو قتل کردیا ہے۔'' گوتم نے بیلا کو بتلایا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم.....؟'' بیلا نے سہم کر اس کی طرف سمٹتے ہوئے کہا۔

گوتم نے نہایت سختی سے بیلا کو اپنے آپ سے دور کیا اور بولا۔''انسپکٹر سنگارا کا ماتحت شاستری درخت پر کھنہ کی گھات میں چھپا بیٹھا تھا، اب معاملہ بہت سنگین ہوگیا ہے بیلا! اب تم بھی مرنے کے لئے تیار رہو، وہ کسی بھی لمحے ہماری جان لے سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

کھنہ جھاڑیوں کی طرف سے تیز تیز قدم اٹھاتا بنگلے کی طرف آرہا تھا۔اس نے جھاڑیوں سے نکلنے سے پہلے پلٹ کر شاستری کی لاش کو دیکھا تھا اور حقارت سے اس کی لاش پر دو تین ٹھوکریں رسید کیں اور پھر وہاں سے بنگلے کی طرف لپکا تھا۔وہ جیسے اڑتا ہوا سا آرہا تھا۔

گوتم نے کھڑکی سے ہٹ کر کمرے میں روشنی کرتے ہوئے کہا۔''اب تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ چپ چاپ بیٹھی رہو..... جیسا وہ کہے ویسا ہی کرنا، سمجھیں.....؟''

بیلا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ لرزیدہ سی آواز میں بولی۔''اوہ بھگوان! میں یہاں آئی ہی کیوں تھی؟''

''خاموش رہو۔'' گوتم نے جھڑک کر کہا۔''اب فضول باتیں نہ کرنا اس سے، کچھ ہوگا۔''

نیچے سے انہوں نے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنی۔

کھنہ اب بنگلے میں آ گیا تھا۔ پھر اس کی تیز اور بھاری قدموں کی آواز سیڑھیوں پر سنائی دی۔قدموں کی چاپ ان کے کمرے کے دروازے کے سامنے سے گزر گئی۔تھوڑی دیر بعد ہی غسل خانے میں پانی گرنے کا شور سنائی دیا۔

''وہ نہا رہا ہے۔'' گوتم نے کہا۔ بیلا کپکپا کر رہ گئی۔ پھر اس نے ہذیانی لہجے میں گوتم کو مخاطب کیا۔''وہ یہاں آیا تو میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالوں گی، اسے اندر آنے مت دینا۔''

''تم ایسی کوئی حرکت نہیں کروگی..... اگر تم نے ایسا کیا تو وہ پاگل ہوجائے گا، اس کے سر پر خون سوار ہے، ہم دونوں کو بھی نہایت بیدردی اور درندگی سے مار دے گا۔ گوتم نے کہا۔''کیا تم مرنا چاہتی ہو؟''

''مجھے بچالو گوتم.....! اس خونی سے بچاؤ۔'' بیلا نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''خاموش.....!'' گوتم نے اسے پھر بری طرح جھاڑ دیا۔''کیا تم اپنی چونچ بند نہیں کرسکیں؟'' غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز بند ہوگئی تھی۔ وہ پانچ منٹ دم سادھے بیٹھے رہے، پھر دروازہ کھلا، قدموں کی آواز دروازے پر آ کر رکی۔

''وہ آرہا ہے، خبر پر قابو رکھنا۔'' گوتم نے اسے سمجھایا۔''اسی میں سلامتی ہے۔''

تالے میں چابی گھومی، دروازہ کھلا۔ کھنہ اندر آرہا تھا۔ وہ گوتم کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ بیلا بستر پر ایک

طرف سمٹ گئی۔

''میں نے تمہارے اپوسم کو مار دیا ہے گوتم.....!

وہ بہت چالاک جانور تھا اور بے حد خطرناک بھی.....! اس کے پاس رائفل بھی تھی اور وائرلیس بھی.....! معلوم ہے تمہیں کچھ.....؟'' اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

گوتم نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ وہ بت بنا بیٹھا رہا۔

''میں جا رہا ہوں گوتم.....! میں یہاں سے کولمبو جاؤں گا، قدم قدم پر خطرہ مول لینے سے رہا لیکن مجھے یقین ہے کہ میں پولیس کو کچھ دینے میں کامیاب رہوں گا۔'' اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''اچھا گوتم! گڈ بائی..... میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں، غلطی ہر شخص سے ہوتی ہے..... تم نے کہا تھا کہ درخت پر اپوسم ہے لیکن ایسا نہیں تھا، میرا اندازہ درست نکلا، کبھی میں نے اندازے میں غلطی نہیں کی..... بھگوان نے مجھے یہ صلاحیت دی ہے، اچھا گوتم ہاتھ ملاؤ، تم میرے اچھے دوست ثابت ہوئے ہو۔''

گوتم الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس کی ذہنی حالت بڑی خراب ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''کھنہ! میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں، اگر تمہیں کھانے کے لیے کچھ چاہئے تو لے لو۔'' گوتم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سفر لمبا ہے، ہوسکتا ہے کہ بھوک لگے۔''

''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، میرے پاس دس ہزار کی ہندوستانی کرنسی ہے، پستول ہے اور جیب می مال ہو تو آدمی بھی کہیں بھی بھوکا نہیں رہ سکتا اور پھر کولمبو بین الاقوامی شہر ہے، وہاں رت جگا رہتا ہے، ہوٹل، شراب خانے، بار بی کیو اور تفریح گھر اور بازار حسن.....! تمہارا بہت بہت شکریہ جو تم نے اتنا خیال لیا۔'' اس نے گوتم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''اچھا دوست.....! الوداع۔''

گوتم نے یہ سوچ کر کہ اس سے جان چھوٹ رہی ہے، اب صرف چند لمحوں کی بات ہے، بڑے خلوص اور گرم جوشی سے ہاتھ بڑھا دیا۔

''کھنہ جا رہا ہے اور باہر جا کر وہ رتنا دیو بن جائے گا۔'' وہ بولا۔ ''تم کھنہ کو خوشی خوشی رخصت کر رہے ہو نا.....! میں یہاں جب تک رہا کھنہ بن کر..... رتنا دیو بن جاتا تو جانے کیا ہوتا.....؟''

کھنہ نے مسکراتے ہوئے گوتم کا ہاتھ تھاما اور ایک زوردار جھٹکا دیا گوتم کا توازن برقرار نہ رہ سکا، وہ لڑکھڑا کر کنہ کی طرف بڑھا، اگلے ہی لمحے کھنہ نے بائیں ہاتھ کا مکا پوری قوت سے اس کے چہرے پر جڑ دیا۔

گوتم کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے اور اس کے ذہن پر تاریکی چھا گئی اور وہ بے جان ہو کر فرش پر گر گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا کیونکہ اس کا مکا انتہائی شدید تھا جس کی وہ تاب نہ لا سکا تھا۔

وہ گوتم پر جھک کر بولا۔ ''گوتم! یہ رتنا دیو تھا..... میں کھنہ کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں، سوری.....!''

''آؤ بیلا.....! اب تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔'' رتنا دیو نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم ایک فاحشہ عورت کو ساتھ لے جا کر کیا کرو گے؟'' بیلا نے نفرت اور حقارت سے کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں ویسا کرو..... تم نے ذرا بھی ہاتھ، پیر نکالے تو میں یہ تمہاری نازک اور صراحی دار گردن توڑ کر رکھ دوں گا۔'' اس نے بیلا کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ چند لمحوں کے بعد کہا۔ ''سنو جیپ تم ہی چلاؤ گی۔ جب تک تم میرے ساتھ رہو گی، پولیس مجھ پر فائرنگ نہیں کرے گی، تم میرے لئے ڈھال کا کام دو گی۔''

بیلا بے بس تھی۔ وہ اس وحشی اور بن مانس جیسے شخص کے مقابلے میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جب وہ اس کے چہرے پر جھکا تھا تو اس کے جسم کی ہڈیاں چٹک گئی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی اس خونی کے ساتھ بنگلے سے باہر آ گئی۔ رتنا دیو نے اس کی نازک کلائی اس پر بری طرح جکڑ رکھی تھی، اسے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

رتنا دیو نے اسے جیپ تک قربانی کے جانور کی طرح کھینچ کر لانے کے بعد اسے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر دھکیلا اور خود تیزی سے دوسری طرف سے آ کر

اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''چلو.....!'' رتنا دیو نے اس کے بالوں کو پکڑ کر کھینچا اور دھاڑا۔ ''جلدی سے یہاں سے نکل پڑو.....! ایوسم آجائے گا۔'' وہ ہنسا۔ ''گو تم نے مجھے بچہ سمجھا تھا..... بے وقوف بنایا تھا لیکن وہ خود بڑا بے وقوف تھا۔'' اس نے بیلا کے بال چھوڑ دیئے۔

''میں اس حالت میں گاڑی نہیں چلا سکتی۔'' بیلا نے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کی کلائی دباتے ہوئے کہا۔ ''تم نے نہ صرف میری کائی چٹخا دی بلکہ میری پسلیاں بھی توڑ دیں، درد سے برا حال ہو رہا ہے۔''

''بکواس مت کرو..... میں کہتا ہوں جیپ چلاؤ، ورنہ تمہارا چوکھٹا ایسا بگاڑ دوں گا کہ تمہاری ماں بھی نہیں پہچان سکے گی۔'' رتنا دیو نے اپنا بھاری ہاتھ اٹھایا۔ ''میرے دل میں بڑے ارمان تھے کہ تمہارا دماغ درست کر دوں، تم نخرے نہ دکھاؤ۔''

کپکپاتے ہاتھوں سے بیلا نے چابی اگنیشن میں ڈال کر ہاتھوں کو حرکت دی۔ نہ صرف اس کی کلائی بری طرح درد کر رہی تھی بلکہ جسم کا جوڑ جوڑ بھی دکھ رہا تھا۔ یہ ظالم، جابر اور خونی صیاد کا حکم تھا، کیسے نہ بجالاتی۔ جیپ حرکت میں آ گئی۔

''مین روڈ کی طرف دیکھو اور ادھر لے چلو۔'' وہ بولا۔ ''یہ وہی راستہ ہے جو کولمبو کو جاتا ہے جس سے تم آئی ہو۔''

جب جیپ نے کچھ فاصلہ طے کیا تو رتنا دیو نے ایک دم چیخ کر کہا۔ ''ایک منٹ کے لئے رکو۔''

بیلا نے جیپ روک لی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ رتنا دیو نے گاڑی کیوں رکوائی ہے۔ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بیلا کو خیال آیا شاید یہ کوئی چیز بھول آیا ہے، شاید اس لیے واپس جانا چاہتا ہے۔

''ادھر دیکھو.....!'' اس نے بیلا کے دائیں جانب اشارہ کیا۔ ''تمہارے شوہر کا ایوسم مرا پڑا ہے۔''

بیلا نے دیکھا تو کانپ کر رہ گئی۔ ایک سپاہی کی لاش گھاس پر پڑی تھی، اس کے دل کی جگہ سے خون بہہ کر رک گیا تھا پھر اسے یاد آیا۔ فائر کی جو آواز اس نے سنی تھی، اس کا نشانہ یہ شخص تھا۔

''اب گاڑی آگے بڑھاؤ۔'' رتنا دیو نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''یہ ایوسم مجھے مارنے آیا تھا، مجھے شکار کرنا چاہتا تھا، شکاری تھا لیکن وہ خود شکار کے ہاتھوں شکار ہو گیا، احمق..... گدھا.....!''

پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا تو بیلا کا دل دہل کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

انسپکٹر سنگارا نے پہلو بدلا۔ شاستری کی طرف سے پیغام ملے نصف گھنٹہ ہو گیا تھا۔ اسے تشویش اور فکر ہونے لگی۔ اب تک پروگرام کے مطابق اسے دو مرتبہ رابطہ قائم کر لینا تھا۔ شاستری کی طرف سے غفلت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ ایک ذمے دار پولیس افسر تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اتنی لمبی ڈیوٹی نہیں دے سکتا تھا، وہ بھی درخت پر بیٹھ کر.....!

اس نے کافی پیتے اور دستی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اپنی بیوی سجاتا سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب مجھے خود اس سے رابطہ قائم کرنا چاہئے..... رتنا دیو صحرائی لومڑی کی طرح مکار اور عیار ہے، بلا کا ذہین ہے..... کہیں شاستری کو کچھ نہ ہو گیا ہو، جانے کیوں مجھے خوف لاحق ہو رہا ہے۔''

''سوچ لو جان.....! شاستری بہت ہوشیار افسر ہے، ہو سکتا ہے کہ تمہارے رابطہ کرنے سے اس کے کام میں خلل پڑ جائے، کسی وجہ سے اس نے رابطہ قائم نہیں کیا ہوگا۔''

انسپکٹر نے کافی ختم کرنے کے بعد دوبارہ گھڑی دیکھی پھر اس نے سجاتا سے کہا۔ ''نہیں سجاتا.....! اب مجھ میں مزید انتظار کرنے کی تاب نہیں رہی، وجہ کچھ ہو، وہ ہر صورت میں مجھ سے رابطہ قائم کرتا۔'' اس نے یہ کہہ کر وائرلیس سوئچ آن کیا۔ ''ہیلو شاستری.....! ہیلو..... کیا بات ہے، تم نے ابھی تک.....!''

دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

''شاستری.....! میری آواز سن رہے ہو..... شاستری! بھگوان کے لئے جواب دو۔'' وہ جیسے گڑگڑایا۔

دو منٹ کے بعد انسپکٹر سنگارا اچھل کر اپنی کرسی

سے کھڑا ہوگیا اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

اس نے ہولسٹر سے پستول نکال کر چیک کیا اور اسے واپس رکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا سجاتا.....! میں جارہا ہوں..... میں اب یہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔''

''اکیلے مت جاؤ، کچھ لوگوں کو ساتھ لے جاؤ..... کالی چرن کو ساتھ لے جاؤ۔'' سجاتا نے مشورہ دیا۔

''میں نے کہا نا کہ میں کسی کا ایک لمحہ بھی انتظار نہیں کرسکتا..... کالی چرن کو انتظام کرنے میں آدھا گھنٹہ تو لگ جائے گا، یہ آدھا گھنٹہ سوہان روح ہوگا، پتہ نہیں جب تک وہاں کیا ہوجائے۔''

پھر وہ سجاتا کی بات سننے کے لئے نہیں رکا۔ وہ دوڑتا ہوا تیزی سے گھر سے نکل گیا۔

انسپکٹر سنگارا کے روانہ ہوتے ہی سجاتا سے رہا نہ گیا۔ اس نے کالی چرن سے فون پر رابطہ کیا۔

''مسٹر کالی چرن.....! میں سجاتا بول رہی ہوں..... بھگوان کے لئے غور سے میری بات سنیں..... آپ درمیان میں کچھ نہ بولیں۔'' سجاتا کی سانس سینے میں اس طرح پھولنے لگی جیسے وہ کہیں دور سے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔ ''معاملات بہت بگڑ گئے ہیں، ہمیں تیزی سے کارروائی کرنا ہے، میں آپ کو بتاتی ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔''

پھر سجاتا نے کالی چرن کو بتایا کہ شاستری نے خود اصرار کر کے رتنا دیو کو نشانہ بنانے کے لئے گوتم کے بنگلے کے باہر ایک درخت پر مورچہ بنالیا تھا۔ جب وہ سب کچھ بتا چکی تو اس نے کہا۔ ''اب آپ جلدی سے کچھ کریں مسٹر کالی چرن! سنگارا ادھر اکیلا روانہ ہوچکا ہے۔''

''او بھگوان.....! خیر بھابی! آپ پریشان نہ ہوں۔'' کالی چرن نے دلاسا دیا۔ ''میرے پاس آدمی ہیں، میں انہیں فوراً روانہ کررہا ہوں..... وہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر موقع پر پہنچ جائیں گے، دھیرج رکھیں بھابی!'' اتنا کہہ کر کالی چرن نے ٹیلی فون بند کردیا۔

انسپکٹر سنگارا نے راستے میں پیٹرول پمپ سے سائیکل گاڑی میں رکھی اور تیزی سے دریا کی طرف روانہ ہوگیا۔ دریا کی طرف جانے والی کچی سڑک پر گاڑی روکی..... دریا یہاں سے دور نہ تھا لیکن راستہ بہت خراب ہوچکا تھا، وہ وہاں سے سائیکل پر سوار ہوا۔ اب اس کا رخ بنگلے کی طرف تھا۔ اس نے تیزی سے سائیکل چلانا شروع کردی۔

تھوڑی دیر کے بعد انسپکٹر سنگارا اس درخت کے پاس کھڑا تھا جس کے نیچے شاستری کی لاش موجود تھی۔

سنگارا اپنے ماتحت رام کو ایک سگے بیٹے کی طرح چاہتا تھا۔ شاستری نے رام کی جگہ لے لی تھی، وہ اسے بھی اسی طرح چاہنے لگا کیونکہ وہ بھی رام کی طرح پرخلوص اور انسانی خدمت کے جذبے سے معمور تھا۔ اسے شاستری کا مستقبل بڑا شاندار دکھائی دیتا تھا۔ اب وہ اسے اس طرح غم زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے واقعی اس کا سگا بیٹا چل بسا ہو۔

اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''اس خونی کو جان سے ماردوں گا..... اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔''

انسپکٹر سنگارا بنگلے کی طرف بڑھا۔ دو قدم چل کر ٹھٹک کے رک گیا۔

سامنے بنگلے کا دروازہ کھلا تو اس نے حیرت سے دیکھا۔ اس نے فوراً ہی ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔ اس نے دیکھا گوتم لڑکھڑاتا ہوا باہر آیا تھا۔ وہ کسی مدہوش انسان کے مانند اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

انسپکٹر سنگارا نے پستول ہولسٹر میں ٹھونس لیا۔ اس کی طرف دوڑتے ہوئے آواز دی۔ ''مسٹر گوتم!''

گوتم نے آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا پھر وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا جبڑا بری طرح درد کررہا تھا۔

''انسپکٹر! وہ کمینہ نکل گیا ہے اور وہ میری بیوی کو بھی یرغمال بنا کر لے گیا ہے۔''

انسپکٹر اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ گوتم نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس نے سن لیا تھا..... چاندنی میں انسپکٹر سنگارا کو گوتم کے چہرے پر گہرا بدنما داغ صاف نظر آیا تھا۔ گوتم نے درد اور تکلیف کے باعث متاثرہ جگہ پر رومال رکھ لیا۔

''فکر مت کرو گوتم! انسپکٹر سنگارا نے اسے دلاسا دیا ''اب وہ خونی بچ کر نہیں جاسکتا کیونکہ وہ باہر سے نکل آیا ہے..... میں سب لوگوں کو مطلع کردوں گا..... یہ

بتائیں وہ کتنی دیر پہلے گیا ہے؟''

''میں اندازے سے کہہ سکتا ہوں کہ پندرہ بیس منٹ ہو گئے ہوں گے..... اس نے میرے جبڑے پر مکا رسید کر کے بے ہوش کر دیا تھا، میں شاید اتنی ہی دیر بے ہوش رہا ہوں..... ہوش میں آتے ہی باہر آ گیا، آپ کی گاڑی کہاں ہے انسپکٹر! پلیز جلدی کیجئے..... وہ میری بیوی کو بھی لے گیا ہے، کہیں وہ اسے جان سے نہ مار دے۔'' گوتم نے مضطرب ہو کر کہا۔

''میں فی الحال سائیکل پر آیا ہوں، سڑک خراب ہونے کی وجہ سے میں نے گاڑی بڑی سڑک پر چھوڑ دی تھی۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''گاڑی میں آتا تو وہ کسی گڑھے میں پھنس جاتی۔''

''تو پھر آپ میری گاڑی میں چلیں۔'' گوتم نے جیب میں چابی نکال کر بڑھا دی۔

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انسپکٹر سنگارا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی دوڑنے لگی تو انسپکٹر سنگارا نے پوچھا۔ ''کیا کچھ اندازہ ہے کہ وہ کدھر گیا ہو.....؟ اس نے کچھ بتایا تھا؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ کولمبو جا کر وہاں کی بھیڑ میں گم ہو جائے گا..... میری بیوی کو ساتھ لے جانے کا اس کا کوئی پروگرام نہ تھا، میں نے ہوش میں آ کر دیکھا تو میری بیوی نہیں تھی، میں نے تمام کمرے اور واش روم بھی دیکھ ڈالے، ظاہر ہے وہ اسے یرغمال بنا کر لے گیا ہے۔''

''اس نے جھوٹ بولا ہے۔'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''وہ سچ اس لئے نہیں بول سکتا کہ کولمبو میں بھی گرفتار ہو سکتا ہے، اس نے تمہیں کولمبو کا اس لئے بتایا کہ پولیس کو غلط راہ پر ڈالا جائے لیکن اب وہ کہیں بھی جائے، بچ نہیں سکے گا۔''

''مجھے شاستری کی موت کا بے حد صدمہ ہے۔'' گوتم نے کہا۔ ''شاستری اس کے ہاتھوں سے مارا نہ جاتا اگر وہ منحوس کتا اس کے درخت کے پاس آ کر نہ بھونکتا..... اسے شک ہو گیا تھا، میں نے اس کا شک دور کرنے کی بڑی کوشش کی تھی۔''

گوتم نے اسے اپوسم کے بارے میں ہونے والی گفتگو سنائی تو سنگارا نے کہا۔ ''وہ کسی لومڑی کی طرح عیار، مکار اور چالاک تھا۔

دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ مین روڈ پر پہنچ گئے۔ انسپکٹر نے نہ صرف انتہائی تیز رفتاری بلکہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلائی تھی، پھر اس نے گاڑی اپنی گاڑی کے عقب میں کھڑی کر دی۔ وہ اپنی گاڑی میں پہنچا اس نے وائرلیس آن کر کے رابطہ قائم کیا۔ جلدی جلدی سب کچھ بتا دیا۔

''فکر مت کرو انسپکٹر سنگارا!'' کالی چرن نے کہا۔ ''سجانا بھابھی نے پہلے ہی مجھے سب کچھ بتا دیا تھا..... سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں..... پندرہ منٹ کے اندر اندر بیس افراد کا دستہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔''

''رتنا دیو..... مسٹر گوتم کی اہلیہ کو بھی یرغمال بنا کر لے گیا ہے..... خیال یہ ہے کہ وہ شاید کولمبو کی طرف گیا ہے کیونکہ اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ کولمبو جا رہا ہے لیکن اس کی بات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا، تاہم کولمبو پولیس ہیڈ کوارٹر کو بھی بتا دیا جائے۔'' انسپکٹر سنگارا نے کہا۔ ''میں بھی اس قاتل کے تعاقب میں مسٹر گوتم کے ساتھ جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے انسپکٹر! میں اس موذی سانپ سے نمٹ لوں گا۔'' کالی چرن نے کہا۔

☆.....☆.....☆

بیلا کچے اور ناہموار راستے پر جیپ چلا رہی تھی۔ اس کے برابر بیٹھا رتنا دیو اسے موذی ناگ لگ رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے اسے ڈس سکتا تھا۔ اس نے گوتم کے ساتھ جو حرکت کی تھی، وہ احسان فراموش تھی لیکن ایک مجرم سے وہ بھی جو خطرناک اور خونی درندہ ہو، کسی اچھائی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس وقت وہ شدید خطرے میں ہے، وہ کسی قیمت پر مرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے رفتہ رفتہ خود پر قابو پانے کی کوشش کی تو اس کے حواس قدرے بحال ہوئے اس کا اعتماد لوٹ آیا۔

رتنا دیو سے سخت نفرت نے اسے مزید حوصلہ دیا۔ اسے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا تھا، ورنہ اس کی موت یقینی تھی۔

اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ جب رتنا دیو کو اس کی کوئی اہمیت اور ضرورت نہیں رہے گی تو وہ اسے نہایت اطمینان سے قتل کردے گا، اس لئے کہ وہ ایک مفرور قاتل ہے، اس کا کہیں کوئی ٹھکانہ اور گھر نہیں ہے، پولس اس کو سرگرمی سے تلاش کررہی ہے۔ وہ اسے ہر جگہ لئے لئے پھرنے سے رہا، بس یہی ہوگا کہ کچھ دن اسے کسی ویرانے اور سنسان علاقے میں رکھ کر فائدہ اٹھائے گا، پھر موت کی نیند سلادے گا۔

پھر اسے یاد آیا کہ جیپ کے خانے میں اس کا وینٹی بیگ رکھا ہوا ہے جس میں ریوالور موجود ہے۔

لیکن اس کے حصول کے لئے کوئی ایسی تدبیر کرنی ہوگی کہ رتنا دیو کی توجہ اتنی دیر کے لئے کسی اور طرف مبذول ہوجائے کہ اس اثناء میں وہ کانہ کھول کر وینٹی بیگ اور ریوالور نکال لے۔ چونکہ وہ تدبیر سوچنے لگی تھی، اس لئے جیپ کی رفتار میں کمی آگئی۔ رتنا دیو بار بار عقبی آئینے میں دیکھتا جارہا تھا کہ پولیس اس کے تعاقب میں تو نہیں آرہی۔

جب رتنا دیو نے محسوس کیا کہ جیپ کی رفتار میں خاصی کمی آگئی ہے تو وہ دھاڑا۔ ''تیز چلاؤ!''

ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک غلیظ گالی ابل پڑی۔ بیلا کو لگا جیسے اس کے وجود پر گرم گرم سلاخ داغ دی گئی ہو۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ فی الحال وہ گالی برداشت کرگئی کہ اسے اپنی جان بچانے کے لئے کچھ کرنا تھا۔

بیلا نے فوراً ہی رفتار بڑھادی تاکہ رتنا دیو کو کوئی شک نہ ہو۔ اس نے دیکھا کہ رتنا دیو آگے جھکا ہوا کیچڑ سے بھرے ہوئے راستے پر نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ اب وہ راستے کے اس حصے کے قریب تھے جہاں سڑک بے انتہا خراب تھی، کچی زمین دلدل کی شکل اختیار کرگئی تھی..... بیلا کو احساس تھا کہ اس نے یہاں ذرا بھی جیپ کو پھنسانے کی کوشش کی تو رتنا دیو اس کی گردن توڑ کر رکھ دے گا۔

''احتیاط سے گاڑی کو دائیں طرف کاٹو اور اب اس کی رفتار کم کردو۔''

بیلا نے مجبوراً رتنا دیو کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ جیپ کو کسی گڑھے میں پھنسا کر اپنی تدبیر پر عمل کرلے تاکہ رتنا نیچے اترے تو وہ وینٹی بیگ سے ریوالور نکال لے لیکن فی الحال وہ ایسا اس لئے نہیں کرسکتی تھی کہ وہ موذی سانپ ہے۔ وہ چوکنا اور ہوشیار تھا، وہ اس کی چال کو سمجھ جاتا۔ اس نے گاڑی کامیابی سے نکال لی۔

''تم واقعی بہت ماہر ہو۔'' رتنا دیو نے اس کی تعریف کی۔ ''اب پھر سے اس کی رفتار بڑھادو۔''

بیلا نے جیپ کی رفتار قدرے اور بڑھادی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں مین روڈ تھی، مضبوط اور پکی.....! یہ راستہ کولمبو شہر کی طرف جانا چاہتی تھی کہ جیپ کو کسی گڑھے میں پھنسا کر اپنی تدبیر پر عمل کرلے تاکہ رتنا نیچے اترے تو وہ وینٹی بیگ سے ریوالور نکال لے لیکن فی الحال وہ ایسا اس لئے نہیں کرسکتی تھی کہ وہ اس موذی سانپ ہے۔ وہ چوکنا اور ہوشیار تھا، وہ اس کی چال کو سمجھ جاتا۔ اس نے گاڑی کامیابی سے نکال لی۔

''تم واقعی بہت ماہر ہو۔'' رتنا دیو نے اس کی تعریف کی۔ ''اب پھر سے اس کی رفتار بڑھادو۔''

بیلا نے جیپ کی رفتار قدرے اور بڑھادی۔ دس منٹ کے اندر اندر وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں مین روڈ تھی، مضبوط اور پکی.....! یہ راستہ کولمبو شہر کی طرف جاتا تھا۔

''گاڑی روک کر اس کی روشنیاں گل کردو۔'' رتنا دیو نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

بیلا نے ہیڈ لائٹس گل کردیں۔ دونوں مکمل تاریکی میں وہاں بیٹھے رہے۔ رتنا دیو گہرے گہرے سانس لے رہا تھا اور شاید اس کا جسم بھی پسینے میں نہا گیا تھا۔ بیلا نے اس کے جسم سے پسینے کی بو اٹھتی اور نتھنوں میں گھستی محسوس کی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل سے ہٹا کر خانے کی طرف بڑھایا۔

اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندا تو اس اپنا ہاتھ روک لیا۔

کیا معلوم اس وحشی درندے نے پہلے ہی جیپ کا خانہ دیکھ لیا ہو اور ریوالور نکال لیا ہو، پھر وہ کیا

لرے.....؟

اس نے سوچا کہ تسلی کرنے میں کیا حرج ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی انگلیاں خانے کی طرف رینگنے لگیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی انگلیاں اپنے وینٹی بیگ کی سطح سے ٹکرائیں۔ وینٹی بیگ میں ریوالور موجود تھا۔ اس نے ایک لمحے کو سوچا۔ کیا اسے اتنی مہلت مل سکے گی کہ وینٹی بیگ نکال کر زپ کھولے اور ریوالور نکال لے.....؟

رتنا دیو کی آواز ابھری۔ ''اب تمہیں سڑک پار کرنی ہے، اس کے دوسری طرف ایک کچی سڑک ہے، جونہی سڑک پر ٹریفک میں وقفہ ہو، تمہیں سڑک پار کر کے جیپ کو کچی سڑک پر لے جانا ہے، میری بات سمجھ گئیں نا.....؟''

''مگر یہ راستہ تو شاید کولمبو نہیں جاتا۔'' بیلا نے خانے سے ہاتھ ہٹا کر کہا۔

رتنا دیو نے استہزائیہ قہقہہ لگایا۔ ''تمہیں معلوم نہیں ہے شاید.....! میں تمہارے شوہر کو پسند کرنے لگا ہوں، وہ ایک اچھا آدمی ہے، میں نے اس سے کولمبو کی بابت اس لیے کی تھی میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا، مجھے اس کے چہرے پر مکا مارنا بھی پسند نہیں تھا لیکن مجبور تھا، میں جانتا ہوں کہ پولیس بنگلے پر پہنچے گی تو تمہارا شوہر انہیں کولمبو کے بارے میں بتا دے گا اور پولیس والے فوراً ہی اس سڑک پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں گے لیکن میں اس وقت جنگل پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

بیلا کو اپنے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وحشی درندہ اسے کھلونا بنانے کے بعد جلد ٹھکانے لگا دے گا۔ اسے اپنی جان بچانے کے لئے جلد ہی کچھ کرنا تھا۔ وقت اس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے طریقے سوچ رہی تھی اور رتنا دیو سڑکوں پر برق رفتاری سے گزرنے والی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

''بس اب جلدی کرو، موقع ہے، تیزی سے گاڑی نکال لو۔'' رتنا دیو نے کہا۔

شاہراہ صاف تھی۔ بیلا نے ہیڈ لائٹس آن کیں، جیپ اسٹارٹ کی اور تیزی سے جیپ کو آگے بڑھایا۔ چشم زدن میں جیپ شاہراہ پار کر کے دوسری طرف کچی سڑک پر اتر گئی تھی۔

''بہت خوب.....! تم واقعی کمال کی ڈرائیور ہو۔'' رتنا دیو نے سراہا۔ ''بس اب ناک کی سیدھ میں چلتی رہو۔''

بیلا نے اس کی بات نہیں سنی۔ اس وقت تو وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں رتنا دیو کے الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے گوتم سے کہے تھے۔ ''ہم دونوں کی ارتھیاں ایک ساتھ اٹھیں گی۔'' اور پھر رتنا دیو نے اس سے کہا تھا۔ ''تم سڑکوں پر پھرنے والی آوارہ کتیا کی مانند ہو، فاحشہ ہو۔''

''ٹھیک ہے وحشی درندے بن مانس.....اگر میں مروں گی تو تجھے بھی ساتھ ہی لے کر مروں گی، ہم دونوں کی ارتھیاں ساتھ ہی اٹھیں گی۔'' اس نے دل میں کہا۔

بیلا نے پلٹ کر دیکھا۔ رتنا نے نشست کی پشت گاہ سے سر ٹکا لیا تھا۔ وہ اس وقت بے حد مطمئن تھا اور ہلکے ہلکے سیٹی بجا رہا تھا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ اب اس کی نظریں سامنے تھیں۔ کچی سڑک کے دونوں طرف جھاڑیاں تھیں، گھنی جھاڑیاں.....! مگر اسے کسی درخت کی تلاش تھی اور پھر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جیپ کی متحرک روشنی میں اس نے دور ایک بہت بڑا گھنا درخت دیکھا، موٹے تنے والا.....! اسے ایسے ہی درخت کی تلاش تھی۔

اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اب ہم دونوں کی موت قریب ہے۔'' بیلا نے جیپ کی رفتار 80 تک بڑھا دی۔

''اے.....! رتنا دیو نے چونک کر کہا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

لیکن اس وقت گاڑی 80 میل کی رفتار سے درخت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ رتنا دیو کچھ کرتا، جیپ پوری رفتار سے درخت سے جا ٹکرائی۔

بیلا اس ٹکر کے لئے ذہنی طور پر تیار تھی۔ اس نے اس ٹکر کی قوت کو پھیلے ہوئے ہاتھوں کی بنا پر برداشت کر لیا

لیکن ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ رتنا دیو کا سر بڑے زور سے ڈیش بورڈ پر ٹکرایا تھا اور پھر وہ واپس اپنی نشست پر آرہا تھا۔

ہوش میں آتے ہی بیلا نے رتنا دیو کو دیکھا۔ کچھ دیر وہ اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ ''نہیں درندے.....! ارتھی صرف تمہاری اٹھے گی۔''

بیلا نے جلدی سے اپنا وینٹی بیگ کھولا، اس میں سے ریوالور نکالا۔ اس کی نگاہیں رتنا دیو پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی اس نے ریوالور نکالا ہی تھا کہ رتنا دیو نے سر کو جھٹکا دیا اور اس کی طرف مڑا۔ بیلا نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا اور زوردار دھماکہ ہوا، رتنا دیو بل کھا کر پیچھے کھسک گیا۔

بیلا پے در پے فائر کرتی چلی گئی۔ ہر مرتبہ وہ بل کھا کر دہرا ہوتا گیا۔

رتنا دیو کی سفید قمیض پر جگہ جگہ سرخ دھبے پھوٹ آئے تھے۔

بیلا کو اپنی اس کامیابی پر عجیب خوشی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی زبردست چمک تھی..... خون رتنا دیو کی قمیض پر پھیلتا گیا۔ وہ اب بھی اٹھنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔

''کیوں رتنا دیو.....! معلوم ہوا کہ عورت کیسی ہوتی ہے..... تم نے جن لوگوں کو قتل کیا، وہ سب بہت اچھے اور نیک لوگ تھے، تمہاری طرح وحشی نہیں تھے..... تم گندگی کے کیڑے ہو رتنا دیو! دیکھا تم نے تمہاری موت ایک عورت کے ہاتھوں ہوئی ہے..... کیا یہ شرم اور ذلت اور تمہاری مردانگی کی توہین نہیں ہے؟''

رتنا دیو اسے گھورتا رہا۔ خون اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے بہنے لگا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن خون اس کے منہ میں بھر گیا۔

''بس اب اسی طرح سسک سسک کر مر جاؤ رتنا دیو.....!

رتنا نے اپنی تمام قوت جمع کی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے بائیں ہاتھ کو حرکت دی اور پوری قوت سے اس کا کھڑا ہاتھ بیلا کی گردن پر پڑا۔ ضرب بڑی شدید تھی، بیلا کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ گوشت کا ڈھیر بن کر سیٹ پر لڑھک گئی۔

☆.....☆.....☆

پانچ گھنٹے کی تلاش کے بعد پولیس نے جیپ اور اس کے اندر رتنا دیو اور بیلا کی لاشیں تلاش کر لیں۔ کالی چرن نے فوراً ہی انسپکٹر سنگارا کو اطلاع دی۔ وہ گوتم کو لے کر جائے حادثہ پر پہنچا۔ گوتم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

انسپکٹر سنگارا نے اپنی گاڑی جائے حادثہ کے قریب روکی تھی۔ کالی چرن ایک درخت کے پاس کھڑا تھا۔

''سب کچھ ختم ہو گیا انسپکٹر!'' کالی چرن نے کہا۔

گوتم گاڑی سے باہر آیا۔ ''میری بیوی کا کیا ہوا؟''

''مجھے افسوس ہے مسٹر گوتم! پلیز آپ ادھر نہ جائیں۔'' کالی چرن نے کہا۔

''گوتم نے اس کی بات نہ سنی اور وہ دوڑتا ہوا جیپ کی طرف بڑھا۔ رتنا دیو کی لاش ایک طرف پڑی تھی، اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی، خوف سے اس کی حالت اور مزید خوفناک ہو گئی تھی۔

''مجھے پولیس والے زندہ گرفتار نہیں کر سکتے۔'' گوتم کے کانوں میں رتنا دیو کی آواز گونجی۔

گوتم نے اس کے بعد اپنی بیوی پر نظر ڈالی۔

وہ نشست کے ساتھ اور گاڑی کے دروازے سے لگی بالکل ساکت ہو چکی تھی۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا، اور اس کی آنکھوں میں اطمینان کی چمک تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

''کل میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔'' گوتم کے کانوں میں اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔''

(ختم شد)

(ہمارے دل عزیز معروف قلم کار ایم الیاس کی تحریریں مختلف اخبارات، رسالوں میں چھپتی رہی ہیں، اور آئندہ بھی امید کرتے ہیں کہ چھپتی رہیں۔ آج کل ان کی طبیعت ناساز ہے۔ تمام پڑھنے والوں سے التماس ہے کہ صحت کے لیے دعا کریں)

چاندی چوک

محمد حمزہ سہیل۔ پشاور

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

کچھ جنات آئے اور انہیں اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے ان جنات نے شاہ ولی اللہؒ کو اپنی عدالت میں پیش کیا، ان پر ایک جن کے قتل کا الزام لگایا گیا..... تو شاہ ولی اللہؒ نے اپنی صفائی میں ایک حدیث کا حوالہ پیش کیا اور.....

حکایات وروایات سے ماخوذ عہد رفتہ کے انمٹ نقوش لئے ایک ناقابل فراموش تحریر

فاطمہ اپنے کمرے میں اکیلی کھڑی کھڑکی میں خود کلامی میں مگن تھی، کراچی کے علاقے کلفٹن میں اپنی فلیٹ کی کھڑکی سے سامنے دیکھائی دینے والی بلند و بالا عمارات کو گھور رہی تھی۔ فاطمہ ایک خوبصورت نوجوان صحافی ہے جو کچھ ہی عرصہ پہلے انگلینڈ سے اپنی پڑھائی مکمل کر کے وطن واپس لوٹی ہے۔ فاطمہ اپنے فلیٹ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی، وہ یہاں اس فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے، وہ مختلف موضوعات پر آرٹیکلز لکھتی ہے، وہ مافوق الفطرت (سپرنیچرل) چیزوں میں کافی دل چسپی لیتی تھی، وہ ان خیالات کے جنگل میں گم تھی کہ اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے، وہ دروازہ کھولتی ہے تو ایک بنجارن کو باہر منتظر پاتی ہے، وہ بنجارن بغیر کچھ بولے سنے اندر داخل ہو جاتی ہے، بعض اوقات انسان ایک کام نہیں کرنا چاہتا مگر وہ کام ہو کر ہی رہتا ہے

بعض اوقات انسان اپنی طرف سے بھرپور کوشش کرتا ہے کسی کام کو انجام دینے کے لئے لیکن وہ کام نہیں ہو پاتا، اور انسان اپنی ہی طاقت کے خلاف مجبور ہو جاتا ہے، کچھ ایسی ہی کیفیت یہاں بھی تھی، اس بنجارن کو نہ چاہتے ہوئے بھی گھر کے اندر آنے کی اجازت دینی پڑی، وہ بھی ایسی بے تکلفی سے گھر کے اندر داخل ہوتی ہے، جیسے یہ گھر کسی اور کا نہیں بلکہ اس کا اپنا گھر ہو، فاطمہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا، نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وہ کرنا پڑا جو وہ نہ کرنا چاہتی تھی، وہ شاید اس کے خلاف کرنا چاہتی تھی۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو انسان نہیں کرنا چاہتا، لیکن وہ مقدر ہوتی ہیں، دل کا کعبہ وقبلہ کہیں اور ہوتا ہے اور نیت ورخ کہیں اور یہی کیفیت تھی فاطمہ کی بھی، وہ بنجارن کوئی جادوگرنی تھی جس نے فاطمہ کو اپنے بس میں کیا ہوا تھا، یا گنڈے تعویز کرنے والی کوئی عامل جن کے موکل ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں، کچھ عجیب سی کشمکش تھی، اور فاطمہ کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔

وہ بنجارن فاطمہ کی موجودگی میں گھر کے کونے کونے میں گھوم پھر کر سامنے والے صوفے پر یوں براجمان ہوئی جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو، بلا کسی تکلف کے اس نے فاطمہ کو اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا اور اس سے یعنی فاطمہ سے اس کے بارے میں پوچھنے لگی، تھوڑی دیر بعد وہ اس سے کہنے لگی۔ ''میڈم صاحبہ آپ اخبار میں لکھتی ہیں۔''

فاطمہ نے اثبات میں سر کے اشارے سے کہا کہ ہاں، تو وہ بنجارن کہنے لگی۔ ''میڈم صاحبہ، میں آپ کو ایک واقعہ کے بارے میں کہنا چاہتی ہوں آپ اس کے بارے میں کیوں نہیں لکھتیں۔''

یہ کہہ کر اس نے بغیر کسی وقفے کے اپنی بات شروع کی، آپ انگریزی تعلیم یافتہ ہو اور کیا معلوم آپ ان چیزوں پر یقین رکھتی ہو یا نہیں، لیکن واقعہ بالکل حقیقی ہے، سو فیصد حقیقی، اس نے فاطمہ کے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر واقعہ بیان کرنا شروع کیا۔

ہندوستان میں ایک محلّہ ہے، جہاں ایک سیٹھ صاحب رہتے تھے، ایک شام سیٹھ صاحب کا حجرہ، جو کہ دوسری منزل پر واقع ہے، پر دستک دی جاتی ہے، اتفاق سے اس شام سیٹھ صاحب حجرے میں اکیلے تھے، انھوں نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک پری چہرہ، نوجوان، خوبصورت لڑکی کو پایا جو کہ ان کے دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے سیٹھ صاحب سے اندر آنے کی اجازت چاہی اور تیزی سے اندر داخل ہوگئی۔ وہ جلدی میں ایسے اندر داخل ہوئی کہ سیٹھ صاحب کو سوچنے یا بات کرنے کا موقع تک نہیں دیا۔ اس کی حیران کر دینے والی خوبصورتی کے آگے سیٹھ صاحب کو کچھ دیکھائی ہی نہ دیا۔ سیٹھ صاحب کی حالت اس وقت ناگفتہ بہہ تھی، اس پری پیکر نے سیٹھ صاحب کو سحر زدہ سا کر کہ کہا، ''سیٹھ صاحب حیا مانع ہے، مگر رہا بھی نہیں جا رہا'' وہ سر جھکا کر کچھ لمحوں کیلئے خاموش ہوئی، ایک لمبی سانس اور مزید کہا۔ ''سیٹھ صاحب بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو جب پہلی بار دیکھا تو میں اسی وقت سے آپ کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی، اور اب میری یہ حالت ہے کہ مجھ پر میرا اپنا اختیار بھی نہ رہا۔ اس لئے سیٹھ صاحب یہ گستاخی کر کے آج میں خود اپنی محبت کا اظہار کرنے یہاں آگئی ہوں، اب اختیار آپ کا ہے، کہ آپ جو بھی فیصلہ میرے حق میں کرنا چاہے آپ کر سکتے ہیں، میں نے اپنے دل کی بات آپ کو کہہ دی ہے، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے، میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوگئی ہوں''۔ اس نوجوان لڑکی نے کمال ہمت کا مظاہرہ کر کے سیٹھ صاحب کے ذاتی حجرے میں آ کر اپنی بات اس کے منہ پر کہہ دی، یہ کوئی آسان کام نہ تھا، ایک پختہ عمر شادی شدہ مرد کے حجرے آ کر یوں محبت کا اظہار کرنا، اس لڑکی نے معصوم سی صورت بنا کر سیٹھ صاحب کو مزید سحر زدہ کر دیا، شکل سے وہ معصوم ہی تھی، اب سیٹھ صاحب کی آزمائش کی گھڑی تھی، انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرے بھی تو کیا کریں، اور کہیں تو کیا، ان کے اوسان خطا ہو گئے تھے، ہلکا پسینہ ان کی چوڑی

پیشانی پر صاف دیکھائی دے رہا تھا۔ وہ ڈر رہے تھے اور ڈر کو چھپانے کی ناکام کوشش بھی کر رہے تھے۔ سیٹھ صاحب بے اختیار یوں گویا ہوئے۔ ''دیکھئے محترمہ ، میں میں تو شادی شدہ ہوں، اور'' یہ کہتے ہوئے ان کی آواز گلے میں دب کر رہ گئی، وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئے، اپنا حوصلہ بڑھاتے ہوئے سیٹھ صاحب نے مزید کہا۔ ''اور میں تو آپ کو جانتا تک نہیں، اور یہ یہ سب کچھ کیا ہے۔'' آخر کار ہمت کر کے انہوں نے اپنی بات پوری کی، مشکل سے کی مگر بات پوری کر گئے۔

سیٹھ صاحب نے اپنی بات پوری کی اور اس لڑکی کو گھورنے لگے، اس خوصورت لڑکی نے کمال اعتماد سے سیٹھ صاحب کو مخاطب ہو کر کہا، سیٹھ صاحب محبت تو اندھی ہوتی ہے، اور میں مجبور ہوں، میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور و معذور ہوں، اس لڑکی نے کمال مہارت سے سیٹھ صاحب کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے اپنی آنکھیں جھکائیں اور کہا۔ ''اور ہاں سیٹھ صاحب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ شادی شدہ ہیں، مجھے آپ کی ہر بات منظور ہے، میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہر امر کے لئے تیار ہوں، یہ کہتے ہوئے اس پری پیکر نے اپنی بانہیں سیٹھ صاحب کے بانہوں میں ڈال دی، اور سیٹھ صاحب کو ہکا بکا کر دیا، یہ انسانی فطرت ہے، کون ایسی نوجوان خوب صورت گھر آئی ہوئی لڑکی کو یوں ہی ہاتھ سے جانے دیتا ہے، ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا، اس کہانی کا انجام سننے لائق ہے، اس بنجارن نے یہ بات کہتے ہوئے اپنے الفاظ پر خوب زور دیا اور اپنی بات جاری رکھی ''ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی'' سیٹھ صاحب کے اوسان خطا ہوئے مگر بعد میں انہوں نے اپنے آپ پر قابو پایا، اور اس لڑکی کے ساتھ کافی گھل مل گئے، اب انہیں اس بات کا ہوش تک نہ رہا کہ یہ سب کچھ غیر معمولی ہے، اور یہ کوئی چھوٹی بات بھی نہیں تھی، مگر وہ دونوں تو بس وہ دونوں اپنے حال کے حالات میں مست ہو گئے، سیٹھ صاحب کافی خوش تھے کہ ایسی لڑکی تو قسمت والوں کو ملتی ہے، ان ملاقاتوں کے چکر میں سیٹھ صاحب یہ تک بھول گئے کہ یہ لڑکی دراصل ہے کون، اس کا نام کیا ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ اس کا خاندان کہاں ہے، وہ تو بس اپنے حال کے حالات میں مست تھے، اس لڑکی کا معمول تھا کہ روز شام ہوتے ہی سیٹھ صاحب کے حجرے پہنچ جاتی۔

دوسری طرف سیٹھ صاحب روز شام ہوتے ہی اس کا منتظر رہنے لگتے، سیٹھ صاحب نے اپنے دوستوں سے بھی ملنا جلنا چھوڑ دیا، سب دوستوں کو منع کر دیا گیا کہ شام کو حجرے میں کوئی نہ آئے۔

وہ ہر شام بن سنور کر سیٹھ صاحب کے دروزے پر پہنچ جاتی، وہ سیٹھ صاحب کی راتوں کو رنگین تر بنا دیتی، پوری رات سیٹھ صاحب کے ساتھ گزارتی، ایسے ہی جیسے میاں بیوی ایک ساتھ رہتے ہیں اور رات گزارتے ہیں، سیٹھ صاحب کے علاوہ اس لڑکی کو کسی اور نے نہ دیکھا تھا، نہ ہی اس کے بارے میں کسی نے سیٹھ صاحب سے کچھ پوچھا تھا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، ہر شام محبت کی ایک نئی داستان رقم ہوتی تھی، اور سیٹھ صاحب جوان تر ہوتے جا رہے تھے، یوں کافی دن گزر گئے، سیٹھ صاحب اپنے حال میں مست، ایک شام وہ نہ آئی، اور پھر غائب ہی ہو گئی، اب سیٹھ صاحب بے قرار و پریشان، سیٹھ صاحب کی زندگی ایک ویران کھنڈر کی مانند ہو گئی تھی، کہاں وہ رنگین شامیں اور کہاں یہ شام تنہائی، اب ہر شام سیٹھ صاحب اپنی محبوبہ کا منتظر رہنے لگے۔

سیٹھ صاحب کے یاروں دوستوں نے بھی انہیں چھوڑ دیا تھا، سب ناراض تھے لیکن کسی کو اس لڑکی کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا، وہ سیٹھ صاحب کے رویے سے پریشان تھے، انھیں حقیقت کا کوئی علم نہ تھا۔ ایک دو دن بعد سیٹھ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں، سیٹھ صاحب کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اس نے کبھی اس لڑکی سے اس کے گھر کا تذکرہ ہی نہیں کیا، نہ ہی اس لڑکی نے اپنے بارے میں پوری بات بتائی، سیٹھ صاحب کے من

میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے، انہیں درحقیقت اب جاکے ہوش آیا، انہیں خیال آیا کہ انہوں نے اس لڑکی کو اپنے دروازے کے علاوہ کبھی کہیں اور نہیں دیکھا تھا، اور یہ کہ انہوں نے اتنے عرصے میں کبھی اس کا نام تک نہ پوچھا، اور نہ ہی اس نے اپنا نام بتایا، وہ عجیب سے شکوک وشبہات میں مبتلا ہوگئے۔

دن گزرتے رہے، لڑکی کا کوئی نام ونشان نہیں ملا، پھر ایک دن شام کے وقت سیٹھ صاحب کے حجرے کے دروازے پر دستک ہوئی، سیٹھ صاحب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، سیٹھ صاحب کے من میں یہ خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ وہی ہو، یہی سوچتے ہوئے سیٹھ صاحب نے دروازے کے قریب جاکر اسے کھولا، سامنے دیکھا تو دو دراز قد جوان دروازے پر کھڑے ہیں، سیٹھ صاحب نے اس سے پہلے انہیں کبھی دیکھا نہ تھا، حیرت زدہ انداز میں ان سے پوچھا کہ ''جی کیا کام ہے؟ کس سے ملنا ہے؟''

ان دونوں نے انتہائی ادب سے سیٹھ صاحب سے درخواست کی کہ ہمارا آپ سے بہت ہی ضروری کام ہے ازراہ کرم آپ ہمارے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے نیچے آئیں ں۔'' سیٹھ صاحب چونکہ یہاں کے معروف کاروباری شخصیت تھے، اس لئے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ ان دونوں جوانوں کے ساتھ نیچے چل پڑے، نیچے اترنے کے بعد سیٹھ صاحب پر غنودگی سی طاری ہوئی، جب ہوش وحواس بحال ہوئے تو خود کو ایک انجان جگہ پایا، ان کے ہوش وہواس بحال ہوئے تو پتا چلا کہ یہ لوگ ایک تاریک کمرے میں داخل ہوئے ہیں، ایک نیم تاریک کمرے میں، وہاں کچھ عمر رسیدہ افراد بیٹھے ہوئے تھے، جو پہلے سے ان کے منتظر تھے۔ اس نیم تاریک کمرے میں ان لوگوں نے انہیں بیٹھنے کو کہا، انہیں وہاں عزت سے بیٹھانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اس بات کے لئے کہ کون پہلے بات شروع کرے گا، اس طرح وہاں سیٹھ صاحب سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، سیٹھ صاحب کو بھی اندازہ ہوگیا کہ یہ گفتگو نہیں بلکہ جستجو اور کسی بات کی تحقیق ہے۔

ان بزرگوں نے سیٹھ صاحب سے کہا۔ ''آپ اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں کہ ایک انسان کسی جن کی بیٹی سے عشق معاشقہ کرے اور اسے بیوی کی طرح اپنے پاس رکھے؟'' سیٹھ صاحب یہ سن کر ہکا بکا ہوکر رہ گئے، انہیں سمجھ ہی نہ آیا کہ ان سے کیا پوچھا جارہا ہے، وہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھنے لگ گئے، ان کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔

اس بنجارن نے فاطمہ کو مخاطب ہوکر کہا کہ ''میڈم آپ غور کریں یہ جو میں کہہ رہی ہوں نا، یہ ایک سچا واقعہ ہے، ایک سچا واقعہ ہے، یہ کوئی من گھڑت داستان نہیں ہے۔ وہ بنجارن کچھ دیر خاموش رہ کر پھر سے گویا ہوئی۔

''ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی'' ہاں سیٹھ صاحب جی! سیٹھ صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، وہ خوفزدہ سے ہو کر رہ گئے، ان بزرگوں نے مخاطب ہوکر ان سے پھر اپنا سوال پوچھا۔

''سیٹھ صاحب میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں کہ ایک انسان کسی جن کی بیٹی سے عشق معاشقہ کرے اور اسے اپنی بیوی کی طرح پاس رکھے؟''

سیٹھ صاحب پسینہ پسینہ ہوکر اب کی بار بھی لاجواب وخاموش، ان کے دل کی دھڑکن انتہائی تیز ہوگئی اور وہ کچھ نہ کہہ پائے، تب ان بزرگوں میں سے ایک نے اپنے ساتھی بزرگ سے کہا کہ یہ آپ کی بات سمجھ نہیں رہے مجھے ان سے بات کرنے کا موقع دیا جائے، اور انہوں نے بات شروع کی۔ ''دیکھو سیٹھ، میں آپ سے سیدھی بات کرتا ہوں، سیٹھ تم نے ہماری عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے۔'' ان کا یہ کہنا تھا کہ سیٹھ صاحب کے منہ سے بے اختیار ہونہہ کی آواز نکلی، اور ان پر سکتہ سا طاری ہونے لگا۔

جبکہ جنات میں سے اسی بزرگ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ہمارے ایک ساتھی کی بیٹی کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار رکھے، آپ

دونوں ہر شام ملتے رہے اور راتیں ایک ساتھ گزارتے رہے۔ اب ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا، سوائے اس کے کہ ہم آپ کو اٹھا کر یہاں لے آتے، ہم لوگ جنات میں سے ہیں، لیکن الحمدللہ، ہم مسلمان ہیں اور ہماری بھی آپ لوگوں کی طرح عزت ہوتی ہے، اب آپ خود انصاف کریں، آپ شادی شدہ ہو، آپ کی بیوی بچے ہیں، لیکن پھر بھی آپ نے ہماری عزت نیلام کر ڈالی، کیا کہنا ہے آپ کا اس بارے میں؟ سیٹھ صاحب پر ایک قیامت تھی جو نہ گزر رہی تھی نہ ہی ٹل رہی تھی۔

خدا خدا کر کے انہوں نے ہمت کی تو بمشکل حلق سے یہ الفاظ نکالنے میں کامیاب ہوئے کہ ''آپ انسان نہیں ہیں؟ آپ جنات میں سے ہیں؟'' جواباً اس بزرگ نے انتہائی غصہ میں کہا کہ ''جی ہاں، ہم انسان نہیں ہیں، ہم جنات ہیں ہم مسلمان بھی ہیں، ہمارا بھی آپ لوگوں کی طرح آخرت پر کامل یقین ہے، اور ہماری بھی ماں بہن ہوتی ہیں، عزت ہوتی ہے، جو آپ نے نیلام کر دی ہے'' سیٹھ صاحب اپنے خوف پر قابو پانے میں ناکام ہوتے ہوئے کہنے لگے ''مگر آپ تو جنات ہو، میرا مطلب ہے کہ آپ بھی میری طرح.....'' بس اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ حلق خشک ہوگئی اور آواز گلے میں اٹک گئی، ان کی بات کا اس بزرگ نے جلدی سے جواب دیا، کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اب انتہائی خوف زدہ ہو گیا ہے، اس نے کہا کہ ''جی ہاں ہم انسان نہیں جنات ہیں، اور یاد رکھو کہ ہماری تخلیق آگ سے ہوئی ہے جیسے آپ کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، اور ہم لوگوں کو اللہ نے یہ صفت دی ہوئی ہے کہ ہم اپنی شکل کسی بھی سانچے میں ڈال سکتے ہیں، کوئی بھی شکل اپنا سکتے ہیں، اس لئے ہم سب تمہارے سامنے انسانی شکل بنا کر آئے ہیں تاکہ آپ کا محاسبہ کر سکیں۔ آپ سے اپنی عزت کے بارے میں پوچھ سکیں۔''

☆.....☆.....☆

دوسری جانب سیٹھ صاحب کے گھر میں صف ماتم بچھ چکا تھا، ایک کہرام تھا جو ہر سو مچا ہوا تھا، سیٹھ صاحب کو کوئی اغوا کر کے لے گیا ہے، اغواء کار انہیں قتل کر دینگے۔ سیٹھ صاحب کی بیوی نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ ہائے! انہیں مار دیا جائے گا، میں بیوہ ہو جاؤں گی، میرے بچوں کا کیا ہوگا، حقیقت کا علم تو کسی کو نہ تھا، کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں، کسی نے وہاں کچھ دیکھا بھی تو نہ تھا۔

تب انہیں مشورہ دیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد جا کر محدث کبیر، فرزند مجدد زماں، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ سے ملا جائے۔ سیٹھ صاحب کی بیوی نے یہ سنا تھا کہ محدث کبیر، فرزندِ مجدد زماں، شیخ العرب والعجم حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے کے لئے تیار ہو گئی۔ کافی مصائب سے دوچار ہو کر وہ وہاں پہنچی، جامع مسجد پہنچ کر وہ شاہ صاحب کا انتظار کرنے لگی، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کر کے اس نے پوری کہانی انہیں سنائی تو حضرت نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ''محترمہ آپ کے میاں کو کچھ بھی نہیں ہوگا، وہ جلد واپس آ جائے گے، انشاء اللہ، آپ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین رکھیں''

تھوڑی دیر بعد حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے سیٹھ صاحب کی بیوی کو بلایا جو وہاں بیٹھی انتظار کر رہی تھی اور فرمایا کہ ''محترمہ اصل بات یہ ہے کہ آپ کے میاں کو کوئی انسان نہیں بلکہ انہیں جنات لے کر گئے ہیں، ان سے ایک غلطی سرزد ہو گئی تھی، ایک بہت بڑی غلطی، جس پر اب وہ شرمندہ ہیں اور توبہ تائب بھی ہو گئے ہیں، انشاء اللہ آج شام کو آپ کے میاں گھر آ جائیں گے۔'' حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ''آپ نے بہت اچھا کیا کہ آپ یہاں چلی آئیں، ابھی دیر نہیں ہوئی اگر اللہ کو منظور ہوا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی''، اس بنجارن نے ایک سرد آہ بھری فاطمہ کو ایک بار پر اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

غور سے سنو، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اس سیٹھ کی بیوی کے جانے کے بعد اپنے ایک مقتدی کو بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا، وہ وہاں سے اسی وقت چل پڑا، ساتھ ہی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سیٹھ صاحب کو لینے کے لئے بندہ بھیج دیا، اسی شام سیٹھ صاحب صحیح سلامت گھر واپس آ گئے اور اپنی پوری آپ بیتی خود ہی سب کو بیان کر دی۔

بنجارن بولی۔ ''حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے جس مقتدی کے کان میں کچھ کہا تھا وہ جنات میں سے تھا، اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ قرآن کریم پڑھتا تھا، وہ وہاں ان کے والد کے وقت سے تھا، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص مرتبہ و مقام دیا ہے۔

ان سیٹھ صاحب سے جنات نے بہت سے سوالات پوچھے، ان کی جان خلاصی اس بات پر ہوئی کہ انہوں نے موقف اپنایا کہ مجھے تو اس لڑکی کا نام تک نہیں معلوم، دوسری بات یہ کہ وہ میرے حجرے میں خود آیا کرتی تھی میں نے اسے کبھی نہیں بلایا، حقیقت تو یہ ہے کہ میں اسے جانتا تک نہیں ہوں، وہ انسانی شکل میں آتی تھی، مجھے کیا پتا تھا کہ وہ انسان نہیں ایک جن زادی ہے۔ اور جان بخشی کی اصل وجہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ تھے۔ یہ بات بروقت حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ تک بات پہنچ گئی تھی، اس لئے سیٹھ صاحب زندہ بچ گئے۔

اس بنجارن نے اپنی بات پوری کی تو فاطمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب میری سنو چاندی چوک میں ایک نان بائی کی دوکان ہوا کرتی تھی، اس دوکان کے عین سامنے ایک خارش زدہ کتا اکثر بیٹھا رہتا تھا، اس خارش زدہ کتے کی حالت ایسی تھی کہ کسی انسان کو اس کے قریب جانا گوارہ نہ ہوتا، پورا بدن خارش زدہ تھا، خارش بھی ایسی کہ ناقابل بیاں، جسم سے بہتا ہوا پیپ، دم آدھی کٹی ہوئی، اور زخمی بھی، دونوں پاؤں میں کیڑے لگے ہوئے، لیکن آنکھیں روشن، بھوک کے کوئی آثار اس پر کبھی دیکھائی نہیں دیتے تھے، صبح سویرے اس نان بائی کی دوکان کے سامنے بیٹھ جاتا، پورا دن کچھ نہ کھاتا تھا، سر شام جنگل کا رخ کرتا۔'' فاطمہ اس بنجارن سے بولی۔ یہ چاندی چوک کا قصہ ہے۔

ایک دن دو صحت مند لمبے چوڑے، سانولے رنگ کے جوان وہاں آئے، وہ وہاں پہلے کبھی نہیں دیکھے گئے تھے، صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اجنبی ہیں، انھوں نے کسی کی جانب کوئی توجہ ہی نہ کی، سیدھا اس نان بائی کی دوکان پر گئے، ان سے ایک روٹی خرید کر وہیں بیٹھ گئے اور اس خارش زدہ کتے کو غور سے دیکھنے لگے، کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، ان میں سے ایک اٹھا اور سیدھا جا کر اس خارش زدہ کتے کے سامنے کھڑا ہوا، اپنے ساتھی کی جانب موڑ کر دیکھا، اس کے ساتھی نے اسے سر ہلا کر اشارہ کیا، اب اس پہلے والے نے وہ روٹی اس کتے کے سامنے ڈالی اور واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا، اب دونوں اس خارش زدہ کتے کو گھورنے لگے، وہ دونوں جوان دنیا و مافیہا سے بے خبر بس اس کتے کو دیکھ رہے تھے، اور اس انتظار میں تھے کہ کب یہ خارش زدہ کتا یہ روٹی کھائے گا، مگر ایسا کچھ نہ ہوا، کیونکہ وہ خارش زدہ کتا کبھی کچھ کھاتا نہ تھا، پاس میں نان بائی کی جو دوکان تھی اس کا مالک جوان دونوں کو کافی دیر سے دیکھ رہا تھا، اسی شش و پنج میں تھا کہ کیسے انہیں جا کر یہ کہے کہ یہ کتا کبھی کچھ نہیں کھاتا، مگر اس کی یا تو ہمت نہیں ہو رہی تھی یا اسے یہ کہنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

سارا دن وہ دونوں وہاں بیٹھے اس کتے کو دیکھ رہے تھے، جب شام ہونے لگی تو حسب معمول اس خارش زدہ کتے نے جنگل کا رخ کیا لیکن خلاف توقع اس نے وہ روٹی منہ میں پکڑی اور اپنے راستے چل پڑا، وہ دونوں صحت مند جوان یہ دیکھ کر انتہائی خوش ہوئے۔ کیونکہ وہ یہی چاہتے تھے، وہ کتا ایک کچے راستے پر چلتے چلتے جنگل کی طرف مڑ گیا، وہ دونوں جوان بھی اس کتے کے پیچھے پیچھے جنگل کی طرف مڑ گئے، کافی دیر چلنے کے

بعد وہ کتا رک گیا، پیچھے کی طرف یوں مڑ کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میرے پیچھے آؤ، اور وہ ایک تہہ خانے میں اتر گیا۔ وہ دونوں جوان اس کتے کے پیچھے اس تہہ خانے میں جلدی سے اتر گئے۔

وہ دونوں جوان چاندی چوک حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے کہنے پر گئے تھے۔ ایک نئی نویلی دلہن بارات والوں سے جنگل میں کہیں کھو گئی تھی، تب انہیں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے چاندی چوک کے اس خارش زدہ کتے کے پاس بھیج دیا تھا، اور انہیں سمجھا دیا تھا کہ اس کتے کو روٹی ڈال کر وہیں اس بات کا انتظار کریں کہ وہ کتا یہ روٹی اٹھا کر جنگل کی طرف چلا جائے۔ اس کا پیچھا کرو، آپ کو دلہن مل جائے گی۔ یہی ہوا۔

وہ جوان تہہ خانے میں اترے تو انہوں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ خاموش و پریشان بیٹھے تھے۔ سامنے دلہن بھی خاموش حیران و پریشان بیٹھی ہوئی تھی۔ وہاں ایک عجیب سا ماحول تھا، ایک عجیب سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، ایک عجیب سی بو آ رہی تھی، اسے بو بھی کہہ سکتے تھے اور بدبو بھی۔ وہاں موجود افراد سب ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ یہ اس جنگل بیابان میں جنات کا عارضی ٹھکانہ تھا۔'' فاطمہ نے کہا کہ اس سے پہلے ان باراتیوں کے ساتھ ہوا ایسا ہوا کیوں؟

اس رات خلاف توقع سخت سردی تھی مسلسل سفر نے جسم کو چور چور کر دیا تھا، تکاوٹ کے مارے آنکھیں کھل نہیں رہی تھیں۔ باراتیوں نے گانے گا گا اور چیخ چیخ کر اپنی آوازیں خراب کر لی تھیں، ان کے گلے بیٹھ گئے تھے، پیدل سفر تھا اور وہ کافی سفر کر چکے تھے، اب پوری بارات کو تھکاوٹ نے بے حال کر دیا تھا۔ جب ایک جنگل کے قریب سے گزرنا ہوا تو انکے بڑوں نے دیکھا کہ وہاں جگہ بھی کافی وسیع ہے اور پانی بھی میسر ہے، تھکان بھی کافی ہے تو وہاں پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا گیا، پورے باراتیوں میں خوشی کی لہر دوڑی۔ سب ادھر ادھر منتشر ہو گئے اور جنگل میں ہلکا ہونے کو نکلے۔ مرد ایک جانب اور عورتیں دوسری جانب، دلہن نے بھی سکھ کا

ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کی دستیابی

اختر بک ڈپو
فیصل بازار سرگودھا

سید نیوز ایجنسی
مین بازار دینہ
PH:0300-9528023

طارق بک ڈپو
لوہاری بازار سیالکوٹ
PH:052-4568440

محمد ناصر شیخ نیوز ایجنٹ
بھیرہ ضلع سرگودھا
0301-6799177

جھنگ نیوز ایجنسی
کمالیہ روڈ نزد ٹوبہ ٹیک سنگھ
PH:0321-7531597

معصوم نیوز ایجنسی
اسٹیشن روڈ جھنگ صدر
0333-8103489

سلطانی نیوز ایجنسی
لاری اڈہ چکوال
0334-8761952

سانس لیا اور اپنی سہیلیوں سے کہا کہ اسے بھی حاجت پوری کرنے کے واسطے ساتھ لے جائیں، تین لڑکیاں اسے اپنے ساتھ ایک جانب لے کر گئیں۔

نئی دلہن کو سجانے کی ایک روایت شروع دن سے ہمارے معاشرے کا ایک اہم حصہ ہے، یہ ایک رواج بھی ہے، کیا امیر کیا غریب سب اپنی اپنی دلہنوں کو سجاتے ہیں، انہیں زیورات پہنائے جاتے ہیں، عروسی ملبوسات سے سجایا جاتا ہے، چوڑیاں، مہندی، پازیب وغیرہ وغیرہ، یہاں بھی ایسا ہی تھا، چونکہ یہ بھی ایک نئی نویلی دلہن تھی ،اس لئے اسے بھی دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

تھکاوٹ نے اس نئی نویلی دلہن کو بے حال کر دیا تھا، اوپر سے زیورات اور بھاری گھونگھٹ، بشری حوائج سب کو ہوتی ہیں، اس دلہن کو بھی حاجت محسوس ہوئی، تو اس کی سہیلیوں نے اس کا ساتھ دیا، اسے ہلکا ہونے کے لئے ایک طرف لے جایا گیا تا کہ اپنی بشری حاجت کو پورا کر سکے، اس کی سہیلیاں ایک ٹولی کی شکل میں اس کے ساتھ گئیں، اسے ایک سنسان جگہ پر لے جایا گیا، کیونکہ دلہن تھی، اس لئے اس کو ایک جانب نسبتاً دور لے جایا گیا تا کہ دلہن کا پردہ رہے اور کوئی دیکھ نہ لے۔

اس بدقسمت کو کیا خبر تھی کہ اس پر کیسی قیامت ٹوٹنے والی ہے ،اسے اس آزمائش کا پتا ہوتا تو وہ وہاں جانے پر موت کو ترجیح دیتی، لیکن تقدیر بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے، اور اسے غالب ہونا ہوتا ہے، اور وہی ہوا۔

یہ ایک سنسان جنگلی علاقہ تھا، انسانی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ آبادی بھی کم تھیں اس لئے لوگ کم ہی آتے جاتے تھے، سہولیات کم تھی ذرائع آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی، رات کی بات ہی کیا دن کی روشنی میں بھی جہاں خوف کا بسیرا ہوتا ہے۔ اکیلے جہاں جانا ممکن ہی نہ تھا، کوئی وہاں جانے کا تصور بھی نہ کر پاتا ،یہ چونکہ ایک قافلہ تھا اس لئے بلاخوف وہاں قیام کر گیا ۔ وہاں لوگ کافی خوف زدہ ہو جاتے، وہاں ڈر اس بات کا لگا رہتا تھا کہ کوئی خون خوار درندہ حملہ نہ کر دے، یا کوئی بھوت پریت چمٹ نہ جائے ۔ کچھ تو وہاں کے لوگوں نے طرح طرح کی کہانیاں مشہور کر دی تھیں، کچھ ویرانے کا ایک اپنا اثر ہوتا ہے۔

خیر اس دلہن کی آزمائش اللہ تعالی کو منظور تھی ،اس کی تقدیر ہی ایسی تھی، اس لئے وہ وہاں پہنچ گئی ۔ اسے اس بات کا اب تک کوئی پتا نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، وہ تو بس ایک سیدھی سادھی دلہن تھی۔ جسے اپنے گھر اور اپنے غریب خاندان کے علاوہ کسی چیز کا کوئی علم ہی نہ تھا۔ ایک انتہائی سیدھی سادھی لڑکی ،اس کیلئے یہ دنیا ایک جہان نادیدہ تھا، اس کی شادی بالکل ویسی ہی ہوئی جیسے عام غریب گھرانوں میں شادیاں ہوتی ہیں۔ نہ اس سے کسی نے اس رشتے کے بارے میں پوچھا تھا، نا ہی اس نے اپنے ہونے والے شوہر کو کبھی دیکھا تھا، بس تاریخ مقرر کر دی گئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔

دن قریب آتے گئے اور آخر کار رخصت کی گھڑی آ گئی۔ باراتی تیار ہوئے، اور بارات چل پڑی ،آج اس لمحے وہ یہاں پر موجود تھی، جہاں سے اس کی زندگی نے ایک الگ ہی موڑ لینا تھا، اسے اس آزمائش سے گزرنا تھا۔

اپنی سہیلیوں کے ساتھ یہ نئی نویلی دلہن جب وہاں پہنچی تو اس کی سہیلیوں نے اسے ایک جانب جانے کو کہا اور خود ایک درخت کے وسیع تنے کے ساتھ کھڑے ہو کر گپ شپ میں مصروف ہو گئیں، دلہن ایک جانب کو گئی تو اس نے ایک ہرن کے خوبصورت بچے کو دیکھا جو وہاں کھڑا اسے گھور رہا تھا، دلہن اسے دیکھ کر فوراً رک گئی کہ شاید یہ مجھ سے ڈر کر بھاگ جائے گا، اس سے پہلے اس نے ہرن کے بارے میں صرف سنا تھا کبھی دیکھا نہ تھا، مگر اسے دیکھتے ہی وہ پہچان گئی، معصوم سا ہرن کا بچہ تھا، وہ بغیر کسی حرکت کے وہیں کھڑی ہو گئی، پھر اسے ہلکا سا چکر آیا، ایک غنودگی سی طاری ہو گئی، ہوش آیا تو دیکھا کہ پورا منظر ہی بدل گیا تھا، اسے سمجھ کچھ نہ آیا کہ یہاں پر ہوا کیا، اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر ہرن کا بچہ غائب تھا، البتہ اس نے ایک انجان نوجوان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ جو اسے حیرت سے

دیکھ رہا تھا، اس نوجوان نے فقط اتنا کہا کہ ''ساتھ چلو''، اس نے سر ہلا کر اشارہ کیا کہ ''ہاں'' دونوں ساتھ ساتھ ایک انجان منزل کی جانب چل پڑے۔

دلہن کو اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ وہ ایک انجان بندے کے ساتھ کہاں اور کیوں جا رہی ہے، وہ ایک نامعلوم سحر میں مبتلا تھی، ایک سحر زدہ دلہن ایک انجان شخص کے ساتھ ایک نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ وہ دونوں یوں چل رہے تھے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے سے آشنا ہوں، اس قسمت کی ماری کو کیا معلوم تھا کہ وہ کس عذاب میں مبتلا ہونے والی تھی۔ اسے ان راستوں کا بھی علم نہ ہو سکا جس پر وہ چل رہی تھی، ہوتا بھی کیسے، اس نے دیکھا ہی کیا تھا، وہ تو ایک انتہائی سیدھی سادھی لڑکی تھی، اسے تو بات کرنا بھی نہ آتا تھا۔

☆.....☆.....☆

تب ان مصیبت زدہ باراتیوں کو گاؤں والوں نے مشورہ دیا کہ دہلی کی جامع مسجد چلے جاؤ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا پتہ معلوم کرو ان سے بات کرو اور اللہ پر توکل کرو۔

''یہ سننا تھا کے سب کے سب تیار ہو گئے، انہیں اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ یہ دن ہے کہ رات ہے، انہیں دلہن کی فکر کھائے جا رہی تھی اور کسی بھی طریقے سے اسے واپس لانا چاہتے تھے۔ سب کے سب باراتی اسی وقت دہلی کیلئے روانہ ہوئے۔'' سب حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ سے ملنے کے لیے بے قرار تھے۔

رات دن سفر کے تکالیف و صعوبتیں برداشت کی، بیماری و بے آرامی کی کوئی پروا وہ نہ کی، سب کو بس ایک ہی فکر تھی اور وہ دلہن کی تھی کہ وہ کہاں اور کیسے ہو گی؟''

فاطمہ نے بات روک لی اور کھانسنے لگی، کھانسنے کے بعد تھوڑی دیر تک وہ کسی سوچ میں گم رہی، پھر بولی۔

''دلہن کے باپ کی حالت ناگفتہ بہہ تھی، اس بدقسمت کو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا، اب اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا، حیرت زدہ، پٹی ہوئی آنکھوں سے وہ چاروں جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے ابھی کہیں سے اس کی جوان جہاں بیٹی سامنے آ کر مسکراتے ہوئے کہے گی کہ ''ابا میں آ گئی'' ان خیالات کی وجہ سے وہ جان بہ لب ہو چکا تھا۔''

فاطمہ اس بنجارن سے بولی ''یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے، اس کا ثبوت بھی موجود ہیں، اس بے چاری دلہن کا باپ جان بہ لب تھا، اس کی دنیا ویران ہو گئی تھی اس کا کل سرمایہ، کل کائنات ہی اس کی یہ بیٹی تھی، مرتا کیا نہ کرتا، رونے لگ گیا اور رو رو کر ہلکان ہو گیا، باقی باراتی بھی افسردہ، حیران و پریشان تھے، کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔''

''جنات ان میں سے ایک جن نے دلہن کو دیکھا اور اسے وہ پسند آ گئی، ویسے بھی وہ ایک دلہن تھی جو سنواری گئی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ جوان بھی تھی اور سیدھی سادھی بھی، سادگی کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔ جو دلوں پر اثر کر جاتی ہے۔ وہ جو اسے اٹھا کر لایا تھا وہ بھی جنات میں سے ایک تھا، جوان تھا، جذباتی بھی تھا، اس نے یہ سوچ کر اسے اٹھا لیا کہ میں اسے اپنے پاس رکھوں گا، یہ میری دلہن بن کر رہے گی۔

مگر یہ کرتے ہوئے وہ یہ بھول گیا کہ وہ دلہن ایک انسان ہے، اور یہ کہ وہ خود ایک جن ہے۔ ان دو مخلوقات کا میل ہو ہی نہیں سکتا۔ بہر حال وہ یہ نادانی کر بیٹھا، اب اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرے بھی تو کیا کرے۔ کیونکہ اس کی اپنی برادری کے لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے۔

جنات میں سے جو بزرگ لوگ تھے انھوں نے اسے وہی بیٹھایا ہوا تھا، وہ انتہائی افسردہ اور پشیماں تھے، ان میں سے اکثر جنات حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ سے واقف تھے، ان کے حلقہ درس میں شریک ہو چکے تھے۔ ان تک حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ پیغام پہنچ چکا تھا۔ اور وہ اسی انتظار میں تھے کہ کوئی آئیگا اور اس دلہن کو عزت کے ساتھ واپس لے جائے گا۔ اس لئے وہ جوان وہاں گئے ہوئے تھے۔'' تو'' فاطمہ نے ایک لمبی سانس لی اور بات جاری رکھی۔

''جب وہ دو جوان اندر داخل ہوئے تو ان کا استقبال کیا گیا، ان کو عزت دی گئی، اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کو ان کے ذریعے معذرت کی گئی۔ اور اس بات کی یقین دہانی کی گئی کہ اس سرکش جن کو سزا دی جائے گی، اس کی سرزنش کی جائے گی۔ یا پھر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ جیسے مناسب سمجھیں سزا تجویز کریں، ان دو جوانوں کے حوالے دلہن کر دی گئی جو جلد ہی واپس پہنچ گئے کیونکہ شادی کا معاملہ تھا۔ دلہن واپس پہنچی تو اس پر جو بیتی اسے کچھ یاد نہ تھا، اتنا جانتی تھی کہ اسے کوئی کہیں دور لے گیا تھا اور بس۔ باراتیوں کی جان میں جان آئی۔ دلہن کے والد کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

شادی کے کچھ ہی دن بعد دلہن اور دلہا حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں دعا کے لئے اور سلام کئے حاضر ہوئے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ سے خوب دعائیں لیں۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کو ان کو خوش دیکھ کر کافی اطمینان و خوشی ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ جن جس نے یہ گستاخی کی تھی وہ اب تو بہ تائب ہو چکا ہے۔ آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ'' فاطمہ بولی۔

''حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بیٹوں حضرت مولانا شاہ اسحاق رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا نام سنا ہے؟ ہندوستان میں ان سے بڑا نام شاید ہی کسی کا ہو، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی تو مجدد زماں تھے، ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، ان کے فرزند حضرت مولانا شاہ اسحاق رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ بھی اس مقام کو پہنچ گئے تھے جہاں بہت ہی کم لوگ پہنچ پاتے ہیں، اس عظیم خاندان کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے انسانوں کے ساتھ ساتھ جنات کو بھی علوم دینیہ سکھائے، انسانوں کی طرح جنات بھی ان سے درس لیتے، دین سیکھتے، اور ان کے حلقوں میں شریک ہوتے۔'' حضرت مولانا شاہ اسحاق رحمتہ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ اپنے باپ کی طرح عملیات کے بھی ماہر تھے، جنات ان کے حلقہ درس میں شریک ہوتے تھے، اس وجہ سے یہ لوگ اس لائن میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے نام کی برکت سے بڑے بڑے مسئلے حل ہو جاتے۔ میں تمہیں ایک اور حقیقی واقعہ سنانا چاہتی ہوں۔

پہلے تو یہ بات سمجھ لو کہ ''مدارس دینیہ ہمارے دین کی بقاء کے ضامن ہیں، یہ خاک نشین، بوری نشین لوگ، یہ ان خاک نشین لوگوں کا کرم ہے کہ سینہ در سینہ ہمارے مذہب کے ایک بڑے حصے کو منتقل کرتے رہتے ہیں، یہ مقدس نفوس، یہ مطہر وجود، آج کے اس پرفتن دور میں بھی اسی عظیم خدمت پر مامور ہیں۔

مدارس دینیہ جن کے بارے میں حضرت علامہ محمد اقبال نے دردِ دل کے ساتھ کہا تھا کہ ''ان مدرسوں کو اسی حال پر رہنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا، جو کچھ ہوگا میں گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہوگا جس طرح اندلس میں کی گئی آٹھ سو سالہ اسلامی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء کے نشانات کے سوا اسلام کے پیروکاروں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔''

صد افسوس کہ ان کا پرسان حال کوئی نہیں، آج بھی یہ بے غرض فرشتہ صفت، تن من کے اجلے لوگ، چندوں اور وظیفوں پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں ان کے ہونے کا احساس تب ہوتا ہے جب ہمارا کوئی اپنا مر جائے، کوئی جنازہ پڑھوانا ہو، یا کوئی بچہ پیدا ہو اس کے کان میں اذان و اقامت دینی ہو یا ہم کوئی عالی شان عمارت، محل یا بنگلہ تعمیر کرے تو اس میں ختم قرآن کروانا ہو، بلاشبہ ان مدارس دینیہ کی حالت ناگفتہ بہ ہیں۔

ایسا ہی ایک مدرسہ ہے، ٹاٹ لٹکے ہوئے اور بچھے ہوئے بھی، لٹکے ہوئے ٹاٹ دروازے کا کام بھی دیتے ہیں اور پردوں کا بھی، اور بچھے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھا بھی جاتا ہے۔ یہاں بھی بے غرض لوگوں کا

ایک مدرسہ ہے، جہاں قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی صدائیں بلند ہو کر فضا کو معطر، مطہر اور مرتعش کرتی رہتی ہیں۔ ایک جگہ جہاں ٹاٹ لٹکے ہوئے ہیں، وہ مدرسے کے ایک کلاس روم کی تقسیم کی ایک نشانی ہے، یہاں کا کل سرمایہ ہی چند ٹاٹ، ایک تختہ سیاہ، کچھ چاک لکھائی کے لئے اور بس، یہاں کے ایک کلاس میں قریبی گاؤں سے آیا ہوا ایک طالب علم عبدالمعید پڑھتا ہے، طالب علم عبدالمعید نہ صرف یہاں کا طالب علم ہے بلکہ یہاں اس مدرسے کے مہتمم صاحب کا بڑا بیٹا بھی ہے۔

بڑی بڑی شفاف آنکھیں، سرخ و سفید چہرہ، ایسا روشن چہرہ جس سے نور جھلکتا دکھائی دیتا ہے، تقوی کے آثار ایسے چہروں پر صاف دکھائی دیتے ہیں۔ دنیا کی نحوست اور گندگی سے کوسوں دور اپنی دنیا میں مگن طالب علم عبدالمعید کو اچانک کچھ ہونا شروع ہو جاتا ہے، لوگ کہتے اسے نظر لگ گئی، کچھ کا خیال تھا کہ اسے کوئی دماغی بیماری ہے، مدرسے کے مہتمم یعنی عبدالمعید کے والد اکثر فرماتے کہ مجھے نہیں معلوم اسے کیا ہوا ہے ہاں اتنا جانتا ہوں کہ نیک لوگوں پر آزمائش آتی رہتی ہیں۔

دن گزرنے لگے، غربت تھی اور ان لوگوں کے پاس تھا بھی کیا، مہتمم صاحب کو چندے کے طور پر نماز جمعہ میں چند پیسے ملتے جس سے مشکل سے گزارا ہوتا، اوپر سے یہ آزمائش، اب جب بھی طالب علم عبدالمعید کلاس میں آ کر پڑھائی شروع کرنا چاہتا اس کی حالت غیر ہو جاتی، وہ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتا۔ وہ کسی کو نہ پہچانتا، حتیٰ کہ اپنے باپ کو بھی نہ پہچان پاتا۔ اپنے ہی باپ سے کہتا ''کون ہو تم''، ''کیا چاہتے ہو''، ''دور ہٹوں مجھ سے''، اس کی پڑھائی کا حرج ہونے لگا، کیونکہ وہ یعنی طالب علم عبدالمعید پڑھائی کے کتابوں سے دور بھاگنے لگا، قال اللہ و قال الرسول ﷺ کی صدا سنتے ہی وہ کانوں میں انگلیاں دبا دیتا اور چیخنے لگتا۔

کچھ دن یہی سلسلہ چلتا رہا، پورا گاؤں اس کے لئے پریشان تھا۔ جب اس کے والد نے یہ دیکھا کہ عبدالمعید ایک عجیب و غریب کیفیت میں تب وہ فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کیونکہ جب بھی طالب علم عبدالمعید اپنی کلاس میں آتا، وہ ایک انجان زبان بولنے لگتا، انھیں احساس ہوا کہ یہ ضرور کوئی جن بھوت ہے جو طالب علم عبدالمعید پر آتا ہے اور اسے پڑھنے نہیں دیتا ہے۔ عبدالمعید کو اس بات کا کوئی پتا نہ چلتا کہ اس کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے، وہ بے چارہ تو بس مدہوش ہو جاتا۔ تب اس گاؤں کے ایک بابے نے مولوی صاحب کو مشورہ دیا کہ طالب علم عبدالمعید کو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ صاحب کے پاس لے جائیں۔ خیر خدا خدا کر کہ مہتمم صاحب عبدالمعید کو حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ لے گئے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے عبدالمعید کی آنکھوں میں غور سے دیکھا اور مہتمم صاحب سے فرمایا کہ ہاں اس بچے پر ایک جن لڑکی کا سایہ ہے، وہ اسے پسند کرتی ہے، وہ جنات میں سے ہے اور غیر مسلم ہے۔ انھوں نے مہتمم صاحب سے پوچھا کہ جب عبدالمعید قرآن کریم کی تلاوت سنتا ہے یا حدیث رسول ﷺ سنتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی؟ مہتمم صاحب نے عرض کیا کہ قال اللہ و قال الرسول ﷺ سنتے ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے، یہ اپنی انگلیاں کانوں میں دے کر چیخنے لگتا ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ یہ سن کر انتہائی غصہ ہوئے اور فرمایا فکر نہ کرو میں اس کی خبر لیتا ہوں۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ مسجد میں درس قرآن دیا کرتے تھے، اس کے بعد اپنی بیٹھک میں سالوں سے جنات کو درس دیا کرتے تھے، درس قرآن کا یہ معمول سالوں سے ان کے ہاں تھا۔ یہی معمول حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہم کے والد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کا بھی تھا۔ ان حضرات کے اس پاس کون کس شکل میں آتا جاتا رہتا تھا، یہ ان کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا اور یہ حضرات ان باتوں کا عام مجالس میں تذکرہ بھی نہیں کرتے تھے۔

پوچھنے کی تو کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

وہ معروف واقعہ بھی انہی کے والد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کا تھا کہ ایک بار انھوں نے ایک سانپ کو مار ڈالا، سانپ چونکہ انتہائی موذی و زہریلا ہوتا ہے اس لئے ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے اس سانپ کو مارا تو کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ کے پاس جنات آئے اور انھیں اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے، ان جنات نے حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کو اپنی عدالت میں پیش کیا، ان پر ایک جن کے قتل کا لزام لگایا گیا۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے جب ان جنات کی عدالت میں پیش کیا گیا تو میں نے اپنی صفائی میں ایک حدیث کا حوالہ پیش کیا اور جج سے کہا کہ حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ''جو اپنی جنس بدل لیں اور اس حالت میں اس کا قتل ہوا تو اس کی ذمہ داری قاتل پر نہ ہرگز نہ ہوگی۔''

ان جنات کے جج نے کہا کہ ہم نے یہ روایت نہیں سنی، ہم تک تو ایسی کوئی روایت پہنچی ہی نہیں، سامعین میں سے ایک عمر رسیدہ جن نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر کہا کہ ''ہاں میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت سنی ہے کہ جو اپنی جنس بدل دے اور قتل کیا جائے تو قاتل سے کوئی قصاص نہ لیا جائے گا۔'' اس عمر رسیدہ جن نے مزید کہا کہ ''میں خود وہاں موجود تھا اور اس وقت میری عمر پانچ سو سال تھی۔'' اس طرح حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ اس کیس سے باعزت بری ہوئے اور انتہائی عزت سے واپس لائے گئے۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ اکثر فرماتے کہ ''میں نے ایک صحابی جن کو دیکھا ہے اس لئے اصولاً میں تابعی ہوا، کیونکہ جس نے اپنی زندگی میں حضور اقدس ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ صحابی کہلاتا ہے اور جو کسی صحابی رسول ﷺ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے وہ تابعی کہلاتا ہے، اس لئے میں اب ایک تابعی ہوں۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ اسی خاندان کے ایک اہم فرد اور چشم و چراغ تھے۔ حیران کن صلاحیتوں کے مالک حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اس طالب علم عبدالمعید کو سامنے بیٹھا کر قرآن کریم کی تلاوت شروع کی، جوں جوں شاہ صاحب قرآن کریم کی تلاوت کرتے جاتے، عبدالمعید کی حالت غیر ہوتی جاتی، وہ کانوں میں انگلیاں دے کر زور زور سے چیخنے لگا۔

لیکن یہاں اس کی ایک نہ چلی۔ کچھ دیر تلاوت قرآن کریم کرنے کے بعد حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے سات کنکریاں اٹھائیں۔ اور ایک ایک کنکری پر کچھ دم کرنے لگے، ان سات کنکریوں سے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے عبدالمعید کو آہستہ آہستہ مارنا شروع کیا، ایک ایک کنکری مارتے جاتے اور کچھ پڑھتے جاتے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ انتہائی آرام سے وہ کنکری مارتے جاتے، لیکن عبدالمعید کو وہ گویا ایٹم بم بن کر لگ رہی تھیں، وہ ایک عجیب آواز سے چیخنے چلانے لگا، ایسی چیخیں جو دل کو ہلا کر رکھ دیں۔ ایک ہیبت زدہ ماحول بن گیا تھا۔ وہاں خوف کے مارے کوئی ہل نہیں رہا تھا، موجود افراد کی خوف کے مارے گویا جان جا رہی تھی۔

تب حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے ایک انجان زبان بولنی شروع کی، اور عبدالمعید اسی زبان میں جواب دینے لگا، ماحول پر ایک سحر چھایا ہوا تھا، وہاں موجود پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کا رنگ غصہ سے لال ہو رہا تھا، عبدالمعید چیخ چیخ کر ہلکان ہو چکا تھا۔ اس کا رنگ زرد آنکھیں سرخ جو دائروں میں گھوم رہی تھیں، ہاتھ پیر سن پڑ چکے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد عبدالمعید بے ہوش ہو گیا اور حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ مسکرانے لگے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے عبدالمعید کے والد سے فرمایا کہ ''مولوی صاحب اس طالب علم کا خاص خیال رکھیں۔ یہ کوئی عام طالب علم نہیں ہے، اس سے ابھی اللہ نے بہت کام لینا ہے یہ ایک انتہائی ذہین اور متقی طالب علم ہے۔''

اس پر ایک کافر لڑکی فدا ہوگئی تھی وہ جنات میں سے تھی، اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ اس طالب علم کو بہکائے اور دینی علوم کے حصول سے روکے، میں نے اسے بھگا دیا ہے وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی، وہ ایک بنجارن جن زادی تھی، آئندہ نہیں آئے گی، میں نے اسے اختیار دیا کہ چاہے تو اسلام قبول کرکے توبہ تائب ہو جائے اور آخرت میں نجات پانے والی بن جائے اور چاہے تو سرکشی نہ چھوڑ کر خسارے والی بن جائے۔'' حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے وہاں موجود عوام کی طرف رخ کیا اور فرمایا ''دیکھو اخلاقی انحطاط، نا انصافی، استحصال، مذہبی، مسلکی، لسانی، علاقائی تعصب، یہ وہ چیزیں ہیں جس نے انسان اور جنات کو تباہ کرکے رکھ دیا ہے، اب اس بات کو یاد رکھو کہ آج آپ لوگ یہاں موجود ہو، کل کو مر جاؤ گے، تب افسوس کرو گے۔ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے مزید فرمایا کہ میں اور میرا خاندان انسان اور جنات کو بچانے کے لئے مختلف تدابیر بروئے کار لاتے رہیں گے۔ ''انسان اور جنات کی زندگی کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی گئی ہے اور اسے کامیابی حاصل کرنے کے لئے اسی بنیادی آئین پر زندگی گزارنی ہوگی۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے عبدالمعید کے والد سے مزید فرمایا کہ میں نے اسے دھمکی دی کہ آئندہ اس طالب علم کے آس پاس بھی بھٹکی تو دائمی اذیت میں مبتلا کردونگا، اب میرے شاگردوں میں سے چند ایک نے جو خود بھی جنات میں سے ہیں اور مسلمان ہیں، اس کی ذمہ داری لے لی ہے اس طالب علم کا خیال رکھیں گے اور اسے اس بنجارن جن زادی سے محفوظ رکھیں گے۔'' حضرت مولانا شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ نے انھیں کچھ ذکر اذکار و وظائف دے کر رخصت کیا، اس کے بعد سے اس طالب علم پر کبھی کوئی اثر نہ رہا۔ وہ محنت سے دینی علوم کے حصول میں مصروف ہوگیا۔

فاطمہ نے اس بنجارن سے کہا۔ الحمد اللہ میں ایک مسلمان لڑکی ہوں، میرا ابھی آخرت پر ایمان ہے اور میں ایک سنی مسلمان ہوں، قرآن کریم کی تلاوت کرتی ہوں اور اس پر کامل اکمل ایمان ہے، اللہ تبارک و تعالی کی پیدا کردہ مخلوقات پر بھی میرا ایمان ہے، خواہ وہ جن ہوں کہ انسان ہوں، نباتات ہوں کہ جمادات وحشرات، سب اللہ تعالی کی مخلوقات ہیں۔

اس بنجارن نے فاطمہ سے کہا۔ ''میڈم صاحبہ، آپ کو معلوم ہے کہ جنات کی عمر بہت زیادہ ہوتی ہے، اس بنجارن جن زادی کی عمر بھی تو کافی زیادہ ہوئی ہوگی، اور کیا پتا کہ وہ کہاں ہوگی اور کیا کر رہی ہوگی، ہوسکتا ہے کہ وہ آپ ہوں، ہوسکتا ہے کہ وہ اس بلڈنگ میں ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ میں ہوں، وہ بھی بنجارن میں بھی بنجارن، میڈم صاحبہ یہ دنیا ہے یہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے، میڈم صاحبہ آپ اس بارے میں ضرور لکھیں، ٹھیک ہے نا، اب میں جاتی ہوں، زندگی کا کیا بھروسہ، عمر تیزی سے گزر رہی ہے۔''

وہ اٹھی اور دروازے کے قریب پہنچ کر فاطمہ کی طرف مڑی اور کہا، ''میڈم صاحبہ، اگر ہماری عمر زیادہ ہے تو کیا، ہم نے بہت کچھ دیکھا ہو تو کیا، ایک دن تو مرنا ہے، انسانوں کی طرح ہم بھی مرتے ہیں'' وہ یہ کہہ کر دروازے سے باہر نکلی، فاطمہ تھوڑی دیر بند دروازے کی طرف دیکھتی رہی، پھر اچانک اسے خیال آیا تو وہ بھاگ کر باہر کی طرف بھاگی، باہر نکل کر اس نے بہت ڈھونڈا لیکن اس بنجارن کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ فاطمہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئی ''یہ تو وہی بنجارن جن زادی تھی، یہ کہانی تو اس کی اپنی تھی۔''

پیانو

ضرغام محمود۔ کراچی

اس بات کو چالیس سال ہوگئے ہیں اور امید ہے کہ چاہنے والی پھولوں کے رتھ پر سدوار ہو کر آئے گی اور ملن کی گیت مسکراتے ہوئے گائے گی۔

ایک دلکش، دلنشین روح کی روداد جو کہ پڑھنے والوں کو گدگدا کر رکھ دے گی

میری کیفیت عجیب سی تھی جہاں برسوں بعد اپنے وطن واپس آنے کی خوشی تھی وہیں یہ دکھ بھی میرا دل چیر رہا تھا کہ اب میں اپنے پیارے والدین کو نہیں دیکھ پاؤں گا ان کے آخری وقت میں بھی میں ان کے قریب نہیں رہا ان کی آخری رسومات میں بھی میں شرکت نہیں کرسکا۔ میں پندرہ سال بعد اپنے وطن لوٹ رہا تھا جب میں دس سال کا تھا تو میرے والدین نے مجھے پڑھنے کے لئے یورپ بھیج دیا تھا اس کے بعد میں کبھی اپنے وطن نہیں آسکا میرے والد نے مجھے وطن آنے کی اجازت نہیں دی میرے ماں باپ خود ہر سال میرے پاس آجاتے تھے دراصل میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور میرا بیک گراؤنڈ زمیندار فیملی سے ہے جہاں دشمنیاں نسلوں نسلوں چلتی ہیں اور شاید ایسی ہی کسی دشمنی کی وجہ سے میرے والدین نے مجھے اس سرزمین سے دور یورپ میں رکھا اب ان کی ناگہانی موت کی وجہ سے مجھے واپس وطن آنا پڑ رہا ہے کچھ روز قبل میرے والدین کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا اور مجھے اس ایکسیڈنٹ کی اطلاع بھی اتنے دن بعد دی گئی کہ میں ان کی آخری رسومات میں بھی شرکت نہ کرسکا۔ جہاز میں اعلان ہوا کہ جہاز لینڈ کرنے والا ہے تو میں نے سیٹ بیلٹ باندھ لی اور شیشے سے پار دیکھنے لگا یہ سرزمین جو میرے ماں باپ کی تھی جہاں سے میرا خمیر اٹھا ہے برسوں بعد میں اس سرزمین پر قدم رکھنے والا ہوں۔ جہاز رکا تو میں نے سیٹ بیلٹ کھولی اور پھر ایک ایک کر کے مسافر جہاز سے اترنے لگے میں بھی جہاز سے اتر کر ٹرمینل کے اندر پہنچا میرے پاس سامان نہایت مختصر تھا لہٰذا کسٹم وغیرہ سے جلدی ہی نجات مل گئی جب میں ایئرپورٹ سے باہر نکلا تو مجھے اپنے خاندانی پرانے نوکر فضل بابا نظر آئے فضل بابا ہمارے خاندانی نوکر تھے ان کے باپ دادا بھی ہماری حویلی میں کام کرتے تھے ابا جان فضل بابا پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے اور اکثر فون پر گفتگو کرتے ہوئے ابا جان فضل بابا سے بھی میری بات کروا دیتے تھے اس لئے فضل بابا میرے لئے اجنبی نہیں تھے۔

''سمیر بیٹا'' فضل بابا آواز دیتے ہوئے مجھے اشارہ کر رہے تھے میں نے بھی ہاتھ ہلا کر انہیں بتایا کہ میں نے انہیں دیکھ لیا ہے پھر میں اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال کر لوگوں کی بھیڑ میں جگہ بناتے ہوئے آگے بڑھا اور فضل بابا کے قریب پہنچا۔

''بیٹا کیسے ہو سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی''

فضل بابا نے میرے کندھے سے بیگ لینا چاہا۔

''جی بابا۔ سفر آرام دہ تھا'' میں نے جواب دیا۔

''لاؤ بیٹا بیگ مجھے دے دو'' فضل بابا نے مجھ سے بیگ لینا چاہا۔

''نہیں بابا۔ کوئی بات نہیں۔ بیگ میں اٹھا لیتا ہوں'' میں نے کہا تو فضل بابا میرے ساتھ چلنے لگے سڑک پر پہنچ کر فضل بابا نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ایک بلیک کلر کی لمبی سے گاڑی میرے قریب آ کر رکی اور اس میں سے ایک باوردی ڈرائیور اترا اور اس نے مجھے سلام کیا میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''یہ اشرف ہے حویلی کا ڈرائیور'' فضل بابا بولے'' اشرف بیگ لے کر ڈگی میں رکھو'' فضل بابا پہلے مجھ سے بولے اور پھر اشرف کو مخاطب کیا تو اشرف نے میرے کندھے سے بیگ لے لیا اور ڈگی کھول کر بیگ اس میں رکھ دیا پھر میں اور فضل بابا گاڑی میں بیٹھے تو اشرف ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی میں فضل بابا سے بات چیت کرنے لگا فضل بابا سے بات کرتے ہوئے اردگرد کا ماحول بھی دیکھتا جا رہا تھا میرے اندازے سے کہیں زیادہ اس شہر نے ترقی کر لی تھی ورنہ پندرہ سال پہلے جس حالت میں، میں اس شہر کو چھوڑ کر گیا تھا اب شہر میں کافی ترقیاتی کام ہو چکے تھے میں حیرت اور مسرت سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

''فضل بابا حویلی جانے سے پہلے میں قبرستان میں مما پپا کی قبر پر جانا پسند کروں گا'' کچھ دیر بعد میں نے فضل بابا سے کہا تو فضل بابا نے اشرف کو گاڑی قبرستان کی جانب لے جانے کا کہا۔ کچھ دیر بعد ہی قبرستان آ گیا۔ میں گاڑی سے اتر کر فضل بابا کی رہنمائی میں مما پپا کی قبروں پر پہنچا مما پپا کی قبریں ساتھ ساتھ تھیں۔ مما پپا کی قبریں دیکھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں آنسو میری آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہنے لگے فضل بابا نے یہ دیکھ کر میرا کندھا تھپتھپا کر مجھے تسلی دی میں نے مما پپا کی قبروں پر فاتحہ پڑھی اور پھر گاڑی میں سوار ہو کر حویلی کی جانب چل دیا۔

حویلی میں سب نوکر چاکر میرے استقبال کے لئے حویلی کے بڑے سے لان میں کھڑے تھے فضل بابا نے سب نوکروں کا مجھ سے تعارف کرایا اکثر حویلی میں کام کرنے والے نوکر پرانے تھے جنہیں میں جانتا تھا سب نے میری آمد پر خوشی کا اظہار کیا میں حویلی میں داخل ہوا تو حویلی حسب سابق تھی ابا جان نے میرے پیچھے حویلی میں جدید انداز میں کافی تبدیلیاں کروا رکھی تھیں جو مجھے خوشگوار محسوس ہوئیں ویسے میں نے محسوس کیا کہ پندرہ سال پہلے میں جس طرح کا اپنا علاقہ چھوڑ کر گیا تھا اس کے مقابلے میں اب یہ علاقہ کافی جدید اور ترقی یافتہ محسوس ہوتا تھا لوگ بھی پڑھ لکھ گئے تھے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ تھے میں نے فضل بابا کے ساتھ پوری حویلی گھومی اور پھر شام کو علاقے کے معززین سے ملاقاتیں بھی کیں میرے کافی پرانے دوست بھی مجھ سے ملنے آئے۔

مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا میں بہت حد تک یہاں کے حالات سے ہم آہنگ ہو گیا تھا پھر میرے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جسے ضبط تحریر لانے کے لئے میں یہ سب لکھ رہا ہوں اس دن شام کا وقت تھا میں اپنے ڈرائیور اشرف کے ساتھ شہر کے بڑے بازار کی جانب جا رہا تھا اور ساتھ ہی کار کے شیشے سے باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا کہ میری نظر ایک دکان پر پڑی۔ داتا اینٹیک شاپ اس دکان کے شیشے کے پار مجھے وہ چیز نظر آئی جس سے مجھے عشق ہے میرے یورپ والے گھر میں بھی وہ چیز رکھی تھی اور میں روزانہ مشق کیا کرتا تھا داتا اینٹیک شاپ میں مجھے ایک پیانو رکھا نظر آیا پیانو سے مجھے عشق تھا اور میں نے پیانو بجانے کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی یورپ والے گھر میں تو میں روزانہ باقاعدہ پیانو بجاتا تھا یہاں آ کر میں اتنا مصروف رہا کہ مجھے فرصت ہی نہیں ملی مگر اب جو میں نے پیانو دیکھا تو۔۔۔۔تو میری طبیعت مچل گئی اور میں نے اشرف سے کار داتا اینٹیک شاپ کی جانب موڑنے کا کہا اشرف میرا حکم سن کر کار کو U ٹرن سے گھما کر داتا اینٹیک شاپ پر لے گیا اور دکان کے سامنے کار روک دی میں

کار سے اتر کر دکان میں داخل ہوا تو ایک بوڑھا شخص پھرتی کے ساتھ میرے قریب آیا۔

''جی بابو صاحب۔۔۔ کیا چاہئے'' وہ شخص جو دکاندار معلوم ہوتا تھا میرے دکان میں داخل ہوتے ہی میرے قریب آکر بولا میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا جو پینسٹھ ستر سال کا چھوٹے قد کا خستہ حال بوڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا سیدھا پیانو کی جانب گیا اور اس کا اوپری حصہ اٹھا کر اسے لکڑی کی مدد سے کھڑا کیا اور اس کے بٹن پریس کرنے لگا بٹن پریس کرتے ہی پیانو سے سریلی موسیقی برآمد ہونے لگی پیانو کی موسیقی جیسے ہی میرے کانوں میں پڑی مجھ پر سرور طاری ہونے لگا بوڑھے دکاندار نے یہ دیکھا تو جلدی سے ایک اسٹول اٹھا لایا اور مجھے بیٹھنے کے لئے دیا میں اسٹول پر بیٹھ گیا اور پھر میری انگلیاں پیانو پر تھرکنے لگیں اور دکان سریلی موسیقی سے گونجنے لگی۔

''واہ صاحب آپ تو پیانو خوب بجاتے ہیں۔ شاید یہ پیانو آپ جیسے ہی کسی قدر دان کا انتظار کر رہا تھا'' بوڑھا دکاندار میرے موسیقی بند کرنے کے بعد بول اٹھا میں نے اس دکاندار کو دیکھا پھر کہا۔

''پیانو پرانا ہے اور اس کے لیفٹ کا دوسرا تار بھی کچھ ڈھیلا ہے۔ پھر بھی اچھی کنڈیشن میں ہے'' میں دکاندار سے بولا۔

''کاریگر پیانو کی کسی بھی کمی کو دور کردے گا'' دکاندار بولا۔

''پیانو کے کاریگر یہاں مل جائیں گے'' میں نے پوچھا کیونکہ پیانو صحیح کرنا ہر ایک کاریگر کے بس کی بات نہیں تھی۔

''اس کے کاریگر تو آپ کو بڑے شہر ہی میں ملیں گے'' دکاندار پیانو پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے میں صحیح کروالوں گا۔۔۔ یہ بتاؤ تم اس پیانو کے کیا لوگے؟'' میں پیانو بند کرتے ہوئے بولا۔

''صاحب یہ ون اینڈ اونلی پیس ہے مارکیٹ میں۔۔۔ اب تو کمپنی نے بھی اس طرح کا پیانو بنانا بند کر دیا ہے'' دکاندار پیانو پر اس طرح ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے وہ کوئی زندہ چیز ہو میں سمجھ رہا تھا کہ دکاندار اس طرح کی باتیں کرکے اپنے مال کی قیمت بڑھا رہا ہے۔ خیر کچھ مول تول کے بعد میں نے وہ پیانو خرید لیا بوڑھے دکاندار نے مجھے رسید دی۔ رسید لینے کے بعد میں نے باہر کھڑے اشرف کو اندر بلایا اشرف دکان کے اندر آکر کھڑا ہوا تو میں نے اس سے کہا ''اشرف یہ پیانو کسی لوڈنگ سوزوکی پر احتیاط کے ساتھ رکھوا کر حویلی لے جاؤ''۔

''اور آپ۔۔۔ آپ کیسے جائیں گے چھوٹے سرکار'' اشرف ادب کے ساتھ بولا۔

''کار کی چابی مجھے دے دو۔ میں خود ڈرائیو کرکے حویلی پہنچ جاؤں گا'' میں نے اشرف سے کہا تو اس نے کار کی چابی میری جانب بڑھائی جسے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے لے لیا۔

میں نے اپنے سامنے پیانو سوزوکی میں لوڈ کروایا اشرف پیانو کے ساتھ بیٹھ کر چلا گیا تو میں بھی بوڑھے دکاندار سے مصافحہ کرکے اپنی کار کی جانب بڑھا جیسے ہی میں کار کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت جوان لڑکی میری کار کے پاس کھڑی ہے میں نے اس لڑکی کی جانب مسکرا کر دیکھا تو وہ لڑکی میرے پاس آئی۔

''آپ باذوق لگتے ہیں آپ نے بہت عمدہ پیانو خریدا ہے'' اس لڑکی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شکریہ۔ پیانو بجانا میرا عشق ہے۔۔۔۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس پیانو کو صرف آپ ہی بجایئے گا''۔ وہ لڑکی پھر بولی۔

''جی۔ میں ہی بجاؤں گا وہ پیانو۔۔۔ مجھے بہت اچھی پریکٹس ہے پیانو بجانے کی'' میں نے اس لڑکی کی بات کا جواب دیا۔

''جی میں جانتی ہوں۔'' وہ لڑکی بولی۔

''آپ کو کیسے معلوم؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''مجھے آپ کے متعلق کافی معلومات ہیں۔۔۔'' وہ بولی۔

''کیسے''؟ نہ جانے کیوں مجھے اس لڑکی میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔

''چھوڑیئے اس بات کو۔۔۔۔اس پیانو کا خاص خیال رکھئے گا۔۔۔'' وہ لڑکی بات پلٹتے ہوئے بولی۔

''جی ہاں۔۔میں اس پیانو کا خاص خیال رکھوں گا'' میں نے جواب دیا۔

''اس پیانو کی لیفٹ سائیڈ کا دوسرا تار تھوڑا سا ڈھیلا ہوگیا ہے کسی اچھے کاریگر کو بلوا کر مرمت کروالیجئے گا۔ معمولی کام ہے'' وہ لڑکی پھر بولی۔

''لگتا ہے آپ پیانو کے متعلق بہت کچھ جانتی ہیں'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''جی وہ پیانو تو میری جان ہے'' وہ بولی۔

''پھر آپ نے کیوں نہیں خرید لیا وہ پیانو'' میں نے پوچھا۔

''میں آپ جیسی مالدار نہیں ہوں'' اس نے جواب دیا۔

''آپ پیانو بجانا جانتی ہیں''؟ میں نے پوچھا۔

''تھوڑا بہت'' اس لڑکی نے انکساری سے جواب دیا۔

''کیا آپ میرا پیانو ٹھیک کرسکتی ہیں'' میں نے لفظ میرا پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔۔مجھے پیانو ریپئر کرنا بھی آتا ہے'' اس نے جواب دیا۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپ ہی وہ پیانو ریپئر کردیجئے'' میں نے اس لڑکی سے کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔اس بہانے میں اس پیانو کو دیکھ بھی سکتی ہوں'' وہ لڑکی بولی تو میں کار کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھا اور پھر دوسرا دروازہ بھی کھول دیا تاکہ وہ لڑکی بھی کار میں بیٹھ سکے۔ میرے دروازہ کھولتے ہی وہ لڑکی نہایت بے تکلفی کے ساتھ میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''میرا نام محمد سمیر ملک ہے'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔

''میں جانتی ہوں۔آپ بڑے ملک صاحب کے اکلوتے بیٹے ہیں اور حال ہی میں تعلیم مکمل کرکے یورپ سے لوٹے ہیں'' وہ لڑکی مسکرا کر بولی۔

''آپ میرے متعلق کافی کچھ جانتی ہیں۔مگر مجھے اب تک آپ کا نام بھی معلوم نہیں'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی مجھے ایسا لگا جیسے میرے چاروں طرف جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔

''میرا نام ممتاز ہے اور میں کوئین میری کالج میں پڑھتی ہوں۔'' وہ لڑکی جس کا نام ممتاز تھا اپنی ہنسی روکتے ہوئے بولی۔

''آپ کی طرح ہی آپ کا نام بھی خوبصورت ہے'' میں نے مسکرا کر اس کی تعریف کی تو وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی اور اپنی حویلی کی جانب روانہ ہوا۔حویلی کے سامنے پہنچ کر میں نے ہارن دیا تو حویلی کے دروازے پر کھڑے چوکیدار نے گیٹ کھول دیا میں کار لیکر حویلی کے لان میں داخل ہوا لان کے روش پر ہلکے سے رینگتی ہوئی کار اور کار میں بیٹھی ہوئی ممتاز جس کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر بار بار آکر اسے تنگ کررہی تھی اور وہ اس لٹ کو اپنی انگلی سے اپنے کان کے پیچھے کرتی مگر پھر وہ شرارتی لٹ سامنے آکر اس کے گالوں کو چومنے لگتی میں اس دلفریب منظر کو دیکھتے ہوئے کار آہستہ سے ڈرائیو کررہا تھا حویلی کے اندرونی دروازے کے سامنے میں نے کار روکی اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا مجھ سے پہلے ہی ممتاز کار سے نیچے اتر چکی تھی پھر میں اور ممتاز حویلی میں داخل ہوئے۔

''بیٹھئے'' میں نے ممتاز کو صوفے پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

''نہیں میں۔۔۔ پیانو دیکھنا چاہوں گی'' ممتاز کے لہجے میں ایسا بانکپن تھا جیسے کوئی معصوم بچہ اپنی

پسندیدہ چیز کا مطالبہ کر رہا ہو۔

''پیانو میں نے ہال میں رکھوایا ہے۔ آیئے'' میں نے ممتاز کو دعوت دی تو وہ فوراً ہال کی جانب چل دی ہال میں پہنچ کر میں نے دیکھا اشرف نے پیانو اس جگہ پر بڑے سلیقے سے رکھوایا ہے جہاں پر پیانو خریدنے سے پہلے میں نے اسے ہدایات دی تھیں۔

ممتاز پیانو دیکھتے ہی چمکتی آنکھوں کے ساتھ بے چینی سے پیانو کی جانب بڑھی پھر اس نے پیانو کا ڈھکن اٹھا کر اس ایک لکڑی کے سہارے کھڑا کیا اور اس کے لیفٹ تار کو ہاتھ سے کھینچنے لگی۔

''کہیں آپ کو چوٹ نہ لگ جائے'' میں نے بوکھلا کر ممتاز سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

''میں ہی نہیں۔۔ یہ پیانو بھی مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔۔ یہ کبھی مجھے تکلیف نہیں پہنچا سکتا'' ممتاز نے کہا اور پھر پیانو کے بٹن کو دبا کر دیکھنے لگی۔

پیانو ٹھیک ہو چکا تھا پیانو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ممتاز کے چہرے پر خوشی کے انت گنت رنگ بکھر رہے تھے میں بغور ممتاز کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''جتنی محبت آپ کو پیانو سے ہے اس لحاظ سے تو آپ کو پیانو خرید ہی لینا چاہیے تھا'' میں نے ممتاز سے کہا۔

''میں نے کہا نا میں آپ جتنی مالدار نہیں ہوں۔۔۔'' ممتاز بولی۔

''چلئے کبھی موقع آیا تو میں یہ پیانو آپ کو گفٹ کر دوں گا'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''شاید ایسا موقع کبھی نہ آئے۔۔۔ بس آپ کی اتنی مہربانی ہوگی کہ کبھی کبھی مجھے اس پیانو کو بجانے کی اجازت دے دیجئے'' ممتاز بولی۔

''یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔۔ آپ کا گھر ہے جب آپ کا دل چاہے آپ یہاں آ کر پیانو بجا سکتی ہے'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''سچی''

''جی ہاں۔۔ کسی بھی وقت آپ پیانو بجانے آ سکتی ہے'' میں نے کہا تو ممتاز مسکرانے لگی اور پھر وہ پیانو کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اس کی مخروطی انگلیاں پیانو کے بٹنوں پر تھرکنے لگی اور پیانو سے مدھر موسیقی نکلنے لگی موسیقی اتنی دلفریب تھی کہ میں بے ساختہ واہ بول اٹھا۔

''ایک وعدہ کیجئے آپ'' پیانو بجانے کے بعد ممتاز بولی۔

''کیا'' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

''اس پیانو کو آپ کے علاوہ کوئی اور ہاتھ نہ لگائے'' ممتاز بولی۔

''کیوں''۔

''کیوں کہ اگر کوئی اور اس پیانو کو ہاتھ لگائے گا تو اس کے سر خراب ہو جائیں گے'' ممتاز بولی۔

''ٹھیک ہے میرے اور تمہارے سوا کوئی اس پیانو کو ہاتھ نہیں لگائے گا'' میں مسکرا کر بولا۔

''سچی''۔

''سچی''۔

''چھوٹے سرکار'' اسی وقت مجھے فضل بابا کی آواز آئی جو مجھے آواز دے رہے تھے میں جلدی سے ہال کے دروازے کے پاس پہنچا فضل بابا دروازے سے آواز دیتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''آیئے فضل بابا آیئے'' میں فضل بابا کو لیکر ہال میں داخل ہوا ''ان سے ملئے یہ ممتاز ہے'' میں نے پیانو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تو پیانو ہے'' فضل بابا حیران ہو کر بولے میں نے جلدی سے پیانو کی جانب دیکھا تو۔۔۔ تو وہاں اسٹول پر کچھ دیر پہلے بیٹھی ممتاز اب وہاں نہیں تھی۔

''یہ۔۔۔ یہ ممتاز کہاں گئی'' میں حیران رہ گیا۔

''کون ممتاز۔۔۔ سرکار''۔

''وہ لڑکی جو میرے ساتھ پیانو کی دکان سے یہاں آئی تھی'' میں حیران ہو کر کہنے لگا۔

''اگر کوئی لڑکی یہاں آئی تھی تو۔۔۔ تو پھر کہاں گئی'' فضل بابا بھی حیران ہو گئے۔

میں جلدی سے حویلی سے باہر نکلا اور گیٹ کی

جانب دوڑا۔

''یہاں سے کوئی لڑکی گئی ہے کیا؟'' میں نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے پوچھا۔

''نہیں مالک۔۔۔ یہاں سے تو کوئی بھی نہیں گیا۔۔ میں یہاں چوکس کھڑا ہوں'' چوکیدار بولا تو میں سر کھجانے لگا۔

''آخر ممتاز گئی کہاں'' میں نے حیرانی سے سوچا پھر حویلی کے اندر کی جانب چل دیا۔۔

''آخر وہ لڑکی گئی کہاں سے جو کسی کو نظر نہیں آئی'' میں ہال میں داخل ہونے کے بعد بڑبڑایا۔

''چھوٹے سرکار کچھ چرا کر تو نہیں لے گئی'' فضل بابا نے پوچھا۔

''نن۔۔۔نہیں'' میں نے جلدی سے جواب دیا کیونکہ میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکی میرا دل چرا کر لے گئی ہے۔

''چھوٹے سرکار۔۔۔۔۔مہمانوں کو دعوت نامے ارسال کر دیئے ہیں آپ ایک مرتبہ نام دیکھ لیجئے'' فضل بابا نے ایک لسٹ میرے ہاتھ میں تھمائی۔

''فضل بابا۔۔آپ بہتر سمجھتے ہیں۔۔'' میں نے بیزاری سے کہا اور لسٹ ان کو واپس تھما دی۔ دراصل میں اپنی آمد اور شہر کی معززین سے ملاقات کے غرض سے ایک چھوٹی سے پارٹی رکھی ہے تاکہ علاقے کے معززین سے تعارف حاصل کر سکوں اسی سلسلے میں فضل بابا مجھے لسٹ دکھا رہے تھے مگر ممتاز کے اس طرح اچانک چلے جانے کی وجہ سے میں کافی اپ سیٹ ہو گیا تھا لہذا میں نے لسٹ فضل بابا کو واپس کی اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

ایک ہفتے تک ممتاز مجھے نہیں ملی میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا مگر ناکام رہا میں اس کے بتائے ہوئے کالج بھی گیا مگر کالج میں چھٹیاں تھیں اور تمام طالبات اپنے گھر چلی گئیں تھیں لہذا مجھے وہاں سے بھی کوئی مدد نہ مل سکی اس کی وجہ سے میں کافی اپ سیٹ رہا۔ پھر میری حویلی میں پارٹی ہوئی جس میں علاقے کے کافی معززین شامل تھے فضل بابا ایک ایک شخص سے میرا تعارف کروا رہے تھے اور میں ہر شخص سے خندہ پیشانی سے مل رہا تھا پارٹی حویلی کے ہال ہی میں رکھی گئی تھی علاقے کے کافی لوگ اس پارٹی میں شامل تھے اور پارٹی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''سمیر یہ پیانو یہاں کیوں رکھا ہے کیا تمہیں میوزک کا شوق ہے'' ایک شخص میرے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا تو میں نے مڑ کر دیکھا وہ علاقے کے جنرل ہسپتال کے ڈاکٹر امتیاز علی تھے۔

''یس ڈاکٹر مجھے میوزک کا بہت شوق ہے خاص طور پر پیانو بجانے کا'' میں نے پیانو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''پھر تو آپ سے ہماری خوب دوستی ہو سکتی ہے کیونکہ پیانو کے عشق میں تو ہم بھی مبتلا ہے'' ڈاکٹر امتیاز نے کہا۔

''یہ ہوئی بات علاقے میں آپ دوسرے شخص ہے جنہیں پیانو کا شوق ہے'' میں نے کہا۔

''دوسرے۔۔۔ یہ پہلا کون ہے'' ڈاکٹر امتیاز نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ایک لڑکی۔۔''

''لڑکی۔۔کون ہے''

''معلوم نہیں۔۔۔مگر جب وہ پیانو بجاتی ہے تو وقت تھم سا جاتا ہے۔۔۔اس کے ہاتھ پیانو پر اس طرح حرکت کرتے ہے جیسے شبنم کی بوندیں نازک پھولوں کا منہ دھلا رہی ہو'' میں نے کہا تو ڈاکٹر امتیاز ہنس پڑے۔

''بھئی ایسی لڑکی سے تو ہم بھی ملنا چاہے کہ جس نے ایک یورپ پلٹ نوجوان کو شاعر بنا دیا'' ڈاکٹر امتیاز بولے تو میں بھی بے ساختہ ہنس پڑا۔

''چلئے ڈاکٹر صاحب کچھ بجائیے'' میں نے ڈاکٹر امتیاز کو پیانو کے اسٹول پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار ابھی نہیں''

''بجانا تو آپ کو پڑے گا'' میں نے اتنا کہہ کر زور دار تالی بجائی اور سب لوگوں کو مخاطب کیا ''خواتین و حضرات۔۔ہمارے ڈاکٹر امتیاز آپ کے لئے پیانو پر

ایک مدھر دھن پیش کر رہے ہیں'' میں نے اتنا کہہ کر تالیاں بجانی شروع کی تو سب لوگ میرے ساتھ شامل ہو گئے اور تالیاں بجانے لگے سب لوگوں کی تالیوں نے مجبور ہو کر ڈاکٹر امتیاز نے پیانو کا ڈھکن اٹھایا اور اس لکڑی کے سہارے کھڑا کر کے خود اسٹول پر بیٹھ گئے اور پھر انھوں نے پیانو پر ایک خوبصورت دھن چھیڑ دی۔ دھن واقعی بہت مدھر تھی سب لوگ جھومنے لگے اسی وقت اچانک ہوائیں تیز چلنے لگی اور کھڑکی کے پٹ زور زور سے ہلنے لگے یہ دیکھ کر ڈاکٹر امتیاز نے پیانو بجانا بند کر دیا۔

''فضل بابا کھڑکیاں بند کر دیں'' میں نے فضل بابا سے کہا تو وہ کھڑکیوں کی جانب بڑھ گئے۔

''موسم تو ٹھیک ٹھاک تھا پھر یہ اچانک تیز ہوائیں کیوں چلنے لگیں'' مجھے ایک آواز سنائی دی۔

''موسم کا کچھ پتا نہیں ہوتا ۔۔۔کب کیا ہو جائے'' ایک اور آواز ابھری فضل بابا نے تمام کھڑکیاں بند کر دی تو ڈاکٹر امتیاز نے پھر پیانو پر دھن چھیڑ دی۔ میں اس دھن میں کھونے لگا ڈاکٹر امتیاز کی انگلیاں نہایت تیزی کے ساتھ پیانو پر حرکت کر رہی تھی اور ہر حرکت کے ساتھ پیانو سے مدھر موسیقی نکل رہی تھی میں آنکھیں بند کئے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک دھڑام کی آواز کے ساتھ میوزک بند ہو گئی اور لوگوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں تو میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔۔آنکھیں کھول کر میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر امتیاز پیانو پر اوندھے منہ گرے ہوئے ہے اور کافی لوگ ان کے اردگرد کھڑے ہوئے ہیں سب لوگوں کے چہروں پر خوف کے آثار نمایاں تھے میں جلدی سے آگے بڑھا اور میں نے ڈاکٹر امتیاز کو پیانو سے اٹھا کر سیدھا کیا کئی مرد میرے مدد کے لئے آگے بڑھے میں نے ان لوگوں کی مدد سے ڈاکٹر امتیاز کو پیانو سے اٹھا کر فرش پر لیٹایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کی نبض ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر مجھے ڈاکٹر امتیاز کی نبض نہیں ملی میں نے ان کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی مگر مجھے ان کے دل کی دھڑکن بھی سنائی نہ دی مجھے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر امتیاز اس جہاں سے گزر چکے ہے پھر بھی میں نے فضل بابا کو ایمبولنس منگوانے کے لئے فون کرنے کا کہا تھوڑی ہی دیر میں ایمبولنس آ گئی جو ڈاکٹر امتیاز کو لیکر ہسپتال کی جانب چلی گئی اس حادثے کے بعد تقریب بدمزگی کا شکار ہو گئی اور لوگ افسردگی کے عالم میں مجھ سے رخصت لیکر تقریب سے چلے گئے سب لوگوں کے جانے کے بعد میں نے اشرف سے کہہ کر کار نکالی اور ہسپتال کی جانب چل دیا۔ ہسپتال پہنچ کر مجھے معلوم چلا کہ ڈاکٹر امتیاز کا ہارٹ فیل ہوا ہے۔ ہسپتال میں موجود ڈاکٹروں نے تفصیلی رپورٹ پوسٹمارٹم کے بعد جاری کرنے کا کہا ہسپتال میں پولیس بھی موجود تھی جس نے میرا بیان لیا میں نے بیان میں یہی لکھوایا کہ میری حویلی میں آج رات ایک تقریب تھی جہاں ڈاکٹر امتیاز بھی موجود تھے ڈاکٹر امتیاز میری حویلی میں پیانو دیکھ کر اسے بجانے لگے اور پیانو بجاتے ہوئے انہیں دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ انسپکٹر نے مجھ سے بیان پر دستخط لئے اور پھر صبح تفتیش کے لئے حویلی آنے کا کہہ کر ہسپتال سے رخصت ہو گیا ڈاکٹر امتیاز کے لواحقین بھی ہسپتال پہنچ چکے تھے لہذا میں نے ان سے تعزیت کی اور پھر ان سے رخصت لیکر حویلی آ گیا۔

ڈاکٹر امتیاز کی واقعے سے میں شدید پریشان تھا لہذا مجھے رات نیند بھی صحیح سے نہیں آئی صبح اٹھا تو فضل بابا نے مجھے بتایا کہ ایک پولیس انسپکٹر میرے انتظار میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے یہ سن کر میں جلدی سے بستر سے نکلا اور فریش ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہاں رات کو میرا بیان لینے والا پولیس انسپکٹر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

''گڈ مارننگ انسپکٹر'' میں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''مارننگ ملک صاحب'' پولیس انسپکٹر چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے تپاک کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا

''بیٹھیے انسپکٹر۔۔'' میں نے اخلاقاً انسپکٹر سے کہا ورنہ میرا دل اندر سے دھڑک رہا تھا کہ کہیں ڈاکٹر امتیاز

کی پوسٹمارٹم رپورٹ میں کوئی غلط بات تو نہیں آ گئی۔

''تھینک یو'' انسپکٹر نے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا میں انسپکٹر کے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ڈاکٹر امتیاز کی پوسٹمارٹم رپورٹ میں موت کی کیا وجہ سامنے آئی'' میں نے اپنے دل کی بے چینی پر قابو پاتے ہوئے پوچھا

''ڈاکٹر امتیاز کی موت ہارٹ اٹیک ہی سے ہوئی ہے انہیں دل کا شدید دورہ پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا'' انسپکٹر نے جواب دیا تو میرے منہ سے ایک اطمینان بھر سانس برامد ہوگئی۔

''انہیں اس طرح اچانک دل کا دورہ کیوں پڑا تھا'' کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔

''اس بات پر ڈاکٹرز بھی حیران ہے کیونکہ ڈاکٹر امتیاز کو دل کی کوئی بیماری نہیں تھی بلکہ چند ماہ قبل انھوں نے اپنا چیک اپ بھی کروایا تھا جس میں انہیں مکمل طور پر صحت مند قرار دیا گیا تھا'' انسپکٹر نے چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''پھر انہیں اچانک دل کا دورہ کیوں پڑا'' میں سوچتے ہوئے بڑبڑایا۔

''اس بارے میں ڈاکٹرز بھی حیران ہے میری ان سے بات ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ بس ڈاکٹر امتیاز کے دل نے اچانک ہی کام کرنا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ان کی جان چلی گئی'' پولیس انسپکٹر بولا تو میں حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''حیرت انگیز بات ہے'' میں پھر بڑبڑایا۔

''کافی زیادہ حیرت انگیز بات ہے'' انسپکٹر بولا۔

''آپ کی آمد کس سلسلے میں ہے'' کچھ دیر بعد میں نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''بس فارملیٹی ہے۔۔ مجھے اس جگہ کا معائنہ کرنا ہے جہاں ڈاکٹر امتیاز کی موت واقع ہوئی ہے'' پولیس انسپکٹر بولا تو میں اسے لیکر پیانو کے پاس آیا۔

''یہاں۔۔۔۔ یہاں بیٹھ کر ڈاکٹر امتیاز پیانو بجا رہے تھے جب ان کی موت واقع ہوئی'' میں نے پیانو کے سامنے رکھے اسٹول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر سے کہا تو انسپکٹر نے پہلے اسٹول کا جائزہ لیا اور پھر پیانو کا معائنہ کرنے لگے۔

''بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ہے'' انسپکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا پھر اس نے اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کیا اور پھر پیانو کا ڈھکن اٹھا پیانو کے بٹن پریس کرنے لگا پیانو سے موسیقی برامد ہونے لگی انسپکٹر پیانو بجا کر دیکھ رہا تھا۔ پھر انسپکٹر اسٹول پر بیٹھ گیا اور پیانو بجانے لگا۔ انسپکٹر کافی دیر پیانو بجاتا رہا۔

''کیا آپ کو بھی پیانو کا شوق ہے'' جب انسپکٹر نے پیانو بجانا بند کیا تو میں نے پوچھا۔

''یہ تو میرے بچپن کا شوق ہے۔۔ مگر والد صاحب کی ناگہانی موت کی وجہ سے میرا شوق ادھورا رہ گیا اور مجھے والد صاحب کی جگہ پولیس میں نوکری کرنی پڑی۔۔ ابھی پیانو دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا۔۔۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں'' انسپکٹر شرمساری سے بولا۔

''کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ کا جب دل چاہے یہاں آ کر شوق پورا کر سکتے ہیں'' میں نے انسپکٹر کو کھلے دل سے اجازت دی۔

''پولیس کی سروس میں وقت ہی تو نہیں ملتا'' انسپکٹر نے مسکرا کر جواب دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اچھا مجھے اجازت دیجئے'' انسپکٹر نے مجھ سے اجازت چاہی۔

''ناشتہ وغیرہ کر کے جاتے'' میں نے انسپکٹر کو ناشتے کی دعوت دی۔

''نہیں ابھی پولیس اسٹیشن جا کر رپورٹ کرنی ہے پھر گھر جاؤں گا رات بھر کا جاگا ہوا ہوں'' انسپکٹر نے مجھ سے کہا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر جانے لگا۔

''ڈاکٹر امتیاز کی باڈی کہاں ہے'' چلتے ہوئے میں نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''ڈاکٹر امتیاز کی باڈی ان کے بھائی لے گئے ہیں شاید ان کی تدفین بھی ہو رہی ہوگی'' پولیس انسپکٹر نے بتایا۔

''اوہ۔۔کس قبرستان میں ہے ڈاکٹر امتیاز کی تدفین'' میں نے پھر پوچھا۔

''یہاں تو ایک ہی قبرستان ہے کوئین میری کالج کے پیچھے سب کی تدفین وہیں ہوتی ہے'' انسپکٹر نے بتایا تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا پولیس انسپکٹر چلا گیا تو میں بھی اپنے کمرے کی جانب چلا۔

''چھوٹے سرکار ناشتہ لگواؤ'' فضل بابا نے انسپکٹر کے جانے کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔۔ابھی میں ڈاکٹر امتیاز کی تدفین میں جارہا ہوں وہاں سے واپس آکر ناشتہ کروں گا'' میں نے جواب دیا اور جلدی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔

جب میں قبرستان پہنچا تو ڈاکٹر امتیاز کی تدفین ہو چکی تھی اور فاتحہ ہو رہی تھی میں فاتحہ میں شریک ہوا اور پھر ڈاکٹر امتیاز کے بھائی سے تعزیت کرنے کے بعد حویلی کی جانب روانہ ہوا حویلی جاتے ہوئے میری نظر کوئین میری کالج پر پڑی تو مجھے بے ساختہ ممتاز یاد آگئی۔ ابھی تک کالج بند تھا کالج کھلنے میں ایک ہفتہ باقی تھا لہذا مجھے ہر حال میں ایک ہفتے تک انتظار کرنا تھا کہ جب کالج کھل جائے گا تو میں کالج آکر ممتاز کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

میں جیسے ہی حویلی پہنچا تو ایک اور بری خبر میری منتظر تھی فضل بابا نے مجھے بتایا کہ جو انسپکٹر صبح میرا بیان لیکر گیا تھا راستے میں جاتے ہوئے اس کی جیپ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور وہ انسپکٹر موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ میں پریشان ہونے کے ساتھ حیران بھی تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ پھر میری نظر پیانو پر پڑی۔

''جو شخص پیانو بجاتا ہے وہ موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے''؟ میرے ذہن میں سوال ابھرا۔

''لیکن میں نے بھی تو کئی بار پیانو بجایا ہے مجھے تو کچھ نہیں ہوا'' میرے ذہن نے مجھے فوراً جواب دیا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔

''فضل بابا آپ کو انسپکٹر کی موت کا کیسے پتا چلا؟'' میں نے فضل بابا سے سوال کیا۔

ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کی دستیابی

محمدی نیوز ایجنسی
لاری اڈہ میانوالی
0304-6248291

معصوم نیوز ایجنسی
اسٹیشن روڈ جھنگ صدر
PH:0300-9528023

مشتاق نیوز ایجنسی
مریم روڈ پرانا نواب شاہ
PH:0301-2306571

عوامی نیوز ایجنسی
کنگن پور ضلع قصور
0300-6119870

آصف میگزین سینٹر
منڈی بہاؤالدین

سلطان ندیم کتاب گھر
ریلوے روڈ دنیا پور ضلع لودھراں

خوشبو ڈائجسٹ سینٹر
نواب آباد واہ کینٹ

بک کارنر شوروم
بمقابل اسٹریٹ جہلم

''اشرف ابھی باہر سے آیا ہے اس نے بتایا''، فضل بابا نے جواب دیا تو میں نے گردن ہلا دی اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

☆.....☆.....☆

اس واقعے کے ایک ہفتے کے بعد وہ رات آئی جب میری ممتاز سے دوسری ملاقات ہوئی اس رات میں گہری نیند سو رہا تھا کہ میرے کانوں میں پیانو کی مدھر دھن داخل ہوئی تو میری نیند اچاٹ ہوگئی کچھ دیر میں غائب دماغی کی حالت میں لیٹا رہا پھر میں نے گھڑی میں وقت دیکھا رات کے تین بج رہے تھے میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''اتنی رات کو کون پیانو بجا رہا ہے'' میں نے سوچا اور جلدی سے اٹھ کر اپنا سلیپنگ گاؤن پہنا اور پیروں میں سلیپریں اٹکاتے ہوئے تیز قدموں سے ہال کی جانب چل دیا جہاں پیانو رکھا تھا پیانو مسلسل بج رہا تھا اور مدھر موسیقی فضا میں رس گھول رہی تھی میں ہال میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ہال میں بہت کم روشنی تھی اس کم روشنی میں، میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی پیانو کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی ہے اور پیانو بجا رہی ہے میں اس لڑکی کے قریب پہنچا تو چونک گیا کیونکہ وہ لڑکی کوئی اور نہیں ممتاز تھی۔

''ممتاز تم اس وقت یہاں'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی۔۔وہ میرا دل پیانو بجانے کا چاہا تو میں آ گئی'' ممتاز پیانو پر موسیقی بجانا بند کرتے ہوئے بولی۔

''مگر آدھی رات کو۔۔''

''دل چاہ رہا تھا اس لئے آ گئی آپ ہی نے کہا تو کہ جب آپ کا دل چاہے آجایئے گا پیانو بجانے۔۔۔اگر آپ کو اعتراض ہے تو میں معذرت خواہ ہو۔۔آئندہ نہیں آؤنگی'' اتنا کہہ کر ممتاز اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں۔۔نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''تو آپ کا کیا مطلب تھا'' ممتاز نے اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر کہا۔

''میرا مطلب ہے اتنی رات کو کوئی آپ کو میرے ساتھ اکیلے میں دیکھ لے گا تو نہ جانے کتنے افسانے بن جائے گے۔۔آپ خوامخواہ بدنام ہو جائے گی'' میں نے وضاحت دی۔

''میں نامی اور بدنامی کے جھنجھٹ سے دور ہو۔۔ہاں مجھے آپ کی عزت کا خیال کرنا چاہیے تھا۔۔مجھ سے غلطی ہوگئی'' ممتاز بولی۔

''نہیں۔۔نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔تم اپنا شوق پورا کرو۔۔میں چائے لیکر آتا ہوں تھوڑی سردی ہے گرما گرم چائے لطف دے گی'' میں نے ممتاز سے کہا۔

''مجھے چائے یا کسی چیز کی کوئی حاجت نہیں ہے'' ممتاز بولی۔

''اچھا چلو۔۔پیانو تو بجاؤ'' میں نے ممتاز سے کہا۔

''نہیں شکریہ۔۔اب میں چلونگی'' ممتاز بولی۔

''چلو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں'' میں نے میز پر سے کار کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا جو شام کو میرا ڈرائیور اشرف وہاں رکھ کر گیا تھا۔

''آپ کو خوامخواہ تکلیف ہوگی میں چلی جاؤ نگی'' ممتاز بولی۔

''کوئی تکلیف نہیں ہوگی چلو'' میں نے کہا تو ممتاز خاموشی کے ساتھ میرے ساتھ چلنے لگی میرا مقصد ممتاز کو گھر چھوڑنے کا یہ تھا کہ اس کا گھر دیکھ سکوں۔

ممتاز کوٹھین میری کالج کے گیٹ کے سامنے اتری۔''تم کالج کے اندر رہتی ہو'' میں نے حیرت سے پوچھا

''جی کالج کے پیچھے ہی رہتی ہوں' ممتاز نے جواب دیا اور تیز قدموں سے چلی گئی جب ممتاز نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے بھی کار گیئر ڈال کر آگے بڑھائی اور حویلی کی جانب چل دیا۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتے سے زیادہ گزر گیا ممتاز پھر نظر نہیں آئی

میں بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا لہذا میں کوئین میری کالج گیا اور چوکیدار وغیرہ سے معلومات کی کوشش کی مگر ناکام رہا میں کالج کے پیچھے کی جانب بھی گیا مگر وہاں کوئی مکان بنا ہوا نہیں تھا وہاں تو علاقے کا قبرستان تھا میں حیران ہونے کے ساتھ پریشان بھی تھا کہ آخر ممتاز کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی اس نے مجھ سے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ میں کالج کے پیچھے رہتی ہوں جبکہ کالج کے پیچھے کوئی مکان نہیں ہے۔ میں نے ممتاز کو ہر ممکن جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ممتاز نہیں ملی۔ فضل بابا بھی میری پریشانی دیکھ رہے تھے آخر ان سے نہ رہا گیا تو وہ مجھ سے پوچھ بیٹھے۔

''چھوٹے سرکار چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔۔ کچھ دنوں سے آپ کافی پریشان نظر آرہے ہیں'' فضل بابا ایک دن مجھ سے پوچھ بیٹھے۔

''بابا۔۔ دراصل میں ممتاز کے لئے پریشان ہوں'' میں نے جواب دیا۔

''ممتاز کون''۔

''بابا میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ پیانو خریدتے وقت ایک لڑکی ملی تو جو حویلی تک آئی تھی'' میں نے فضل بابا کو یاد دلایا۔

''ہاں۔۔ چھوٹے سرکار یاد ہے۔۔ وہ لڑکی پھر اچانک غائب ہوگئی تھی'' فضل بابا بولے۔

''ہاں وہی لڑکی۔۔۔ وہ لڑکی ایک ہفتہ پہلے بھی حویلی آئی تھی پیانو بجانے'' میں نے کہا۔

''اچھا۔۔ تو پھر''۔

''اب اس لڑکی کا پتا معلوم نہیں ہو رہا اس نے اپنی رہائش جو بتائی تھی وہاں تو قبرستان ہے'' میں نے فضل بابا کو بتایا۔

''تو آپ کیوں پریشان ہے''؟ فضل بابا میری پریشانی نہ سمجھ پا رہے تھے۔

''دراصل۔۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ممتاز کو پسند کرنے لگا ہوں'' میں نے جھجکتے ہوئے فضل بابا کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کیا تو بے ساختہ فضل بابا ہنس پڑے۔

''ارے تو پھر مشکل کیسی ہیں ابھی معلوم ہوجائے گا'' فضل بابا بولے۔

''کیسے۔۔ میں تو کئی دن سے پریشان ہو رہا ہوں'' میں نے پوچھا۔

''پولیس کے ذریعے۔۔ یہاں کی پولیس علاقے کے ہر شخص کا ریکارڈ رکھتی ہے'' فضل بابا بولے تو میں بے ساختہ اچھل پڑا اور فضل بابا کے گالوں پر پیار کرلیا فضل بابا شرما گئے۔

''ہرے فضل بابا۔۔۔ آپ نے تو مشکل آسان کردی'' میں نے فضل بابا سے کہا۔

''لیکن پولیس اپنا ریکارڈ مجھے کیوں بتائی گی؟'' کچھ دیر بعد مجھے خیال آیا۔

''یہاں کے ایس پی داور رضا آپ کے والد کے پرانے دوست ہے وہ آپ کی مدد کرسکتے ہے'' فضل بابا بولے۔

''تقریب میں تو ایس پی داور رضا کو آپ نے نہیں بلایا تھا'' میں نے سوچتے ہوئے کہا کیونکہ حویلی میں ہونے والی تقریب میں، میں کسی داور رضا کے نام کے آدمی سے نہیں ملا تھا۔

''ایس پی داور رضا کو دعوت نامہ بھیجا تھا مگر اس وقت وہ بیرونِ ملک گئے ہوئے تھے اس لئے تقریب میں نہ آسکے بعد میں ان کا معذرت کا فون آیا تھا میں نے آپ کو بتایا بھی تھا'' فضل بابا نے وضاحت کی تو میں نے مطمئن ہوکر گردن ہلادی۔

''بس آپ ایس پی داور رضا کے پاس چلے جایئے وہاں آپ کی مشکل کا حل نکل جائے گا'' فضل بابا بولے تو میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اٹھ گیا او اشرف آواز دینے لگا اشرف اندر آیا تو میں نے اسے گاڑی نکالنے کا کہا اور خود تیار ہونے کے لئے کمرے کی جانب چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں پولیس ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا ایس پی داور رضا سے اپنی مشکل بیان کر رہا تھا۔

''یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے یہاں کی آبادی بھی زیادہ نہیں ہے اور اس میں ممتاز نام کی جوان لڑکیاں تو بہت کم ہوگی۔'' میری پرابلم سن کر ایس پی داور رضا بولے۔

''شکریہ سر۔۔۔ میں آپ کا بہت احسان مند ہوگا'' میں نے کہا

''لیکن تمہیں ایک وعدہ کرنا پڑے گا'' ایس داور رضا میری بات سن کر بولے۔

''جی فرمائیے سر''۔

''تمہیں مجھے یہ سر کہنا چھوڑنا پڑے گا'' ایس پی بولے۔

''جی کیوں'' میں حیرت زدہ رہ گیا۔

''تمہیں مجھے انکل کہنا پڑے گا کیونکہ میں اور تمہارے والد تو قیر ملک بچپن کے دوست تھے'' ایس پی داور رضا بولے تو میرے سینے میں اٹکی سانس بحال ہوگئی۔

''اوہ یہ بات ہے تو میں آج بلکہ ابھی سے آپ کو انکل کہتا ہوں انکل داور'' میں کہا تو ایس پی داور رضا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے قریب آئے میں بھی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ایس پی داور نے مجھے گلے سے لگا لیا ان کی آنکھیں بھیگ گئی۔

''میں اور تمہارے والد بہت گہرے دوست تھے'' ایس پی داور اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولے۔

''جی''۔

''تمہارے والد بہت اچھے انسان تھے اللہ انہیں غریق رحمت کرے'' ایس پی داور بولے۔

''آمین''۔

ایس پی داور میرے مرحوم والد کی باتیں کرتے رہے اتنے میں چائے آگئی چائے پیتے ہوئے بھی وہ میرے مرحوم والد کی تعریفیں کر رہے تھے۔

''ارے باتوں باتوں میں، میں تمہارا کام تو بھول گیا'' ایس پی داور بولے پھر انھوں نے انٹر کام کا بٹن دبایا۔

''احمد کو بھیجو'' انٹر کام کا بٹن دبانے کے بعد ایس پی داور نے کہا تو کچھ دیر بعد ایک ینگ سا لڑکا کمرے میں اجازت لیکر داخل ہوا۔

''احمد یہ میرے بہت اچھے دوست کے صاحبزادے ہے ان کا مسئلہ سن لو'' ایس پی داور نے احمد سے کہا۔

''جی سر'' احمد میری جانب متوجہ ہوا تو میں نے احمد کو ممتاز کے متعلق بتایا۔

''کوئی خاص مسئلہ نہیں سر۔۔۔ میں ابھی ساری ممتاز نام کی لڑکیوں کا بائیو ڈاٹا لیکر آتا ہوں'' احمد بولا اور کمرے سے چلا گیا دس منٹ بعد احمد دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اس بار اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

''سر کوئی تیس کے قریب ایسی عورتیں ہیں جن کے نام ممتاز ہے یا ممتاز ان کے نام کا ایک جز ہے ان تیس عورتوں میں صرف پانچ لڑکیاں ایسی ہے جن کی عمریں سولہ سے چھبیس سال کے درمیان ہے اور اتفاق سے کوئی بھی ممتاز نام کی لڑکی کوئین میری کالج میں نہیں پڑھتی ہے'' احمد نے تفصیل بتائی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور کہا ''یہ ہے ان پانچ لڑکیوں کی تصویریں اور ان کا بائیو ڈاٹا آپ دیکھ کر بتائے آپ کو کس ممتاز کی تلاش ہے'' احمد نے یہ کہہ کر کاغذ میرے سامنے رکھا تو میں نے بے چینی سے کاغذ پر نظریں دوڑائی اور ایک ایک تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔

''ان میں سے تو کوئی نہیں ہے'' میں تمام تصویریں غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

''غور سے دیکھ لیجئے۔۔۔ اس شہر میں تو یہی ممتاز نام کی لڑکیاں ہے'' احمد بولا۔

''نہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں ہے'' میں بولا۔

''سمیر تمہارے پاس اس کی کوئی تصویر وغیرہ ہو تو۔۔۔ کام بہت آسانی سے ہو جائے گا'' ایس پی داور میری اور احمد کی بات چیت سن کر بولے۔

''نہیں میرے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں ہے'' میں بے چارگی سے بولا۔

''تم نے بتایا کہ وہ تمہارے گھر آئی اور ایک مرتبہ تم اسے چھوڑنے بھی گئے'' ایس پی داور رضا سوچتے

ہوئے بولی۔

''جی ہاں''۔

''تم پھر تمہاری حویلی میں جو CC ٹی وی کیمرہ لگا ہے اس میں تو اس لڑکی کی تصویر ضرور آئی ہوگی'' ایس داور رضا میری بات سن کر بولے۔

''یس۔۔یس انکل آپ نے تو مشکل ہی آسان کردی'' میں نے جوش میں کہا۔

''بس تو CC ٹی وی کی وڈیو لے آؤ۔۔لڑکی ہم ڈھونڈ نکالے گئے'' ایس داور میرا جوش دیکھ کر مسکرا اٹھے تو میں شرمندہ ہوگیا۔

''تھینک یو انکل۔۔میں ابھی CC ٹی وی کی وڈیو لیکر آتا ہوں'' میں بولا اور ایس پی داور رضا سے ہاتھ ملا کر باہر نکلا اور جلدی حویلی پہنچ گیا۔حویلی پہنچتے ہی میں نے فضل بابا کو CC ٹی وی کی وڈیو لانے کا کہا حویلی میں ہر جگہ CC ٹی وی کیمرہ لگا ہوا تھا بیرونی گیٹ ہی نہیں بلکہ ڈرائینگ روم اور ہال تک میں کیمرے لگے ہوئے تھے فضل بابا نے ہال کے کیمرے سے فلم نکالی اور مجھے دی میں نے وڈیو کیمپوٹر سے منسلک کیا اور وڈیو چلنے لگی۔

''چھبیس تاریخ کو ممتاز نے یہاں آکر پیانو بجایا تھا'' میں سوچتے ہوئے بڑبڑایا اور وڈیو ریورس میں چلانے لگا چھبیس تاریخ کی وڈیو آئی تو میں نے کیمپوٹر کا بٹن دبایا اور وڈیو نارمل حالت میں چلنے لگی میری آنکھیں بے چینی سے کیمپوٹر اسکرین پر جمی ہوئی تھی۔ منظر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا پھر میں نے کمپیوٹر اسکرین پر ایک حیرت انگیز منظر دیکھا پیانو کے بٹن آپ ہی آپ دبنے لگے اور پیانو سے مدھر دھن نکل کر فضا میں بکھیرنے لگی کچھ ہی دیر بعد میں منظر میں داخل ہوا اور پھر میں کسی انجان مخلوق سے بات کرنے لگا میری آواز ہیڈ فون کے ذریعے میرے کانوں میں آرہی تھی مگر میں کس سے مخاطب تھا وہ شخصیت نظر نہیں آرہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے میں ہوا سے باتیں کررہا ہوں۔

''یہ۔۔یہ سب کیا ہے ممتاز وڈیو میں کیوں نظر نہیں آرہی'' میں نے بوکھلا کر کہا فضل بابا جو خود بھی کیمپوٹر اسکرین پر نظر جمائے کھڑے تھے حیران نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

''کچھ۔۔نہ کچھ گڑ بڑ ہے۔مجھے کوئین میری کالج سے معلومات لینی ہوگی'' اتنا کہہ کر میں نے جلدی سے کار کے چابیاں اٹھائی اور باہر کی جانب دوڑا۔

میں آندھی طوفان کی طرح کار چلاتا ہوا کوئین میری کالج پہنچا راستے میں کئی جگہ میرا ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا مگر میرے سر پر دھن سوار تھی میں جلد از جلد کوئین میری کالج پہنچنا چاہتا تھا میری تیزی کے ساتھ کوئین میری کالج پہنچا کوئین میری کالج پہنچتے ہی پہلے میں نے انکل ایس پی داور کو فون کر کے صورتحال بتائی پھر ان سے مدد طلب کی۔۔۔پہلے تو وہ بھی حیران رہ گئے کہ کس طرح ممتاز کی وڈیو CC ٹی وی کیمرے میں نہیں آئی پھر انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ کوئین میری کالج کی پرنسپل کو فون کردیں گے تاکہ وہ مجھ سے تعاون کرے جب میں کوئین میری کالج پہنچا اور میں نے کالج پرنسپل سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مجھے فوراً پرنسپل صاحبہ نے اپنے کمرے میں بلوالیا میں نے کمرے میں داخل ہوکر پرنسپل کو سلام کیا۔

''ایس پی داور رضا صاحب کا فون ابھی ابھی آیا تھا کہئے آپ کو کس کی تلاش ہے'' پرنسپل صاحبہ نے میرے سلام کے جواب میں پہلے تو مجھے کرسی پر بیٹھنے کا کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوکر کہنے لگی۔

''اصل میں مجھے ایک لڑکی کی تلاش ہے'' میں نے پرنسپل صاحبہ سے کہا۔

''کیا نام ہے لڑکی کا اور وہ کس اسٹینڈرڈ میں پڑھتی ہے'' پرنسپل صاحبہ میری بات سن کر بولی۔

''جی مجھے کلاس تو معلوم نہیں۔۔نام اس کا ممتاز ہے'' میں نے جواباً کہا۔

''ممتاز کے آگے یا پیچھے تو کچھ نہیں ہے اور ممتاز کے باپ کا نام کیا ہے'' پرنسپل نے پھر پوچھا۔

''یہ تو مجھے معلوم نہیں'' میں نے شرمندگی سے جواب دیا۔

''اچھا میں معلوم کرتی ہوں'' پرنسپل نے کہا اور پھر گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلایا۔

''دو چائے لیکر آؤ اور زریں کو کہو کہ میں نے بلایا ہے'' پرنسپل نے چپراسی سے کہا تو وہ خاموشی سے واپسی کے لئے مڑ گیا تھوڑی دیر بعد ایک دبلی پتلی لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

''جی میم آپ نے مجھے بلایا'' وہ لڑکی پرنسپل کی میز کے قریب آ کر بولی۔

''زریں۔۔۔یہ میمبر ملک ہے ان کو ایک لڑکی کی تلاش ہے جو یہاں پڑھتی ہے۔'' پرنسپل نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو زریں میری جانب متوجہ ہوئی۔

''جی لڑکی کا نام کیا ہے اور وہ کس کلاس میں پڑھتی ہے'' زریں بولی۔

''ممتاز نام ہے کلاس کا مجھے نہیں معلوم'' میں نے زریں کو مخاطب کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ممتاز۔۔'' زریں سوچتے ہوئے بولی ''ممتاز نام کی تو کوئی لڑکی کالج میں نہیں پڑھتی'' کچھ دیر سوچنے کے بعد زریں بولی۔

''آپ یقین سے کہہ سکتی ہے'' میں نے پوچھا۔

''پورے یقین کے ساتھ کیونکہ کالج میں صرف دوسو طالبات ہے اور مجھے تقریباً طالبات کے نام زبانی یاد ہے'' زریں بولی۔

''زریں کو ہم لوگ کمپیوٹر کہتے ہے اسی تمام طالبات کے نام اور ان کے ایڈریسز زبانی رٹے ہوئے ہے'' پرنسپل کہنے لگی۔

''پھر بھی شاید۔۔آپ سے کوئی بھول ہو رہی ہو اور۔۔۔ممتاز نام کی طالبہ یہاں ہو۔۔کیونکہ مجھے ممتاز نے خود بتایا تھا کہ وہ اس کالج میں پڑھتی ہے'' میں نے امید بھری نظروں سے زریں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک آپ میرے ساتھ آیئے کمپیوٹر میں کالج کی تمام طالبات کی معلومات فیڈ ہے دیکھ لیتے ہیں'' زریں یہ کہہ کر دروازے کی جانب مڑی تو میں بھی کرسی سے کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ جانے کے لئے مڑا تو میری نظر پرنسپل کے دائیں جانب دیوار پر پڑی جہاں ایک بڑی سے تصویر لگی تھی جہاں کئی طالبات ایک پیانو کے گرد کھڑی تھی اور ایک طالبہ پیانو بجا رہی تھی۔ میں اس تصویر کے قریب گیا تو خوشی سے اچھل پڑا کیونکہ پیانو بجانے والی طالبہ ممتاز ہی تھی۔

''یہ رہی۔۔۔یہ رہی ممتاز'' میں خوشی سے چیخ اٹھا۔

''کیا کہہ رہے ہے آپ'' پرنسپل بھی اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور زریں بھی حیران نظروں سے میری جانب دیکھنے لگی۔

''یہی ہے ممتاز جو مجھے کئی مرتبہ مل چکی ہے اور میری گھر پیانو بجانے بھی آ چکی ہے'' میں پر جوش لہجے میں بولا۔

''کب آئی ممتاز آپ کے گھر پیانو بجانے'' پرنسپل نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

''یہی کوئی ایک ہفتہ پہلے'' میں نے جواب دیا۔

''یہ تصویر بیس سال پہلے کی ہے'' پرنسپل صاحبہ نے جواب دیا۔

''کیا''۔

''جی ہاں۔۔۔'' یہ تصویر بیس سال پہلے کی ہے جب ہماری طالبات نے آل پاکستان میوزک ایوارڈ جیتا تھا'' پرنسپل صاحبہ پھر بولی تو میں حیران رہ گیا۔

''مگر یہ لڑکی چند دن پہلے ہی مجھے ملی تھی پھر میرے گھر بھی آئی تھی پیانو بجانے۔۔یہ تو کہہ رہی تھی کہ کالج کے پیچھے ہی رہتی ہے'' میں غور سے تصویر دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں کالج کے پیچھے قبرستان ہی میں اسے دفنایا گیا تھا'' پرنسپل صاحبہ بولی تو میں حیرت سے تصویر کو دیکھنے لگا جس میں ممتاز پیانو پر بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر خوشیاں رقص کر رہی تھی میں نے ممتاز پر سے نظر ہٹا کر پیانو کو غور دیکھا تو میں مزید حیران ہوا کیونکہ تصویر میں وہی پیانو تھا جو میں نے داتا الیکٹک شاپ سے خریدا تھا۔

''یہی پیانو میں نے داتا الیکٹک شاپ سے

خریدا تھا'' میں نے تصویر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پرنسپل سے کہا۔

''آپ۔۔آپ نے یہ پیانو خریدا؟'' پرنسپل صاحبہ حیرت سے بولی۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے'' میں نے حیران ہوکر پرنسپل صاحب سے پوچھا۔

''یہ ممتاز کا خاص پیانو تھا ممتاز اس پیانو کو کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی حتیٰ کہ ممتاز کی موت کے بعد بھی جب بھی کسی نے اس پیانو کو بجانے کی کوشش کرتا وہ بے موت مارا جاتا تھا اس لئے اس پیانو کو موت کی موسیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسے ایک تاریک جگہ پر رکھوا دیا گیا تھا'' پرنسپل صاحبہ بولی تو میں حیران رہ گیا ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر امتیاز اور پولیس انسپکٹر کی لاشیں آگئیں جنہوں نے پیانو بجایا تھا اور وہ بے موت مارے گئے۔

''آپ صحیح کہہ رہی ہے ڈاکٹر امتیاز اور پولیس انسپکٹر نے یہ پیانو بجایا تھا تو وہ لوگ بے موت مارے گئے'' میں یاد کرتے ہوئے بولا۔

''میں سب جانتی ہو۔۔۔اس پیانو کی وجہ سے کئی جانیں گئی ہیں اسی لئے اس پیانو کو ایک تاریک اسٹور میں رکھ دیا گیا تھا شاید داتا اینٹیک شاپ کے مالک نے لالچ میں اس پیانو کو اسٹور سے نکال کر آپ کے ہاتھوں بیچ دیا'' پرنسپل صاحبہ بولی۔

''شاید یہی بات ہو۔۔مگر ممتاز کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ۔۔وہ ابھی مجھ سے کیوں ملی۔۔۔اب میں سمجھ رہا ہوں کہ وہ ایک پرچھائیں تھی اسی لئے CC ٹی وی کیمرے میں بھی اس کی تصویر نہیں آئی'' میں سب یاد کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''جب ممتاز کی موت واقع ہوئی تھی تو میں اس کالج میں نئی نئی لیکچرار بن کر آئی تھی ممتاز ایک شوخ وچنچل لڑکی تھی مگر پوری ذمہ دار بھی تھی پڑھائی میں بہت اچھی تھی پیانو بجانے کا تو اسے عشق تھا اور اسے یہ عشق اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا جو اس کی پیدائش کے وقت انتقال کر گئی تھی۔یہ پیانو اس کی ماں کی نشانی تھی ممتاز کا باپ اسی کالج میں چوکیدار تھا مگر وہ نشے کا عادی تھا اور سارا سارا وقت نشے میں رہتا تھا اپنی تنخواہ نشے میں اڑانے کے بعد ایک دن اس نے اس پیانو کو بھی کباڑیئے کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہا تاکہ اپنا نشہ پورا کر سکے مگر ممتاز اس کے آڑے آگئی اور اس نے پیانو نہ بیچنے دیا کیونکہ یہ پیانو ایک تو اس کی ماں کی نشانی تھی دوسرے ممتاز کو بھی اس پیانو سے عشق کی حد تک پیار تھا مگر ممتاز کا باپ اپنا نشہ پورا کرنے کے لئے یہ پیانو بیچنا چاہتا تھا بس اسی کشمکش میں ممتاز کے باپ نے ممتاز کو تھپڑ مارا اور ممتاز غش کھا کر گری اور اس کا ماتھا پیانو سے ٹکرایا چوٹ اتنی شدید تھی کہ ممتاز نے موقع پر ہی تم توڑ دیا'' پرنسپل صاحبہ ممتاز کی کہانی سناتے ہوئے بولی۔

''اوہ تو پھر۔۔۔''۔

''ممتاز کے باپ کو اس جرم میں پھانسی ہوگی ممتاز کو کالج کے پیچھے قبرستان میں دفنا دیا گیا اور ممتاز کے گھر کا سارا سامان بک گیا اسی میں یہ پیانو بھی تھا سب سے پہلے یہ پیانو یہیں کی ایک ٹیچر نے خریدا مگر چند دن بعد ہی وہ ٹیچر پیانو بجاتے ہوئے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا پھر اسی طرح دو تین موتیں اور واقع ہوئی تو اس پیانو کو منحوس قرار دے دیا گیا اور اس پیانو کے متعلق عجیب وہ غریب داستانیں مشہور ہوگئیں۔سب لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ممتاز چونکہ اس پیانو سے ٹکرا کر مری تھی لہٰذا اس کی روح کسی کو اس پیانو کو بجانے نہیں دے رہی اور جو بھی اس پیانو کو بجانے کی کوشش کرتا وہ اسے مار دیتی'' پرنسپل تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے بولی ان کی آنکھیں جھلملانے لگیں انھوں نے اپنا چشمہ اتارا اور اپنی آنکھیں پونچھیں۔

''اگر پیانو بجانے والے ہر شخص کو ممتاز مار دیتی تھی تو۔۔۔تو اس نے مجھے کیوں زندہ چھوڑ دیا'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''شاید وہ تم سے پیار کرنے لگی تھی'' پرنسپل بول اٹھی میں نے تصویر میں بیٹھی ممتاز کو غور سے دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ پرنسپل کی بات سن کر مسکرا دی ہو۔

''ممتاز'' میری منہ سے ایک آہ نکلی اور میں تیز قدموں سے پرنسپل کے آفس سے باہر نکلا اور تیز تیز چلتا ہوا کالج سے باہر آیا اب میرے قدم کالج کے پیچھے کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں ممتاز کی قبر تھی میں دوڑتا ہوا قبرستان میں داخل ہوا سامنے ہی ایک قبر تھی جس پر ایک کتبہ لگا ہوا تھا اور کتبے پر بڑے بڑے حرفوں میں ممتاز کا نام لکھا تھا میں بے ساختہ قبر کے سرہانے گر پڑا میری آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

''ممتاز۔۔ممتاز۔۔۔۔میں تم سے محبت کرتا ہوں۔۔بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔۔۔پلیز۔۔پلیز ایکبار۔۔۔صرف ایک بار میرے سامنے آجاؤ۔۔ممتاز'' میں بے اختیار ممتاز کی قبر پر پڑا ہوا رو رہا تھا اور ممتاز کو پکار رہا تھا۔

''سمیر'' ممتاز کی آواز میرے کانوں میں آئی تو میں نے بے اختیار نظر اٹھا کر دیکھا ۔۔۔مگر یہ کیا۔۔مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

''کیا۔۔۔کیا میں اندھا ہو گیا ہو'' میرے ذہن کی سلیٹ پر سوال ابھرا۔

''جب آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوں تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا'' فوراً ہی ذہن کی سلیٹ پر سوال کا جواب بھی آیا میں نے اپنی آنکھیں صاف کیں تو سامنے سفید لباس میں ممتاز کھڑی تھی، میں بے اختیار ممتاز کی جانب لپکا اور اسے پکڑنے کی کوشش کی۔۔مگر یہ کیا میرا ہاتھ اس کے جسم سے اس طرح پار ہو گیا جیسے وہاں کوئی نہ کھڑا ہو۔

''تم مجھے نہیں چھو سکتے سمیر میں کوئی ٹھوس جسم نہیں رکھتی میں تو ایک سایہ ہوں۔۔۔ایک پرچھائیں ہوں'' ممتاز کے لب ہلے۔

''ممتاز۔۔۔ممتاز مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔۔۔'' میں ممتاز کے سامنے گڑگڑایا۔

''ابھی ہمارے ملن کا وقت نہیں آیا سمیر۔۔'' ممتاز بولی۔''کب۔۔کب آئے گا وقت''۔

''جب تم اس جسم سے آزاد ہو جاؤ گے''۔

''مم۔۔میں ابھی۔۔ابھی اس جسم کے بوجھ سے آزادی حاصل کرتا ہوں'' میں نے دیوانوں کی طرح چیخا۔

''نہیں سمیر۔۔وعدہ کرو۔۔مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی اپنی جان لینے کی کوشش نہیں کرو گے۔۔۔۔مجھ سے وعدہ کرو'' ممتاز بولی، ساتھ ہی وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگی۔

''ممتاز۔۔ممتاز'' میں چیخا میری کیفیت دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔

''مجھ سے وعدہ کرو سمیر تم کبھی اپنی جان لینے کی کوشش نہیں کرو گے''۔

''مم۔۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کبھی اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔۔مگر۔۔تم بھی وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملنے آؤ گی'' میں اپنے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔

''تم جب بھی دل سے پیانو بجاؤ گے تو مجھے اپنے پاس ہی پاؤ گے'' ممتاز نے اوپر جاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں روتے ہوئے اس کی قبر پر گر پڑا۔

☆.....☆.....☆

آج اس بات کو چالیس سال گزر گئے، میں بوڑھا ہو گیا ہوں ہر رات اس امید پر سوتا ہوں کہ اس زندگی کے بوجھ سے نجات مل جائے گی مگر۔۔۔۔۔نہ جانے میری یہ سزا کب ختم ہو گی۔۔۔ہاں ممتاز نے اپنا وعدہ نبھایا میں جب بھی دل سے پیانو پر کوئی دھن چھیڑتا ہوں تو ممتاز کو اپنے پاس محسوس کرتا ہوں اس کی خوشبو مجھے اپنے پاس محسوس ہوتی ہے۔۔۔اور۔۔۔بس اب تو زندگی کا خاتمہ ہوا ہی جاتا ہے میں نے یہ زندگی ایک سزا کی طرح کاٹی ہے۔۔۔بس اب تو ملن کی رات آنے ہی والی ہے۔ممتاز مجھے لینے کے لئے پھولوں کی رتھ پر سوار آئے گی میری آنکھیں راستے پر لگی ہوئی ہیں میرا انتظار ختم ہی ہونے والا ہے میں پھولوں کی رتھ پر سوار ہو کر ممتاز کے ساتھ ملن کے گیت گاؤں گا۔۔۔آہ ممتاز۔

بھٹے کا آسیب

خلیل جبار

اکثر انسان اپنے آپ کو عقل کل سمجھنے لگتا ہے مگر وہ نہیں سمجھتا کہ ایک ایسی طاقت بھی ہے جو کہ سب پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ سبق آموز کہانی۔

حیرتناک خوفناک دہشت ناک کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے.....حقیقی.....کہانی

اینٹوں کے بھٹے پر مزدور جن میں بچے، عورتیں اور مرد شامل تھے کام کرنے میں مصروف تھے۔ منشی سلیم مزدوروں پر نظر رکھے ہوئے تھا جو بھی کام میں سستی برتتا تھا وہ اسے ٹوک دیتا تھا۔ ان دنوں اینٹوں کے بڑے آرڈر تھے اور بھٹے کے مالک ابراہیم کو وہ آرڈر ہر صورت میں پورے کرنا تھے۔

سلیم بھٹے پر منشی کے فرائض انجام دیتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ دوسرے منشی کی طرح سخت نہیں تھا۔ نرم دل انسان تھا۔ وہ مزدوروں کا بہت خیال رکھتا تھا۔ کوئی مزدور بیمار ہو جاتا تھا تو اس سے وہ کام کم لیتا تھا۔ اس کے برعکس دوسرے منشی مزدوروں سے بیماری کی حالت میں بھی سخت کام لیتے تھے۔ یہی وجہ تھی بھٹے پر کام کرنے والے مزدور منشی سلیم سے بہت خوش تھے۔

بھٹے پر ایک نیا مزدور قیصر کام کرنے آیا تھا۔

اسے بھٹے پر کام کرتے ہوئے ابھی دو ہفتے ہی ہوئے تھے لیکن بھٹے پر کام کرنے والے مزدور اس سے تنگ آ گئے تھے۔ منشی سلیم نے اسے اپنے پاس بلایا اور سمجھاتے ہوئے کہا۔

''قیصر تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

''میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''جب تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پھر تم سارے مزدوروں کو تنگ کیوں کر رہے ہو ہر مزدور تمہارے رویے کی شکایت کر رہا ہے، تم لوگوں کو تنگ نہیں کرو۔''

''میں کسی کو تنگ نہیں کرتا، لوگ خواہ مخواہ میری شکایت کرتے ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو، میں اس بھٹے پر ایک عرصے سے کام کر رہا ہوں، میں سب مزدوروں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''میری بات کا یقین کریں میں کسی کو بلاوجہ تنگ نہیں کرتا۔''

''دیکھو میری بات یاد رکھو یہاں کام کرنا ہے تو آئندہ مجھے اس طرح کی کوئی شکایت نہیں ملنی چاہیے۔''

''مزدوروں کو بھی یہ بات سمجھا دیں کہ وہ مجھ سے نہ الجھیں۔''

''بے فکر رہو تم سے کوئی نہیں الجھے گا۔'' منشی سلیم نے سخت لہجے میں کہا۔

قیصر منشی کو سخت لہجے میں دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ خاموشی میں ہی عافیت ہے ورنہ اس کی کام سے چھٹی ہو جائے گی۔''

قیصر ایک شریر قسم کا آدمی تھا۔ وہ ہر کسی سے بلا وجہ لڑائی، جھگڑا کرتا رہتا تھا۔ کبھی کسی کو شرارت کے ذریعے تنگ کرتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے کام سے جواب مل جاتا تھا۔ لیکن وہ شرارت کرنے اور لوگوں کو بلا وجہ تنگ کرنے سے باز نہ آتا تھا۔ اس لئے خاصے عرصے سے بے روزگار تھا۔ اتنا عرصہ بے روزگار رہ کر بھی وہ خود کو سدھارنے کو تیار نہ تھا۔

منشی سلیم کے سمجھانے پر کچھ دن قیصر صحیح رہا۔ اس کا رویہ بھی عام مزدوروں سے اچھا ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ منشی سلیم کی نظروں میں آ گیا ہے۔ اس پر اس کا شرارت کرنا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس کے بے روزگار ہو جانے پر پھر سے بے روزگاری کے دن شروع ہو جائیں گے۔

وہ خود کو دو ہفتے ہی قابو رکھ سکا اس نے مزدوروں سے تھوڑی بہت چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ دراصل اسے لوگوں کو تنگ کر کے خوشی و راحت ملتی تھی اس لئے اس طرح کی حرکتیں کرتا تھا۔

منگل کا دن تھا۔ منشی سلیم کو گھر میں کام تھا۔ وہ مزدوروں کو کام کی ہدایت دے کر گھر چلا گیا۔ وہ مزدوروں کو کہہ کر گیا تھا کہ شام گئے تک وہ لوٹے گا۔ جس جس کو جو ذمہ داری دی گئی ہے وہ اپنی ذمہ داری اچھے طریقے سے نبھائے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ منشی سلیم اپنے کام نمٹا کر آ گیا۔ ایک جگہ اسے کاشف کے بیٹے ثمن کی چیخ و پکار سنائی دی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کوئی بری طرح سے پیٹ رہا ہے۔ وہ تیزی سے آواز کی سمت بڑھا۔ قیصر بری طرح سے ثمن کی پٹائی کر رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس نے میرے پاؤں پر اینٹ گرا دی ہے۔''

''بچہ ہے اس سے وزن نہیں اٹھ رہا ہوگا اکثر بڑے مزدوروں سے اینٹیں گر جاتی ہیں پھر یہ بچہ ہے۔'' منشی سلیم نے کہا۔

''میں اسے زندہ نہیں چھوروں گا۔ اس کی مجال کیسے ہوئی۔ میرے پاؤں پر اینٹ گرانے کی۔'' قیصر نے ثمن کی پٹائی کرنا نہیں چھوڑی تھی۔

''یہ میرا حکم ہے اسے چھیڑ دو۔''

''نہیں چھوڑوں گا۔''

''تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔'' منشی سلیم نے زوردار آواز میں کہا۔

قیصر کی سمجھ میں منشی سلیم کی بات نہیں آ رہی تھی۔

اس لیے وہ آگے بڑھا اور قیصر سے پٹائی کرنے کا ڈنڈا چھین لیا۔ قیصر اسے کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گھونسے اور مکے ثمن کو مارنے شروع کر دیئے۔

''قیصر باز آجاؤ۔ تم پہلے بھی اس لڑکے کی پٹائی کر چکے ہو، تم اسے مارنے کے بہانے ڈھونڈتے ہو۔'' منشی سلیم نے کہا۔

قیصر کے باز نہ آنے پر منشی سلیم نے اس پر حملہ کر دیا۔ اسے منشی سلیم کے اس طرح حملہ کرنے کی بالکل توقع نہ تھی۔ منشی سلیم صحت و طاقت میں اس پر بھاری تھا چند لمحوں میں ہی اس نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال کر رکھ دیا۔ قیصر برابر پٹتا رہا اور کہتا رہا اب میں ثمن کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اس نے میری پٹائی کرائی ہے۔''

''یہ وقت بتائے گا میرے ہوتے ہوئے تم ثمن کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔'' منشی سلیم نے کہا۔

''دوسرے مزدوروں کے آجانے پر معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔ لیکن قیصر کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی۔ منشی سلیم کے ہاتھوں وہ ثمن کی وجہ سے پٹا ہے اور اس کا وہ ضرور بدلہ لے گا۔ چند دن خاموشی سے گزرے قیصر فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ ثمن سے کس طرح انتقام لے۔ ایک، دو اور تیسرا ہفتہ گزر گیا۔ قیصر نے کسی مزدور کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے منشی سلیم کی پٹائی کرنا اس کے لئے فائدہ مند ہوا ہے۔ وہ سدھر گیا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ بالکل بھی نہیں بدلا تھا۔ یہ اس کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ وہ ثمن سے اس طرح انتقام لینا چاہتا تھا کہ وہ انتقام بھی لے اور کسی کو شک بھی نہ ہو۔

ایک دن اسے موقع مل گیا۔ بھٹے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ مزدور لوگ کھانا کھانے گئے ہوئے تھے۔ دوپہر میں کھانے کے وقت بھٹے کے نزدیک کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ثمن بھٹے کے پاس اپنی کوئی چیز بھول گیا تھا وہ لینے آیا تھا۔ قیصر بھی وہیں موجود تھا۔

''اب میں دیکھتا ہوں تجھے میرے ہاتھوں سے کون بچاتا ہے۔ اس دن تجھے منشی سلیم نے بچالیا تھا۔ میں تجھے آج زندہ ختم کر دوں گا۔'' قیصر نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے جو تو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔'' ثمن کو بھی غصہ آ گیا۔

''کیا تجھے یہ یاد نہیں میری اس دن تیری وجہ سے کتنی بے عزتی ہوئی تھی۔ میں منشی کی ایسی کی تیسی کر دیتا لیکن مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں مجھ پر پولیس میں مقدمہ درج کرا کے جیل بھجوا دے اس لئے خاموشی سے منشی سلیم کی مار سہہ گیا تھا۔

''تم مجھ پر اب بھی حملہ کر کے پولیس کی حراست میں جا سکتے ہو۔''

''میں نے ایسی اسکیم سوچی ہے میرے انتقام کی آگ بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔ تیرا بھی کام تمام ہو جائے گا۔

تلافی

''تمہارا گانا سن کر مجھے حیرت ہوئی ہے؟''

''جی ہاں! میں نے فن موسیقی کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اور گانا سیکھنے پر پورے پچاس ہزار روپے خرچ کیے ہیں۔''

''میں اپنے ابو سے ملواؤں گی تمہیں!''

''کیا وہ ٹی وی پروڈیوسر ہیں؟''

''نہیں تو۔''

''پھر کیا ہیں؟''

''میرے ابو اصل میں وکیل ہیں، ان کی کوششوں سے تمہیں پچاس ہزار روپے واپس مل جائیں گے۔''

(دانش علی۔ کراچی)

Pakistanipoint.com

''تم میرے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔'' شمن چونکا۔

''یاد ہے میں نے تجھے دھمکی دی تھی کہ تیری جان لوں گا۔ آج وہ دن آ گیا ہے میں آج تیری جان لے کر رہوں گا۔'' قیصر نے پراسرار انداز میں اس کی طرف دیکھا شمن اس کا ارادہ جان کر کانپ کر رہ گیا۔ اس وقت وہ وہاں اکیلا تھا۔ کم عمر تھا۔ قیصر کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی مدد کو ادھر ادھر دیکھا۔ دور تک کوئی مزدور نہ تھا۔ ایک گھنٹے تک کسی بھی مزدور کے آنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔

شمن نے جیسے ہی بھاگنا چاہا قیصر نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شمن نے خود کو چھڑانے کی پوری کوشش کی لیکن اس کی مضبوط گرفت سے باہر نہ نکل سکا۔ قیصر اسے بھٹے کی طرف لے جا رہا تھا۔ شمن سمجھ گیا کہ قیصر کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بھٹے میں گرنے سے وہ جل کر خاک ہو جاتا اور قیصر پر کوئی الزام بھی نہ آتا۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لئے چیخ و پکار بھی کی لیکن اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ بھٹے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ قیصر نے جیسے ہی شمن کو بھٹے میں ڈالنا چاہا اچانک وہ لڑکھڑایا اور اس کی گرفت سے شمن آزاد ہو گیا شمن نے جیسے ہی بھاگنے کی کوشش کی اسے اپنے عقب سے قیصر کی چیخ سنائی دی۔ وہ بھٹے میں گر چکا تھا۔ بھٹے سے کچھ فاصلے پر منشی سلیم کھڑا تھا۔ جو شمن کو بھٹے میں جھونکنا چاہتا تھا۔ وہ خود بھٹے میں گر گیا تھا۔

''بچ..... چا..... چا..... یہ.....'' شمن نے بوکھلائی آواز میں کہا۔

''میں نے تمہیں بچانے کے لئے قیصر پر دور سے اینٹ ماری تھی۔ اگر میں بروقت اینٹ نہ مارتا تو یہ تمہیں بھٹے میں جھونک دیتا۔'' منشی سلیم نے بتایا۔

''یہ بھٹے میں گرا کیسے؟''

''اس کے دماغ پر اینٹ لگنے سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بھٹے میں گر گیا۔'' منشی سلیم نے کہا۔

''مجھے مارنے والا خود مر گیا۔'' شمن نے کہا۔

''تم گھر چلے جاؤ، میری طرف سے تمہیں چھٹی ہے اور اس واقعہ کا کسی اور سے ذکر مت کرنا، میری بات سمجھ گئے ناں۔''

''آ..... ہاں۔''

''پولیس آئے گی بلاوجہ تمہیں قتل کے مقدمے میں پھنسانے کی کوشش کرے گی حالانکہ وہ اپنی غلطی سے بھٹے میں گر کر جل مرا ہے۔'' منشی سلیم نے کہا۔

شمن کی سمجھ میں منشی سلیم کی بات آ گئی تھی۔ اس لیے شمن نے اس معاملے سے لاتعلق رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''اور ہاں کوئی پوچھے تو تم یہی بیان دینا کہ تمہارے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس لیے تم مجھ سے چھٹی لے کر گھر چلے گئے تھے۔ اچھا میں مزدوروں کے پاس جا رہا ہوں، وہ کھانا کھا چکے ہوں گے۔ میں ان سے پوچھوں گا کہ قیصر کہاں ہے اس کی تلاشی ہو گی اور اس کی لاش بھٹے سے برآمد ہونے پر یہی تصور کیا جائے گا۔ یہ اتفاقی حادثہ ہے۔'' منشی سلیم نے کہا۔

شمن اس کی بات سمجھ گیا تھا۔ اس لئے اس نے اس طرح گردن ہلائی جیسے اس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی ہے۔ وہ گھر چلا گیا۔

منشی سلیم نے وہی کیا جو اس نے شمن کو بتایا تھا پولیس آئی اور قیصر کے بھٹے میں جل جانے کو اتفاقی حادثہ قرار دے دیا گیا۔

کئی ماہ گزرنے پر لوگ اس واقعہ کو بھول گئے تھے۔ ایک دن منشی سلیم بھٹے پر آگ دیکھ رہا تھا اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آگ میں سے انسانی ہیولہ نکلا ہے۔ منشی سلیم کو ایک حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ قیصر کا چہرہ تھا۔ وہ نفرت سے منشی سلیم کو دیکھ رہا تھا۔ ''تم نے قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔''

''میں کیوں تمہیں قتل کروں گا۔''

''کیا تم نے میرے سر پر اینٹ نہیں ماری تھی۔''

''یہ سب میں نے شمن کو بچانے کو کیا تھا۔ ورنہ تم

اسے ہلاک کر ڈالتے۔ ''تمہارے اینٹ مارنے سے میں اپنی جان سے چلا گیا۔ تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔ میں تم سے اپنا بھرپور انتقام لوں گا۔''

''تم مر چکے ہو، میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔'' منشی سلیم نے کہا۔

''میں مر کر بھی تم سے اپنا انتقام لوں گا۔''

''یہ وقت بتائے گا۔'' منشی سلیم نے کہا۔

کچھ لمحوں میں قیصر کا ہیولہ غائب ہو گیا۔

اس نے بظاہر قیصر کے ہیولے سے یہ بات کہہ دی تھی مگر اندر سے وہ بری طرح سے ڈر گیا تھا۔ منشی سلیم اس کا قاتل نہیں تھا۔ ایک انسانی جان بچانے کے لئے اس نے قیصر کو اینٹ ماری تھی تاکہ وہ ثمن کو چھوڑ دے۔ اینٹ قیصر کے سر میں زور سے لگی تھی۔ اس بنا پر اسے چکر آیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بھٹے میں گر پڑا۔ اس کی روح آسیب میں تبدیل ہو چکی تھی۔ آسیب منشی سلیم کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ گھر جانے پر رات بھر اسے نیند نہ آئی تھی۔ بار بار سوتے سے اس کی آنکھ کھل رہی تھی۔ اسے یہ دھڑکا لگ گیا تھا کہ کہیں سوتے میں قیصر کی روح اس کا گلا نہ گھونٹ دے۔

صبح ہونے پر منشی سلیم نے عامل جلال الدین سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ عامل جلال الدین ایک بڑا عامل تھا۔ وہ انسانوں کو آسیب سے نجات دلانے اور کالے جادو کی کاٹ کرنے کا ماہر تھا۔ منشی سلیم کو اس سے پوری امید تھی کہ وہ قیصر کے آسیب سے ضرور نجات دلائے گا۔

عامل جلال الدین کا آستانہ علاقے کی مسجد کے پاس ہی تھا۔ منشی سلیم نے اسے تمام واقعات بیان کر دیئے۔

''قیصر کا شیطانی ذہن تھا۔ وہ لوگوں کو تنگ کر کے خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس بنا پر اسے یہ سزا ملی ہے۔ وہ مر کر بھی تمہیں پریشان کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ تمہیں کسی طرح بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ محض تمہیں تنگ کرنا چاہتا ہے تاکہ تم ساری زندگی خوف و پریشانی میں گزارو۔'' عامل نے کہا۔

''کیا اس کا حل ہے کہ قیصر مجھے پریشان نہ کرے۔'' منشی سلیم نے کہا۔

''ہاں اس کا حل ہے میں جیسا کہتا ہوں اس پر عمل کرنا، تمہیں قیصر سے نجات مل جائے گی۔ میں تمہیں دم کر کے پانی دوں گا۔ وہ پانی تمہیں بلا ناغہ بھٹے میں ڈالنا ہوگا۔ اس طرح قیصر کی روح تمہیں نظر نہیں آئے گی اور نہ ہی پریشان کرے گی۔'' عامل جلال الدین نے کہا۔

منشی سلیم کو عامل جلال الدین نے ایک بوتل دی جو اسے پوری بھٹے میں ڈالنا تھی۔ دوسرے دن پھر ایک بوتل لے کر جانا تھا۔ اس طرح چالیس دن اسے آستانے پر آ کر بوتل لے کر جانا تھا۔ منشی سلیم نے جب پہلی بار بھٹے میں پانی ڈالا اسی وقت اسے قیصر کا ہیولہ نظر آیا۔

''تم عامل کی باتوں میں آ کر اچھا نہیں کر رہے ہو۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

''تم مجھے پہلے اپنا انتقام لینے کے لئے مارنے کی دھمکی دے چکے ہو۔ اسی لیے مجھے اس کا توڑ کرنا پڑے گا۔'' منشی سلیم نے کہا۔

اس کی بات سن کر قیصر کا ہیولہ غائب ہو گیا۔

منشی سلیم روزانہ بوتل کا پانی بھٹے میں ڈالتا رہا۔ وہ جب بھی پانی ڈالتا۔ قیصر کا ہیولہ ظاہر ہوتا اور سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکی دے کر چلا جاتا۔ چالیسویں روز قیصر کا ہیولہ ظاہر ضرور ہوا مگر کچھ بولا نہیں اور پھر غائب ہو گیا۔

منشی سلیم کا چالیس دن کا عمل پورا ہو چکا تھا۔ اسے قیصر کی روح سے نجات مل گئی تھی۔

کئی سال بیت گئے۔ پھر کبھی اسے قیصر کا ہیولہ نظر نہ آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ قیصر سے اسے نجات مل گئی ہے۔ وہ اب کبھی تنگ نہیں کرے گا۔ جب عامل جلال الدین سے اس نے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کر دی کہ اب بھی قیصر کا ہیولہ اسے نہ نظر آئے اور نہ تنگ کرے گا۔

موت کی سرگوشی

مظہر الحق علوی

قسط نمبر 3

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی اور روح کو دہلا دینے والی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو تحیر کے سمندر میں غوطہ زن کرکے رکھ دے گی صدیوں بعد ہارر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تحفۂ خاص

ایک ایسے..... شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت..... سے نکل آیا تھا

میں نے موزے اور جوتے پہن لئے اور اب میں پوری طرح سے ملبوس اور تیار کھڑا تھا اور جب مناسب سمجھوں اپنے گھر جا سکتا ہوں۔

لیکن بڑے میاں کی دکان میں کھڑے ہی کھڑے میں نے فیصلہ کرلیا۔

چونکہ میں ظاہری طور پر اتنا بہت سا بدل گیا تھا اور میں اپنی بیوی کو چونکانا اور خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے دن کے وقت اپنے گھر نہ جانے کا ارادہ کیا۔ عورتیں کمزور دل کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہوسکتا تھا کہ میری خلاف توقع واپسی اور اس سے بھی زیادہ خلاف توقع میری ظاہری صورت اس کے نازک دل پر اور اس کے اعصاب پر نظر انداز ہو اور اس کا نتیجہ خطرناک ہو۔ چنانچہ میں نے سوچا۔ میں سورج غروب ہونے کا انتظار کروں پھر اس عقبی راستے سے، جس سے میں واقف تھا، ویلا رومانی جاؤں گا اور اپنے کسی ملازم سے ملاقات اور بات کرنے کی کوشش کروں گا بلکہ ممکن ہے کہ میری ملاقات اپنے دوست جیدو فیراری سے بھی ہوجائے اور وہ میری موت سے واپسی کی خوش خبری رفتہ رفتہ نینا کو سنائے اور پھر اسے میری تبدیل شدہ شکل و صورت دیکھنے اور قبول کرنے کے لئے تیار کرے۔

جب میں یوں سوچ رہا تھا تو لباس فروش بوڑھا میرے قریب ہی اونگھتے یا سوچتے ہوئے اپنا سر ایک طرف جھکائے کھڑا تھا اور غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''دور جانا ہے تمہیں؟'' اس نے قدرے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''بہت دور۔''

اس نے میری آستین پکڑ لی۔ اس کی آنکھیں خباثت سے چمک رہی تھیں۔

''ایک بات بتاؤ۔'' اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ''اور میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ بات مجھ تک ہی رہے گی۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کسی عورت کے پاس جارہے ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

اور اب میں کچھ ناپسندیدگی اور کچھ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''ہاں۔'' میں نے سکون اور بے پروائی سے جواب دیا۔ ''ہاں عورت کے پاس ہی جارہا ہوں۔''

اور وہ بے اختیار ہنسنے لگا۔ خاموش اور مکروہ ہنسی جس نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی اور اس پر تشنج سا

طاری کر دیا تھا۔

میں نے نفرت اور حقارت سے اس کی طرف دیکھا، ایک جھٹکا مار کر اس کی چنگل سے اپنی آستین چھڑائی اور پلٹ کر دروازے کی طرف چلا۔ بوڑھا بھی لنگڑاتا اور ٹانگیں گھسیٹتا میرے پیچھے ہی پیچھے آیا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے وہ آنسو پوچھ رہا تھا جو یوں بے تحاشہ ہنسنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے بہہ آئے تھے۔

''عورت کے پاس جا رہے ہو۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تم نہ تو پہلے آدمی ہو اور نہ ہی آخری جو عورت کے پاس جا رہے ہو۔ واہ بہت اچھی بات ہے۔ جاؤ ضرور جاؤ۔ تم مضبوط ہو، بہادر ہو جاؤ۔ تلاش کر لو اسے پہچان لو اسے اور پھر مار ڈالو اسے۔ بے شک۔ بے شک تم یہ کام آسانی سے کر سکتے ہو بے حد آسانی سے مار ڈالو اسے قتل کر دو۔ جاؤ اور مار ڈالو اسے۔''

اور اب وہ دروازے میں کھڑا دانت بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مسوڑے پیس رہا تھا اور اپنی سوکھی اور مڑی ہوئی انگلی سے سامنے اشارہ کر رہا تھا اور نفرت اور غصے سے اس کی صورت اور بھی زیادہ بگڑ کر بھیانک ہوگئی تھی اور وہ کہانی کے اس بونے شیطان کی یاد دلا رہا تھا جس کا کام ہی اللہ کے نیک بندوں کے سروں پر آگ برسانا تھا۔

میں نے بے پروائی سے اسے خدا حافظ کہا لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ بوڑھا بدستور اپنی دکان کے نیچے دروازے میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ اب بھی اسی طرح بھنچے ہوئے تھے اور منہ ہل رہا تھا۔ چنانچہ وہ اب بھی مسوڑے پیس رہا تھا اور اس کی ایک آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں مڑی ہوئی تھیں جیسے اس نے کوئی نظر نہ آنے والی چیز دبوچ لی ہو ہوا میں سے، اور اب اس کا گلا گھونٹ رہا ہو۔

میں اس بوڑھے سے اور اس کی دکان سے دور آ گیا۔ اس تنگ راستے سے نکل کر بڑی اور بھیڑ والی سڑک پر آ گیا۔ لیکن اس بوڑھے کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''جاؤ اور مار ڈالو اسے۔''

وہ دن مجھے حد سے زیادہ طویل معلوم ہوا۔ میں یونہی، بے مقصد شہر میں بھٹکتا رہا اور مجھے جانی پہچانی صورتیں بس گنی چنی سی دکھائی دیں۔ کیونکہ امیر لوگ وبا سے ڈر کر یا تو شہر چھوڑ گئے تھے یا گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے میں جہاں بھی اور جس طرف بھی گیا۔ طاعون کی تباہی کے آثار نظر آئے۔ تقریباً ہر موڑ پر مجھے جنازہ لے جاتے ہوئے لوگ ملے۔ ایک جگہ مجھے ایک گھر کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے نظر آئے۔ یہ لوگ ایک لاش کو ایک ایسے تابوت میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہے تھے جو اس کے لئے بہت چھوٹا تھا۔ انہوں نے مردے کے ہاتھ اور پاؤں موڑ کر اور اسے دوہرا کر کے اسے تابوت میں ٹھونسا تو میں نے اس کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔ یہ نظارہ حقیقت میں دل الٹ دہلا والا تھا۔

ایک دو منٹ تک خاموش کھڑا ان لوگوں کی سنگ دلانہ کارروائی دیکھتا رہا۔ پھر میں نے ان لوگوں کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں کہا۔

''بھائیو! پہلے مرنے والے کو خوب اچھی طرح سے دیکھ کر یہ اطمینان کر لو کہ یہ پوری طرح سے مر گیا ہے۔ اس کے بعد ہی اسے دفن کرنا۔''

لوگوں نے گھوم کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک شخص نے قہقہہ لگایا اور گالی بکنے کے بعد کہا۔

''مسیح مصلوب کی قسم! اگر مجھے اس کے مرنے کا یقین نہ ہوتا یا مجھے ذرا سا بھی شک ہوتا تو میں اس کی گردن مروڑ دیتا۔ لیکن وبا کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ یہ لعنتی بے شک وشبہ مر چکا ہے۔ یہ دیکھو۔''

اور اس نے مردے کا سر پکڑ کر اوپر اٹھایا اور اسے تابوت کے دونوں پہلوؤں سے زور زور سے ٹکرایا جیسے وہ نعش کا سر نہیں بلکہ لکڑی کا کوئی ٹکڑا ہو۔

اس بے دردانہ منظر کی تاب نہ لا کر میں کچھ کہے

بغیر پلٹ کر چل دیا ایک دوسرے نسبتاً چوڑے اور عام راستے پر کئی لوگ مختلف ٹولیوں میں کھڑے تھے اور اشتیاق لیکن شرمندگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر طاعون پر سرگوشیاں کر رہے تھے۔

''میرے بھائیوں کیا معاملہ ہوا ہے یہاں؟''

میں نے پوچھا تو ایک بولا۔ ''خود ہی دیکھ لو۔''

ایک چارپائی پر، جس پر گندا گدا بچھا ہوا تھا، لڑکی کی نعش لٹائی گئی تھی۔ اس کے شباب کا ابھی آغاز ہی تھا اور وہ بے حد خوب صورت تھی۔ موت کے ظالم اور سرد لمس کا اثر ابھی اس کے چہرے، اعضا اور جسم سے اظہار نہ تھا۔ چنانچہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی سو رہی ہے اور اس کی لاش پر ایک شخص یوں آڑا پڑا ہوا تھا جیسے ٹھوکر لگی ہو اور اس پر گر گیا ہو اور وہ بھی جیسے بے جان تھا۔ وہ ذرا بھی حرکت نہیں کر رہا تھا اگر اس کی سانس چل رہی تھی تو اس کے بھی آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ وہ بھی مردہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بانہیں لڑکی کے گرد مضبوطی سے لپٹی ہوئی تھیں اور اس کا چہرہ لڑکی کے ٹھنڈے سینے میں دفن تھا۔ جو اس زندہ اور گرم لمس کا کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔ سورج کی ایک سیدھی کرن سنہری بھالے کی طرح کمرے کی تاریکی میں در آئی تھی اور اس پورے المناک منظر کو اچھال رہی تھی۔

''گزشتہ رات یہ مری ہے اور تب سے یہ اس پر اسی طرح پڑا ہوا ہے۔'' ایک نوجوان نے سرگوشی میں کہا۔ جس نے سب سے پہلے زبان کھولی تھی۔ ''اور اس کے بازوؤں نے تو آہنی شکنجے کی طرح اسے جکڑ رکھا ہے۔ کوئی انہیں الگ کرنا تو ایک طرف رہا، ہلا بھی نہیں سکتا۔''

نوجوان جس کا نام بادشاہ تھا۔ آگے بڑھا، اس نے بدنصیب عاشق کے شانے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا اور اب وہ بولا ہے تو اس کی آواز بے حد نرم اور سریلی تھی۔ جو سننے والوں کے کانوں کے پردے سے ہلکی موسیقی کے بول کی طرح ٹکرائی۔

فیجی کو مائیو!''

کوئی جواب نہ ملا۔ بادشاہ کے اس ایک سادے لفظ نے عورتوں کے دلوں پر اثر کیا۔ وہ رونے لگیں اور ہچکیاں لینے لگیں لیکن بے حد نیچی آواز میں۔ بادشاہ کی موجودگی میں بین کرنے کی گستاخی وہ نہ کر سکتی تھیں۔ البتہ ان کی آنکھوں سے آنسو بے تحاشہ بہہ رہے تھے۔ حتیٰ کہ چند مردوں نے بھی ناکیں، سڑسڑائیں اور اپنی آنکھیں پونچھیں۔

''فیجی کو مائیو!'' بادشاہ نے ایک بار پھر کہا۔ ''میں تمہارا بادشاہ ہوں۔ مجھے سلام نہیں کرو گے؟''

لڑکے نے اپنی مردہ معشوقہ کے سینے پر سے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے بولنے والے کی طرف دیکھا۔ اس کا وحشت زدہ چہرہ پریشان حال اور پھٹی ہوئی آنکھیں اس دیوانے کی سی تھیں جو پریشان خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہو۔

بہت آہستہ آہستہ اور بادل ناخواستہ..... جیسے کوئی مقناطیسی قوت جس پر اس کا اختیار نہ ہو۔ اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہو..... اس نے نعش کو اپنی گرفت سے الگ کیا وہ اپنا ہاتھ بادشاہ کی طرف بڑھا دیا۔ ہیو میرٹ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر اس جوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے یقین اور سنجیدگی سے کہا۔

''میرے دوست! محبت تو لافانی ہے۔''

نوجوان نے بادشاہ پر نظریں گاڑے رکھیں، اس کے بشرے کی کرختگی دور ہو گئی، اس نے بادشاہ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بادشاہ نے جھک کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ بادشاہ کے ایک ساتھی نے آگے بڑھ کر بادشاہ کی مدد کی۔ دونوں نے مل کر جوان کو اٹھایا اور اس لڑکی کی نعش سے دور لے چلے، روتا، بلکتا ہوا جوان ایک فرمانبردار بچے کی طرح چل دیا۔

اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں نے اسے پاگل ہونے سے اور شاید مرنے سے بھی بچا لیا تھا۔

اور جب بادشاہ ان لوگوں کے درمیان سے جو وہاں جمع تھے اور جنہوں نے سب کچھ دیکھا تھا، گزرا تو

انہوں نے تالیاں بجائیں اور اس کی جے کے نعرے لگائے اس کا جواب بادشاہ نے سر جھکا کر دیا اور بیکا موریتوں کو اشارہ کیا جو اب بھی دروازے پر منتظر تھے۔

چنانچہ اس کے بعد بادشاہ آگے بڑھ گیا اور لوگوں نے اس کی اتنی تعریفیں کیں اور ایسی دعائیں دیں کہ سو جنگوں میں فتح حاصل کر کے لوٹے ہوئے کسی بادشاہ کو بھی اس کی رعایا نے نہ دی ہوں گی۔

میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور میں نے اپنے جسم میں ایک نئی قوت محسوس کی اور یہ نتیجہ تھا ایک ''ہیرو'' کی موجودگی کا، اس شخص کی موجودگی کا جو ہر طرف سے ہر پہلو سے سچا بادشاہ تھا۔ بے شک میں شاہ پرست ہوں، اس کے باوجود میں کسی ظالم اور سنگدل بادشاہ کو تخت سے اتارنے کے لئے اور باغیوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اٹلی کا ہیومبرٹ ایک اچھا بادشاہ تھا اور آج بھی میں اس کی یاد سے اپنی رگوں کو گرماتا ہوں۔

بادشاہ کے چلے جانے کے بعد میں بھی وہاں سے ہٹ آیا۔ میرا جی چاہا کہ اس چھوٹے سے ریستوران کی خبر لی جائے۔ جہاں میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی تلاش کے بعد مجھے دور ریستوران مل گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور میں نے دیکھا ریستوران کا موٹا مالک پیٹرو کپڑے سے گلاس اور بوتلیں یوں گھس رہا تھا، جیسے میری ''موت'' کے بعد سے اب تک وہ اسی کام میں مصروف رہا تھا، اور سامنے اسی گوشے میں وہی بنچ تھا جس پر مجھے لٹایا گیا تھا اور جس پر میری، جیسا کہ عام خیال تھا۔ موت واقع ہوئی تھی۔

میں ریستوران میں داخل ہوا۔ پیٹرو نے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر خوش آمدید کہا میں نے اس کے سلام کا جواب دے کر کافی اور بریڈ رول کا آرڈر دیا۔ ایک میز کے پیچھے سراسر بے تعلقی سے بیٹھ کر اخبار کھول لیا اور پیٹرو میرے آرڈر دینے کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

''سمندر میں لمبا سفر کیا ہے آمیگو؟ اور مچھلیاں پکڑنے کا کیا حال رہا؟''

لمحہ بھر کے لئے تو میں گڑبڑایا اور سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں، لیکن پھر اپنے حواس مجتمع کر کے مسکرایا اور فوراً ہی اثبات میں جواب دیا۔

''لیکن اپنی کہو۔'' میں نے بشاشت سے کہا۔

''طاعون کا کیا حال ہے؟''

''پیٹرو نے غم واداسی سے سر ہلایا۔

''کچھ نہ پوچھئے۔ میرے خدا! لوگ شہد کے برتن میں گری ہوئی مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ ابھی کل ہی کی بات ہے۔ خدایا۔ کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔''

اور میرے لئے کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور پہلے سے بھی زیادہ غم و افسوس سے سر ہلایا۔

''کیوں کیا ہوا تھا کل؟'' میں نے پوچھا۔

حالانکہ میں جانتا تھا کہ کیا جواب ہو گا۔

''وہ۔ تم جانو۔ میں نیپلز میں ابھی ابھی آیا ہوں چنانچہ کچھ نہیں جانتا۔''

پسینہ بہاتے ہوئے موٹے پیٹرو نے اپنا موٹا ہاتھ میز کی سنگ مرمر کی سطح پر رکھ دیا اور شہادت کی انگلی سے اس پر الٹی سیدھی لکیریں بناتے ہوئے پوچھا۔

''رئیس کونٹ رومانی کا نام تو سنا ہو گا تم نے؟''

''نہیں۔ میں نے کہا میں نیا نیا آیا ہوں، اجنبی ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور کافی کے کپ پر سر جھکا لیا۔

''ہا۔ آ'' پیٹرو نے کچھ کراہ کر اور کچھ آہ بھر کے کہا۔ ''خیر۔ اب کیا ہے میاں! اب کوئی کونٹ رومانی نہیں رہا۔ ختم ہوا یہ خاندان، لیکن کیا بتاؤں۔ بے حد امیر تھا۔ یہ کونٹ رومانی...... کہتے ہیں بادشاہ کی طرح دولت مند تھا۔ لیکن دیکھو! یسوع نے اسے اپنے پاس بلا لیا اور سب کچھ یہیں دھرا رہ گیا۔ بیٹے! ڈیکش کے راہب فراسپر بانو گزشتہ کل اسے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ کل صبح کی بات ہے۔ یہ کونٹ پر طاعون نے یا، ہیضے نے میرا مطلب ہے جو بھی وبا پھیلی ہے یہاں کوئی طاعون کہتا ہے اور کوئی ہیضہ، حالانکہ دونوں میں زمین

Pakistanipoint.com

آسمان کا فرق ہے۔ صرف یہ فرق نہیں ہے کہ دونوں جان لیوا ہیں۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں؟ کونٹ اس وبا کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ ارے صاحب! پانچ ہی گھنٹوں میں چٹ پٹ ہوگئے۔ چہ۔ ہا۔'' اور یہاں پیٹرو نے ''چٹاخ'' سے ہاتھ مار کر ایک مچھر کا خون کر دیا۔ ''اس زنزارا'' کی طرح مردہ وہ سامنے چوبی بنچ نہیں ہے؟ بس اسی پر جاں بحق ہوئے اور سورج غروب ہونے سے پہلے لوگوں نے انہیں دفنا بھی دیا۔ ایک خواب سا تھا۔ بھیانک خواب۔''

میں ظاہر بے پروائی سے بریڈ مکھن لگانے میں مصروف رہا۔

''مجھے تو اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔'' میں نے بے یقینی سے کہا۔

''وہ بہت زیادہ دولت مند تھا تو کیا ہوا۔ موت تو سب کے لئے ہے۔ چاہے امیر ہو، چاہے غریب۔''

''سچ کہا۔ بالکل سچ کہا۔'' پیٹرو نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔ ''کیونکہ ساری غربت بھی سپریا اللہ والے کو نہ بچا سکی۔''

میں چونکا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے بظاہر انجان بن کر کہا۔ ''یہ تم کسی اللہ والے کا ذکر کر رہے ہو؟''

''سچ مچ ولی اللہ والا ہی تھا وہ۔'' پیٹرو نے سر ہلایا۔ ''یہ میں اس خدا ترس راہب کا ذکر کر رہا ہوں، جو کونٹ رومانی کو یہاں لایا تھا! وہ رحم دل مقدس باپ کیا جانتا تھا کہ بہت جلد خدا اسے اپنے پاس بلا لے گا۔''

اور میں نے اپنے دل میں ایک سرد لہر محسوس کی۔

''انتقال ہو گیا ان کا؟'' میں نے پوچھا۔

''انتقال! ہو گیا۔'' پیٹرو نے جواب دیا۔ ''وبا نے انہیں بھی دبوچ لیا اور میں سمجھتا ہوں یہ جراثیم انہیں کونٹ رومانی سے لگے تھے کیونکہ وہ اس کی آخری سانس تک اس پر جھکے رہے تھے اور وہاں انہوں نے اس پر مقدس پانی چھڑکا اور خود اپنی صلیب گلے سے اتار کر کونٹ کی لاش کے سینے پر رکھ دی اور پھر وہ کونٹ کی چیزیں، گھڑی انگوٹھی اور سگار کیس، لے کر ویلا رومانی گئے۔ انہوں نے کہا کہ جب تک وہ یہ چیزیں یہ خود ہی جا کر نینا کو نہ دے آئیں گے اور اسے یہ نہ بتائیں گے کہ کونٹ کا انتقال ہو چکا ہے، تب تک انہیں چین نہ آئے گا۔''

''بیچاری میری نینا۔'' میں نے دل میں کہا اور پھر بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ''بہت سخت صدمہ ہوا ہوگا نینا کو؟''

''اب یہ تو میں کیا جانوں؟'' پیٹرو نے اپنے پہاڑ کے سے شانے اچکائے۔ ''مقدس باپ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا کہ وہ بے ہوش ہوگئی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ عورتیں تو بات بات پر بے ہوش ہو جاتی ہیں، خدا ترس سپریانو نے کونٹ کی تجہیز و تکفین کی اور جب واپس آئے تو خود بھی بیمار ہو گئے اور آج صبح ہی خانقاہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ خدا انہیں جنت نصیب کرے۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے ہی میں نے غمناک خبر سنی..... بے حد نیک آدمی تھے..... انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے جنت میں ایک آدھ گوشہ دلا دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ وہ سینٹ پیٹرک کی طرح اپنا وعدہ وفا کریں گے۔''

میں نے ناشتے کی پلیٹ، ایک بھی لقمہ توڑے بغیر پیچھے دھکیل دی۔ میرے گلے میں پھندے سے پڑ گئے تھے۔ مقدس راہب سچ مچ جنت کا مرتبہ حاصل کر چکا تھا۔ اس نے دوسروں کی خدمت میں خود اپنی جان قربان کر دی تھی۔ ایسی قربانی پر میں نے آنسو بہائے ہوتے لیکن میں اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہ چاہتا تھا۔ اس خود غرض اور بزدل دنیا میں سے ایک بے غرض اور دلیر ہستی اٹھ گئی تھی۔

میں خیالات میں گم، اداس اور خاموش بیٹھا تھا۔ پیٹرو نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔

''کیوں؟ کافی پسند نہیں آئی یا بھوک نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں جبراً مسکرا دیا۔

''نہیں۔ کافی وغیرہ میں کوئی خرابی نہیں۔ بھوک بھی بہت لگی تھی لیکن تمہاری باتوں نے مار دی سچ مچ نیپلز

میں اجنبی کی دلچسپی کا تو کوئی سامان ہی نہیں۔ یہاں مرنے والوں اور مرتے ہوؤں کی کہانیوں کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں؟''

پیٹرو نے چہرہ ایسا بنایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شرمندہ ہے۔

''سچ کہتے ہو۔ یہاں اور کچھ ہے ہی نہیں۔ کم سے کم ان دنوں نہیں ہے۔''

وہ بولا۔ ''لیکن تمہیں اس سے کیا مطلب آمیگو؟ یہ تو وبا اور خدا کی مرضی ہے۔''

ابھی اس نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ میری نگاہیں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک شخص بڑی فراغت سے چلتا ہوا ریستوران کے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ یہ میرا دوست جیدو فیراری تھا۔ میرا جی چاہا کہ دوڑ کر اس کے پاس جاؤں اور اس سے بات کروں لیکن اس کی چال ڈھال اور انداز میں کوئی خاص بات تھی جس کی وجہ سے میں نے اپنے آپ کو روکا۔

وہ آہستہ آہستہ اور بڑے اطمینان سے چل رہا تھا اور بڑے اسٹائل سے سگار پی رہا تھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور کوٹ کے کالر میں تازہ گلاب اڑسا ہوا تھا۔ وہ گلاب جس کو گلوئر دی فرانس کہتے ہیں اور یہ ہو بہو ان گلابوں جیسا ہی تھا جیسا کہ میرے ویلا کے اوپری حصے میں اتنی فراط سے اگ رہے تھے۔

وہ دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں بے یقینی اور حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے دل کو سخت دھکا لگا تھا۔ وہ بے حد خوش پرسکون اور مطمئن معلوم ہوتا تھا۔ حقیقت میں وہ اتنا خوش تھا کہ میں نے پہلے کبھی اسے ایسا خوش نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ اس کے یقین کے مطابق میں اس کا بہترین اور جگری دوست ابھی کل ہی گزر گیا تھا۔ دوست کا یا کوئی بھی غم تازہ ہو تو آدمی یوں نہیں مسکراتا جیسے میلے میں جا رہا ہو اور نہ ہی کوٹ کے کالر میں تازہ گلاب لگاتا ہے۔ نہیں۔ یہ تو ماتم اور سوگ کی علامت نہیں۔

ایک لمحے کے لئے میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اپنی چند باتیت پر ہنس پڑا۔ مسکراہٹ کا کیا۔ وہ تو یونہی آجاتی ہے اور پھر ظاہر ہے آدمی کے دل کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ رہا گلاب تو ہوسکتا ہے وہ جیدو نے راہ چلتے اور بے خیالی میں توڑ لیا ہو یا کیا پتہ ہماری ننھی اسٹیلا نے اسے دیا ہو اور جیدو نے اس کا دل خوش کرنے کے لئے لگالیا ہو۔

لیکن اس نے بازو پر وہ کالا فیتہ نہ باندھ رکھا تھا جو سوگ میں ہونے کی علامت ہے؟

ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی کل ہی تو میرا انتقال ہوا ہے۔ چنانچہ اسے یہ سب چیزیں لانے اور سارے انتظام کرنے کا کہاں سے وقت ملا ہوگا اور پھر یہ کالے فیتے اور دوسری چیزیں تو بیکار کی رسمیں ہیں اور یہ ظاہری چیزیں دلی کیفیت کو ظاہر نہیں کرتیں۔

چنانچہ اپنے آپ کو یوں مطمئن کرنے کے بعد بھی میں نے جیدو کا پیچھا نہ کیا۔ اور وہ میرے وجود اور ریستوران میں میری موجودگی سے بے خبر آگے بڑھ گیا۔

''شام تک میں انتظار کروں گا۔'' میں نے سوچا۔ ''اور پھر راز فاش ہوگا اور پھر سب کچھ ظاہر ہو جائے گا۔''

میں پیٹرو کی طرف گھوم گیا۔

''کتنا بل ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''جو جی چاہے دے دو آمیگو۔'' اس نے کہا۔ ''ماہی گیروں کو ہیں مجبور نہیں کرتا۔ کیا کروں صاحب، وقت بہت خراب آیا ہے۔ ورنہ آپ کو یہاں ناشتہ مفت ہی مل جاتا۔ تمہارے ہم پیشہ لوگوں کے لئے میں نے بہت دنوں تک ایسا ہی کیا ہے۔ مدد کی ہے ان کی اور مفت کھانا کھلایا ہے اور اسی لئے مرحوم پیریانو اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے کہ سینٹ پیٹر مجھے یاد رکھیں گے اور مادر مقدس مجھ پر خصوصیت سے مہربان ہوں گی۔ کیونکہ میں ماہی گیروں کی مدد کرتا ہوں اور مسیح کے بارہ حواریوں میں سے ایک ماہی گیر تھا۔ اور تم جانو میں مادر مقدس کی مہربانیوں سے اپنے آپ کو محروم کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن کیا کروں کہ وقت.....''

اور میں نے ہنس کر ایک فرانک اسے دیا جو اس نے فوراً جیب میں رکھ لیا۔

''تم نے تو آدھے فرانک کی قیمت کا بھی ناشتہ نہیں کیا۔'' اس نے ایک بڑی سچائی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ''پھر بھی ایک فرانک دے دیا۔ اس کا اجر یسوع دیں گے۔ فکر نہ کرو۔''

''ہاں۔ اس کا تو مجھے یقین ہے۔'' میں نے بشاشت سے کہا۔ ''خدا حافظ میرے دوست۔ مادر مقدس تمہارے دھندے میں برکت دے۔''

جواب میں پیٹرو نے مجھے آئندہ سفر کی کامیابی کی دعا دی اور میں اسے بوتلیں اور گلاس صاف کرتا چھوڑ کر ریستوران سے باہر آ گیا اور شہر کے ان راستوں پر گھومتا رہا جن پر آمد و رفت نسبتاً کم تھی۔

اور میں سورج کے غروب ہونے کا منتظر تھا۔ کیونکہ شام میرے لئے خوشیوں اور محبت کا پیغام لے کر آنے والی تھی اور اس آفتاب کے غروب ہوتے ہی میری کامیابی اور مسرت کا آفتاب طلوع ہونے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

آخر کار وہ آ گئی۔ وہ شام جس کا مجھے اس قدر بے قراری سے انتظار تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور اس نے دن بھر کی تپی ہوئی فضا کو سرد کرنا شروع کر دیا اور ہوا کے جھونکے خنکی کے ساتھ ہزاروں پھولوں کی خوشبو لائے اور دم بہ دم بدلتے ہوئے رنگوں کا ایک کارواں سا فلک پر رواں دواں نظر آیا اور خلیج کا پانی آئینے کی طرح بے حرکت تھا، جو فلک پر کے تمام روشن رنگوں اور اندھیرے داغوں کا عکس دگنی شدت اور تفصیل سے نمایاں کر رہا تھا۔

لیکن میرے دل میں آرزوؤں کا ایک طوفان تھا، بے چینی اور بے صبری میرے رگ و ریشے میں ڈنک مارتی خون کے ساتھ گردش کر رہی تھی۔ لیکن میں کوشش کر کے اپنے آپ کو روک رہا تھا۔

میں انتظار کرتا رہا یہاں تک کہ سورج خلیج کے آبی ویرانے میں ڈوب گیا اور آسمان پر سے رنگوں کے قافلے گزر گئے اور وہ سرخی بجھ گئی، جو آفتاب کے غروب ہونے کے بعد یوں ابھر آئی تھی جیسے اسے رخصت کرنے آئی ہو، اور پھر اندھیرے کے باریک پردے آسمانوں سے لٹکا دیئے گئے جو رفتہ رفتہ دبیز ہوتے چلے گئے اور ہوا کی سائیں سائیں یوں معلوم ہوئی جیسے اس اندھیرے میں فرشتے پرواز کر رہے ہوں اور ادھر سے ادھر جا رہے ہوں اور پھر افق مغرب سے پورے چاند نے اپنا پیلا سر ابھارا۔

''اور اب میری بے قراری انتہا کو پہنچ گئی، میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک گیا اور بے اختیار میرے قدم اس جانے پہچانے راستے پر اٹھ گئے، جو اوپر ویلا رومانی کی طرف جاتا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، خوشی سے میرے اعضا کانپ رہے تھے اور میری ٹانگوں میں بے قراری نے بجلیاں بھر دی تھیں اور میرے قدم تیز اٹھ رہے تھے۔

پہلے کبھی یہ راستہ اتنا طویل نہ معلوم ہوا تھا کہ کاٹے نہ کٹ رہا تھا۔

آخر کار میں بڑے پھاٹک کے سامنے تھا۔ وہ مضبوطی سے بند اور مقفل تھا۔ اس کے دائیں بائیں ستونوں پر بیٹھے ہوئے پتھر کے شیر دانت نکالے مجھے گھور رہے تھے، اور میں اندر، پھاٹک کے دوسری طرف، باغ میں چلتے ہوئے فوارے اور اس کے پانی کے حوض میں گرنے کی آواز سن رہا تھا۔ میری ہر سانس کے ساتھ میرے باغ میں کھلے ہوئے گلابوں اور دوسرے پھولوں کی خوشبو میرے پھیپھڑوں میں پہنچ رہی تھی۔

''گھر۔ آخر کار۔ میں اپنے گھر آ گیا۔''

میں مسکرایا اور میرا انگ انگ امید و بیم مسرت سے کانپ گیا۔

اپنے گھر میں صدر دروازے سے داخل ہونے کا میرا ارادہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اندر کی طرف ایک محنت بھری اور طویل نگاہ ڈالی اور پھر بائیں طرف گھوم گیا۔ اس طرف ایک چھوٹا سا خفیہ دروازہ تھا جس کے دوسری طرف وہ راستہ تھا جس کے دونوں کناروں پر شاہ

بلوط اور صنوبر کے درخت کھڑے تھے اور ان کے بیچ میں کہیں کہیں نارنگی کے پیڑ تھے۔ یہ میری تفریح کی پسندیدہ جگہ تھی۔ کچھ تو اس لئے کہ سخت گرمیوں کی دوپہروں میں بھی یہاں ٹھنڈے اور گھنے سائے رہتے تھے اور کچھ اس لئے کہ گھر کا کوئی فرد بھی اس طرف آتا نہ تھا۔ سوائے میرے پاس آتا بھی تھا تو کبھی کبھار۔ کبھی کبھی جیدو میرے ساتھ اس طرف آجاتا تھا ورنہ اکثر و بیشتر میں اکیلا ہی ہتا تھا۔ چنانچہ میں تنہا ہی درختوں کے سایوں میں ٹہلتا، یا کتاب پڑھتا یا خود اپنے خیالات میں گم رہتا۔ یہ راستہ ویلا کے پچھواڑے جاتا تھا اور جب میں اسی سائے دار راستے پر چل پڑا تو میں نے سوچا کہ چپکے سے پچھواڑے پہنچ کر اسونتا سے اکیلے میں بات کروں گا۔ یہ اسونتا ہماری بچی اسٹیلا کی انا ہونے کے علاوہ ہمارے گھر کی بوڑھی، پرانی اور وفادار خادمہ تھی۔ جس کی بانہوں میں میری والدہ نے آخری سانس لی تھی۔

کائی اور گھاس اگے راستے پر میں تیزی سے لیکن خاموشی سے چل رہا تھا اور میرے سر پر شاہ بلوط اور صنوبر اور نارنگی کے پتے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ کبھی کبھی بلبل گا اٹھتی اور اس کی میٹھی آواز اس خاموشی کو چھید دیتی۔ اور پھر بلبل دفعتاً یوں خاموش ہو جاتی جیسے درختوں کی آپس میں گتھی ہوئی ٹہنیوں کے گھنے سایوں سے خوفزدہ ہو گئی ہو۔ انہی ٹہنیوں میں سے چاندنی چھن چھن کر نیچے آرہی تھی اور اس نے راستے پر اندھیرے اور اجالے کے عجیب و غریب نقش و نگار بنا دیئے تھے۔ ایک جھاڑی میں سے جگنوؤں کا جھنڈ اٹھ کر فضا میں یوں بکھر گیا۔ جیسے اس کے گلے کا ہار ٹوٹ گیا ہو اور اس کے لعل ادھر ادھر بکھر گئے ہوں۔ نارنگی کے شگوفوں کی اور یاسمین کے پھولوں کی بھینی خوشبو فضا میں تیر رہی تھی۔

جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا، جیسے جیسے ویلا کے قریب پہنچ رہا تھا، میری خوشی اور میرا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ خوشگوار خیالات میرے دماغ میں اور پیار بھرے جذبات میرے دل میں کروٹیں لے رہے تھے۔

میں اپنی پیاری نینا کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے بے تاب تھا۔ اس کی پیار بھری نظریں اپنے چہرے پر پھسلتے محسوس کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ میں جیدو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے اور گرم جوشی سے اس کا مصافحہ کرنے کے لئے بے چین تھا، میں جانتا تھا کہ اب تک اسٹیلا سو چکی ہوگی لیکن مجھے یقین تھا کہ مجھ سے ملانے کے لئے اسے جگا دیا جائے گا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ جب تک میں اس کا معصوم چہرہ چوم نہ لوں گا۔ جب تک میری خوشی مکمل نہ ہوگی اور میں اس کے ریشمی، سنہری بالوں پر ہاتھ پھیروں گا.....

یکا یک میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میرے قدم ایک دم سے یوں تھم گئے جیسے کسی غیبی ہاتھ نے مجھے پکڑ کر روک دیا ہو۔

ایک آواز سن رہا تھا میں۔

کیسی آواز تھی یہ؟

ہنسی کی آواز..... سریلی ہنسی کی آواز۔ جیسے چاندی کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

میں غور سے سننے لگا اور پھر سر سے پیر تک کپکپی کی ایک لہر سی دوڑ گئی میرے جسم میں۔ یہ میری بیوی کی ہنسی کی آواز تھی۔ میں اس کی ہنسی کو اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ اس کے سریلے پن سے واقف تھا۔ میرا دل سرد گہرائیوں میں ڈوب گیا اور میں سوچ میں پڑ گیا۔

حیرت ہے کہ وہ یوں ہنس رہی تھی۔ جب کہ اس کے خیال میں اس کا شوہر مر چکا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو چکا تھا۔

یکا یک درختوں کے درمیان، مجھے سفید لباس کی جھلک نظر آئی۔ اپنی چھٹی حس کی تحریک پر میں جلدی سے راستے پر سے ہٹ کر کنارے پر کی جھاڑیوں میں دبک گیا۔ اب میں سب کچھ اور سب کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن کوئی مجھے نہ دیکھ سکتا تھا۔

ایک بار پھر خاموشی میں چاندی کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور اس ہنسی کی تیز دھار میرے دماغ کو چیر گئی۔

میرے خدا! نینا خوش تھی۔ بہت خوش۔ وہ ہنس

رہی تھی۔ اسے کوئی غم، کوئی صدمہ نہ تھا۔ یہاں باغ میں اور چاندنی رات میں وہ خوش دلی سے گھوم رہی تھی۔ جب کہ میں، مجھے تو توقع تھی کہ میں اسے ایک کمرے میں بند پاؤں گا۔ یا وہ ہمارے ذاتی اور چھوٹے سے گرجا میں مریم مقدس کے مجسمے کے سامنے سر جھکائے، ہاتھ جوڑے، گھٹنوں کے بل بیٹھی میری مغفرت کی دعا مانگ رہی ہوگی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں گے۔

ہاں۔ یہی توقع تھی مجھے، جب ہم کسی عورت سے پیار کرتے ہیں تو کیسے الو بن جاتے ہیں۔

یکا یک بجلی کی سی تیزی سے میرے دماغ میں ایک خیال کوند گیا۔ میری نینا کہیں پاگل تو نہ ہوگئی تھی؟ صدمے سے اس کا دماغ تو نہیں چل گیا تھا؟ اس حالت میں وہ شیکسپیئر کی ہیروئن اوفیلیا کی طرح، رات کو یہاں بھٹک رہی اور آپ ہی آپ ہنس رہی تھی شاید۔

اس خیال سے میں کانپ گیا اور جس جھاڑی کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی ٹہنیاں ذرا ہٹا کر میں نے اس طرف جھانک کر دیکھا، جس طرف سے ہنسی کی آواز آئی تھی۔

دو انسانی سائے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس طرف آرہے تھے۔ ایک میری بیوی تھی..... نینا اور دوسرا میرا دوست تھا جیدو فیراری۔ اب اس میں کوئی خاص اور غیر معمولی بات نہ تھی۔ میں نے سوچا۔ آخر جیدو میرا دوست ہی تو تھا۔ چنانچہ نینا کو دلاسے، تسلی دینا اور اس کی ڈھارس بندھانا اور اس کا غم غلط کرنا کیا اس کا فرض نہ تھا؟

بے شک تھا..... لیکن میرا اپنی آنکھوں پر سے اعتبار اٹھ چلا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا میں دیکھ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ جیدو کے بازو کا سہارا لئے چل رہی تھی یا.....؟ اور بے اختیار میرے منہ سے ایک گالی نکل گئی۔

اور گالی روحانی اذیت کی ایک چیخ تھی۔ کاش کہ میں مر گیا ہوتا۔ کاش۔ میں اس تابوت سے باہر نہ آیا ہوتا جس میں میں سکون سے لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت میں جس درد و کرب میں مبتلا تھا، اس کے مقابلے میں موت اور مقبرے کی خوفناکی کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس وقت کی یاد آج بھی میرے دماغ پر نہ بجھنے والی اور نہ بجھائی جانے والی آگ کی طرح جل رہی ہے اور اس وقت کی تلخی کو دور کرنے کے لئے اس منظر کو بھگا دینے کے لئے آج بھی میری مٹھیاں غصے سے بھینچ کر گھونسے بن جاتی ہیں۔

میں نہیں جانتا کہ اس وقت میں نے کس طرح اپنے قاتل غصے پر قابو حاصل کیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے کس طرح اپنے آپ کو روکا اور ان جھاڑیوں کے پیچھے خاموشی سے دبکا رہا۔

ہاں۔ میں نہیں جانتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اپنی کمین گاہ سے باہر نہ آ گیا۔

اور میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے وہ المناک اور غم زدہ منظر آخر تک دیکھا۔ میں نے اپنی عزت کا خون ہوتے دیکھا اور وہ بھی ان دو ہستیوں کے ہاتھوں جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز تھیں اور جن پر مجھے سب سے زیادہ اعتبار تھا۔ ہاں۔ اپنی آنکھوں سے میں نے اپنی عزت کا خون کئے جاتے دیکھا اور خاموش رہا۔

وہ دونوں۔ جیدو فیراری اور میری بیوی۔ ان جھاڑیوں کے قریب آ گئے جن کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا، اور اب میں ان کی ایک ایک حرکت دیکھ سکتا اور ان کی باتوں کا ایک ایک لفظ سن سکتا تھا۔

وہ مجھ سے صرف تین قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ جیدو نے اپنا بازو میری بیوی کی کمر میں ڈال رکھا تھا اور نینا نے اپنا بازو جیدو کی گردن میں دے رکھا اور اپنا سر اس کے شانے پر ٹکا رکھا تھا۔ اسی طرح وہ سینکڑوں مرتبہ میرے ساتھ باغ میں گھومی تھی۔

اس نے بگلے کے پروں جیسا سفید اور بے داغ لباس پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کے سینے پر عین اس جگہ جہاں دل ہوتا ہے، ایک سرخ گلاب لگا رکھا تھا..... اور یہ گلاب بہت زیادہ سرخ تھا، خون کی طرح۔ اور یہ پھول اس نے جیسے کی پن کے ذریعے وہاں لگایا تھا اور پن کا ہیرا چاندنی میں چمک رہا تھا جیسے روشن ہو۔ ہیرے کی اس پن کے بجائے تو ٹھیک اس جگہ خنجر کا پھل

دستے تک اترا ہوا ہونا چاہئے..... لیکن میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ چنانچہ میں بس اسے خشک آنکھوں، خالی خالی نظروں سے، ہندزبان لئے دیکھتا رہا۔

وہ خوب صورت معلوم ہورہی تھی۔ بے حد خوب صورت۔ اس کے خوب صورت چہرے پر غم کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کی آنکھیں ایسی شفاف تھیں، پہاڑی جھیل کی طرح اور اس کے ہونٹوں پر وہی ملکوتی تبسم تھا۔ بچے کی سی معصوم مسکراہٹ، معتبر اور دل لوٹ لینے والی۔ اور وہ بولی..... میرے خدا وہ مسحور کن آواز، جس میں عجیب موسیقی تھی اور میرا دل اچھلنے اور دماغ گھومنے لگا۔

''بیوقوف جیدو!'' نینا نے بشاشت سے اور کچھ مضحکہ خیزی سے کہا۔ ''میں سوچتی ہوں کہ بروقت فابیو نہ مرگیا ہوتا تو کیا ہوتا؟''

اور میں بے چینی سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ جواب دینے سے پہلے جیدو ہنسا اور پھر بولا۔

''اسے تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ چلتا۔ بہت ہوشیار اور چالاک ہو تم۔ اس کے علاوہ اس کی خود بینی نے اسے بچالیا۔ اسے اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ یہ بات تو کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتی تھی کہ تم اس کے علاوہ کسی دوسرے مرد کی طرف بھی متوجہ ہوگی۔''

میری بیوی..... بے نقص ہیرا، نسائیت کا بے داغ نمونہ۔ ہنسی اور پھر قدرے بے چینی سے پہلو بدل کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''اچھا ہوا کہ فابیو مرگیا'' وہ بڑبڑائی۔ ''کم سے کم مجھے اس کے مرنے کی خوشی ہے۔ لیکن جیدو مایو! تم ضرورت سے زیادہ دیدہ دلیر ہو۔ اب تمہیں بار بار یہاں میرے پاس نہیں آنا چاہئے۔ نوکر باتیں بنائیں گے اور تم جانو مارتے کے ہاتھ پکڑے جاسکتے ہیں، لیکن بولتے کی زبان نہیں۔ اور پھر یہ بات بھی ہے کہ مجھے کم سے کم چھ مہینے تک سوگ میں بیٹھنا ہے اور دوسری بھی بہت سی باتیں ہیں۔''

جیدو کی انگلیاں اس جڑاؤ مالا سے کھیل رہی تھیں جو نینا کی صراحی دار گردن میں پڑی ہوئی تھی۔ جیدو نے سر جھکا کر وہ جگہ چوم لی جہاں مالا کا پینڈنٹ لٹک رہا تھا اور پھر وہ اسے بار بار چومنے لگا اور میں جھاڑیوں کے پیچھے دبکا دیکھتا رہا اور خون میری رگوں میں سنسنانے لگا۔ میرا غصہ بڑھتا چلا گیا اور میرے دماغ میں بیک وقت سینکڑوں ہتھوڑے چلنے لگے اور میری کنپٹیوں میں خون بجنے لگا۔

''نہیں، میری جان۔'' جیدو نے کہا۔ ''میرے خیال میں یہ تو برا ہوا ہے کہ فابیو مرگیا۔ وہ زندہ تھا تو ہمارے لئے ایک پردہ بنا رہا۔ کسی کو ہم پر شک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ فابیو ہمارے لئے ایک طرح سے محافظ کا کام دے رہا تھا۔ بے شک وہ بے خبر تھا تاہم ہمارا، ہم دونوں کا بہترین محافظ تھا۔ ہے کہ نہیں؟''

میری کمین گاہ کی ٹہنیاں سرسرائیں اور چیخیں۔ میری بیوی نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔

''چپ رہو۔'' اس نے بے چینی سے کہا۔ ''اسے ابھی کل ہی دفن کیا گیا ہے اور کہتے ہیں کہ مرنے والے کی روحیں آتی ہیں..... اور یہ جگہ تو فابیو کی پسندیدہ تھی وہ یہیں ٹہلتا اور تفریح کرتا تھا۔ اس کے علاوہ'' میری بیوی نے قدرے تاسف سے اضافہ کیا۔ ''وہ بہرحال میری بچی کا باپ ہے اور یہ تمہیں نہیں بھولنا چاہئے۔''

''خدا کی قسم میں بھول سکتا ہوں یہ بات بھی؟'' جیدو نے ایک دم سے غصے ہوکر کہا۔

''اور میں اس کو ہر اس بوسے کے عوض سو سو بددعائیں دے رہا ہوں۔ جو اس نے تمہارے ہونٹوں سے چرایا ہے۔''

میں نے ایک سناٹے کے عالم میں یہ الفاظ سنے۔ شادی کے معاملے میں یہ ایک نیا اور حیرت انگیز انکشاف ہوا تھا۔ یعنی شوہر چور ہوتے ہیں جو بوسے چراتے ہیں۔ صرف عاشق ایماندار اور حق دار ہوتے ہیں۔ بوسوں کے بھی اور آغوش کے بھی۔

جیدو! میرے دوست جس کو میں نے حقیقی بھائی سے زیادہ چاہا۔ اس وقت تم موت کے کتنے قریب تھے؟

اگر اس وقت تم نے جھاڑیوں میں جھانکتا ہوا میرا چہرہ دیکھا ہوتا اور اس پر اس بے پناہ غصے کے آثار دیکھے ہوتے جو میرے اندر کھول رہا تھا، تو خدا کی قسم تم اسی وقت مارے ہیبت کے وہیں گر کر مر جاتے۔

''تم نے اس سے شادی کیوں کی؟'' چند ثانیوں کے توقف کے بعد جیدو نے پوچھا۔ وہ نینا کے بالوں کی لٹ سے کھیل رہا تھا جو اس کے سینے پر پڑی ہوئی تھی۔

نینا نے برا سا منہ بنا کر شانے اچکائے۔

اس لئے کہ میں کانوینٹ سے، خشک مزاج ننوں اور ان کے احمقانہ طور طریقوں سے بیزار ہوگئی تھی اور اس لئے بھی کہ فابیو امیر تھا، سنسنی خیز حد تک امیر تھا اور میں خوفناک حد تک غریب تھی اور غربت میں برداشت نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ وہ مجھ سے پیار کرتا تھا'' اور یہاں میری بیوی کی آنکھوں میں کینہ وارنہ چمک آ گئی۔

''ہاں۔ دیوانہ تھا میرا اور.....''

''تمہیں پیار تھا اس سے؟'' جیدو نے غضب ناکی سے پوچھا۔

''ماچی۔'' اس نے ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔

''میرے خیال میں میں اسے پہلے چاہتی تھی کوئی ایک دو ہفتے تک.....اور مجھے اس سے اتنا ہی پیار تھا جتنا کہ ایک بیوی کو اپنے شوہر سے ہوتا ہے۔ آخر شادی کس لئے کی جاتی ہے؟ عزت، دولت اور آسائش کے لئے اور فابیو نے یہ سب کچھ مجھے دیا۔''

''تو پھر مجھ سے شادی کر کے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔'' جیدو نے پیچ و تاب کھا کر کہا۔ نینا ہنسی اور اس نے اپنا نازک ہاتھ، جس کی انگلیوں میں انگوٹھیاں چمک رہی تھیں، جیدو کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

بے شک نہ ہوگا۔ بالکل بھی نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ میں نے کب کہا ہے کہ تم سے شادی کروں گی؟ بطور عاشق تو تم بے حد اچھے ہو اور پسندیدہ بھی.....لیکن بطور شوہر.....کچھ کہا نہیں جا سکتا.....اس کے علاوہ اب میں آزاد ہوں، میں جو چاہوں کرسکتی ہوں۔ چنانچہ میں اپنی آزادی سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں اور پھر۔''

وہ اپنی بات پوری نہ کرسکی کیونکہ جیدو نے اسے ایک دم سے اپنے قریب گھسیٹ کر سینے سے بھینچ لیا۔ اس وقت جیدو کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

''ایک بات سن لو نینا۔'' جیدو بولا۔ اس کی آواز گھمبیر تھی۔ ''تم مجھے الو نہیں بناؤ گی، خدا کی قسم! میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ تمہارے ہاتھوں میں نے بہت دکھ برداشت کئے ہیں۔ جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا.....یعنی اس دن جب تمہاری شادی اس احمق فابیو سے ہو رہی تھی تو میں اسی دن تمہاری محبت میں گرفتار ہوگیا۔ میں دیوانہ وار تمہیں چاہنے لگا اور میں نے اپنی محبت کو دل میں رکھا۔ میں جانتا تھا کہ تم فرشتہ نہیں، ایک عورت ہو، چنانچہ وہ وقت آئے گا جب مجھے میری محبت کا پھل دے گا اور وہ وقت آ گیا یہ تمہاری شادی کو صرف تین مہینے گزرے تھے کہ میں نے تمہیں تلاش کرلیا، اپنی محبت کا اظہار کردیا۔ اور میں نے دیکھا کہ تم رضامند اور تیار تھی.....بلکہ میری کہانی سننے کی مشتاق تھی۔

اور تم نے مجھے شہ دی، اکسایا، اپنے لمس سے، باتوں سے، نظر سے، تم نے مجھے وہ سب کچھ دیا جس کی مجھے خواہش تھی۔ پھر اب یہ بہانے بازی کیوں؟ تم میری اتنی ہی اور ایسی ہی بیوی ہو، جتنی اور جیسی فابیو کی تھیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ میری بیوی ہو کیونکہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور فابیو سے تمہیں پیار نہ تھا۔ کم سے کم تم نے تو ایسا ہی کہا تھا اور ہر چند کہ تم نے اپنے شوہر کو دھوکا دیا۔ لیکن خیال رہے میرے ساتھ ایسا نہ کرنا۔ مجھے دھوکا دینے کی جرأت کبھی نہ کرنا۔ مجھے فابیو پر کبھی رحم نہ آیا تھا۔ میں نے اس پر رحم کیا بھی نہیں، کبھی نہیں، وہ بہت آسانی سے بیوقوف بن گیا۔ حالانکہ ایک شادی شدہ آدمی کو تو ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہنا چاہئے اور اسے کسی پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے۔ اپنی بیوی پر بھی نہیں اور دوستوں پر بھی نہیں۔ اب اگر وہ ایسا نہیں کرتا بے پرواہ بنا رہتا ہے اور اس کی عزت گیند کی طرح ایک سے دوسرے ہاتھ کی طرف پھینکی جاتی ہے تو اس میں صرف اس کا

شوہر کا قصور ہے۔ میں پھر کہتا ہوں نینا کہ تم میری ہو اور میں فابیو نہیں ہوں۔ چنانچہ تم مجھے دھوکا نہ دے سکو گی اور مجھ سے بچ نہ سکو گی۔''

یہ دھمکی آمیز الفاظ بڑی تندی اور تیزی سے اس کے منہ سے ٹپک رہے تھے اور رات کی خاموش فضا اس کے لہجے کو اور بھی اثر انگیز بنا رہی تھی۔ اس کے یہ الفاظ اور یہ دھمکیاں سن کر میں تلخی سے مسکرایا۔

نینا اس کی بانہوں کی گرفت میں غصے سے تڑپنے لگی، یا یوں کہئے کہ مچلنے لگی۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' وہ بولی۔ ''بالکل ریچھ ہو تم۔ چپ۔ سی۔ بھئی پسلیاں درد کرنے لگی ہیں میری۔''

جیدو نے فوراً ہی اسے چھوڑ دیا۔ اس نے نینا کو اس سختی سے دبوچ رکھا تھا کہ اس کے سینے پر سفید لباس میں لگا ہوا سرخ گلاب مسلا گیا تھا اور اب اس کی پنکھڑیاں ایک ایک کر کے نینا کے قدموں میں گر رہی تھیں۔ نینا کی آنکھوں میں غصے اور بغاوت کی چنگاریاں سی روشن ہو گئیں اور اس کے ابرو تن گئے۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا اور خاموش رہی۔ یہ سرد خاموشی نفرت اور حقارت کی تھی۔

نینا کے بشرے سے کسی خاص جذبے کا اظہار ہوا شاید، اس کی اس سرد خاموشی نے جیدو کو چونکا دیا اور بے تاب کر دیا۔ اس نے ایک دم سے لپک کر نینا کا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانوں کی طرح اسے چومنے لگا۔

''مجھے معاف کر دو، کارنیا مایو!'' وہ گڑبڑایا۔ ''میں تمہیں سرزنش کرنا نہ چاہتا تھا۔ خدا کی قسم! میرا یہ مطلب نہ تھا۔ تم بے انتہا خوب صورت ہو تو اس میں تمہارا قصور نہیں۔ تمہارا یہ حسن مجھے پاگل اور بے اختیار کر دیتا ہے۔ میں اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ تم میری دنیا ہو، میری زندگی ہو، میری روح، نینا! میری جان! بیکار غصہ کرنے اور بحث کرنے سے کیا فائدہ؟ سوچو۔ ذرا سوچو تو سہی کہ ہم آزاد ہیں۔ اپنی زندگی کو خوشیوں اور مسرتوں کے ایک طویل خواب میں تبدیل کرنے کے لئے آزاد ہیں۔ ایسی مکمل ترین مسرت جو فرشتوں کے نصیب میں بھی نہیں اور ہمارے لئے سب سے بڑی اور مبارک فال تو فابیو کی موت ہے اور اب جب کہ ہماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اب جب کہ ہم ایک دوسرے کے لئے ہی رہ گئے ہیں۔ ایسی سنگدلی کا ثبوت مت دو نینا! میرے لئے اپنا دل نرم کرو۔ میری جان! دنیا میں محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔''

وہ مسکرائی۔ اس ملکہ کی طرح جو اپنی گستاخ رعایا کی گستاخی معاف کر رہی ہو۔

اور اب جیدو نے اسے آہستہ سے اپنی طرف کھینچا تو وہ بغیر کسی حیل وحجت کے اس کے سینے سے لگ گئی اور اپنے ہونٹ اس کے بوسے کے لئے پیش کر دیئے۔

اور میں جیسے خواب کے عالم میں بیٹھا رہا اور میں نے انہیں ایک دوسرے سے لپٹتے دیکھا اور میں نے انہیں ایک دوسرے کو چومتے دیکھا اور ان کا ہر بوسہ میرے دل پر اور میری روح پر ایک تازہ زخم لگا رہا تھا۔

''کس قدر بیوقوف ہو تم میرے جیدو۔'' وہ اپنے عاشق کے گھنے بالوں میں اپنی انگوٹھیوں بھری انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''بے صبری، شکی مزاج اور بدگمان۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ وہ رات تمہیں یاد نہیں ہے جب فابیو بالکونی میں بیٹھا اپنی پسندیدہ کتاب ''مکالمات افلاطون'' پڑھ رہا تھا۔ بے چارہ فابیو'' اور یہاں وہ ہنسی۔ ''اور ہم دونوں ڈرائنگ روم میں کوئی گیت گانے کی کوشش کر رہے تھے..... اور تب میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ''میں دنیا میں تمہیں سب سے زیادہ چاہتی ہوں؟ کہا تھا نا۔ اس کے بعد تو تمہیں اطمینان ہو جانا چاہئے تھا۔''

جیدو مسکرایا اور نینا کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''مجھے اطمینان ہو گیا۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کے حالیہ جوش و جذبے کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ ''پورا اطمینان۔ لیکن محبت کے ساتھ شک اور بدگمانی

ہوتی ہے۔ فابیو نے کبھی شک نہیں کیا..... جانتا ہوں کہ اسے تم پر پورا اعتبار تھا۔ چنانچہ وہ ایک کامیاب عاشق نہ تھا اور یقین کر وہ تم سے زیادہ اپنے متعلق سوچتا تھا۔ وہ شخص اپنی بیوی کو تنہا گھر میں چھوڑ کر کئی دنوں تک سمندر کی سیر اور شکار کو جاتا ہو، جو اپنی بیوی کی خبر گیری کرنے اور اس کی صورت تکنے پر مکالمات افلاطون کو ترجیح دیتا ہو، وہ خود اپنی تقدیر پر مہر لگا دیتا ہے۔

چنانچہ ایسا شخص اسی قابل ہے کہ اس کا شمار ان احمق فلسفیوں میں ہی کیا جائے جو عورت کو ایک ناقابل حل معمہ سمجھتے ہیں۔ یہی گدھے ہیں جو عورت سے دھوکا کھاتے ہیں۔ اب رہا میں تو میں بے شک شکی مزاج ہوں۔ میں تو اس زمین پر بھی شک کرتا ہوں جس پر تم چلتی ہو اور اس ہوا پر شک کرتا ہوں جو تمہارے رخساروں کو چھوتی ہوئی گزرتی ہے..... اور جب فابیو زندہ تھا تو مجھے اس پر بھی شک تھا اور اس پر بھی مجھے رشک آتا تھا۔ نینا! زندگی میں صرف فابیو میرا رقیب تھا اور اب تو ہر چیز میری رقیب ہے۔ خدا کی قسم!'' اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ ''اب اگر کسی مرد نے میری محبت سے خود اپنی محبت ٹکرانے کی کوشش کی..... میرا مطلب ہے تم سے پیار کرنے یا اس کا اظہار تک کرنے کی کوشش کی تو میں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ اس کے جسم کو اپنی برہنہ تلوار کی نیام نہیں بنا لیتا۔''

نینا نے اس کے سینے پر سے اپنا نازک سر اٹھایا۔

میں نے دیکھا کہ اس کے گورے چہرے پر بیزاری اور ناگواری کے آثار تھے۔

''پھر وہی؟'' نینا نے پیار بھری سرزنش کی۔ ''تم پھر غصہ کر رہے ہو۔''

اور جیدو نے اسے چوم لیا۔

''توبہ۔ توبہ۔ تم سے غصہ کر سکتا ہوں؟ جب تک تم مجھ سے، صرف مجھ سے پیار کرتی رہو گی۔ میں غصہ نہ کروں گا۔ آؤ چلیں۔ یہ جگہ تو کچھ زیادہ ہی نم اور سرد ہے..... سردی لگ جائے گی..... اندر چلیں.....؟''

میری بیوی نے..... نہیں..... چونکہ ہم دونوں ہی اس کے حسن کے دیوانے تھے اور وہ ہم دونوں پر ہی مہربان تھی اس لئے میری نہیں بلکہ ''ہماری بیوی'' نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اب وہ دونوں گھوم کر ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ چلتے چلتے وہ دونوں ایک دفعہ رک گئے۔

''سنو! بلبلیں گا رہی ہیں۔ سن رہی ہو نا ان کے نغمے؟'' جیدو نے پوچھا۔

نینا کان لگا کر ایک لمحے تک سنتی رہی اور پھر اس نے کانپ کر اپنے سر پر اور کانوں پر ریشمی اسکارف ٹھیک سے لپیٹ لیا۔

''مجھے نفرت ہے اس پرندے سے۔'' وہ بولی۔ ''اس کی آواز اتنی تیکھی ہے کہ مجھے بے چین کر دیتی ہے۔'' اور۔ فابیو کو اس پرندے سے اور اس کے نغموں سے پیار تھا اور وہ ایک گیت بھی تو گایا کرتا تھا ان کے ساتھ۔ کیا بول تھے اس کے؟ ہاں۔''

اور وہ میرا پسندیدہ گیت گانے لگی۔ لیکن دو تین شعر گا کر ہی بے اختیار ہنس پڑی۔

''بے چارہ فابیو بہت بے سرا تھا۔'' وہ بولی۔

''چلو جیدو۔''

اور وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے یوں سکون سے آگے بڑھ گئے جیسے ان کے ضمیر بالکل صاف ہوں گے، جیسے گناہ کی سزا ان کے لئے ہے ہی نہیں، جیسے ان کی چرائی ہوئی خوشی کی جنت میں انتقام کی آگ کے بھڑکنے اور ان کی خوشی کو خاکستر کر دینے کا کوئی امکان ہے ہی نہیں۔

میں انہیں جاتے دیکھتا رہا دور جاتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ نینا کے سفید لباس کی آخری جھلک بھی درختوں اور جھاڑیوں کے سائے میں ڈوب گئی۔

وہ چلے گئے اور اس رات وہ دوبارہ اس جگہ واپس نہ آئے۔

میں جھاڑی کے پیچھے سے نکل آیا تھا اور ٹھیک اس جگہ کھڑا ہوا تھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ دونوں کھڑے ہوئے تھے۔ میں اس منظر کی صحیح حقیقت سمجھنے اور قبول کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ میرا سر

چھا رہا تھا اور نظر کے سامنے روشنی کی دھندلی دھندلی لکیریں اور دائرے تیر رہے تھے۔ چاندنی خونی سرخ دکھائی دے رہا تھا۔ ٹھوس زمین میرے قدموں تلے جھکولے لے رہی تھیں۔ طوفان میں پھنسی ہوئی کشتی کی طرح ڈول رہی تھی۔ مجھے تو شک ہو چلا تھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔ یا یہ میرا بھوت تھا جو اپنی قبر میں سے نکل آیا تھا اور اب گزری ہوئی خوب صورت اور پیاری چیزوں کو بگڑتے، برباد ہوتے اور کھنڈر بنتے بے بسی سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

مجھے یوں معلوم ہوا کہ میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی خوب صورت کائنات اب خدا کے اختیار میں نہ رہی تھی اور یہ دنیا اب ایک عظیم الشان عجوبہ نہ رہی تھی بلکہ میرے لئے تو یہ دنیا ایک پھولا اور بلبلہ تھی جس میں کچھ نہ تھا سوائے خلاء کے...... ایک بلبلہ...... ایک گیند جسے کھلنڈرے شیاطین لاتیں مار کر خلاء میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر لڑھکا رہے تھے۔

یہ روشن ستارے، یہ ہرے بھرے درخت، خوشبوؤں کے وہ پیالے جنہیں ہم پھول کہتے ہیں اور یہ حیرت ناک مناظر جنہیں ہم قدرت کہتے ہیں۔ کس کام کی یہ سب چیزیں...... بلکہ...... میں نے سوچا...... خود خدا بھی کس کام کا جب کہ وہ صرف ایک عورت کو بھی وفادار نہیں رکھ سکتا؟ وہ جس کو میں نے چاہا وہ جو نازک بدن تھی، وہ جو مسیح کی دلہن کی طرح معصوم اور فرشتے کی طرح بھولی تھی۔ ہاں۔ وہ بھی...... کیا ثابت ہوئی؟ کسی بھی درندے سے زیادہ کم ذات جسم فروش عورت سے بھی زیادہ گری ہوئی...... ایک دوزخی چیز جس سے سارے مرد نفرت کریں اور اس پر آوازیں کسیں جس کی طرف انگلیاں اٹھائی جائیں، جس کے لئے پھنکارتی ہوئی زہریلی زبانیں شرم ناک باتیں کہیں۔

اور وہ درندہ صفت وہ گری ہوئی وہ ذلیل اور بے حیا چیز میری بیوی تھی، میری بچی کی ماں تھی اس نے خود اپنی مرضی سے اور اپنی خوشی سے اپنی روح کو بدبودار، گندی، کیچڑ میں لتھیڑ دیا تھا، اس نے اپنی بھلائی کے لئے برائی کا استعمال کیا تھا، اس نے بہ رضا و رغبت اپنے سر پر بے شرمی کا تاج رکھ لیا تھا۔ اس نے بڑی خوشی سے عزت و وقار کو بے حیائی اور بے شرمی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

''اب کیا کیا جائے؟''

یہ ایک ایسا سوال تھا جو میری روح کو مسلسل اذیت دے رہا تھا۔ میں خالی خالی نظروں سے اپنے قدموں کے درمیان زمین پر دیکھ رہا تھا اور آس لگائے کھڑا تھا کہ کوئی عفریت زمین سے نکل آئے گا اور میرے اس سوال کا جواب دے گا۔

''کیا کیا جائے میری بے وفا اور بے حیا بیوی کے ساتھ؟ کیا کیا جائے میرے مسکراتے ہوئے دغاباز دوست کے ساتھ؟

یکا یک میری نگاہیں پھول کی ان پنکھڑیوں پر مرکوز ہوگئیں جو وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ جیدو نے جب نینا کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر بھینچا تو اس کے۔ نینا کے سینے پر لگا ہوا گلاب مسلا گیا تھا اور یہ پنکھڑیاں اس سے الگ ہوکر زمین پر بکھر گئی تھیں۔

اور اب وہ روش پر مسلی ہوئی اور مڑی ہوئی پڑی تھیں۔ میں نے جھک کر انہیں اٹھا لیا اور اب میں انہیں اپنی ہتھیلی کے کٹورے میں رکھے دیکھ رہا تھا۔ ان سے مست کن خوشبو اٹھ رہی تھی۔ انہیں چومنے کے لئے بے اختیار میرا سر جھک گیا...... میں نے اپنے آپ کو روکا۔ نہیں۔ میں انہیں نہ چوم سکتا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے یہ ایک مجسم جھوٹ کے سینے پر تھیں۔ بے شک نینا وہی تھی۔ جھوٹ...... ایک مجسم اور زندہ جھوٹ ایک حسین اور چلتا پھرتا جھوٹ۔

''جاؤ اور مار ڈالو اسے۔''

کس نے کہا تھا یہ؟ اور اپنے دل میں ایک عجیب طرح کا کھولتا ہوا درد لئے میں یاد کرنے لگا۔ کس نے کہے تھے یہ الفاظ'' میں نے اپنے پراگندہ دماغ پر زور ڈالا اور مجھے یاد آ گیا...... اور تب میں نے لاشعوری طور

پر سوچا کہ وہ فاقہ کش اور مفلس لباس فروش مجھ سے زیادہ مرد تھا۔ اس نے فوراً ہی انتقام لے لیا تھا جب کہ میں جھاڑیوں کے پیچھے احمقوں کی طرح دبکا رہا تھا اور بے حد مناسب موقع نکل گیا تھا۔

لیکن۔ ہاں۔ موقع ہمیشہ کے لئے تو نہ نکل گیا تھا۔

انتقام لینے کے بہت سے مختلف طریقے تھے اور آدمی کو بہترین طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ ایسا طریقہ جو زوردار ہو، ایسا ہو جو ان لوگوں کو بہت دیر تک بے حد سخت اذیت میں مبتلا رکھے جنہوں نے عزت کا نیلام کیا ہے۔ خاندان کے وقار پر کیچڑ اچھالنے والے ان لوگوں کو دیر تک اس طرح تڑپاتا رہے کہ وہ موت کی آرزو کریں اور انہیں موت نہ آئے۔ یہ سچ ہے کہ گنہگار کو گناہ کرتے وقت ہی..... یعنی اس عمل کے دوران ہی ٹھکانے لگا دینا چاہئے..... لیکن..... پھر یہ ہوگا کہ رومانی خاندان کا ایک فرد خونی کہلائے گا اور اس کی وجہ سے پورا رومانی خاندان خونیوں کا خاندان کہلائے گا۔ ''خونیوں کا خاندان'' کا ٹھپہ لگ جائے گا اس مشہور اور باعزت خاندان پر۔

نہیں۔ نہیں۔ میں ایسا نہ ہونے دوں گا۔ بدلہ لینے کے دوسرے طریقے بھی تو ہیں۔ دوسرے کئی راستے ہیں جو اسی منزل کو پہنچتے ہیں۔ انہیں پہچاننا اور پھر ایک مناسب راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ بشرط یہ کہ تھکا ہوا دماغ کوئی مناسب طریقہ سوچ لے۔ ٹھیک ہے۔ دماغ کو بھی موقع دینا چاہئے۔

اور میں اپنی درد کرتی ہوئی بے جان سی ٹانگوں پر اپنے نڈھال جسم کو گھسیٹتا ہوا اس طرف چلا جہاں ایک درخت گرا پڑا تھا اور میں اس کے تنے پر بیٹھ گیا۔ پھول کی مرجھائی پنکھڑیاں اب بھی میری مٹھی میں ہی تھیں۔ میرے کانوں میں جیسے تیزی سے بہتے ہوئے پانی کا شور تھا، دماغ میں طوفانی ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، زبان پر خون کا ذائقہ اور میرے ہونٹ جل رہے تھے جیسے مجھے تیز بخار ہو گیا ہو۔

''اس سفید بالوں والے ماہی گیر کو دیکھ رہے ہو؟'' بادشاہ نے کہا تھا۔ اور یہ ''سفید بالوں والا ماہی گیر'' میں تھا۔

اور میں نے میکانکی طور سے ان کپڑوں کو دیکھا جو میں نے پہن رکھے تھے ایک خودکشی کر لینے والے کا لباس تھا۔

''گدھا تھا وہ تو کہ اس نے خودکشی کر لی۔'' پرانے کپڑوں کے اس بوڑھے بیوپاری نے کہا تھا۔

بے شک، نرا گدھا تھا وہ۔ اور میں ایسا کروں گا۔ کم سے کم ابھی نہیں۔ پہلے تو مجھے کچھ کرنا ہے۔ بے شک اگر مجھے اس سے اپنے آپ کو صاف نکال لانے کا راستہ نظر آ جائے تو یہ کام کرنا ضروری ہے۔ مجھے ایک ایسا راستہ سوچنا تھا جو مجھے اس طرح سیدھا سیدھا منزل مقصود تک پہنچا دے کہ آخر میں مجھے نہ تو کوئی پشیمانی ہو اور نہ ہی مجھے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑے یا راستے میں کہیں ٹھوکر کھانی پڑے۔

میرے خیالات بھٹک رہے تھے۔ اس بخار زدہ آدمی کی طرح جو ہذیان میں مبتلا ہو۔ گلاب کی ان پنکھڑیوں کی خوشبو، جو میری مٹھی میں تھی۔

میری طبیعت خراب کر رہی تھی۔ اس کے باوجود میں انہیں پھینک نہ رہا تھا۔ نہیں ان پنکھڑیوں کو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا، اس لئے کہ یہ مجھے وہ ہم آغوش یاد دلاتی رہیں گی جو میں نے یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔

میں نے جیب میں اپنا بٹوہ تلاش کیا۔ مل گیا تو اسے باہر نکال کر کھولا اور مرجھائی ہوئی سرخ پنکھڑیاں احتیاط سے اس میں رکھ دیں۔ بٹوہ جیب میں رکھا تو مجھے دو چرمی تھیلیاں یاد آئیں جو میرے پاس تھیں۔ وہی دو تھیلیاں جن میں سے ایک سنہری سکوں سے بھری ہوئی تھی اور دوسری ان جواہرات سے جو میں ''اسے'' تحفے میں دینا چاہتا تھا۔

اور اندھیرے مقبرے میں اپنے کارنامے مجھے یاد آ گئے۔ میں نے آزادی اور زندگی کے لئے جو ہولناک جدوجہد کی تھی اسے یاد کر کے میں مسکرایا۔

''زندگی اور آزادی۔''

''چہ۔! یہ دونوں چیزیں میرے لئے اب کس کام کی تھیں؟ کیوں سنبھالوں میں انہیں؟ صرف ایک مقصد رہ گیا تھا اب ان کا.....انتقام۔

کسی کو میری ضرورت نہ تھی، ایک ان چاہی چیز تھا میں۔ اس دنیا میں اپنا پچھلا مقام حاصل نہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ ''لوگ'' نہ چاہتے تھے۔ وہ ساری دولت اور کل جائیداد جس کا میں کبھی مالک تھا، خود میری وصیت کے مطابق اب میری بیوی کی تھی۔ میری جگہ اب وہ رئیسہ اور ویلا رومانی کی مالکن تھی۔

لیکن میں کہاں مفلس تھا۔ سب کچھ گنوانے کے باوجود میں بھی بے پناہ دولت کا مالک تھا۔ ڈاکو کارمیلو یزی کا خزانہ میرا تھا اور یہ اتنی دولت تھی جو کسی کو بھی زندگی بھر کے لئے شہر کا بلکہ پورے علاقے کا سب سے زیادہ امیر آدمی بنا سکتی تھی۔ چنانچہ میں مرحوم فابیو رومانی کی بیوہ سے زیادہ بہت زیادہ امیر تھا۔

جب میں نے یوں سوچا تو ایک طرح کی میٹھی میٹھی خوشی میری رگوں میں دھڑکنے لگی۔

روپیہ؟..... ہاں۔ روپے سے سب کچھ کیا جاسکتا تھا۔ ہاں۔ سونے سے انتقام بھی خریدا جاسکتا تھا۔

لیکن کس قسم کا انتقام؟

ایسا انتقام جو میں لینا چاہتا تھا۔ انوکھا، صاف ستھرا، چوکھا، سخت، عبرت ناک اور مکمل ترین۔

ہاں۔ میرا انتقام ایسا ہی ہونا چاہئے اور میں سوچنے لگا۔ غور کرنے لگا۔

سمندر کی طرف سے تازہ اور فرحت بخش ہوا بہنے لگی، جھومتے ہوئے درختوں کے پتے آپس میں پراسرار سرگوشیاں کرنے لگے، بلبلیں اپنی مترنم آوازوں میں چہچہانے لگیں اور گہرے نیلے آسمان کے پس منظر میں پورا چاند کسی انتقام جو فرشتے کی روشن ڈھال کی طرح معلوم ہوا۔ اور میں گزرتے ہوئے وقت سے بے خبر کئی گھنٹوں تک وہیں اپنے خیالات میں گم بیٹھا رہا۔

''بے چارا فابیو! بہت بے سرا تھا۔'' نینا نے کہا تھا۔

اور پھر وہ ہنسی تھی۔ اس کی وہی تیز اور سرد ہنسی، جیسے دو تلواریں آپس میں ٹکرا رہی ہوں، سچ کہا تھا نینا نے زندگی کا ساز بجانے میں مجھ سے ایک زبردست غلطی ہوگئی اور سُر بگڑ گیا۔ ہم سب انسانوں میں زندگی کا ساز بجانے کی قابلیت تو ہوتی ہے اور ہم بڑے مزے سے یہ ساز بجاتے ہیں اور پھر ایک عورت کا لمس۔ ایک عورت کا جھوٹ۔ اس میں اپنا سر ملا دیتا ہے اور ہماری انگلی غلط پڑ جاتی ہے، گز غلط چل جاتا ہے اور نغمہ بجنے لگتا ہے۔ سر بگڑ جاتا ہے اور پھر سب سے بڑا عظیم نغمہ نگار بھی گزرے ہوئے پرسکون اور خوشگوار دنوں کے شیریں سر دوبارہ نہیں ملا سکتا۔

یہی انکشاف ہوا، اس رات مجھ پر اور اس سے پہلے کہ آپ اور آپ کے غم، دونوں ساتھ ساتھ بوڑھے ہو جائیں، آپ پر بھی یہ انکشاف ہوگا اور میری روح آپ کی سمجھ میں بھی یہ حیرت انگیز بات آجائے گی اور آپ کی بے یقینی یقین میں تبدیل ہو جائے گی۔

''سفید بالوں والا ماہی گیر۔''

سخت اذیت میں مبتلا اور جھنجھلائے ہوئے میرے دماغ میں بادشاہ کے یہ الفاظ بار بار گونج رہے تھے۔ بے شک..... میں بہت زیادہ بدل گیا تھا، میں بوڑھا اور کمزور معلوم ہوتا تھا۔ زندگی سے بیزار ایک معمر آدمی۔ کوئی بھی مجھے پہچان نہ سکے گا۔ کہ میں وہی..... پہلے والا فابیو ہوں۔

اور اس خیال کے ساتھ ہی ایک تجویز میرے ذہن میں آگئی۔ انتقام کا ایک خاکہ جو اتنا انوکھا، ایسا زبردست اتنا مکمل اور ساتھ ہی اس قدر ہولناک کہ میں خود ہی یوں اچھل پڑا جیسے کسی زہریلے سانپ نے مجھے ڈس لیا ہو۔

اور اب بے چینی سے میں ٹہل رہا تھا۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔ اور اس خوفناک انتقام کے منصوبے کی مہیب روشنی میرے اندھیرے دماغ کے ایک ایک گوشے میں پہنچ رہی تھی۔

کہاں سے آئی تھی میرے دماغ میں یہ

بھیانک دلیرانہ تجویز؟ کون سے شیطان نے یا یوں کہیے کہ انتقام کے کون سے فرشتے نے یہ تجویز مجھے سمجھا دی تھی؟ میں نے حیرت سے سوچا۔

اور اپنی اس حیرت میں ہی انتقام کے اس طریقے کی تمام تفصیلات اول تا آخر، ایک ترتیب سے جانے لگا۔ اس تجویز پر عمل کرنے کے دوران جو معمولی سے معمولی واقعہ اور چھوٹے سے چھوٹا اتفاق ہوسکتا تھا۔ اس پر پہلو سے میں نے غور کیا۔ میرا ماؤف دماغ مایوسی کی غفلت سے جیسے ایک دم بیدار ہوگیا اور اب خیالات جیسے سپاہیوں کی طرح پوری طرح مسلم اور چوکنے کھڑے تھے۔ محبت، پیار، معافی، درگزر، صبر..... چہ..... یہ جذبات میرے نزدیک مرچکے تھے۔ اس دنیا میں مجھے ان سے کیا واسطہ؟ صلیب سے اتر کر مرتے ہوئے یسوع مسیح نے اپنے دشمنوں کو معاف کردیا تھا تو اس نے مجھے کیا؟ میں مسیح تو نہیں اور پھر..... مسیح نے کبھی کسی عورت سے محبت تو نہ کی تھی۔

میری قوت ارادی اور مستقل مزاجی عود کر آئی۔

کم درجہ لوگ..... ماہی گیر اور عام ملاح یا پرانے کپڑے بیچنے والے اگر اپنی بیوی کی بے وفائی کا بدلہ اس طرح لیتے ہیں۔ کہ اسے قتل کردیتے یا خود ہی خودکشی کرلیتے ہیں تو یہ ان کے طریقے ہیں جو بے حد سستے قسم کے اور گرے ہوئے طریقے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جاہل ہیں اور غیر جذباتی ہیں لیکن میں..... میں نہ تو کم درجہ ہوں اور نہ ہی کسی معمولی خاندان کا فرد۔ چنانچہ میں اس قسم کا کوئی اوچھا جرم کرکے اپنے خاندان کے نام کو بٹہ نہ لگاؤں گا۔ نہیں رومانی انتقام یقینی سکون، اطمینان، سوچ بچار اور احتیاط سے لیا جائے گا۔ نہیں اس میں کسی قسم کا اندھا غیض وغضب نہ ہوگا، جلد بازی نہ ہوگی، کوئی بھاگ دوڑ اور ہنگامہ نہ ہوگا، کسی قسم کا عاجلانہ جوش وخروش نہ ہوگا اور کوئی بھی اوچھی حرکت نہ ہوگی۔ فابیو رومانی کا انتقام اس کی شایان شان ہوگا، مکمل ترین ہوگا، عبرت ناک ہوگا اور سخت ہوگا۔

چنانچہ میں سر جھکائے اور ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھے آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا اور ڈرامے کے ایک ایک منظر پر غور کررہا تھا۔ جس میں، میں سیاہ پردہ اٹھنے سے لے کر آخری سین پر پردہ گرنے تک، مرکزی کردار ادا کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

میرے دماغ پر چھائی ہوئی دھند ہٹ گئی تھی، میری سانس اب تک ٹھیک سے چل رہی تھی، میرے تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہوچلے تھے۔ جو منصوبہ میں نے بنایا تھا، اس کی تقریباً یقینی کامیابی کے خیال نے مجھے مطمئن کرکے خون سے کھولتے ہوئے لاوے کو ٹھنڈا کردیا۔ اب میں پوری طرح سے پرسکون تھا اور میرے حواس درست تھے۔ اب میں ماضی کو یاد کرکے غمزدہ اور اداس نہ ہورہا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس محبت کے گنوا دینے پر میں کیوں آنسو بہاؤں جو مجھے ملی ہی نہیں؟ ایسا تو نہ تھا کہ وہ دونوں بدذات میری فوری موت کے منتظر رہے تھے؟ نہیں میری شادی کے تین ہی مہینوں بعد ان دونوں نے مجھے اُلو بنانا شروع کیا تھا اور تین برسوں تک وہ اپنے گناہ میں مصروف رہے تھے اور میں ایسا اندھا بنا رہا تھا کہ مجھے ذرہ برابر بھی شک نہ ہوا۔ سچ سچ ان دونوں نے..... میری شریک حیات اور میرے جگری دوست نے..... مجھے سویا ہوا بیچ دیا تھا..... لیکن اب مجھے اپنے زخم کی گہرائی معلوم ہوچکی تھی۔ اب مجھے پتہ چل گیا تھا کہ کیسا کاری زخم لگایا گیا تھا مجھے۔ میں وہ آدمی تھا جس کے ساتھ سخت دھوکا کیا گیا تھا۔ میں وہ احمق تھا جسے بڑی کمینگی سے، بے خبری میں ٹھکا گیا تھا۔ چنانچہ اب انصاف، عقل اور خودداری کا تقاضا تھا کہ میں ان ذلیل اور کمینے لوگوں کو سخت سے سخت سزاؤں جنہوں نے میرے ساتھ چل چالی تھی اور مجھے بیوقوف بنایا تھا۔

اپنی بیوی کی محبت میں نے اپنے دل میں یوں نکال پھینکی جس طرح کہ آدمی اپنے گوشت میں چبھا ہوا کانٹا نکال پھینکتا ہے۔ نینا کے لئے میرے دل میں اب کوئی نرم گوشہ نہ تھا۔ نرمی میں نے اپنے دل میں سے

یوں اکھاڑ کر پھینک دی جس طرح وہاں مقبرے میں، میں نے اپنی گردن سے چپکے ہوئے اس انجانے اور ان دیکھے گھناؤنے کیڑے کو..... یا جو کچھ بھی وہ تھا اس کو..... اکھاڑ کر دور اندھیرے میں پھینک دیا تھا۔ دوستی کا وہ گرم جذبہ، جو میں برسوں سے جیدو کے لئے اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا اوپر سے نیچے تک ٹھیٹھ بنیاد پر سرد اور منجمد ہو گیا اور اس کی جگہ ایک دوسرا جذبہ ابھر آیا۔ نفرت کا نہیں بلکہ بے پناہ اور بے رحمانہ حقارت کا جذبہ۔

اور جب مجھے یہ یاد آیا کہ میں کس کس طرح خوشی خوشی ''گھر'' کی طرف آیا تھا اور اپنے دل میں کیسا مجنونانہ جوش اور رومیو کی سی محبت تھی تو مجھے اپنے آپ سے بھی گھن آنے لگی اور سچ تو یہ ہے کہ میں خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو گیا۔ وہ بیوقوف بھی مجھ سے زیادہ عقلمند ہوگا جو پہاڑ کی ایک چوٹی پر سے گھاٹی پھلانگ جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ گھاٹی میں گر کر مر جائے گا۔

میں بیدار ہو چکا تھا، میرا خواب پورا ہو چکا تھا اور زندگی کا فریب ختم ہو چکا تھا۔ میں انتقام لینے کے لئے کمر کس چکا تھا اور میں بہت جلد انتقام لے لوں گا۔

چنانچہ یوں کوئی ایک گھنٹے تک انتقام کے منصوبے پر غور کرنے کے بعد میں نے وہ راستہ منتخب کیا جس پر مجھے چلنا تھا۔ اور اپنے اس فیصلے پر گویا مہر لگانے کے لئے میں نے اپنے گریبان میں سے، سینے پر لٹکتی ہوئی وہ صلیب نکالی جو مرحوم راہب سپریانو نے میرے ساتھ میرے تابوت میں رکھ دی تھی۔ میں نے اسے چوما اور پھر مقدس علامت کو آسمان کی طرف بلند کر کے میں نے قسم کھائی کہ اس وقت تک اپنے دل میں رحم کی جگہ نہ دوں گا، اس وقت تک آرام نہ کروں گا اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ مکمل ترین انتقام نہیں لے لیتا۔

اور خاموش آسمان میں روشن ستارے میری اس قسم پر آنکھیں جھپکنے لگے، گاتی ہوئی بلبلیں بھی گھڑی بھر کے لئے جیسے میری قسم کے الفاظ سننے کے لئے خاموش ہو گئیں۔ ہوا نے آہیں بھر کر یاسمین کے پھولوں کی پنکھڑیاں میرے قدموں میں بکھیر دیں اور یوں میں نے سوچا۔ میری زندگی کے سفید دنوں کے آخری پتے بھی ٹوٹ کر بکھر گئے۔ خوشیوں کے دن، میٹھی یادوں کے دن اور سہانے خوابوں کے دن پورے ہوئے اور میں نے فیصلہ کیا کہ آج سے میری زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کچھ اور ہو گی۔ اب وہ ایک گرم کی ہوئی بظاہر خوب صورت اور لطیف زنجیر ہو گی۔ فولاد کی طرح سخت بے لوچ، سرد اور نہ ٹوٹنے والی ایک ایسی لمبی اور مضبوط زنجیر جیسے وہ جھوٹی زندگیوں کے گرد کئی دفعہ لپیٹا جا سکے گا۔ اس طرح کہ ان دونوں کے لئے فرار کی کوئی راہ نہ رہے گی۔ بے شک ایسا ہی کرنا ضروری تھا اور میں ایسا ہی کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

میں اپنے دل میں انتقام کی آگ نہیں بلکہ مضبوط ارادہ لئے پلٹا اور خاموش، مستحکم قدموں سے چل دیا۔ میں نے چھوٹا خفیہ دروازہ کھولا اور باہر کچی روش پر آ گیا۔ اور جب میں ویلا رومانی کے صدر دروازے میں سے باہر آ رہا تھا تو میں نے ایک کھنکتی ہوئی آواز سنی اور سر اٹھا کر دیکھا کہ ایک نوکر۔ خود میرا نوکر رات کے لئے پھاٹک بند کر رہا تھا۔ میں نے تالے میں کنجی گھومنے اور آڑ لگانے کی آواز سنی، اور مجھے یاد آیا کہ یہ پھاٹک جب میں نیپلز سے سڑک پر آیا تھا، پہلے تو مضبوطی سے بند تھے۔ تو پھر اس کے بعد انہیں کیوں کھولا گیا تھا؟

ہاں۔ اسی لئے تو اور میں اپنی بیوی کی عیاری پر آپ ہی آپ مسکرا اٹھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جانتی تھی کہ کیا کر رہی ہے۔ دکھاوا کرنا تو بہر حال ضروری تھا۔ سینور فیراری کو رسم و رواج کے مطابق گھر کے ایک ملازم کے ذریعے شائستگی سے صدر دروازے تک پہنچانا اور اخلاق سے رخصت کرنا ضروری تھا تاکہ کسی کو کوئی شک نہ ہو۔

(جاری ہے)

پراسرار پٹاری

نشاوقار-گلستان جوہر کراچی

وہ بلا کسی چوپائے کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں اور پائوں پر کھڑی تھی کہ اچانک اس کی غراہٹ سنائی دی اور اس کے دو دانت جو کہ لمبے تھے باہر کو نکل آئے تھے جسے دیکھ کر لوگ دہشت زدہ ہوگئے۔

دل و دماغ پر خوف کا سکہ بیٹھاتی تحیر انگیز خونچکاں..... بھونچکاں..... ڈراؤنی کہانی

''کائنات.....! آج میں جلدی گھر آجاؤں گا..... موسم بہت سہانا ہے۔ تم تیار رہنا سمندر کی سیر کو چلیں گے۔'' کامل نے گھر سے نکلتے وقت اپنی نئی نویلی دلہن سے کہا۔ جسے وہ گاؤں سے بیاہ کر لایا تھا۔ کائنات کامل کی بچپن کی محبت اور اس کی پھوپھی زاد تھی۔ اپنے بے تحاشہ حسن اور ذہانت کی بدولت بچپن سے کامل کے دل پر حکومت کر رہی تھی۔ اس پر سونے پر سہاگہ مڈل کلاس تک پڑھ کر گاؤں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں میں بھی اس کا شمار ہوتا تھا۔

کامل دس سال پہلے روزگار کی تلاش میں اندرون سندھ سے کراچی آیا تھا۔ جہاں اسے ایک فیکٹری میں نوکری مل گئی تھی۔ اسی لئے وہ شادی کے فوراً بعد کائنات کو اپنے ساتھ ہی کراچی لے آیا تھا۔ کائنات کو کراچی میں سب سے زیادہ سمندر پسند آیا تھا۔ اسے

سمندر پر جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ اور کامل کو کائنات کی ہر خوشی عزیز تھی۔ اسی لیے کامل کو جب موقع ملتا اسے سمندر کی سیر پر لازمی لے کر جاتا۔

مئی کے مہینے میں جہاں کراچی میں سارا دن سورج آگ برساتا ہے۔ وہیں شام ڈھلے ساحل سمندر سے آنے والی ٹھنڈی ہوائیں دن بھر کی آگ کو کافی حد تک ٹھنڈا کر دیتی ہیں۔ جب سے کائنات کراچی آئی تھی۔ تب سے اسے ڈوبتے سورج کے وقت موٹر سائیکل پر کامل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کراچی کی بڑی بڑی سڑکوں پر سفر کرنا بڑا بھایا تھا۔ ڈوبتے سورج کی لالی اور گرم ہواؤں کا ہولے ہولے ٹھنڈی ہوا میں بدل جانا ایک خوش کن احساس پیدا کر دیتا تھا۔ آج بھی سورج غروب ہونے سے پہلے دونوں میاں بیوی ساحل سمندر پر موجود تھے۔ اور سورج غروب ہونے کا منظر دیکھ رہے تھے کہ اچانک کائنات کی نظر ایک طرف سمندر کے اوپر لائن سے بنے ہوٹلوں پر پڑی جہاں لوگ کرسیوں اور میزوں کے علاوہ ان ہوٹلوں کی چھتوں پر بڑے بڑے گول تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اور سمندر سے آنے والی ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''کامل! یہ کونسی جگہ ہے؟ کتنا حسین منظر ہے وہاں بیٹھ کر سمندر کو دیکھنا تو مجھے ابھی تک وہاں لے کر کیوں نہیں گیا۔'' کائنات نے آخری جملہ بولتے ہوئے قدرے خفگی سے کامل کو دیکھا۔ ''ارے پگلی وہ جگہ امیر لوگوں کی ہے میری تنخواہ میں ہماری یہ والی تفریح ہی بہت مشکل سے ہو پاتی ہے۔ تو فکر نہ کر بس دعا کر رب سائیں مجھے اتنا پیسہ دے کہ میں تیری ہر خواہش پوری کر سکوں۔'' کامل نے کائنات کی آنکھوں میں اترتی اداسی کو دیکھ کر اسے سمجھایا۔

''کاش ہمارے پاس بھی ڈھیر سارا پیسہ ہوتا۔ کاش ہمیں بھی کوئی خزانہ مل جائے۔ جیسے پہلے زمانے میں لوگ زمین کھودتے تھے اور خزانہ مل جاتا تھا۔ خیر رب سائیں بھی انہی کو دولت سے نوازتا ہے۔ جو ہاتھ پاؤں چلاتے ہیں۔ تیرے پاس نہ ہنر ہے نہ تعلیم، ایسے میں تجھ سے یہ امید لگانا کہ تو میری ہر خواہش پوری کرے گا۔ محض دیوانے کے ایک خواب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ہائے میری قسمت ساری عمر باپ کے گھر آسائشوں کے لیے ترستی رہی۔ شوہر بھی ایسا ملا کے اب باقی کی زندگی بھی حسرتوں میں گزر جائے گی۔'' کائنات نے ایک لمبی سانس لبوں سے خارج کر کے حسب عادت شکوہ کیا۔ شکر کرنا تو جیسے کائنات جانتی ہی نہیں تھی۔

کائنات فطرتاً ایک لالچی اور ناشکری عورت تھی۔ کراچی جیسے بڑے شہر میں رہنے اور گاؤں کی مشکل زندگی سے بچنے کے لیے اس نے کامل سے شادی کی تھی۔ ورنہ کائنات جیسی حسن پرست عورت کے لیے کامل جیسا عام سی شکل صورت کا مرد کسی خاص اہمیت کا حامل نہ تھا۔ کہنے کو تو وہ اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھتی تھی۔ لیکن ذہنی پسماندگی کا یہ حال تھا کہ بات بات پر کامل کو انگوٹھا چھاپ، جاہل، غریب اور عام سی شکل صورت والا ایسا مرد جو کائنات جیسی خوبصورت پڑھی لکھی ذہین عورت کے ساتھ چلتا ہوا حور کے پہلو میں لنگور لگتا تھا۔ کہ طعنے دیتی رہتی تھی۔ اور کامل اس کی محبت میں اتنا ڈوب چکا تھا۔ کہ اس کی بدتمیزیوں کو محبوب کی ادا سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا۔

''ارے یہ، یہ کیا ہے؟'' کامل جو کائنات کی باتوں پر دلبرداشتہ ہو کر ایکسٹرا انکم کمانے کے لیے اپنی ہی فیکٹری میں رات کی نائٹنگ میں واچ مین کی ڈیوٹی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسی اثنا میں کوئی بھاری سی چیز کامل کے پاؤں سے آ کر ٹکرائی۔ غالباً لہروں نے اسے سمندر سے نکال کر ساحل پر لا پٹخا تھا۔ جہاں وہ کامل کے پاؤں سے آ کر ٹکرائی تھی۔ یہ تو کوئی قدیم چیز دکھائی دے رہی ہے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی۔ کامل نے اس پٹاری نما ڈبے کو اپنے پاؤں کے پاس سے اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ کامل کھول اسے دیکھتے ہیں اس میں کیا ہے؟ کائنات بھی اپنا غصہ بھول کر تجسس سے پٹاری کو دیکھنے لگی۔ نہیں مجھے ڈر لگ رہا ہے اس میں رب جانے

کیا ہے اس کے اندر عجیب پراسراری چیز ہے کہ دیکھ کر ہی وحشت ہورہی ہے۔ کامل نے اس ڈبے کو دور پھینکتے ہوئے کہا۔ اور کائنات کا ہاتھ پکڑ کر تیز تیز چلتا ہوا پارکنگ کی طرف آ گیا۔ جہاں اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اور موٹر سائیکل کو تقریباً ہوا میں اڑاتا ہوا آدھے گھنٹے کا راستہ پندرہ منٹ میں طے کر کے گھر پہنچا اور سکون کا سانس لیا۔ نا جانے کیوں اس پٹاری نما ڈبے کو دیکھ کر کامل کی چھٹی حس زور زور سے خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے۔ عجیب سے ڈر نے کامل کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ جس سے وہ گھر آ کر بھی نکل نہیں پا رہا تھا۔

ساری رات کامل کے خواب میں ایک انتہائی ہیبت ناک شخص مسلسل اس سے وہ پٹاری مانگتا رہا جیسے وہ خود سمندر میں پھینک کر آیا تھا۔ وہ بار بار کامل کو اس پٹاری کے بابت خبردار کر رہا تھا کہ کامل اس پٹاری کو واپس اس ہیبت ناک شخص کو دے دے ورنہ وہ پٹاری کامل کو برباد کر دے گی اور کامل بار بار اسے یہ یقین دلا رہا تھا۔ کہ پٹاری اس کے پاس نہیں ہے۔ اس کی شکل اس قدر خوفناک تھی۔ کہ سوتے میں مارے دہشت کے کامل کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ سوتے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ کائنات جو پہلے ہی کامل کے سوتے میں چیخنے پر خوفزدہ ہوگئی تھی۔ دروازے کے زور زور سے بجنے پر مزید خوفزدہ ہوگئی۔ دونوں نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

رات کے اس پہر بھلا کون ہوسکتا ہے۔ تمام عزیز و اقارب تو ان کے اندرونی سندھ میں رہتے ہیں۔ یہاں تو کوئی انھیں صحیح سے جانتا تک نہیں تھا۔ اوپر سے طوفانی بارش اور بادلوں کی گرج چمک دل دہلائے دے رہی تھی۔ اور کچھ خواب کا بھی اثر تھا جس کی وجہ سے کامل کی دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی۔ دروازہ دھڑ دھڑانے کی آواز مستقل اعصاب پر ہتھوڑے کے مانند برس رہی تھی۔ بلآخر کامل ہمت کر کے دروازے تک پہنچ ہی گیا۔

کک کک کون؟ کامل نے تھوک نگلتے ہوئے بڑی مشکل سے پوچھا۔ دروازہ کھول کامل میں کرم داد تیرا چاچا کرم داد کی آواز سن کر کائنات اور کامل کی جان میں جان آئی۔ چاچا! تو اس پہر؟ خیر تو ہے سب کامل نے جلدی سے دروازہ کھول کر چاچا کو اندر آنے کا راستہ دیا بارش کی وجہ سے وہ اوپر سے نیچے تک پورا بھیگ چکا تھا۔ سلام ماما کرم داد کائنات نے کرم داد کے قریب آ کر سر پر ہاتھ پھیروایا اور کچن سے جا کر پانی لے آئی جب تک کامل، کرم داد کے لیے اپنے کپڑے لا چکا تھا۔ یہ لے چاچا کپڑے بدل لے تیرے تو سارے کپڑے ہی گیلے ہوگئے ہیں۔

”نہیں کامل مجھے فوراً نکلنا ہے۔ تجھے خبردار کرنے آیا ہوں تو خطرناک ماورائی مخلوق کے شکنجے میں پھنس گیا ہے۔ جتنا جلدی ہو سکے اپنے آپ کو بچا تیری دنیا اور آخرت دونوں خطرے میں ہیں۔ ان کی بہت ہی قیمتی چیز تیرے پاس آ گئی ہے وہ انھیں واپس کر دے ورنہ وہ ماورائی طاقتیں تجھے برباد کر دیں گی۔“ چاچا کرم داد یہ کہتے ہوئے تیزی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ جیسے اگر وہ زیادہ دیر کامل کے گھر ٹھہرا تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔

چاچا کرم داد روحانی علم کا ایک بہت بڑا عالم تھا اور گاؤں میں اپنی روحانیت اور بہت سی باتوں پر وقت سے پہلے آگہی پر مشہور تھا۔ کامل تو اس کی گود میں کھیلا ہوا تھا۔ چاچا کرم داد کے دل میں ہمیشہ سے ہی کامل کے لیے نرم گوشہ تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ کامل پر آنے والی آفت کا اسے علم ہوگیا تھا۔ اور وہ دوڑا دوڑا رات کے اس پہر طوفانی بارش میں اسے خبردار کرنے چلا آیا تھا۔

جسے ہی کرم داد گھر سے باہر نکلا ایک زور دھماکہ کے ساتھ لائٹ چلی گئی۔ شاید تیز ہواؤں کے باعث بجلی کا تار ٹوٹ کر گرا تھا۔ چاچا کرم داد کے گھر سے نکلتے ہی گلی میں موجود بلیوں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ چاچا سویرے تک ٹھہر جا موسم بہت خراب ہے۔ کامل کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کرم داد باہر

نکل کر اندھیرے میں گم ہو چکا تھا۔

کائنات موبائل کی ٹارچ آن کر کے کمرے کے دروازے پر کھڑی پریشانی سے کامل کو دیکھ رہی تھی۔ کامل جو پہلے ہی خواب کی وجہ سے خوفزدہ تھا۔ اوپر سے ہنگامی حالت میں چاچا کرم داد کی آمد اور ان کا خبردار کرنا کامل کو مزید خوفزدہ کر گیا۔

موبائل کی رنگ ٹون نے کامل کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ ''ارے بابا سائیں کی کال آ رہی ہے۔ یقیناً چاچا کے بارے میں پوچھے گا کہ وہ خیریت سے پہنچا یا نہیں لا جلدی موبائل دے میں بات کروں بابا سائیں سے۔

سلام بابا سائیں سب خیر تو ہے اس وقت فون کیا۔ کامل نے کال ریسیو کر کے بابا سائیں سے بات کی اور ساتھ ہی کائنات کو اشارے سے موم بتی جلانے کو کہا۔ وسلام۔ خیر نہیں ہے کامل تیرا چاچا کرم داد اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ آج رات تین بجے دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے وہ اب ہم میں نہیں رہا۔ کل ظہر میں اس کی تدفین ہے تو کائنات کو لے کر آ جانا''

کیا ہوا کامل سب خیر تو ہے۔ کائنات ہاتھ میں موم بتی لیے کامل کو فون پر باتیں کرتے دیکھ رہی تھی۔ لپک کر کامل کی طرف بڑھی جس کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ مانو خون کی ایک بوند نہ ہو جسم میں پاؤں کی کپکپاہٹ کے باعث اس کا پورا جسم کٹی ہوئی شاخ کی طرح ڈول رہا تھا۔ اگر کائنات بروقت اسے نہ پکڑتی تو وہ کب کا زمین بوس ہو چکا ہوتا۔ کائنات نے اسے سہارا دے کر زمین پر بٹھایا اور آہستہ آہستہ اس کی کمر سہلانے لگی۔ کافی دیر تک کامل سکتے کی حالت میں زمین پر بیٹھا گھڑی کو دیکھتا رہا جس میں اس وقت ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اور چاچا کرم داد تین ساڑھے تین کے درمیان ان کے گھر آیا تھا۔ جبکہ بابا سائیں تو کہہ رہے تھے کہ چاچا کرم داد کا انتقال رات تین بجے ہوا ہے تو اس کا مطلب وہ چاچا کرم داد کی روح تھی۔ جو اسے خبردار کرنے آئی تھی۔ گھڑی کو دیکھتے ہوئے کامل نے لرزتے ہوئے سوچا۔ اتنے میں قریب کی مسجدوں سے اذان فجر کی آوازیں بلند ہوئیں تو کہیں جا کر کامل کا خوف کچھ کم ہوا۔

کیا ہوا کامل تو ٹھیک تو ہے نا؟ کامل کو حواسوں میں آتا دیکھ کر کائنات نے پوچھا۔ خیریت نہیں ہے کائنات ہم بہت برے پھنسے ہیں۔ تجھے پتا ہے ہمارے اس گھر کا ایڈریس کسی کو نہیں پتا۔ میں نے شادی کے بعد تیری سہولت کے لیے یہ گھر کرائے پر لیا تھا۔ اور اس کے بعد تجھے رخصت کر کے لے آیا یہاں پر۔ اس کے بعد گوٹھ سے کوئی ہمارے گھر نہیں آیا اور نہ ہی میں وہاں گیا۔ تو پھر چاچا کرم داد رات کے اس پہر طوفانی بارش میں ہمارے گھر کیسے پہنچا۔

کائنات نے حیرانگی سے کامل کو دیکھا جو ابھی بھی ہلکے ہلکے کپکپا رہا تھا۔ کائنات جو ہمارے گھر رات کو تین بجے آیا تھا وہ چاچا کرم داد نہیں تھا۔ بابا سائیں نے بتایا ہے کہ چاچا کرم داد کو آج رات تین بجے دل کا دورہ پڑا اور وہ اس دنیا سے چلا گیا۔ کامل نے کائنات کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سختی سے جکڑ کر کہا مبادا کائنات بے ہوش ہی نہیں ہو جائے۔ یہ سب سن کر وہ خود اس وقت خطرناک حد تک خوفزدہ ہو گیا تھا۔

کک کک کیا۔ کائنات بری طرح سے ہکلا گئی۔ دھیرے دھیرے صبح کی روشنی تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی نمودار ہوئی تو میاں بیوی کا خوف کچھ کم ہوا پرندوں کی چہچاہٹ نے سناٹے کا سکوت توڑ کر ان کے گھر میں بسا موت کا سناٹا ختم کیا تو کامل اور کائنات نے اس وحشت ناک سناٹے کے ختم ہونے پر سکھ کا سانس لیا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کہاں کیا غلطی ہوئی ہے مجھ سے۔ شیطانی قوتوں کی ایسی کون سی شے میرے ہاتھ لگ گئی ہے۔ جسے لینے کے لیے شیاطین پاگل ہو رہے ہیں۔ رات بھر عجیب ڈراؤنے خوابوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ پھر چاچا کرم داد والا واقعہ۔ یہ ہو کیا رہا ہے میرے ساتھ؟ کامل دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

کامل ایک بات کہوں غصہ تو نہیں ہوگا؟ کائنات نے ڈرتے ڈرتے کامل سے پوچھا اگر نارمل حالت ہوتے تو شاید کائنات کبھی بھی کامل کو کچھ نہیں بتاتی۔اس نے یہ ہی سوچا تھا کہ وہ جو بھی کچھ کرے گی کامل کی غیر موجودگی میں کرے گی۔لیکن پے در پے پراسرار واقعات نے کائنات کو بھی اچھا خاصا خوفزدہ کر دیا تھا۔

کیا ہوا ہے بول؟ تو نے کچھ چھپایا ہے کیا مجھ سے؟ کامل نے انجانے خوف سے گھبرا کر جلدی سے کائنات کا بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

کل جب تو سمندر سے واپسی پر موٹر سائیکل لینے گیا تھا۔ اس جگہ سے جہاں بہت ساری موٹر سائیکلیں کھڑی ہوتی ہیں پارکنگ ایریا تو ،تو نے مجھ سے اس جگہ سے تھوڑا دور کھڑے ہونے کو کہا تھا۔تو تو میں نے جلدی سے جا کر وہ پٹاری اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لی تھی۔ جسے تو سمندر میں پھینک کر آیا تھا۔ کائنات نے ڈرتے ڈرتے کامل کو بتایا۔

اوہ تبھی تو سوچوں کہ اچانک سے زندگی میں ہلچل کیوں مچ گئی ہے۔ جب میں اس کو وہاں پھینک کر آیا تھا۔ تو کیوں اٹھایا تو نے اس کو؟ بڑی اپنے آپ کو عقل مند سمجھتی ہے؟ میں نے کچھ سوچ کر ہی اس کو پھینکا تھا نا، جا جلدی سے لے کر آ اس کو۔ ابھی واپس سمندر میں ڈال کر آتا ہوں اس پٹاری کو، کامل نے غصے سے گھورتے ہوئے کائنات کو جھڑکا۔

کامل کو غصے میں دیکھ کر کائنات جلدی سے بھاگ کر کمرے سے پٹاری تو لے آئی، لیکن اس کا دل کسی طور راضی نہیں تھا۔ کہ پٹاری کو واپس سمندر میں پھینک کر آیا جائے کامل ٹھنڈے دماغ سے میری بات سن تو اس پٹاری کو ایک واری کھول کر تو دیکھ ہوسکتا ہے رب سائیں ہماری قسمت بدلنا چاہتا ہو۔ کائنات نے پٹاری کامل کے حوالے کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

جیسے ہی پٹاری کائنات کے ہاتھ سے کامل نے اپنے ہاتھ میں لی اس کا غصہ ختم ہوگیا۔ اور وہ تجسس سے اس پٹاری کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔اور یہ ہی تو اس پٹاری کی خاصیت تھی یہ صرف لالچی لوگوں کے پاس ہی جاتی تھی۔اور ان کے پاس پہنچ کر انھیں مزید لالچی بنا دیتی تھی۔ ور یہاں تو کائنات بری طرح لالچ میں مبتلا تھی اور کائنات کی خواہشات کی تکمیل کے لیے کامل بھی لالچ میں آجاتا تھا۔

کامل کو تجسس سے پٹاری کو دیکھتا دیکھ کر کائنات کا بھی حوصلہ بڑھا۔ کامل میں نے سنا ہے کہ سمندر میں بڑا خزانہ چھپا ہوسکتا ہے اس پٹاری میں سونا چاندی ہو جو ہمارے دن پھیر دے پٹاری نے دونوں میاں بیوی کے دماغوں کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں کرلیا تھا۔ جس

سردار جی

ایک سردار جی دانت نکلوانے کے لیے دندان ساز کے پاس گئے۔ڈاکٹر نے ٹیکہ لگانا چاہا تو سردار جی اڑ گئے ''کہ ٹیکہ نہیں لگواؤں گا۔کوئی اور ترکیب کرو۔''

خاصی بحث وتمحیص کے بعد طے پایا کہ سردار جی کو وہسکی پلائی جائے تاکہ نشے کی وجہ سے دانت نکالے جانے کی تکلیف محسوس نہ ہو۔سردار جی نے پینا شروع کی اور آہستہ آہستہ آدھی بوتل پی گئے۔ ڈاکٹر کی قوت برداشت جواب دینا شروع ہوگئی۔اس نے کہا۔

''کیا خیال ہے سردار جی، اب نکال لوں دانت؟''

سردار جی نے چند لمحے لہرانے کے بعد بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں اور کرپان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''اب تم میرے دانت کو ہاتھ لگا کر تو دکھاؤ۔''

(شمس الحق شمسی۔کراچی)

کی وجہ سے کل سے اب تک ہونے والے تمام پراسرار واقعات اور چاچا کرم داد کی آمد اور ان کا خبردار کرنا سب ان کے دماغ سے محو ہو چکا تھا ڈر خوف کی جگہ لالچ نے لے لی تھی اب تو صرف ایک ہی لگن تھی کہ جلد سے جلد پٹاری کو کھول کر اس سے دولت حاصل کی جائے تو نے تو کہا تھا کہ اس میں سونا، چاندی ہوگا یہ تو خالی پڑی ہے۔ کامل نے جلدی سے پٹاری کھولی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ تو خالی تھی۔

خالی پٹاری دیکھ کر کائنات کو بھی مایوسی ہوئی۔ اور وہ کامل کے ہاتھ سے پٹاری لے کر اس کے اندر جھانکنے لگی۔ جیسے وہ پٹاری نہیں کنواں ہے اور اندر جھانکنے پر کنویں کی تہہ میں چھپا خزانہ اسے نظر آجائے گا۔ کامل اس پٹاری کے چاروں طرف کچھ لکھا ہوا ہے۔ کائنات نے ہاتھ سے پٹاری کے اندر کی مٹی صاف کی اور اندر لکھے الفاظ کو جوڑ توڑ کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

جو چاہو گے ملے گا لیکن
دینا ہوگا وہ جو ہے قیمتی

کائنات نے حیرت سے اپنے منہ سے نکلنے والے الفاظ کو سنا اور حیرانگی سے کامل کو دیکھنے لگی کامل اس پٹاری پر جو زبان لکھی ہے وہ مجھے پڑھنا نہیں آتی۔ رب سائیں جانے یہ کون سی زبان ہے میں تو اپنی مادری زبان بھی اٹک اٹک کر پڑھتی ہوں مجھے نہیں پتا ایک انجان زبان کو میں نے اتنی روانی سے کیسے پڑھ لیا ہوسکتا ہے یہ پٹاری ہماری قسمت بدلنا چاہتی ہو۔ جب ہی تو سب کچھ خود بخود ہوتا چلا جارہا ہے۔

کامل نے کائنات کی حیرانگی دور کرنے کیلئے اسے تسلی دی اس وقت لالچ نے دونوں میاں بیوی کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ آنے والے وقتوں میں ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اور ویسے بھی جو کہ اب میں اسے ہماری قیمتی چیز چاہیئے۔ اور قیمتی چیز ہمارے پاس کوئی ہے نہیں جس کے چلے جانے کا ہمیں دکھ ہوگا۔ اور جب ہمارے پاس بہت سی دولت ہوگی تو ہر چیز خریدی جاسکتی ہے بازار سے کائنات نے کامل کو سمجھاتے ہوئے کہا اور پٹاری کو سختی سے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر دولت مانگنے لگی۔

☆.....☆.....☆

اگلے کچھ دنوں میں بڑے عجیب سے واقعات رونما ہوئے۔ پٹاری نے گھر میں رکھی ہوئی ہر بند چیز کو نوٹوں اور جواہرات سے بھر دیا تھا کامل اور کائنات جس بند چیز کو کھولتے اس میں جواہرات اور نوٹوں کا ڈھیر نظر آتا۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل ہوگئی تھی۔ کائنات بہت خوش تھی وہ جو چاہتی تھی وہ اسے مل گیا تھا۔ اور کامل، کائنات کی خوشی میں خوش تھا۔

ابھی یہ لوگ صحیح سے خوش بھی نہیں ہو پائے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کائنات کا حسن بالکل ماند پڑتا چلا گیا ایسا لگتا تھا جیسے دیمک اسے آہستہ آہستہ چاٹ رہی ہو۔ بڑے سے بڑے اسکن اسپیشلسٹ کو دکھایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔

''درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔''

چند ہی دنوں میں کائنات خوبصورت اور جوان لڑکی سے انتہائی بدصورت اور ہیبت ناک بڑھیا لگنے لگی تھی۔ جو بھی اس کی شکل دیکھتا اس کی چیخیں نکل جاتیں کامل نے کائنات کو باہر لانا لے جانا بالکل بند کر دیا تھا اب کامل سمجھ گیا تھا کہ یہ سب پٹاری کا کیا دھرا ہے۔ اس نے دولت کے بدلے میں کائنات کی سب سے قیمتی چیز اس کا حسن چھین لیا تھا۔ لیکن جب تک دونوں میاں بیوی کو یہ بات سمجھ آئی بہت دیر ہو چکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کائنات گل سڑ کر کیچڑ بن گئی تو مجبوراً کامل نے اسے ایک شاپر میں ڈال کر گھر کے آنگن میں ہی دفنا دیا۔ لیکن کائنات کی قبر سے مستقل آوازیں آرہی تھیں۔ کامل میں زندہ ہوں مجھے نکال یہاں سے میرا دم گھٹ رہا ہے یہاں پر۔

کائنات کو دفنا کر کامل کافی دیر تک قبر کے سرہانے بیٹھا روتا رہا۔ اسے اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ وہ کیوں لالچ میں آیا اچھی خاصی خوشگوار زندگی برباد ہو کر رہ گئی سب سے بڑھ کر اس کی زندگی اس کی کائنات

اس سے جدا ہوگئی تھی اور پھر قبر سے آنے والی کائنات کی آہ و بکا نے اسے الگ بے چین کر رکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے یہ سب ایسی باتیں تھی جو کسی کو بتائی بھی نہیں جاسکتی تھیں۔ انہیں سوچوں میں گم کامل گھر سے باہر نکلا وہ بہت پریشان تھا اسے ہر حال میں کائنات کو اس اذیت سے نکالنا تھا جس سے وہ دوچار تھی۔

رک کہاں جارہا ہے تیرے مسئلے کا حل میرے پاس ہے۔ کامل اپنی سوچوں میں گم ایک نالے کے ساتھ بنی فٹ پاتھ پر سے گزر رہا تھا کہ اچانک سے آنے والی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک آدمی نالے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ حلیہ سے وہ کوئی فقیر لگ رہا تھا جس نے انتہائی گندے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔

جا بابا اپنا کام کر پہلے اپنے مسئلے حل کر پھر کرنا دوسروں کا مسئلہ حل اپنی حالت کی خبر نہیں چلے ہیں دوسروں کے حالات بدلنے۔'' کامل جو پہلے ہی پٹاری کے چکر میں آکر اپنی محبوب بیوی کو کھو چکا تھا۔ اس شخص کی باتیں سن کر غصے سے پھٹ پڑا۔

''میں دعویٰ کرتا ہوں تیری بیوی کو زندہ کرنے کا، بول کیا پھر بھی یقین نہیں کرے گا تو میرا۔'' اس فقیر کے کہہ گئے الفاظ سے کامل کے آگے بڑھتے قدم رک گئے۔ اور وہ تیزی سے پلٹ کر اس فقیر کے قدموں میں آکر بیٹھ گیا۔ ''تت تجھے کیسے پتا یہ سب کون ہے تو؟ کیا تو سچ کہہ رہا ہے؟ میری کائنات کو تو دوبارہ زندہ کردے گا؟ میرے پاس بہت سارا پیسہ ہے میں اپنا سارا پیسہ تیرے قدموں میں ڈھیر کردوں گا۔ بس تو میری کائنات کو زندہ کردے۔'' کامل نے اس فقیر کے گھٹنوں پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔

''تو رکھ اپنی دولت اپنے پاس مجھے بس وہ پٹاری چاہیئے جو تیرے پاس ہے۔ فقیر نے کامل سے کہا اور کامل کے اثبات میں سر ہلانے پر اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ''ٹھیک ہے تو چل میرے ساتھ میں سمجھاتا ہوں تجھے سب۔'' فقیر اٹھ کر ایک جانب چلنے لگا اور کامل اس کے پیچھے ہولیا۔

''تو مجھے کہاں لے کر جارہا ہے بابا۔ میری کائنات تو گھر پر ہے تو گھر چل میرے ساتھ اور اسے زندہ کر۔'' کائنات کی جدائی نے کامل کو پاگل سا کردیا تھا۔ وہ گناہ ثواب کی پرواہ کئے بغیر ہر اس کام کو کرنے کے لیے تیار تھا۔ جو اس کی کائنات کو دوبارہ زندہ کردے اس کے کیچڑ زدہ روپ کو اس کا اصلی روپ دے دے۔

''کب، کہاں، کیسے اور کیوں کو چھوڑ کر تو صرف وہ کرتا جا جو میں تجھ سے کرنے کا کہوں۔'' فقیر اس کو لے کر قبرستان میں بنی ایک جھونپڑی میں لے آیا۔ ''بیٹھ جا سکون سے اور یہ لے پانی پی۔ فقیر نے جھونپڑی میں رکھے مٹکے میں سے اسے پانی نکال کر دیا اور کچے فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ پانی پی کر کامل کو واقعی سکون محسوس ہوا اور اس کی اضطرابی کیفیت میں پہلے کی نسبت کافی بہتری آگئی۔ تو غیر ارادی طور پر وہ فقیر کو دیکھنے لگا۔

جو دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھ رہا تھا اس فقیر کی شکل اس قدر خوفناک تھی کہ عام حالت میں اگر وہ اس کو دیکھتا تو شاید چیخ مار کر بے ہوش ہوجاتا۔ لیکن پے در پے پراسرار واقعات اور کائنات کا انتہائی خوبصورتی سے بدصورتی اور پھر اس کے وجود کا کیچڑ میں بدل جانا ان سب واقعات نے کامل کے اعصاب کو پتھر اکر رکھ دیا تھا۔ اب اس کے دل سے ہر قسم کا ڈر اور خوف نکل چکا تھا۔ اب بس ایک لگن تھی کہ اپنی کائنات کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔ تیری بیوی مری نہیں زندہ ہے۔ بس اس کا وجود اور اس کی خوبصورتی کا بھینٹ لے لیا گیا ہے اور جس طاقت نے یہ سب کیا ہے میں تو کیا کوئی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ لیکن تیری بیوی کو اس دنیا میں واپس لاسکتا ہوں۔ بس تجھے وہ سب کرنا ہوگا جو میں تجھ سے کہوں۔''

''تو جو کہے گا میں وہ سب کرنے کے لیے تیار ہوں بس میری کائنات مجھے مل جائے مجھے اور کچھ نہیں

چاہیے۔''

کامل نے ایک بار پھر فقیر کے دونوں پاؤں پکڑ کر اس سے کہا۔

''کل اماوس کی رات ہے اور اس رات تمام شیاطین کی طاقت ڈبل ہو جاتی ہے اور کالا جادو اس رات میں سر چڑھ کر بولتا ہے۔ تیری بیوی زندہ ہے اور اس کی روح اسی دنیا میں موجود ہے۔ بس اس کے لیے ایک انسانی جسم چاہیئے جس میں وہ روح سمائی جاسکے۔ بس تجھے ایک انسانی جسم کا بندوبست کرنا ہے۔ فقیر کی بات پر کامل نے حیرانگی سے اسے دیکھا انسانی جسم میں کہاں سے لے کر آؤں گا بھلا کون دے گا مجھے اپنا جسم اس کام کے لیے؟ فقیر کی بات سن کر کامل پریشان سا ہو گیا۔

اوم عقلے بھلا ایک جیتا جاگتا انسان تجھے کیوں دے گا اپنا جسم تیری بیوی کی روح کے لیے پھر اس کی روح کہاں جائے گی پگلے۔ کامل کی بیوقوفانہ بات پر فقیر قہقہے لگا کر ہنس پڑا اس ہنسی کی آواز اتنی ڈرانی تھی کہ ایک پل کے لیے کامل کو لگا کے اس کی دل کی دھڑکن رک سی گئی ہے۔

کل سورج ڈھلتے ہی اندھیرا جب قبرستان کو اپنی آغوش میں لے لے گا تو کل عصر کے وقت ایک خوبصورت جوان لڑکی کا جنازہ آئے گا۔ تجھے اس لڑکی کا جسم قبر سے نکال کر میرے پاس لانا ہوگا یہاں پر فقیر نے جھونپڑی میں موجود واحد چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر تو دیکھتا رہ جائے گا کہ اس لڑکی کے جسم میں تیری بیوی کی روح کیسے سما جائے گی۔ فقیر کی باتوں پر کامل لمحہ بھر کے لئے کانپ سا گیا۔ فقیر جو بول رہا تھا وہ کام کسی بھی عام انسان کے لیے اتنا آسان نہیں تھا۔ کامل کا دماغ اسے بار بار سرزنش کر رہا تھا کہ کچھ بہت غلط ہونے والا ہے اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا بوریا بستر اٹھائے اور ہمیشہ کے لیے گاؤں واپس چلا جائے۔ اب تک جو ہوا سو ہوا مزید اپنے آپ کو اس شیطانی دلدل میں پھنسانے سے بہتر ہے کہ اللہ سے توبہ کرے اور اپنی باقی ماندہ زندگی اللہ اللہ کرتے گزار دے۔ کل سورج کے ڈھلتے ہی تو آجانا۔ دیر نہ کرنا مردہ جسم اور زندہ روح کا ملاپ اماوس کی رات کو ہی ہوتا ہے۔ اگر تو نے دیر کی تو اپنی بیوی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دے گا۔ چل جا اب تو مجھے ساری رات چلہ کاٹنا ہے تمام شیطانی طاقتوں کو جمع کرنا ہے تیرے کام کے لیے۔

ایسا لگتا تھا جیسے فقیر کو کامل کے دل و دماغ میں چلنے والی باتوں کا علم ہو گیا ہے۔ کامل نے جھونپڑی سے باہر نکلتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

سارے راستے کامل اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ کرے تو کیا کرے بلآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ ہی گیا کہ بس گھر سے اپنی ضروری چیزیں لے کر چابی مکان مالک کے حوالے کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس شہر کو چھوڑ دے گا۔

کامل کہاں چلا گیا تھا تو مجھے اکیلا چھوڑ کر تجھے پتا ہے نا تیری کائنات کتنا ڈرتی ہے اکیلے پن سے مجھے نکال اس قبر سے میں زندہ ہوں میرا جسم گل سڑ گیا ہے میری روح زندہ ہے مجھے نکال یہاں سے۔

کامل جیسے ہی گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا پورے گھر میں کائنات کی آواز اسے گونج رہی تھی جیسے کسی خالی اور سنسان جگہ پر آواز گونجتی ہے اور عجیب سی خوشبو اور بدبو کی ملی جلی مہک پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی کامل سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بدبو ہے یا خوشبوں لیکن اس مہک کی وجہ سے کامل کی سانس رک رہی تھی۔ اس کا نظام تنفس اس مہک کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور اس کو پنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا وہ جوان سارے چکروں سے جان چھڑا کر ہمیشہ کے لیے اپنے گاؤں جانے کا سوچ کر گھر اپنا ضروری سامان لینے آیا تھا۔

اب اسے کل رات کا شدت سے انتظار تھا کے جلدی کل کا سورج ڈھلے اور وہ قبرستان کی راہ لے اسے ہر حال میں اپنی کائنات کو واپس اس دنیا میں لانا تھا۔ اس کی روح کے لیے جسم کا بندوبست کرنا تھا۔ آخر

پٹاری سے حاصل کردہ رقم کا وہ کائنات کے بغیر کیا کرے گا کائنات کے بغیر تو یہ زندگی زندگی ہی نہ تھی۔

کائنات کی قبر سے مستقل آوازیں آرہی تھیں۔ کامل ساری رات اس کی قبر کے سرہانے بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا اسے تسلی دیتا رہا رات سے صبح اور صبح سے شام ہوگئی جب سورج ڈھل گیا اور رات کی تاریکی چار سو پھیل گئی۔ تو کامل نے اس فقیر کے کہنے پر کائنات کی قبر کھودی اور اس میں سے وہ شاپر نکالا جس میں کائنات کی کیچڑ زدہ باقیات تھے جنھیں کامل نے نہ جانے کیا سوچ کر شاپر میں ڈالا تھا۔ جو آج فقیر کے کہنے پر اسے نکالنا پڑا۔ اس شاپر کو لے کر کامل سیدھا قبرستان کی طرف چل دیا۔ ''یہ لے بابا یہ میری کائنات ہے دنیا کی سب سے حسین ترین عورت جسے اس پٹاری نے کیچڑ بنا دیا ہے۔''

کامل فقیر کے کہنے پر کیچڑ اور پٹاری دونوں ساتھ لایا تھا فقیر کو دونوں چیزیں تھماتے ہوئے اس نے افسردگی سے کہا اور فقیر کے اشارہ کرنے پر جھونپڑی سے نکل کر سیدھا اس قبر کے پاس آ گیا۔ جس کی نشاندہی فقیر نے کی تھی۔ اور اب اسے یہاں سے وہ مردہ جسم نکالنا تھا جس کے بارے میں کل فقیر اسے سب کچھ بتا چکا تھا۔ قبر کے پاس آنے تک کامل ہر طرح کے احساسات و جذبات سے آزاد تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے بیلچے سے نئی تازہ بنی ہوئی قبر کی گیلی مٹی کو ہٹانا شروع کیا تو اس کے اندر عجیب سے احساسات پیدا ہوگئے جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا قبر کے نزدیک جلتی ہوئی اگربتیاں اور قبر پر پھیلی ہوئی تازہ گلاب کی پتیاں اس بات کی علامت تھیں کہ میت کو دفن کیے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔ اور فقیر نے بھی اس سے ایسے ہی مردہ جسم کا کہا تھا جسے دفنائے ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا ہو۔

اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے لیکن قبرستان میں پھیلا گھپ اندھیرا اور بادلوں سے ڈھکا آسمان آدھی رات کا سماں پیش کر رہا تھا۔ اماوس کی رات کے اندھیرے نے قبرستان میں عجیب سی وحشت پیدا کر دی تھی۔ موسم کے تیور بتا رہے تھے کے کسی بھی وقت بارش شروع ہو جائے گی۔ کبھی کبھی آسمان پر بجلی چمکتی تو کچھ لمحے کے لیے قبرستان کی تاریکی ختم ہو جاتی اور قبرستان کی نئی پرانی ٹوٹی خستہ حال قبریں اور ان کے قطبے عیاں ہو کر ماحول کی ہولناکی میں مزید اضافہ کر دیتے قبرستان میں لگے درختوں پر شاخیں ایسے لٹک رہی تھیں۔ جیسے درختوں پر چڑیلیں الٹی لٹکی ہوں یا پھر کامل کو ہی اس وقت ہر چیز سے خوف محسوس ہو رہا تھا قبرستان کی خاموشی میں جب کسی جانور کی آواز خلل ڈالتی تو کامل پوری جان سے کانپ جاتا تھا۔

جیسے ہی کامل میت کو اٹھانے کے لیے اس کے قریب گیا کافور کی تیز مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی اور وہ کھانستا ہوا قبر سے باہر نکلا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

فقیر نے اندر جھونپڑی میں عمل شروع کر دیا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کی آواز کامل کے کانوں سے ٹکراتی اور وہ جو سب کچھ چھوڑ کر بھاگنے کی سوچ رہا ہوتا دوبارہ سے کام میں لگ جاتا۔

کامل نے ایک بار پھر گہری سانس لی اور دوبارہ قبر میں اتر گیا اپنا ایک ہاتھ میت کے سر کے نیچے رکھا اور دوسرا اس کی کمر کے نیچے رکھا اور اسے گود میں اٹھا کر قبر سے باہر نکلا اور فقیر کی جھونپڑی کی سمت چل دیا۔

جھونپڑی کی جانب بڑھتے ہوئے اس کی نظر قبرستان کے خارجی دراوزے پر پڑی جہاں اسے ایک ہیولا دکھائی دیا۔ جو ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب بلا رہا تھا اور آہستہ آہستہ سرگوشی کے سے انداز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ جو کامل کو صحیح سے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ''کامل بھاگ یہاں سے بہت برا ہونے والا ہے تیرے ساتھ شیطانی قوتوں نے تیرا دل و دماغ مفلوج کر دیا ہے میں تیری کوئی مدد نہیں کر پا رہا میں قبرستان کے اندر نہیں آ سکتا شیطانی قوتوں نے قبرستان کو اپنے حصار میں لے لیا ہے بہت مشکل سے میں نے اپنی آواز

تجھ تک پہنچائی ہے تو جیسے ہی قبرستان سے باہر نکلے گا تو بچ جائے گا ان سے۔''

جیسے ہی بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں دروازے کے باہر کی طرف کھڑا شخص جو بار بار اسے خطرے سے آگاہ کررہا تھا کی شکل واضح ہوگئی ابھی وہ چاچا کرم داد کہتا ہوا اس کی جانب لپکا ہی تھا کہ ایک دم بادلوں کی تیز گرج چمک کے ساتھ دھواں دھار بارش شروع ہوگئی۔

''اوئے کامل جلدی آ تیری کائنات کی روح اپنے نئے جسم میں جانے کے لئے تیرا بڑی بے صبری سے انتظار کررہی ہے۔'' فقیر کی آواز نے کامل کے قدم دوبارہ جھونپڑی کی سمت کردیے وہ جو وقتی طور پر چاچا کرم داد کی آواز پر ہوش میں آیا تھا۔ دوبارہ شیطانی قوتوں کے شکنجے میں جکڑ کر اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو کھو بیٹھا۔

کامل میت کو لے کر جھونپڑی میں داخل ہوا اور فقیر کی پہلے سے تیار کی ہوئی چارپائی پر اس میت کو لٹا کر فقیر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ جہاں فقیر اپنے سامنے ایک کالے رنگ کے پیالے میں کوئلے دہکا رہا تھا جس میں رب جانے اس نے اینا کیا ڈالا تھا کہ ایک مسحور کن خوشبو چار سو پھیلی ہوئی تھی جس نے لمحہ بھر میں کامل کا سارا ڈر خوف ختم کر کے اسے ریلکس کردیا تھا۔ اب وہ بڑی بے چینی سے کائنات کی نئے جسم میں آمد کا انتظار کر رہا تھا اور مستقبل کے سہانے خواب بن رہا تھا۔ پٹاری سے حاصل کردہ دولت اتنی تھی کہ وہ اگر ساری زندگی بھی بیٹھ کر کھاتا بھی تو کم نہ پڑتی کامل نے سوچ لیا تھا کہ وہ کائنات کو ساتھ سمندر پار لے جائے گا وہاں یہ لوگ اپنی نئی زندگی کی ابتدا کریں گے۔

ابھی وہ مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھویا ہوا ہی تھا کہ اسے کسی چیز کے غرانے کی آواز اپنے بالکل قریب سے محسوس ہوئی۔ اور ایک ساتھ بہت سی بلیوں کی رونے کی آوازیں تو بے ساختہ کامل نے آنکھیں کھول کر آواز کے سمت دیکھا۔ اور خوف اس کی کمر کی ہڈی میں سنسناہٹ بن کر دوڑ گیا۔

کامل نے پتھرائی ہوئی نظروں سے فقیر کو دیکھا جس کے گلے پر میت اپنے دانت گاڑے اس کا خون پی رہی تھی اور غرانے کی اور تڑپنے کی آواز اس فقیر کی تھی کامل خوف سے جم کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ جیسے ہی میت خون پی کر ہٹی تو وہاں موجود بلیوں نے اس فقیر کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی۔ کامل اس کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کیونکہ جس لڑکی کو وہ قبر سے نکال کر لایا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی۔ لیکن اس وقت وہ کسی چڑیل سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ لمبے بکھرے ہوئے بال سفید کفن جو کہ فقیر کے خون سے لال ہوگیا تھا اور اس پر لال انگارہ آنکھیں جن کی پتلیاں اوپر کو چڑھی ہوئی تھی۔ وہ کسی چوپائے کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں اور پاؤں پر کھڑی تھی اس کے منہ سے خون ٹپک رہا تھا اور چہرہ آہستہ آہستہ خوبصورتی سے انتہائی ہیبت ناک اور خوفناک ہوتا جارہا تھا جب وہ اس فقیر کا خون پی چکی تو آہستہ آہستہ کامل کی طرف بڑھنے لگی۔

کامل! تو نے میری روح کو جسم دیا۔ تیرا شکریہ، لیکن مجھے بہت شدید پیاس لگی ہے۔ جو انسانی خون سے ہی بجھے گی۔ مجھے معاف کردے تیرا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ لیکن مجھے تیرا خون پینا ہی پڑے گا۔ میں چاہ کر بھی اپنے آپ کو روک نہیں سکتی۔ اماوس کی رات میں جب مردہ جسم اور زندہ روح کا ملاپ ہوتا ہے تو ڈائن جنم لیتی ہے۔ اور ڈائن کی پیاس انسانی خون سے ہی بجھتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس ہیبت ناک زندہ روح اور مردہ جسم کے ملاپ نے اپنے دانت کامل کی گردن پر گاڑ دیے۔

اور جب کامل کا خون پینے کے بعد بھی اس کی تشنگی نہ ہوئی تو وہ قبرستان سے نکل کر انسانی آبادی والے علاقے کی طرف چل دی۔ اسے ابھی اپنی پیاس بجھانے کے لیے مزید شکار درکار تھے۔ قریب پڑی پراسرار پٹاری لالچی انسانوں کا عبرتناک انجام دیکھ کر قہقہے لگا کر ہنس دی۔

بددعا کا آسیب

مونا شہزاد۔ کیلگری کینیڈا

اچانک دروازہ کھلا اور محبوب کمرے میں داخل ہوا اسے زندہ دیکھ کر خوبرو حسینہ حیران رہ گئی اسے کسی طور یقین نہیں آرہا تھا کہ برسوں پہلے خودکشی کرنے والا اچانک زندہ کیسے ہوگیا لیکن حقیقت اس کے سامنے تھی۔

خودغرضی اور مطلب پرستی کی ایک انمٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر کپکپی طاری کردے گی

لڑکی کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ وہ کسی وقت میں خوبصورت رہی ہوگی مگر اس وقت تو اس کو دیکھ کر کراہیت آرہی تھی۔ وہ کمرے کے کونے میں بیٹھی کچھ کھا رہی تھی۔ پادری نے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہا تو وہ ٹھہرا گیا۔ وہ بیٹھی چوہے کا گوشت کھا رہی تھی۔ اس کے منہ پر خون لگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل سیاہ ہوگئی تھیں ان کا سفید حصہ غائب ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر زخموں کے نشان تھے۔ شاید وہ بہت دن سے نہائی نہیں تھی۔ اس کے پاس سے عجیب سی سڑاند آرہی تھی۔ پادری کا دل اچھل کر گلے میں آ گیا اور اسے بہت سخت متلی سی محسوس ہوئی۔ وہ ناک پر رومال رکھے مڑا۔ لڑکی جست مار کر اس کے سامنے آ گئی۔ پادری زندگی میں پہلی بار شدید دہشت زدہ ہو چکا تھا۔ لڑکی چلائی:

''میں چڑیل ہوں۔ میں سب کچھ کھا جاتی ہوں۔ میں کھانا کھا جاتی ہوں، مال کھا جاتی ہوں، کسی کا اعتبار اور پیار کھا جاتی ہوں۔ پھر کسی کی زندگی بھی کھا جاتی ہوں۔ مگر پتا نہیں کیوں میری بھوک ختم نہیں ہوتی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے چوہے کے باقیات اپنے منہ میں بھر لئے۔

پادری تیزی سے ہاتھ جھٹک کر باہر بھاگ گیا۔ اس نے کانپتے ہوئے کہا:

''یہ واقعی کوئی چڑیل ہے جس کا سایہ آپ کی بیٹی پر ہوگیا ہے۔ آپ اس کا سر مونڈ دیجئے۔ جیسے ہی اس کے بال کٹ جائیں گے، چڑیل کا سایہ جاتا رہے گا۔ اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتا۔''

مسٹر پنٹو اور مسز پنٹو نے پریشانی میں سر ہلایا، ان کی اکلوتی بیٹی پچھلے چھ ماہ سے عجیب و غریب بیماری کا شکار تھی۔ سب ڈاکٹر جب اس کے علاج سے عاجز آ گئے تو بات روحانی علاج پر آ گئی تھی۔ آج چرچ سے پادری کو اسی مسئلے کے حل کے لئے بلایا گیا تھا مگر وہ بھی خوفزدہ ہو کر بھاگ گیا تھا۔ مسٹر پنٹو نے بیٹی کو بے ہوشی کا انجکشن زبردستی لگایا اور نائی کو گھر بلا کر اس کے بال مونڈنے کا حکم دے ڈالا۔ اب وہ دونوں بے صبری سے اپنی بیٹی کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تین گھنٹے بعد وہ ہوش میں آئی تو جست لگا کر چھپکلی کو پکڑ کر کھاتے ہوئے ہذیان بکنے لگی۔

''میری بھوک نہیں مٹتی!
میری بھوک نہیں مٹتی۔''

مسٹر پنٹو اور مسز پنٹو روتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ ان کے ہاتھوں سے امید کا دامن پھر نکل چکا تھا۔ ان کی بیٹی چڑیل کی چڑیل ہی تھی۔

☆.....☆.....☆

مسٹر پنٹو نے ڈرتے ڈرتے ماہر نفسیات کے کمرے میں قدم رکھا، انہوں نے بیٹی کا ہاتھ کس کر پکڑ رکھا تھا۔ وہ زیر لب کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ ڈاکٹر نے لڑکی کو آرام دہ کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ لڑکی اسے دیکھ کر اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر بولی:

''تجھے کھا جاؤں!
میں تجھے کھا جاؤں گی۔''

ماہر نفسیات نے مسٹر پنٹو کو ہاتھ سے رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔

ماہر نفسیات نے لڑکی کی آنکھوں کے آگے رنگ دار، چمکیلا گولا گھمانا شروع کر دیا۔ جلد ہی لڑکی تنویمی نیند کا شکار ہو چکی تھی۔

ماہر نفسیات گہری آواز میں بولا:

''الٹی گنتی میں گننا شروع کر دیتا ہوں۔ تم مجھے ماضی کے اس دن میں لے جاؤ گی جب اس مسئلے کا آغاز ہوا ہے۔''

اس نے پچاس سے الٹی گنتی کا آغاز کیا۔ وہ جب تیس تک پہنچا تو لڑکی نے بولنا شروع کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی فلم کا سین دیکھ کر اس کی وضاحت کر رہی ہو۔

وہ ہولے سے بولی:

''وہ بہت وجیہہ تھا اور روز چھپ چھپ کر مجھے دیکھتا تھا۔ میں جان کر اسے نظر انداز کرتی رہتی تھی۔ میری زندگی فلرٹنگ پر چل رہی تھی۔ میں اور میری سہیلیاں نوجوان کالج کے لڑکوں کو جی بھر کر احمق بناتی تھیں۔ ایسے میں میری نظر میں مجبور مرد کی کیا اہمیت تھی دوسرا میں جانتی تھی کہ ان سے پیسے ٹھگنا مشکل کام ہوتا تھا۔ خیر اس روز کا بیان میں آپ کو اس کی ڈائری سے اس کی زبانی پڑھ کر سناتی ہوں۔ اس نے ڈائری میں لکھا تھا۔ اچانک اس کے گلے سے مردانہ آواز برآمد ہونے لگی۔ ماہر نفسیات تیزی سے نوٹس بناتے ہوئے سارا سیشن ریکارڈ کر رہا تھا۔

وہ نوجوان مردانہ آواز بولی:

''میں نے حسرت سے اس خوبصورت حسینہ کو چوری چوری دیکھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ کوئی اتنا دلکش اور معصوم کیسے ہو سکتا تھا؟

وہ روز کی طرح آج بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ میں نے کافی ہاؤس کے ماحول پر نظر ڈالی۔ کئی نوجوان ان طرحدار شوخ لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان منچلوں کی شوخیاں

نوجوانوں کے سینوں پر چھریاں چلا رہی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے آج میں نے ہمت نہیں کی تو کوئی نہ کوئی نوجوان اس حسینہ کو لے اڑے گا۔ میرا دل ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا۔ میں پچھلے چھ ماہ سے اس کافی ہاؤس میں صرف اسی امید پر آتا تھا کہ مجھے اس نازنین کا دیدار نصیب ہوجائے۔ مجھے یاد تھا کہ میں نے پہلی مرتبہ اسے مری کے مال روڈ پر دیکھا تھا۔ میں کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر بھرتی ہوا تھا اور اپنی کلاسز سے فارغ ہوکر وقت بتانے مال روڈ آ گیا تھا۔ ایسے میں میری ٹکر اس نازنین سے ہوگئی تھی اور اس کی کافی اس پر گر گئی تھی۔ وہ ناک چڑھا کر ایک ادا سے بولی تھی۔

''اندھے ہو کیا؟

تمہیں نظر نہیں آ رہا کہ میں سامنے سے آ رہی ہوں۔ سارا لباس تباہ کر دیا۔''

میں نے معذرت کی کوشش کی مگر وہ سنی ان سنی کر کے اسے وہاں سے چل پڑی۔ اس روز مجھے پتا چلا تھا کہ پہلی نظر کی محبت کیا ہوتی ہے۔ وہ وہاں سے جا چکی تھی مگر اس کا سحر مجھ پر طاری ہو چکا تھا میں بہت دیر وہیں سرشار سا کھڑا رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ سایہ بھی ہو سکتی تھی۔ ایسے میں ہماری دوبارہ ملاقات ناممکن تھی۔ میں اس روز بہت عرصے بعد چرچ گیا تھا اور سراپا دعا بن گیا تھا۔ میرا رواں رواں دعا کر رہا تھا کہ وہ نازنین مجھے دوبارہ واپس مل جائے۔ اگلے روز وہ مجھے ماؤنٹین کافی ہاؤس میں مل گئی۔ وہ شاید گزشتہ کل کا واقعہ بھول چکی تھی۔ اس نے اچٹتی ہوئی لاپروا نظر مجھ پر ڈالی اور دوستوں سے بات چیت میں مگن ہوگئی۔ میں نے ان کے قریب والی میز پر ڈیرہ ڈال لیا اور کان ان کی گفت و شنید کی طرف لگا دیئے۔ مجھے پتا چلا کہ وہ مقامی کانونیٹ کی طالبات تھیں اور روز شام چار بجے کافی ہاؤس میں اکٹھی ہوتی تھیں۔ بس پھر اس روز سے میں بھی روز اس کے دیدار کے لئے کافی ہاؤس پہنچ جاتا تھا۔ آج بھی میں تو بس اسی تپسیا میں مصروف تھا کہ کالج کے نوجوان طالبعلموں نے میرا سکون چرا لیا، وہ لگاوٹ سے ان لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ لڑکیاں بھی ان کی توجہ پا کر کچھ زیادہ ہی شوخ ہو رہی تھیں۔ آخر کار مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں جھجکتا ہوا ان کے قریب گیا اور دھیرے سے بولا:

''کیا آپ جیسی خوبصورت لڑکی کو میں کافی آفر کر سکتا ہوں۔''

وہ شعلہ بدن، ناز آفرین میری بات سن کر لگاوٹ سے معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی سہیلیوں سے بولی:

''کیا خیال ہے سکھیوں! آج میری سالگرہ کے خاص موقع پر مسٹر ایکس، وائی، زیڈ کو ہم اپنے ساتھ کافی پینے کا شرف بخشیں۔''

تمام لڑکیاں معنی خیز انداز میں بولیں:

''بالکل سارہ! کیوں نہیں! کیوں نہیں!

میں فاتحانہ انداز میں مسکرایا، آخر کار محبوب سے رابطے کا سلسلہ جو نکل پڑا تھا۔ میں نے کافی ہاؤس میں بیٹھے طالبعلموں کو دیکھ کر سر ہلایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے حسرت سے ماہ جبینوں کے جھرمٹ میں گھرے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے رقابت اور رشک محسوس کر رہے تھے۔ اس ماہ جبین نے بیرے کو بلایا اور آرڈر لکھوانا شروع کر دیا۔ اب میرے چہرے پر گھبراہٹ کے رنگ نمایاں ہونے لگے تھے۔ مہینے کا آخر تھا۔ میری جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں اتنے بڑے آرڈر کا بل ادا کر سکتا، مگر میں دل کڑا کر کے بیٹھا رہا۔ میں نے سوچا:

''شاید اس کی سالگرہ ہے۔ اس لئے بل بھی یہ خود ادا کرے گی۔''

جلد ہی میز سج گئی۔ ڈونیٹس، ٹمبٹس، چاکلیٹ اسٹرابیریز، چیز کیک، سموسے، پیٹیس، نوڈلز، چاٹ، چکن کارن سوپ، فرائیڈ چکن لگتا ہے کوئی چیز مینیو کی بچی نہیں تھی۔ کئی ڈشز میرے لئے نئی تھیں جن کے نام سے بھی میں واقف نہیں تھا۔ میں نے اپنے ماتھے پر آئے

پسینے کو صاف کیا اور ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرنے لگا۔ سارہ ایک پرکشش مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے باتیں کررہی تھی جب کہ باقی لڑکیاں مجھ سے بات چیت کے بجائے آپس میں گپ شپ میں مصروف تھیں۔ پھر چیز کیک پر اٹھارہ موم بتیاں روشن کی گئیں اور سارہ کی اٹھارہویں سالگرہ کا کیک مبارک سلامت کے شور میں کاٹا گیا۔ مجھے آج اپنا آپ معتبر سا لگنے لگا۔ لڑکیاں پھر کھانے پینے میں مگن ہوگئیں۔ وہ سب میرے سامنے بیٹھی کھانے سے بھرپور انصاف کررہی تھیں۔ آخر میں کافی بھی آ گئی۔ جلد ہی سب سہیلیوں نے سارہ کو تحائف دینے شروع کردیئے۔ سارہ ہر ایک کا منہ چوم کر تحفہ وصول کرتی۔ آخر وہ مسکرا کر اٹھلا کر میری طرف رخ کرکے بولی:

''میری سالگرہ کا تحفہ آپ کیا لائے ہیں؟''

مجھے تو اپنی خوش نصیبی پر رشک سا آ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اسی حسینہ کی صراحی دار گردن کو مدنظر رکھتے ہوئے پچھلے ماہ ایک گولڈ کی چین خریدی تھا۔ اس چین پر لگے دل شکل کے پینڈنٹ میں مابدولت نے اپنی تصویر ڈالی تھی جب کہ اس نازنین کی تصویر کا خانہ ابھی خالی تھا۔ میں نے جھٹ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ بریسلٹ مخملیں کیس سے باہر نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ سارہ نے مسکراتے ہوئے اپنی گردن جھکائی۔ میں اس ادا پر ریشہ خطمی ہوگیا، میں نے کانپتے ہاتھوں سے وہ چین اسے پہنادی۔ وہ ایک ادا سے اٹھی اور میرے گال سے ہونٹوں کو مس کرکے ایک ادا سے بولی:

''تھینکس مسٹر؟''

میں نے کپکپاتے ہونٹوں سے اپنا نام بتایا۔ وہ مسکرائی اور بولی:

''سجاد۔''

میرے کانوں میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اسی اثنا میں بیرا بل لے آیا۔ وہ مسکرا کر بولی:

''سجاد! بل ادا کریں گے۔''

اس نے ٹشو پیپر پر اپنا سیل فون نمبر لکھا اور ایک ادا سے میری ہتھیلی پر دھر دیا۔

میں اس کی اسی ادا پر ریشہ خطمی ہوگیا۔ وہ مسکرا کر مجھے شکریہ کہہ کر سہیلیوں کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ میں نے بل پر نظر دوڑائی تو بارہ ہزار کا بل دیکھ کر چکرا گیا۔ میری جیب میں صرف پانچ ہزار روپے تھے۔ میں نے باقی بل کریڈٹ کارڈ سے ادا کیا۔ میں کبھی بھی کریڈٹ کارڈ استعمال نہیں کرتا تھا کیونکہ مجھے قرضے کا بوجھ ہرگز پسند نہیں تھا۔ مگر سارہ کی سالگرہ اور اس کے التفات کی خوشی میں آج مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

پھر تو روز میری ملاقاتیں اس سے ہونے لگیں۔ کبھی ہم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھاتے، کبھی کسی آئس کریم پالر میں۔ سارہ ہر جگہ اپنی سہیلیوں کو ساتھ لاتی۔ میرے شکوے پر مسکرا کر ایک ادا سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی:

''کیا کروں جان؟

وارڈن سخت ہے۔ ان کے بغیر میں کہیں نہیں جاسکتی۔''

میں بھی فوراً مان جاتا۔ میں اسے دل کھول کر شاپنگ کرواتا اس کی ہر خواہش پوری کرتا۔ میں محبت کے دھنک رنگوں میں اتنا گم تھا کہ مجھے احساس نہیں ہوا کہ سارہ پر کی گئی شاہ خرچیوں کے نتیجے میں میرا بال بال قرضے میں جکڑا جارہا تھا۔ میں جب بھی اسے انکار کرنا چاہتا وہ مچل کر میرے گلے لگ جاتی۔ اس کے جسم کا گداز اور خوشبو میرے حواس مختل کردیتی۔ میں اب خواہش کے الاؤ میں جلنے لگا تھا۔ میں ایک بھرپور جوان مرد تھا سارہ کی مہربانیاں میری پیاس مزید بڑھا رہی تھیں۔ میں نے حتمی فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اب اس سے بات کرکے اس کے والدین سے رشتے کی بات کروں گا۔ یہی سوچتے ہوئے آج میں کشمیر پوائنٹ کی طرف تنہا ہائکنگ کرتا جارہا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں وہ آواز پڑی جس کو میں لاکھوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ آواز سارہ کی تھی۔ میں اسے ڈرانے کی نیت سے دبے پاؤں درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ اور اس کی ہمجولیاں خرمستیاں کرتی آرہی تھیں۔ وہ سانس لینے کے

بہانے رکیں۔

شگفتہ نے کہا:

''سارہ! تو نے مجنوں کے متعلق کیا سوچا ہے؟ معاملہ اب سنجیدہ ہوتا جارہا ہے۔ ہم میں سے کسی نے کبھی کسی مرغے کو اتنا حلال نہیں کیا جتنا تو نے سجاد کو کردیا ہے؟ پھر پارٹ ٹائم دوسری عاشقیاں بھی تو چل رہی ہیں۔ سوچ اگر کسی دن بھانڈا پھوٹ گیا تو؟''

میرے دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا۔ میرا پورا جسم سماعت میں ڈھل گیا۔ میں سارہ کا جواب سننا چاہتا تھا۔

سارہ ہنس کر بولی:

''کیا کروں؟ سجاد جیسا الو بھی تو پہلے نہیں ٹکرا۔ ابھی تو اس سے گاڑی کی فرمائش کرنی ہے۔ پیدل سفر کر کر کے میرے تو پیر گھس گئے ہیں۔ بس گاڑی آ گئی اور سجاد صاحب کی چھٹی پکی۔''

فائزہ ہنس کر بولی:

''وہ احمق گاڑی بھی لے دے گا تجھے مہارانی۔ ابھی پچھلے ہفتے تو تجھے ڈائمنڈ رنگ دی ہے اس نے۔ قسم سے بڑا ہی بھولا ہے۔ کاش ایسا احمق عاشق ہمیں بھی مل جائے۔ ہمیں تو سب سیانے ہی ملتے ہیں جو دوسری ملاقات میں ہی جسمانی ہوس بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ناز معنی خیز انداز میں بولی:

''سارہ کا عاشق بھولا ہے یا چغد عظیم ہے؟''

سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

آنیہ بولی:

''ویسے یار مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ اچھا نہیں کررہے۔ وہ دوسرے لڑکوں کی طرح تیرے ساتھ وقت گزاری نہیں کررہا۔ وہ واقعی میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، کبھی اپنی حد سے نہیں بڑھا۔ یہ تو سارہ ہی ہے جو اس کے گلے لگ لگ کر اس کا صبر آزمائی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ مسئلہ کیا ہے وہ بھی عیسائی ہے اور سارہ بھی عیسائی ہے۔ وہ پڑھا لکھا، برسرروزگار ہے۔ شکل وصورت کا بھی اچھا ہے۔ پھر مسئلہ کیا ہے؟''

سارہ ناک سکوڑ کر بولی:

''تو کر لے اس سے شادی۔ مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ چہرے پر چشمہ لگائے۔ نوکروں کی طرح جی حضوری کرتا مرد بھلا مرد ہوتا ہے، مرد تو وہ ہوتا ہے جو عورت پر حکومت کرتا ہے۔ پھر مجھے تو میرا ڈیوڈ ہی پسند ہے۔ صحیح مرد، حکم دیتا، اپنے ناز اٹھواتا، میری منگنی اس سے میری مرضی سے ممی ڈیڈی نے کی ہے تو میں شادی بھی اسی سے کروں گی۔''

میرا سر چکرا رہا تھا۔ جسے میں دل کی لگی سمجھ رہا تھا وہ درحقیقت سارہ کی نظر میں محض دل لگی تھی۔ اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور سارہ کا مفلر ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا میرے پیروں میں آ گرا۔ میں سن سا کھڑا اگلا بی مفلر کو پتھرائی ہوئی نظروں سے تک رہا تھا۔ اچانک سارہ کی آواز آئی:

''میرا مفلر۔۔۔''

آنیہ بولی:

''چھوڑ یار! تجھے کون سی کمی ہے۔ سجاد کو کہنا دس دلا دے گا۔''

وہ ہنستی، کھلکھلاتی ہوئی اوپر کی جانب چلی گئیں۔ مگر سارہ بھاگتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں گھس آئی۔ اس کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی۔ وہ شرمندگی سے پیلی پڑ گئی۔ میں نے اسے زخمی نگاہوں سے دیکھا اور کہا:

''تو یہ سب تمھاری بھوک کا شاخسانہ تھا۔ کتنی بھوک ہے تمھاری؟

کیا کیا ہڑپ کرو گی میرا پیار، میرا مان، میرا سمان، میری عزت نفس، میری کمائی؟''

اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر میں اس کا ہاتھ جھٹک کر بھاگ گیا۔

☆.....☆.....☆

اچانک مریضہ خاموش ہوگئی۔

ماہر نفسیات بھاری آواز میں بولا:

''پھر کیا ہوا سارہ؟

سجاد کہاں گیا؟''

سارہ نے تکلیف سے سر پٹخا اور کہا:

''مجھے نہیں پتا؟

مجھے بھوک لگی ہے؟

میں سب کچھ کھا جاؤں گی۔''

اچانک اس کے جسم پر تشنجی کیفیت طاری ہوگئی۔ ماہر نفسیات اسے ٹرانس سے فوراً باہر لے آیا۔ اس نے باہر آ کر مسٹر پٹو کو بلایا اور اگلے ہفتے دوبارہ مریضہ کو لانے کو کہا، وہ اس دوران کچھ تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ اس کا طریقہ علاج تمام ماہرین نفسیات سے یکسر مختلف اور جدید تھا۔ وہ بھوت پریت اور چڑیلوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اگلے ہفتے سارہ اسی دگرگوں حالت میں کھینچ کر اس کے پاس لائی گئی۔ ماہر نفسیات نے چمکدار رنگین گولے کی حرکت سے اسے ٹرانس میں کیا اور کہا:

''سارہ! مجھے بتاؤ تمھاری حالت اس طرح کیسے ہوئی؟''

سارہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولی:

''میں یاد نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے اس طرف مت لے کر جاؤ۔''

ماہر نفسیات نے حتمی لہجے میں کہا:

''تمھیں حقیقت بتانی پڑے گی۔''

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی:

''کشمیر پوائنٹ کے واقعے کے بعد مجھے احساس گناہ نے گھیر لیا۔ میں نے سجاد کو فون کیا، اس سے کالج میں ملنے گئی مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں اس کے کاٹیج گئی تو وہاں مجھے اس کی ڈائری ملی۔ ڈائری پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ میں نے ایک محبت کرنے والے شخص کا دل توڑ دیا تھا۔ مجھے احساس ندامت ہر وقت گھیرے رکھتا۔ مگر سجاد تو جیسے غائب ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا اترا ہوا چہرہ، اس کی شکوہ کناں آنکھیں یاد آتیں۔ میری نیندیں اڑ گئیں، میں اس کے اعتبار کی قاتل تھی۔

کچھ دنوں کے بعد میری سالگرہ تھی۔ میری سہیلیوں نے میرا دل بہلانے کے لئے اس کا اہتمام ماؤنٹین کافی ہاؤس میں ہی کیا۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس روز جب کافی ہاؤس پہنچی تو اس روز کافی ہاؤس غیر معمولی طور پر خالی تھا۔ صرف ہم چھ دوستیں وہاں موجود تھیں۔ کیک سے پہلے بہت پر تکلف اسنیکس پیش کئے گئے۔ مجھے اپنی اٹھارہویں سالگرہ یاد آ گئی جس پر میں پہلی بار سجاد سے ملی تھی۔

میرا دل رو پڑا، میرا من کیا کہ سجاد کسی کونے سے نکل کر آ جائے اور مجھے تحفہ دے کر گلے لگا لے۔۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ میری امید مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں اسے منالوں گی۔ میں خود اس کی بے لوث محبت سے متاثر ہو چکی تھی۔ کھانے کے بعد میری سہیلیوں نے کیک پر موم بتیاں لگائیں، میں نے موم بتیاں بجھائیں اور کیک کاٹا، میرا رواں رواں کہہ رہا تھا کہ میرا محبوب قریب ہی موجود ہے۔ میں ابھی انھی سوچوں میں گم تھی کہ ایک عجیب و غریب حلئے کی بنجارن ایک طشت لے کر میرے پاس آئی۔ طشت رومال سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس عورت نے میرے ہاتھ میں ایک خط دے دیا۔ میں نے خط کھولا اس پر لکھا تھا۔

سارہ!

میں حیران ہوں کہ تمھارے خوبصورت، بھولے بھالے چہرے کے پیچھے مکروہ چہرے کو پہچاننے میں مجھ سے غلطی کیسے ہو گئی؟

تم مجھے کھلونا سمجھ کر کھیل رہی تھی۔ تم محض پیسوں اور چیزوں کی بھوک مٹانے کے لئے مجھے استعمال کر رہی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ تمھیں بھول جاؤں۔ مگر تمھاری بے وفائی نے میرا جگر چھلنی کر دیا ہے۔ میں آج کے دن یعنی تمھاری سالگرہ کے دن اپنی جان دے کر تمہیں بد دعا دے رہا ہوں کہ تم ہمیشہ نامراد رہو۔ تمھاری بھوک کبھی نہ مٹے۔ تم کبھی کسی کو دوبارہ اپنی بھوک کا نشانہ نہ بنا سکو۔ دیکھو اس تھال میں تمھارے لئے کیا تحفہ ہے؟

سارہ نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا:

''میں نے اس تھال سے کپڑا اٹھایا تو اس میں اس کا کٹا ہوا سر موجود تھا۔ اس کی سرد بے نور آنکھیں

مجھے گھورتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

میری محبت کو چند سکوں کے عوض کیوں بیچ ڈالا؟

وہ تنویمی حالت میں بھی سسکیاں لیتے ہوئے روتے ہوئے بولی:

''اس بنجارن نے مجھے نفرت سے دیکھا اور میرے چہرے پر سجاد کا خون مل دیا۔ اس روز میں دہشت سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری سہیلیاں میرے اردگرد موجود تھیں۔ سالگرہ کے کیک پر موم بتیاں ابھی بھی جل رہی تھیں۔ میں نے ان سے سجاد کے کٹے ہوئے سر اور بنجارن کے متعلق پوچھا مگر انھوں نے سب باتوں سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں کیک کاٹتے کاٹتے اچانک بے ہوش ہوگئی تھی۔ اس روز سے میں روگی بن گئی۔ وہ بنجارن مجھے اکثر نظر آتی ہے اور جب میں ہوش میں آتی ہوں تو میں کوئی نہ کوئی قبیح حرکت کر بیٹھتی ہوں۔''

ماہر نفسیات نے گہرا سانس لیا اور پوچھا:

''سارہ! کیا اس وقت وہ بنجارن یہاں موجود ہے؟''

سارہ ہذیانی انداز میں چیخی اور بولی:

''ڈاکٹر صاحب! وہ موجود ہے اور کہہ رہی ہے کہ میں بددعا کے اثر سے کبھی نکل نہیں سکوں گی۔''

سارہ نے اپنے ہاتھ اپنی بند آنکھوں کے آگے کیے اور چیخ کر بولی:

''دیکھیں ڈاکٹر صاحب! میرے ہاتھ سجاد کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔''

ماہر نفسیات نے دیکھا اس کے ہاتھوں سے واقعی خون ٹپک رہا تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا دل کانپ رہا تھا۔ اچانک کمرے کی مدھم سی لائٹ بھی بند ہوگئی اور سارہ کی ڈراؤنی ہنسی کی آواز کمرے میں پھیل گئی۔ کمرے کا ٹمپریچر اچانک بہت گر سا گیا۔ ڈاکٹر نے اپنے حواس مجتمع کیے اور اونچی آواز میں سارہ کو ٹرانس سے باہر آنے کو کہا۔ سارہ یک لخت ٹرانس سے باہر آ گئی۔ کمرے کی فضا اب نارمل تھی۔ سارہ کے ہاتھوں پر خون کے نشانات بھی نہیں تھے۔ سارہ خوفزدہ سی بولی:

''ڈاکٹر صاحب! کیا ہوا؟''

ماہر نفسیات نے ٹھنڈا سانس لیا اور بولا:

''سارہ! تمہاری حالت کا سبب کوئی چڑیل یا روح نہیں ہے۔ تم اپنے احساس گناہ کا شکار ہو کر بددعا کے آسیب سے ڈر گئی ہو۔ انسانی دماغ بہت طاقتور ہے۔ اس روز کچھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ بچپن میں تم نے کبھی بنجارن اور بددعا کے زوداثر ہونے کی کوئی کہانی سنی ہوگی جو تمھارے لاشعور میں محفوظ تھی۔ تمھارے احساس گناہ نے اس کہانی کو تمہارے لئے حقیقت میں بدل دیا تھا۔

تم نے تصور کرلیا کہ سجاد نے تمھاری بے وفائی کے غم میں خودکشی کرلی ہے۔ حالانکہ سجاد تو زندہ ہے اور اس نے شادی بھی کرلی ہے۔ یہ دیکھو۔''

ماہر نفسیات نے اس کے آگے تصاویر کا ایک البم رکھا۔ سارہ نے تصاویر دیکھیں تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی:

''وہ مر گیا تھا، میں نے خود اس کا سر طشتری پر پڑا دیکھا تھا۔ اس بنجارن نے مجھ پر اس کا خون پھینکا تھا۔''

ماہر نفسیات مسکرایا اور ہنس کر بولا:

''سجاد صاحب! اندر آ جائیں۔''

دروازہ کھلا اور سجاد اندر برآمد ہوا۔ سارہ اسے زندہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ سجاد نے اسے دیکھا تو تاسف سے بولا: ''سارہ! تم نے کیا حال بنا رکھا ہے؟

میں تمہیں اپنی بددعا کے خوف سے آزاد کرتا ہوں۔ میرا دل تمہاری حرکت سے ٹوٹا ضرور تھا مگر میں خودکشی جیسی قبیح حرکت کبھی بھی نہ کرتا۔ میں سب کچھ چھوڑ کر اپنے آبائی گاؤں چلا گیا تھا۔''

یہ سن کر سارہ کی آنکھیں پھیل گئیں اور وہ چکرا کر بے ہوش ہوگئی۔ ماہر نفسیات نے طمانیت کا سانس لیا، اسے یقین تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد سارہ ایک نارمل لڑکی بن چکی ہوگی۔ بددعا کا آسیب اتر چکا تھا۔

پنکی کی گڑیا

کرن خان-کوٹ رادھا کشن

"اے گڑیا اب تیرا کھیل ختم" یہ کہہ کر ہوا میں معلق عورت نے اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھایا تو اس کے ہاتھ سے چنگاریاں نکلیں اور گڑیا اس کی لپیٹ میں آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے گڑیا جل کر خاک ہوگئی تو.....

ایک روح کا عجیب وغریب شاخسانہ جس نے اپنے بچوں کے لئے.....قربانی.....دی

کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا۔ باہر بارش ایک تواتر سے برس رہی تھی۔ اچانک منظر بدلا تو نظر آیا ایک موٹا، لمبا، چوڑا بازو سمیت، ہاتھ دکھائی دیا۔ موٹی بھدی انگلیوں میں لمبے بڑے بڑے ناخن..... اور وہ..... ہاتھ لڑکی کا منہ نوچنے لگا کہ اچانک پنکی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھی۔

☆.....☆.....☆

عالیشان بنگلے کے سامنے کرولا آکر رکی، شاکر رضا گاڑی سے اترے ان کی بیوی نیلم بھی برابر کی نشست چھوڑ کر گاڑی سے باہر کھڑی ہوگئی۔ شاکر رضا نے اترتے ہی بنگلے کے سابقہ مالک سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پھر باتوں میں دونوں مشغول ہوگئے۔

دس سالہ پنکی اپنے چھوٹے بھائی ببلو اور بڑی بہن سارہ کے ساتھ گاڑی کی پچھلی نشست پر براجمان تھی۔ سفر طویل ہونے کے سبب وہ سوگئی تھی اور ایک بھیانک خواب نے اسے نیند سے بیدار کردیا تھا۔

''پنکی، سارہ، ببلو جلدی سے آؤ، ہم نئے گھر میں پہنچ چکے ہیں۔'' نیلم نے اپنے تینوں بچوں کو آواز لگائی تو وہ تینوں بچے بھی ممی، بابا کے ساتھ بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہ عالیشان بنگلہ تھا جو وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔

شاکر رضا نے لاک میں چابی گھما کر مین ڈور کھولا۔ اندر تمام لائٹس آن تھیں۔ ڈبل اسٹوری بنگلہ نہایت قیمتی فرنیچر سے آراستہ پیراستہ خوبصورت تھا۔ فرش پر عمدہ سرخ رنگ کا قالین بچھا تھا۔ چار کمرے نیچے تھے، ہر کمرے کی آرائش بڑی فرصت سے کی گئی تھی۔ سامنے لگا لمبا خوبصورت پنڈولم کلاک بارہ کا ہندسہ عبور کررہا تھا۔ دیواروں کو بیش قیمت پینٹنگز سے سجایا گیا تھا۔ ایک کمرے میں خوب صورت بیڈ کراؤن والا بیڈ موجود تھا۔ ایک کمرا بچوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس میں تین چھوٹے چھوٹے بیڈ ترتیب کے ساتھ موجود تھے۔ ''کمرے اور بنگلہ پسند آیا میرے بچو۔''

شاکر رضا کی آواز پر ساری فیملی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بلیک تھری پیس میں شاکر رضا بہت اسمارٹ دکھائی دے رہے تھے۔ ''یس بابا! مجھے بہت پسند آیا۔'' ببلو نے کہا۔ ''مجھے یہ کھلونے پسند آئے ہیں بابا۔'' پنکی نے کھلونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بابا میرا کمرا الگ ہونا چاہئے۔ میں اب بڑی ہوچکی ہوں۔'' سارہ نے اچٹتی نگاہ کمرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا تم دوسرے کمرے میں شفٹ ہوجاؤ۔'' شاکر رضا نے جواب دیا۔ ''تھینکس بابا، آپ دنیا کے سب سے اچھے بابا ہیں۔'' سارہ نے شاکر رضا کو تشکر سے دیکھا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

''چلو بچو! اب سوجاؤ کافی رات ہوچکی ہے باقی باتیں صبح کریں گے۔'' نیلم نے پنکی، بلو پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور پھر شاکر کے ساتھ اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

شاکر رضا اپنی بیوی نیلم اور اپنے تین بچوں پنکی، بلو اور سارہ کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ وہ ایک آفس میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ ایک دن ان کے دوست نے ایک عالیشان اور خوبصورت بنگلے کا ذکر کیا، جس کا مالک بیرون ملک میں تھا، جس کے باعث اس کا یہ بنگلہ کرائے کے لئے خالی پڑا تھا لیکن اب بنگلے کا مالک اپنا بنگلہ فروخت کرنا چاہتا ہے۔

شاکر رضا کو قوی امید تھی کہ ایسا بنگلہ کروڑوں میں ملے گا لیکن جب اس کا ریٹ سنا تو حیرت سے اچھل پڑے۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ یہ آفر ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے اور انہوں نے وہ بنگلہ نہایت سستے داموں خرید لیا اور اپنی فیملی سمیت اس میں شفٹ ہوگئے۔

آج اس بنگلے میں ان لوگوں کو آئے ایک مہینہ ہوچکا تھا اور اس عرصے میں وہ خوش و خرم بنگلے میں رہ رہے تھے۔ شاکر علی الصبح دفتر چلے جاتے۔ بچوں کی سمر ویکیشنز چل رہی تھیں اس لئے وہ گھر میں ہی رہتے تھے۔

''پنکی، پنکی بیٹا، کہاں ہو؟'' نیلم پنکی کو آوازیں دیتی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ پنکی صوفے پر بیٹھی ایک گڑیا سے کھیل رہی تھی۔ ''پنکی یہ کیا ہے۔'' نیلم نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے استفسار کیا۔ پنکی کے ہاتھ میں ایک ہیبت ناک گڑیا موجود تھی۔ جس کے بال کھلے ہوئے تھے اور منہ سائیڈ سے جھلسا ہوا تھا۔ وہ دھول سے اَٹی پڑی تھی۔ جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بہت ہی پرانی گڑیا ہے۔ ''ممی یہ گڑیا مجھے کھلونوں کی الماری سے ملی ہے، ہے نا کتنی یونیک.....'' پنکی نے مسکراتے ہوئے گڑیا کی تعریف کی۔

''بیٹا یہ گڑیا بہت پرانی ہے۔ بابا کے ساتھ جا کر نئی گڑیا لے آنا۔'' نیلم نے کہا۔ ''لیکن ممی مجھے اسی گڑیا سے کھیلنا ہے، میں اس کے کپڑے بدل کر اسے نیا کر دوں گی۔'' پنکی نے ضد کی تو نیلم نے ہتھیار ڈال

دیئے۔ ''ٹھیک ہے بیٹا لیکن پہلے کھانا کھالو، تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔'' نیلم نے کہا تو پنکی اپنی گڑیا کو گود میں اٹھائے ممی کے ساتھ ڈائننگ روم میں چلی گئی اور پھر کھانا کھانے کے بعد پنکی نے اپنی گڑیا کو نئے کپڑے پہنائے، اس کے بال سنوارے اور اس کا منہ صاف کیا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ گڑیا اب بالکل نئی جیسی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے جلنے کا نشان غائب تھا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ پنکی باہر لان میں بچوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔

''پنکی! یہ گڑیا تمہیں کہاں سے ملی؟'' مینا نے استفسار کیا۔ ''یہ گڑیا مجھے کھلونوں کی الماری سے ملی ہے اور پتا ہے وہاں سے مجھے اور بھی ڈھیر سارے کھلونے ملے ہیں۔'' پنکی نے چہک کر بتایا۔

لیکن پنکی..... یہ گڑیا..... گڑیا..... تو.....'' مینا کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے بھائی علی نے مینا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مینا..... ممی نے منع کیا تھا ناں گڑیا کے متعلق بتانے سے.....''

''کیوں کیا خاص بات ہے اس گڑیا میں، کیا راز چھپا رہے ہو تم دونوں۔'' پنکی نے بھنویں سکیڑ کر متجسس ہو کر پوچھا۔

''پنکی..... وہ دراصل..... بس تم یہ گڑیا کہیں پھینک دو یا پھر جلادو، یا کہیں گڑھا کھود کر دفنادو، میری ممی کہتی ہیں اس گھر میں آسیب کا سایہ ہے۔'' مینا کا انداز ڈرا دینے والا تھا۔ ''اچھا..... ٹھیک ہے میں ابھی اس گڑیا کو جلا دیتی ہوں۔'' مینا نے کہا اور ماچس منگا کر گڑیا کو آگ لگادی۔

پنکی، مینا، علی اور بلو تینوں دائرے کی شکل میں کھڑے جلتی گڑیا کو دیکھنے لگے۔ ''ویسے مینا یہ آسیب کیا ہوتا ہے؟'' پنکی نے ناسمجھی سے سوال داغا۔ اتنے میں مسجد سے موذن نے مغرب کی اذان دی تو علی نے مینا کا ہاتھ تھاما اور پنکی کو مخاطب کیا۔ ''اچھا پنکی ہم گھر جارہے ہیں، کل کھیلیں گے۔'' علی یہ کہہ کر اپنی بہن مینا کا ہاتھ پکڑے گھر کی جانب چل دیا۔

پنکی انہیں دور تک دیکھتی رہی۔ اسے اپنی گڑیا کے جل جانے کا زیادہ افسوس نہ تھا تاہم اسے لفظ ''آسیب'' ڈرا رہا تھا۔

رات کو ڈائننگ ٹیبل پر وہ اپنی ممی سے یہ سوال کر بیٹھی۔ ''ممی! یہ آسیب کیا ہوتا ہے؟'' وہ ناسمجھی میں نیلم کی طرف دیکھنے لگی جو کہ اب حیرت سے اسے گھور رہی تھی۔ ''پنکی! بیٹا آپ نے یہ لفظ کہاں سنا ہے۔''

''ممی ساتھ والے گھر سے مینا اور علی آئے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ اس گھر میں آسیب کا سایہ ہے۔'' پنکی نے معصومیت سے جواب دیا۔

''بیٹا! آئندہ آپ نے اپنے کسی فرینڈ کی ایسی کوئی بات نہیں سننی، آسیب وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔'' مدمقابل کرسی پر دراز شاکر نے برجستہ جواب دیا جو چکن سے انصاف کرنے کے بعد ٹشو سے ہاتھ صاف کررہے تھے۔

''لیکن ممی انہوں نے تو میری گڑیا جلادی۔'' پنکی نے جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ سارہ ہاتھ میں وہی گڑیا پکڑے ڈائننگ ٹیبل کی طرف آرہی تھی۔ ''پنکی! یہ لو اپنی گڑیا، باہر لان میں بے یارومددگار پڑی تھی، ویسے کوئی چیز سنبھال کر نہیں رکھتی تم۔'' سارہ نے گڑیا ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی اور خود کرسی کھینچ کر کھانا کھانے میں مشغول ہوگئی۔

''پنکی بیٹا یہ رہی آپ کی گڑیا، اور خبردار آئندہ مینا اور علی آئیں تو انہیں سختی سے کہہ دینا کہ صرف میرے ساتھ کھیلو مجھے ڈرانے کی ضرورت نہیں میری ممی نے منع کیا ہے، آسیب وغیرہ کی باتیں کرنے سے۔'' نیلم نے پنکی کی گڑیا جلانے والی بات کو اس کی ناسمجھی سمجھتے ہوئے رد کردیا اور پھر چاول پلیٹ میں ڈالنے لگی۔

''ممی! میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے گڑیا کو خود جلایا تھا۔'' پنکی نے نیلم کو پھر سے مخاطب کیا۔

''پنکی بیٹا! خاموشی سے کھانا کھاؤ، اور اب نو

مستی، نو مذاق۔‘‘ شاکر نے پنکی کو شہادت کی انگلی سے وارن کرتے ہوئے کہا۔

پنکی بضد رہی لیکن سب نے اس کی بات کو ’’اگنور‘‘ کیا۔

رات میں پنکی نے اس گڑیا کو واپس الماری میں رکھ دیا اور خود سونے کے لئے بیڈ پر لیٹ گئی۔

آدھی رات کو پیاس کی شدت سے پنکی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر نظریں دوڑائیں تو دیکھا شیشے کا جگ خالی تھا۔ وہ کچن میں پانی کی غرض سے گئی تو اس نے دیکھا اسٹور روم کا زیرو بلب آن ہے۔ ’’لیکن ممی تو ساری لائٹس آف کر دیتی ہیں۔‘‘ وہ دل ہی دل میں جابلائی اور لائٹ آف کرنے کی غرض سے اسٹور روم میں گئی تو اس نے دیکھا۔ اسٹور روم کی آہنی دیوار پر کسی عورت کا سایہ ہے جو کہ کسی بچے کا گلا کاٹ رہی ہے۔

اچانک دیوار پر خون کی چھینٹیں گریں۔ پھر خون سے کسی نے دیوار پر لکھا۔ ’’چلے جاؤ...... یہ میرا گھر ہے...... میں تم سب کو مار دوں گی۔‘‘

خوف سے پنکی کی چیخیں نکل گئیں جس نے گھر کے در و دیوار ہلا دیئے۔ ’’کیا ہوا پنکی بیٹا۔‘‘ نیلم نے خود سے لپٹی پنکی سے سوال کیا جو خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ’’ممی وہ سامنے دیوار پر...... خ خ خون ن ن...... ہے۔‘‘ وہ بمشکل ہکلاتے ہوئے جملہ مکمل کر پائی۔

’’لیکن سامنے دیوار پر تو کچھ نہیں ہے۔‘‘ نیلم نے سامنے نظریں دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔

’’پنکی بیٹا آپ نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔‘‘ پنکی کے والد شاکر صاحب نے پنکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو پنکی نے سامنے دیوار پر پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا تو اب وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

’’لیکن ممی...... سامنے دیوار پر خون کی چھینٹیں تھیں اور کچھ لکھا بھی تھا۔‘‘ پنکی خوف و ہراس کے عالم میں گویا ہوئی۔

’’پنکی آپ رات کو یہاں کیا کر رہی ہو، چلو بابا کی گود میں آؤ، بابا آپ کو خود روم میں چھوڑ کر آئیں گے۔‘‘ بابا نے پنکی کو گود میں اٹھا کر شفقت سے اس کا ماتھا چوما اور اسے کمرے میں لے گئے۔

’’بابا میں سچ کہہ رہی ہوں، میں نے وہاں کچھ دیکھا تھا، سامنے دیوار پر کسی عورت کا سایہ جو کسی اپنے کا......‘‘ پنکی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شاکر صاحب نے انگلی رکھ کر اسے چپ کروا دیا۔ وہ تھپکی دے کر پنکی کو سلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اچانک پنکی کی نظر سامنے گلاس ونڈو پر پڑی۔ وہاں پنکی کی گڑیا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ سائیڈ سے جلا ہوا تھا۔ اس کی سپاٹ آنکھوں سے نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پنکی نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح شاکر صاحب آفس چلے گئے تو پنکی بھی لان میں آ کر پودوں کو پانی دینے لگی۔ وہ رات کے واقعے کو بھول نہیں پائی تھی تاہم وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ دوبارہ کبھی اسٹور روم کا رخ نہیں کرے گی۔

پنکی کی ممی نئی ملازمہ سے صفائی کروا رہی تھیں۔ نیا گھر کافی بڑا تھا اس لئے انہوں نے ملازمہ کا انتظام کر لیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی ناخن گھس رہی تھیں تبھی ملازمہ مخاطب ہوئی۔ ’’باجی! ایک بات تو بتائیں آپ نے یہ گھر کیسے خرید لیا، لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ گھر آسیبی ہے۔‘‘

نیلم نے شاکی نظروں سے اسے گھورا۔

’’آسیب اور آسیبی...... کیا مطلب؟‘‘

’’ہائے باجی! آپ کو نہیں پتا اس گھر میں آسیب ہے، آپ سے پہلے جو کرائے دار یہاں رہتے تھے نا......‘‘ ملازمہ اب جھاڑو چھوڑ کر نیلم کے قریب آئی اور قدرے سرگوشیانہ انداز میں گویا ہوئی۔ ’’ان سب کی موت ہو گئی، کوئی کہتا ہے انہوں نے خودکشی کر لی لیکن سننے میں آیا ہے کسی نے تیز دھار چھرے سے ان کی گردن پر وار کیا تھا، اس کے بعد سے یہ گھر کرائے پر

نہیں چڑھتا، اس لئے اس کے مالک نے یہ گھر سستے داموں بیچ دیا ہے، کوئی اس گھر میں نہیں رہ پاتا۔'' ملازمہ نے اپنی بات مکمل کی۔

''آسیب واٹ نان سینس؟ آسیب وغیرہ کچھ نہیں ہوتا اور اگر کوئی ایسا مسئلہ ہوتا بھی تو شاکر کو خبر ہوتی، وہ کبھی یہ گھر نہ خریدتے۔'' نیلم نے ملازمہ کو جواب دیا۔

''ملازمہ دوبارہ جھاڑو اٹھائے کام میں مشغول ہوگئی، قدرے توقف کے بعد پھر بولی۔ ''ویسے باجی چھوٹا منہ بڑی بات، آپ یہ گھر بیچ کر کہیں اور چلے جائیں، اس گھر میں کوئی زیادہ وقت نہیں رہ پاتا، اگر میرا شوہر بیمار نہ ہوتا اور مجھے پیسوں کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں کبھی یہاں کام نہ کرتی۔'' ملازمہ نے نیلم کو دیکھا جو اب گہری سوچ میں مبتلا تھی۔

''میں آسیب وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی اور نہ ہی شاکر یقین رکھتے ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوتا یہ سب پرانی باتیں ہیں۔'' نیلم نے ملازمہ کو جواب دیا اور پھر سے ناخن گھسنے لگی۔ ان کے ذہن میں مبہم سا خیال آیا لیکن پھر انہوں نے لاپرواہی سے سر جھٹک دیا۔

ملازمہ کو رخصت کر کے شام کو جب نیلم کا رخ کچن کی جانب تھا کہ اچانک سارہ کی دلخراش چیخ نے انہیں وہیں منجمد کر دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی سارہ کے کمرے کی طرف لپکی، سارہ بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی، اس کے کمرے کی حالت ایسی تھی، جیسے ابھی ابھی طوفان آ کر تھما ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پورے کمرے میں اخبار پھیلے پڑے تھے، جبکہ سارہ تو اخبار پڑھتی ہی نہ تھی۔

نیلم نے لپک کر سارہ کو دیکھا وہ بے ہوش پڑی تھی۔ ''سارہ، سارہ بیٹا اُٹھو'' پنکی بھی دوڑتی ہوئی نیلم کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ ''ممی! آپی کو کیا ہوا ہے۔'' وہ سارہ کو بے ہوش دیکھ کر بولی۔

''پنکی بیٹا آپ آپی کو دیکھو، میں پانی لے کر آتی ہوں۔'' نیلم اٹھ کر کچن سے پانی لینے گئیں۔

پنکی سارہ پر جھکی ہوئی تھی، یکدم اس کی آنکھیں پٹ سے کھلیں۔ اس نے پنکی کو گردن سے دبوچ لیا۔

''میں نے کہا تھا ناں..... چلے جاؤ..... یہ میرا گھر ہے..... تم سب مارے جاؤ گے۔'' پنکی نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو چھت سے پنکی کی گڑیا چاروں ہاتھ پیروں کی مدد سے چھپکلی کی مانند الٹی چپکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پنکی کی دلخراش چیخوں نے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔

نیلم دوڑتی ہوئی فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ پنکی نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا رکھا تھا۔ وہ نیچے زمین پر دیوار کو لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سارہ بیڈ پر چت لیٹی ہوئی تھی۔

نیلم نے آگے بڑھ کر پانی کی چھینٹیں سارہ کے چہرے پر ڈالیں تو اسے ہوش آ گیا۔ ''مما..... مجھے کیا..... ہوا تھا؟'' وہ ہاتھوں میں سر تھامے آہستگی سے اٹھی۔ ''بیٹا آپ بے ہوش ہوگئی تھیں۔'' نیلم نے سارہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

نیلم نے پنکی کو گود میں اٹھالیا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ''پنکی بیٹا، کیا ہوا تھا، آپ نے چیخ کیوں ماری۔'' نیلم نے پیار سے پنکی کے سلکی بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ پنکی نے پانی پی لیا۔ ''ممی..... میری گڑیا اچھی نہیں ہے، وہ گندی گڑیا ہے، میں نے اس گھر میں نہیں رہنا، یہ اچھا گھر نہیں ہے۔'' پنکی زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ روتے روتے اسے ہچکی لگ گئی۔ نیلم نے اسے گلے سے لگالیا۔

یکدم نیلم کی نظر پنکی کے چہرے پر پڑی۔ سارہ کے چہرے پر نیلے دھبے پڑ چکے تھے۔ اس کی گردن، بازو غرض جسم کے ہر اعضاء پر نیلے دھبے نمایاں تھے۔ حیرت و خوف سے نیلم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''پنکی تمہارے جسم پر یہ دھبے کیسے۔'' نیلم کے لبوں سے بے اختیار جملہ ادا ہوا۔ پنکی نے اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر جب نیلے دھبے دیکھے تو وہ بھی خوفزدہ ہوگئی۔ ''مما، بابا کو کال کریں یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔''

پنکی پریشانی کے عالم میں گویا ہوئی۔ ممی یہ سب میری گڑیا کی وجہ سے ہو رہا ہے، یہ گڑیا ہم سب کو مار دے گی۔'' پنکی خوفزدہ ہو کر بولی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے، پنکی بیٹا، ان سب چیزوں کا بھلا گڑیا سے کیا تعلق؟'' نیلم نے جواب دیا کہ اچانک تمام لائٹس آن، آف ہونے لگیں اور جھٹکے سے لائٹ چلی گئی۔ ''ممی.....'' پنکی ڈر کے مارے نیلم سے لپٹ گئی۔

''سارہ تم پنکی کا دھیان رکھو اور یہیں رکو، میں ٹارچ لائٹ لاتی ہوں۔'' نیلم نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں ممی میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' پنکی نیلم سے لپٹ کر رونے لگی۔

''اوہو پنکی بیٹا..... ضد نہ کرو چلو آؤ، تم دونوں ساتھ ہی آ جاؤ۔'' نیلم نے سارہ اور پنکی دونوں کو ساتھ آنے کے لئے کہا۔ وہ تینوں کمرے سے باہر آئیں اور نیلم ماچس جلا کر آگے بڑھنے لگی۔ ''دھیان سے آگے سیڑھیاں ہیں۔'' نیلم نے سارہ اور پنکی کو تنبیہ کیا اور خود آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ ''پنکی، سارہ تم دونوں اوپر ہی ٹھہرو، میں ٹارچ لے آؤں۔'' نیلم نے کہا اور ماچس جلا کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ نیلم ٹارچ لائی اور پھر وہ تینوں واپس کمرے میں چلی گئیں۔ نیلم نے موبائل پر شاکر صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ کال ریسیو ہوئی۔ ''ہیلو شاکر، آپ جلدی گھر آ جائیں، سارہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

یکدم کچن سے چھناکے کی آواز آئی جیسے کوئی کانچ کا برتن ٹوٹا ہو۔ ''ممی..... ممی.....'' ببلو کی آواز پر نیلم چونکی۔ سارہ کی حالت غیر ہونے لگی۔ وہ بیڈ پر لیٹ گئی، اسے سستی محسوس ہو رہی تھی، اس کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے۔ ''ببلو..... یہ تو ببلو کی آواز ہے۔'' پنکی بیٹا آپ سارہ کے پاس رکو میں ذرا ببلو کو دیکھ کر آتی ہوں۔ نیلم نے سارہ کی حالت غیر ہوتی دیکھ کر پنکی سے کہا۔

''ممی..... بچاؤ..... بچاؤ.....'' ببلو کی آواز پر نیلم فوراً کمرے سے نکل گئی۔ ''آ رہی ہوں ببلو بیٹا، آپ کہاں ہو'' نیلم نے کہا اور ٹارچ کی مدد سے فٹا فٹ سیڑھیاں اترنے لگی۔ پنکی نیلم کے پیچھے دوڑی۔ سامنے لاؤنج میں کوئی راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا۔ اس کی پشت ہونے کے باعث چہرہ واضح نہ تھا۔ چیئر پر کسی بچوں نے سر ٹکا رکھا تھا۔ نیلم نے ہاتھ آگے بڑھا کر ببلو کے سر پر پیار کیا۔ ''ببلو، کیا ہوا تھا میرے بچے۔'' نیلم نے دست شفقت سر پر پھیرا، تو ان کے ہاتھوں پر خون لگ گیا۔ ببلو کا مردہ جسم یکدم ہی چیئر سے گر کر زمین بوس ہو گیا۔ نیلم کی چیخ نکل گئی۔

یکدم سامنے اندھیرے میں دو نیلی آنکھیں دکھائی دیں۔ ٹارچ لائٹ نے واضح کیا تو وہاں پنکی کی گڑیا کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جو خون سے بھری ہوئی تھی۔

''میں نے کہا تھا ناں کہ اس گھر سے چلے جاؤ، یہ میرا گھر ہے، تم سب مرو گے، کوئی نہیں بچے گا۔'' پنکی کی گڑیا غرائی۔

نیلم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ حیرت سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یکدم پنکی کی گڑیا نے دوڑ لگا دی۔ وہ نیلم پر حملہ آور ہوئی۔ نیلم صوفے کے پیچھے جا چھپی۔ ٹارچ لائٹ ان کے ہاتھ سے دور جا گری، خوف کے مارے وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

پنکی نیلم کے پیچھے آ گئی۔ ''ممی کہاں ہیں آپ۔'' وہ ساکت کھڑی نیلم کو آواز دینے لگی۔ سامنے گلاس ونڈوز سے چھن چھن کر آتی روشنی میں اسے نیلم کہیں دکھائی نہ دی۔ پنکی کی گڑیا سب کے خون کی پیاسی ہو گئی تھی۔ اچانک سناٹا چھا گیا۔ باہر موسم ابر آلود ہوا اور بارش زمین کو بھگونے لگی۔

نیلم زبان کو تالا لگائے کونے میں سسک رہی تھی۔ صوفے کے پیچھے چھپی رو رو کر اپنے بچوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ پنکی نیلم کو ڈھونڈتی آگے بڑھی تو ٹھوکر کھا کر لڑکھڑا گئی۔ زمین پر ببلو کی لاش ساکت پڑی تھی۔ خوف سے پنکی کی چیخ حلق میں ہی

پھنس گئی۔ پتلی کے سامنے دو نیلی آنکھیں دکھائی دیں پنکی کی گڑیا گلاس ونڈو کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ گلاس ونڈو سے آتی چاند کی روشنی نے اسے واضح کردیا۔

''آج تک اس گھر میں جو بھی آیا، وہ مارا گیا، تم سب بھی مرو گے۔'' گڑیا گرجدار آواز میں گویا ہوئی اس نے کلہاڑی اٹھالی تو پنکی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے اور آنکھیں بند کرکے آیت الکرسی کا ورد کرنے لگی۔

اور جب پنکی نے آنکھیں کھولیں تو گڑیا غائب تھی۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

اچانک سامنے سے شاکر صاحب ہاتھ میں بریف کیس تھامے آتے دکھائی دیئے۔ ''پنکی بیٹا، یہ لائٹس کیوں آف ہیں، سب کہاں ہیں۔'' انہوں نے تاسف سے پوچھا تو پنکی دوڑتی ہوئی اپنے بابا شاکر سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس نے بابا کے عقب میں دیکھا تو شاکر صاحب ایک ڈاکٹر کو لے کر لاؤنج میں داخل ہورہے تھے۔ ''اگر وہ بابا ہیں تو یہ ساتھ کون ن ن ہے۔'' سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پنکی کے ذہن کی اسکرین پر خیال ابھرا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ چیخ مار کر بہروپیا سے دور ہوئی۔

شاکر صاحب کے قدم لاؤنج میں رکھتے ہی وہ بہروپیا ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

''پنکی بیٹا، آپ کی ممی اور سارہ کہاں ہیں۔'' وہ سہمی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''بابا..... وہ اوپر ہیں.....'' شاکر صاحب نے سیل فون کی ٹارچ آن کی اور ڈاکٹر کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ پنکی صوفے پر سہمی سمٹی بیٹھی رہی۔ یکدم اس کی نظر شاکر اور ڈاکٹر کے پیروں پر پڑی۔ دونوں کے پاؤں الٹے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر چابی گھما کر کوئی لاؤنج میں داخل ہوا۔ ''اتنا اندھیرا کیوں ہے نیلم، سارہ، سب کہاں ہیں۔'' شاکر صاحب کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ پنکی خوف سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے بابا شاکر کو دیکھ رہی تھی۔ یکدم کسی نے تیز دھار کلہاڑی سے وار کیا گیا اور شاکر صاحب کی گردن تن سے جدا ہوگئی۔ خون کا فوارہ گردن سے نکلا، شاکر صاحب کا بے جان وجود زمین پر ساکت پڑا تھا۔

پنکی صوفے سے نیچے اتر کر دھیرے دھیرے پیچھے کو چلنے لگی۔ وار کرنے والی کوئی اور نہیں پنکی کی گڑیا ہی تھی۔

''سارہ آپی.....'' پنکی نے مبہم سا سارہ کو پکارا۔ یکدم سیڑھیوں سے لڑھکتی سارہ کی لاش پنکی کے پاؤں کو چھونے لگی۔ اس کی گردن پر بھی تیز دھار کلہاڑی سے وار کیا گیا تھا۔

''دیکھ لیا سارہ کا حال اب تیری باری ہے۔'' گڑیا نے کہا اور کلہاڑی کو سر سے اوپر کیا۔

اچانک لاؤنج میں تیز آندھی چلنے لگی۔ تمام فرنیچر آندھی کی زد میں آکر گول گول ہوا میں گھومنے لگا۔ سامنے ایک عورت، اور دو بچے کھڑے تھے۔ آندھی رکنے پر وہ واضح دکھائی دینے لگے۔ تینوں نے سفید کپڑے زیب تن کررکھے تھے۔

''اے گڑیا اب تیرا کھیل ختم'' یہ کہہ کر اس عورت نے ہوا میں ہاتھ بلند کیا اور مٹھی بھینچ لی۔ گڑیا ہوا میں معلق ہوئی، اور دیکھتے ہی دیکھتے تڑپ تڑپ کر جل کر خاک ہوگئی۔

اور نیلم نے بھاگ کر پنکی کو گلے سے لگالیا۔

''تم لوگ خوش قسمت ہو، آج پورے چاند کی رات میں تم لوگوں کی بدولت اس گڑیا کا خاتمہ ہوگیا۔'' یہ کہہ کر وہ تینوں روحیں ہوا میں تحلیل ہوگئیں۔

نیلم پنکی کو لے کر وہ گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

اب وہ گھر سنسان پڑا ہے، آج تک اس گھر میں کوئی نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ پھر کبھی کسی نے وہ گھر نہیں خریدا لیکن ایک گڑیا جس کی آنکھوں سے نیلی روشنی نکلتی ہے، آج بھی اندھیری رات میں کمرے کی گلاس ونڈو میں کھڑی دکھائی دیتی ہے۔

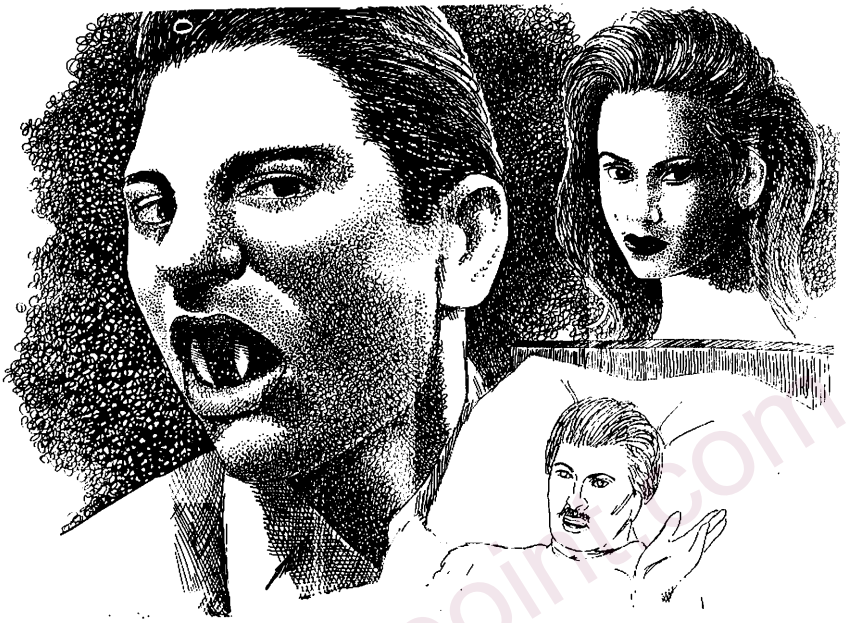

وادی کا آسیب

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

لڑکی کو اپنے ہاتھ سے صبر کا دامن پھسلتا محسوس ہو رہا تھا اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے اس شدت سے دبایا کہ اس کی اپنی ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر.....

ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز سرد لہر دوڑاتی خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی کہانی

بے رحم سورج اس چھوٹے سے کارواں پر اپنا قہر ڈھا رہا تھا جو پہاڑیوں کے اوپر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ ان کے نیچے ہلکے سبز اور بدنما پیلے رنگ کی چٹانیں دور جنگل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ چٹانوں کے دامن میں جنوب سے مشرق کی جانب ایک خشک ندی کے نشانات بتا رہے تھے کہ کبھی یہاں پانی موجود تھا۔ اس خشک ندی کے کناروں پر پام کے بلند درخت کھڑے تھے اور ان کے پیچھے چٹانوں کی سبز ڈھلوانیں۔

اس ندی کے دائیں طرف ایک بل کھاتا ٹیڑھا میڑھا راستہ چٹانوں کے اندر سے ہوتا ہوا پہاڑیوں کے اوپر جا رہا تھا۔ ہر طرف غشی طاری کرنے والی خاموشی طاری تھی۔ اڑتی دھول، ظالم سورج کی گرمی اور نہ ٹوٹنے والی یہ خاموشی کسی نحوست کی طرح برما کے ان پہاڑوں پر مسلط تھی۔

مورین فین بمشکل اپنے آپ کو خچر کی زین پر سیدھا رکھ پا رہی تھی۔ اس کا سر مسلسل ہچکولے کھا رہا تھا اور جو نقاب اسنے اپنے چہرے پر اوڑھ رکھا تھا وہ سورج کی تیز روشنی سے اس کی آنکھوں کو بچا نہیں پا رہا تھا۔ اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحہ بے ہوش ہو کر اپنے خچر کی پشت سے نیچے جا گرے گی۔

اپنے سارے حواس کو مجتمع کر کے وہ سیدھی تن کر بیٹھی تھی اور اس کی پر اعتماد نظریں سامنے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ باہم پیوست تھے اور وہ ذہنی طور پر اس اظہار کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس سفر کو جاری رکھنے کے قابل ہے۔

اس کے بالکل آگے خچر کی باگ پکڑے رمسالال چل رہا تھا۔ اس کی چال بالکل متوازن تھی اور وہ ان چٹانی راستوں پر دائیں بائیں دیکھے بغیر پر سکون انداز میں چلتا جا رہا تھا۔ اس وقت اس آسیب زدہ ماحول میں مورین کو کوئی سہارا تھا تو وہ صرف اس خاموش آدمی کا۔ اس کا مسلسل چلنا اس کو حوصلہ دے رہا تھا۔

اس کے پیچھے مقامی مزدوروں کی ایک لمبی قطار تھی ان کو دیکھ کر مورین کے دل میں کسی بچھو کی لمبی سی دم کا خیال ابھرتا اور اس دم کے آخری سرے پر جہاں بچھو کا ڈنگ ہوتا ہے اس کا شوہر میجر فین اپنے خچر پر سوار تھا۔

اس بے کراں سکوت میں بعض اوقات اس کو کسی خچر یا گدھے کے سُم کسی پتھر سے ٹکرانے کی آواز آتی تو وہ چونک اٹھتی۔ بعض اوقات اس کا اپنا خچر لڑکھڑا جاتا۔ کئی دفعہ مزدوروں کی آوازیں ابھرتیں جو اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے مگر پھر جلد ہی سناٹا چھا جاتا۔ ہاں..... بچھو کی دم کے بالکل آخری سرے سے ایک غراتی ہوئی ڈانٹ وقفے وقفے سے ضرور ابھرتی جو مزدوروں کے دم توڑتے قدموں کی رفتار کو بڑھا دیتی۔

یہ راستہ اب ایک گھاٹی میں داخل ہو رہا تھا جس کے دونوں طرف بلند چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور بڑی بڑی زرد رنگ کی چھپکلیاں اور دوسرے رینگنے والے خوف ناک شکل کے کیڑے ان سے ڈر کر چٹانوں میں بنے بلوں میں گھس رہے تھے۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ یہاں ان چٹانوں نے انہیں سورج کی تیز دھوپ سے کچھ سایہ ضرور فراہم کر دیا تھا لیکن تقریباً پچاس گز سامنے گھاٹی دوبارہ کھل گئی تھی اور ایک دفعہ پھر قہر برساتی دھوپ ان کے سروں پر برسنے لگی تھی۔

مورین کو صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے پھسلتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے اس شدت سے دبایا کہ اس کی اپنی ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مگر اپنے اوپر اختیار کی یہ کوشش کامیاب ثابت ہو گئی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا اور وہ کانپنے لگی۔ وہ رمسالال سے بات کرنا چاہتی تھی مگر جانتی تھی کہ بولنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

اب ان کا قافلہ ایک ہموار سطح پر پہنچ گیا تھا۔ دیو قامت بانسوں کے پودوں کے جھنڈ تھے اور بلند و بالا درختوں کی شاخیں آپس میں الجھ رہی تھیں۔

قافلے کی دم کے آخری سرے سے میجر فین نے کڑکتی ہوئی آواز میں رکنے کا حکم دیا تو رمسالال نے فوراً باگیں کھینچ کر مورین کا خچر روک دیا پھر اس نے اس کو سہارا دے کر زین سے نیچے اتارا اور ایک جگہ بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ اس وقت تک وہ خود حرکت کرنے کے قابل ہو گئی جب اس کا شوہر اس کے پاس آ کر کھڑا ہوا اور اس کو دیکھنے لگا۔ اس کی تراشیدہ بھنویں تن گئیں اور ہلکی نیلی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کے حسین چہرے پر تفکر کی لکیریں تھیں۔ مزدور خچروں اور گدھوں سے سامان اتارنے میں مصروف رہے اور میجر فین پاؤں پھیلائے کھڑا اس کو گھور رہا تھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی نظریں ملیں مگر زبان کچھ نہ بولی۔ رمسالال مزدوروں کو ہدایات دے رہا تھا۔

''ہم..... یہاں رات گزاریں گے۔'' میجر فین بولا۔ اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک تیز مزاج شخص ہے۔

مورین خاموش بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولا۔ ''تم برما کا اصل حسن دیکھنا چاہتی تھیں نا..... لو تمہاری آرزو پوری ہو رہی ہے۔''

مورین نے اس کی بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تو وہ اپنی ہلکی مونچھوں کو مروڑتا ہوا کیمپ لگانے کے کام کا

معائنہ کرنے چلا گیا۔

رمسالال اس وقت تک مورین کے لیے خیمہ تقریباً کھڑا کر چکا تھا اور مورین اس کو کام کرتے مضطرب انداز میں دیکھ رہی تھی کیونکہ ظالم سورج اپنی قہر سامانیوں سمیت پہاڑوں کے پیچھے اتر گیا تھا مگر اس کی تپش ابھی باقی تھی۔ مورین کی برداشت اپنی آخری حد تک پہنچ گئی تھی مگر اس نے اپنے شوہر کے سامنے اپنے آپ کو کمزور ظاہر نہیں کیا تھا۔

جب سارا کام مکمل ہوگیا تو رمسالال نے خیمے کے دروازے پر پڑا کپڑا ایک طرف ہٹایا اور سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔

مورین اٹھی اور خیمے میں داخل ہوگئی۔ جب رمسالال نے خیمے کا پردہ گرادیا تو وہ بھی فرشی بستر پر ڈھے گئی اور اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

اس چھوٹے سے میدان میں جلد ہی شام کا دھندلکا اترنے لگا اور لیمپ روشن ہونے لگے۔ کہیں کہیں آگ کے سرخ دائرے رقصاں تھے جس کے گرد مزدور ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان سے کچھ دور ایک کالی چٹان تھی جس کے گرد گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اس چٹان پر میجر فین سینے پر ہاتھ باندھے ساکت کھڑا تھا۔ ہوا بانس کے پودوں میں سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ کیمپ میں آگ چیخ رہی تھی اور مقامی مزدوروں کی بڑبڑاہٹ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ابھر کر رہ جاتی۔ مگر ان سب سے بے نیاز مورین کا شوہر میجر فین اس چٹان پر کھڑا اس راستے کو بغور دیکھ رہا تھا جس پر چلتے ہوئے وہ یہاں پہنچے تھے۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح کھڑا رہا پھر چٹان سے نیچے اترا اور تیزی سے چلتا ہوا اس راستے پر کچھ دور تک گیا پھر رک کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ واپس مڑا اور مورین کے خیمے کے قریب آگ کے الاؤ کے پاس بیٹھے رمسالال کو کندھے سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اوپر اٹھایا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ غرایا۔

رمسالال اس کے ساتھ چل پڑا۔ میجر فین نے اسے راستے کے سرے پر کھڑا کر دیا اور حکم دیا۔ ''سنو..... غور سے سنو اس آواز کو.....''

رمسالال کان لگا کر پوری توجہ سے سننے لگا۔ میجر فین اس کے چہرے کی طرف مضطرب انداز میں دیکھ رہا تھا۔ ''کیا تم نے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں سنیں؟''

رمسالال نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ ''مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا صاب۔''

''اپنا کان زمین کے ساتھ لگاؤ اور سنو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے دور اس راستے پر سائے حرکت کرتے دیکھے ہیں اور گھوڑوں کے سموں کی آوازیں سنی ہیں۔''

رمسالال گھٹنوں کے بل زمین پر جھک گیا۔ میجر فین اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اضطراب بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں اس کا چہرہ خوفناک نظر آرہا تھا۔ رمسالال اٹھ کھڑا ہوا اور سر کو نفی میں ہلانے لگا۔ ''کچھ بھی نہیں ہے صاب.....'' اس نے دہرایا۔

میجر فین نے اس کے کندھے کو سختی سے پکڑا اور اپنی طرف گھماتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کیا تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو'' وہ غرایا۔ ''یقیناً تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا صاب..... میں قسم اٹھاتا ہوں یہ سچ ہے۔''

''تم بھی ان کے ساتھ ملے ہوئے ہو۔'' میجر فین غصے سے پھٹ پڑا اور اس کو پیچھے دھکیلتے ہوئے ایڑیوں کے بل گھوما اور اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔

رمسالال بھی مڑا اور آگ کے الاؤ کے پاس پہنچ گیا۔ میجر فین فوجی انداز میں چلتا ہوا اپنے خیمے کے دروازے پر رک گیا۔ کچھ غور سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنے کندھے جھٹکے اور خیمے کے اندر چلا گیا۔

ایک مقامی شخص نے جلتی آگ پر مزید تیل چھڑکا تو چنگاریاں تیزی سے فضا میں اچھلیں اور منظر مزید دھندلا گیا۔ جب کبھی آگ چٹختی تو انسانی آوازوں کا شور اٹھتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ کبھی کسی کتے کے بھونکنے کی ہلکی سی آواز آجاتی۔ کہیں کہیں چمگادڑوں کی ہلکی چیخیں بھی سنائی

دیتیں ہوا اپنے شب کے سفر پر نکل پڑی تھیں۔

اچانک ایک خوفناک اور دل دہلا دینے والی دھاڑ مشرق کی جانب گھنے درختوں کے بیچ اندھیرے سناٹے کو چیرتی ہوئی ابھری اور پھر معدوم ہوگئی مگر آگ کے گرد بیٹھے لوگوں میں کوئی ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ وہ برما کے جنگلوں کی ان آوازوں کے عادی تھے۔ جانوروں کے غرانے، چنگھاڑنے، دھاڑنے اور چیخنے کی آوازوں کے علاوہ آسمان پر پرندوں کے پھڑ پھڑانے کی آوازیں جنگل کے بیدار ہونے کی علامات تھیں۔ اندھیرے کے مسافر چہ گاوڑیں بھی باہر نکل آئی تھیں۔

کافی دور بندوق کے دھماکے کی آواز آئی جو پہاڑیوں میں گونجنے لگی اور پھر معدوم ہوگئی۔ کوئی بھی نہیں چونکا کیونکہ یہ بھی یہاں کا معمول تھا۔ اس کے بعد وہ پراسرار دھماکہ پھر سنائی دیا اور دوبارہ کہیں کھو گیا۔ اب آگ دھیمی پڑنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

موریں لیٹی ہوئی تو تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کھلی آنکھوں سے خیمے کی چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ کھانا کھا چکی تھی مگر اب پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ رات کی ان آوازوں سے خوف زدہ نہیں تھی کیونکہ اس کے پاس سوچنے کے لیے مزید خوف ناک اور خطرناک چیزیں تھیں۔

رمسالال اس کے باپ کے دور کا نوکر تھا۔ وہ اس پر تو اعتماد و اعتبار کر سکتی تھی مگر دوسرے دوسرے مزدور تو میجر فین کے آدمی تھے۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ ایسا کیا ہوا کہ اس کا شوہر ایک آرام دہ بنگلے کے عیش و آرام کو چھوڑ کر ان بے آب و گیاہ اور بنجر و ویران پہاڑیوں میں نکل آیا تھا۔ اس نے ظاہر یہ کیا تھا کہ یہ ایک تفریحی دورہ ہے مگر ان کے پاس ساز و سامان اس قسم کا نہ تھا جو سیر و تفریح کے لیے کام آتا ہے اور عموماً یہ بھی نہیں ہوتا کہ کوئی آدھی رات کو نرم بستر سے نکل کر اس قسم کے سفر پر روانہ ہو جائے۔ اس پر مستزاد یہ کہ روانگی کے آخری لمحے تک میجر فین نے اس سے اس معاملے میں کوئی بات نہیں کی۔ بات تو وہ اس سے ویسے بھی کم ہی کرتا تھا۔ ان کی گفتگو صرف کسی پارٹی وغیرہ میں صرف عام لوگوں کے سامنے ہوتی تھی۔ زبردستی کے اس سفر نے تو اسے توڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر بلانوش ہے۔ اب خدا جانے اس معاملے کا اختتام کیا ہوگا۔

وہ دھیرے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور ایک موم بتی روشن کر لی جو وہ اپنے لباس سے نکال کر پہلے ہی رکھ چکی تھی۔ یہ وہ آخری موم بتی تھی جو وہ اس پاگل کر دینے والے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے گھر سے لے کر چلی تھی۔

شادی کے بعد اس نے جو کچھ سیکھا تھا اس کے عوض اپنے آنسوؤں کا خراج پیش کیا تھا۔ یہ میجر فین کے کردار کا وہ پہلو تھا جسے اس نے شادی سے پہلے اس سے چھپایا تھا۔ دونوں نے تقریباً سال بھر پہلے شادی کی تھی۔ میجر فین برٹش آرمی میں ملازم تھا اور آج کل ہندوستان میں تعینات تھا۔ خوشی کے دن مختصر رہے اور جلد ہی ان کے درمیان خلیج بڑھنے لگی جو چھے ماہ پہلے اتنی وسیع ہوگئی جسے عبور کرنا دونوں میں سے کسی ایک کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ اینگلو انڈین معاشرے میں طلاق کا تصور نہ تھا اور بے چاری موریں اپنی ازدواجی زندگی کی ابتداء میں ہی اس وجہ کو سمجھ گئی تھی۔

اس نے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکالا اور موم بتی کی دھیمی روشنی میں ایک بار پھر پوری توجہ سے اسے پڑھنے لگی۔ یہ اس کی ماں نے اس کے نام لکھا تھا جس میں اس نے میجر فین سے اپنی کھلی نفرت کے باوجود خاصی لچک دکھائی تھی۔ یہ خط تھا زیادہ تر دلاسوں پر مشتمل تھا۔ وہ اسے اس دھیمی روشنی میں بار بار پڑھتی رہی۔ لکھا تھا۔

''مسٹر ہیرنگے نے اپنے آخری خط میں مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں اگلے جہاز سے فوراً رنگون آجاؤں۔ اس نے مجھے ہر حقیقت بتا دی ہے مگر اس طرح نہیں کہ مجھے دھچکا لگے۔ مجھے کبھی بھی رالف فین پر بھروسہ نہیں رہا اور یہ حقیقت تم سے چھپی نہیں ہے۔ میں اس کی سابقہ زندگی کو اچھی طرح جانتی ہوں مگر تم نے میری کسی بات پر یقین نہ کیا۔ میری بے چاری اور پیاری بیٹی ..... میں وہ کچھ بھی جانتی ہوں جو تم نہیں جانتی۔ اس کا باپ

کولمبو میں نہیں مرا تھا بالکل اس نے کلکتہ کے ایک پاگل خانے میں آخری سانس لی تھی اور فین خاندان میں دوسرے جانے پہچانے شرابی بھی موجود ہیں۔"

ابھی وہ اتنا ہی پڑھ پائی تھی کہ ایک ہاتھ مورین کے کندھے کے اوپر سے آیا اور اس نے وہ خط اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ وہ اضطراری کیفیت میں بوکھلا کر مڑی تو دیکھا کہ اس کا شوہر میجر فین غضبناک چہرہ لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی مٹھی بھنچی ہوئی تھیں اور نیلی آنکھوں میں شدید غصہ تیر رہا تھا۔ وہ دھاڑا۔

"تو تم..... اس کا خط بھی اپنے ساتھ لے کر آئی ہو۔"

مورین نے کمبل کے ایک کونے کو مضبوطی سے پکڑ لیا مگر کچھ بولی نہ حرکت کی کیونکہ اس وقت فین کے سر پر پاگل پن کا بھوت سوار تھا۔

میجر فین نے تیزی سے موم بتی کو اٹھایا اور اس کو خط کے قریب لے جا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھوں کی لرزش اس اضطراری کیفیت کو ظاہر کر رہے تھے جس سے وہ گزر رہا تھا۔ خط پڑھتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے مگر آنکھوں کی وحشت نہ گئی۔ وہ دھیرے سے بولا۔

"تمہاری ماں کی طرف سے ہے مگر اس میں بھی جیک ہیرنگے۔ لعنت ہو اس جیک ہیرنگے پر۔"

اس نے موم بتی نیچے رکھ دی اور خط کے پرزے کرنا شروع کر دیے۔ اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ رہا تھا۔ مورین اس صورت حال سے خوف زدہ تھی۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی پھیلتی جا رہی تھی۔ فین نے ہذیانی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے اس خط کے پرزے ہوا میں اچھال دیے اور پھر شرارے برساتی آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم جھوٹی اور منافق ہو..... تم کیوں نہیں مانتی کہ وہ....."

غصے کی شدت کے باعث وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا اور وہیں کھڑا لرزتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں قہر تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم نہیں مان سکتی..... نہیں مان سکتی۔"

وہ مڑا، تیزی سے خیمے کا پردہ ہٹایا اور پھر باہر نکل گیا۔

مورین اس کے واپس جاتے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔ ایک زوردار دھاڑ رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی کہیں دور ابھری اور پھر کہیں قریب ہلکی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سنائی دی جیسے شاید کوئی پرندہ خیمے کے اوپر سے گزرا تھا۔

☆.....☆.....☆

پو پھٹتے ہی یہ مختصر قافلہ ایک بار پھر اپنے خوف ناک سفر پر روانہ ہو گیا۔ میجر فین پوری طرح شراب کے نشے کے زیر اثر نظر آ رہا تھا۔ وہ حسب معمول قافلے کی دم کے آخری سرے پر تھا اور اکثر کافی پیچھے رہ جاتا۔ وہ رک رک کر کچھ سننے اور دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اب وہ ان پہاڑیوں سے نکل کر شمال مشرق کی طرف ایک پیالہ نما وادی میں اتر رہے تھے جہاں دریائے سلوین کا ایک معاون دریا بہہ رہا تھا۔ خشک موسم شروع ہو چکا تھا اس لیے یہ پورا علاقہ شدید تپش اور گرد کا منظر پیش کر رہا تھا۔

چلنے سے پہلے وہ بے لذت سا ناشتہ کر چکے تھے۔ مورین کو اب یقین ہو چلا تھا کہ اس کا شوہر پوری طرح پاگل ہو چکا ہے۔ وہ اپنے آپ سے بڑبڑاتا رہتا تھا اور مڑ مڑ کر اپنے کندھے کے اوپر سے پیچھے اس راستے کو بار بار دیکھتا رہتا جس سے وہ گزر رہے تھے۔

دوپہر تک وہ ایک گاؤں کے باہر پہنچ گئے جس کے باشندے اس اجنبی قافلے کو دیکھنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ مورین کو ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید یہاں کوئی غیر ملکی موجود ہو مگر صرف مقامی لوگوں کو دیکھ کر وہ مایوس ہو گئی۔ اس کی حالت نہایت ابتر تھی۔ وہ ایک پاگل شخص کی راہ نمائی میں سفر کر رہی تھی۔ وہ ان انجانے ویرانوں اور جنگلوں میں مہذب دنیا سے دور اور زیادہ دور جا رہی تھی۔ آس پاس مقامی لوگ تھے جو اس کے لیے اجنبی تھے مگر ایک شخص ضرور تھا جو اس کے لیے امید کی کرن تھا۔

اس سفر سے اس کے شوہر کا کیا مقصد تھا وہ ابھی تک سمجھ نہ پائی تھی۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل بھی نہ تھی نہ

ہی اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا کہ وہ کوئی منصوبہ بنا سکتی۔ اس قابل رحم حالت میں وہ آگے بڑھنے پر مجبور تھی۔

دوپہر کی گرمی اور حدت اس وادی میں ناقابل برداشت تھی۔ ان حالات میں قیام ناگزیر تھا اس لیے انہوں نے جنگل کے کنارے کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا۔ سورج کی حدت سے یہاں سبزہ تک جھلسا ہوا نظر آرہا تھا۔ یہاں کوئی پاگل ہی رکنے کا سوچ سکتا تھا مگر میجر فین کے حکم کی سرتابی ممکن نہ تھی۔ مزدور قہر بھری نظروں سے اپنے مالک کو دیکھتے ہوئے کام پر لگ گئے۔ رمسالال بھی اس فیصلے پر خوش نظر نہیں آتا تھا مگر مورین نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ ذہنی طور پر پریشان تھی اور خاموش رہنا مناسب سمجھتی تھی۔ اس کے منہ سے نکلا ایک بھی لفظ ساری صورتحال کو خراب کر سکتا تھا۔ اس کا کوئی فعل چنگاری ثابت ہو سکتا تھا۔

مزدوروں کو کام میں مصروف چھوڑ کر اس شدید گرمی میں میجر فین تنہا ایک طرف نکل گیا۔ اس نے کسی کو کچھ بتایا نہ وضاحت کی کہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ مورین کو اس کی روانگی کا علم رمسالال کی زبانی ہوا۔ اس نے لاتعلقی سے یہ خبر سنی مگر کوئی سوال نہ کیا اور اپنے چھوٹے خیمے میں لیٹی سامنے جنگل کو دیکھتی رہی۔ دن گزرتا رہا رمسالال جو کھانا اس کے سامنے رکھ گیا وہ اس نے کھا لیا مگر شوہر کا رویہ اس کے لیے شدید تناؤ کا باعث تھا۔ یہ ناقابل قبول صورت حال تھی۔

پوری دوپہر اس قافلے پر ایک خوف ناک سکوت چھایا رہا مگر سہ پہر کے قریب اچانک وہاں کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شور تھم گیا۔ رمسالال کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ صبح وہ جس گاؤں کے قریب سے گزرے تھے وہاں سے چند لوگ آئے تھے۔ وہ رمسالال سے اس کی تفصیل جاننا چاہتی تھی مگر اندرونی کیفیت نے اس کے ذہن اور دماغ کو باندھ رکھا تھا اس لیے وہ چاہ کر بھی کچھ بول نہ پائی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ سہ پہر کے بعد شام ڈھلنے لگی اور ایک دفعہ پھر کیمپ میں شور شرابا شروع ہو گیا۔ ابھی تک میجر فین واپس نہیں آیا تھا۔ کیڑے مکوڑے اور دوسرے رینگنے والے جانور اس کے ارد گرد نمودار ہونا اور چلنا پھرنا شروع ہو گئے تھے مگر اسے کسی چیز کی پروا نہ تھی۔ اس نے ایک مکڑی کو مسل ڈالا جو تقریباً ایک انچ بڑی تھی اور اس کے بستر کی چادر پر گھوم رہی تھی۔ مسلنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک اس کو کاہلی سے دیکھتی رہی۔

اندھیرا اترنے لگا اور رات کو ابھرنے والی جنگل کی آوازیں بیدار ہونے لگیں۔ تب رمسالال خیمے میں آیا۔

''معذرت چاہتا ہوں میم صاب..... مگر مجھے آپ سے بات کرنا ہوگی۔''

وہ نیم دلی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

رمسالال نے بات شروع کی۔ ''قریبی گاؤں سے کچھ لوگ آئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں سے اپنا کیمپ اٹھا لیں کیونکہ یہ ان کے دیوتا کی زمین ہے اور ان کے لیے مقدس ہے۔''

''رمسالال..... میں تو کچھ نہیں کر سکتی۔'' مورین دھیمی آواز میں بولی۔

''ہمیں ان کی بات ماننا ہوگی۔'' رمسالال نے جواب دیا۔

''میجر فین ہی اس معاملے میں کچھ کر سکتا ہے۔'' مورین بے بسی سے بولی۔

''مگر وہ جنگل میں کچھ تلاش کرنے گئے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے۔'' رمسالال نے وضاحت کی۔

مورین نے کوئی جواب نہ دیا تو رمسالال دوبارہ بولا۔

''مزدوروں کو یہ بات پہلے سے معلوم تھی مگر اب یہ مقامی لوگ جو یہاں آئے ہیں تو وہ زیادہ خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ یہ جگہ آسیب زدہ ہے میم صاب.....''

اس کی بات سنتے ہی مورین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک جھرجھری لے کر اپنے سر کو جھٹکا۔ اپنی مایوسیت دور کرنے کی کوشش کی اور بولی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟''

اس جنگل میں ایک قدیم مندر کے کھنڈرات ہیں

جہاں ایک رشی کی باقیات دفن ہیں۔اس کی روح اس جگہ کی حفاظت کرتی ہے اور اس کی وجہ سے شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد یہاں کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔'' رمسا لال نے وضاحت کی۔

''مگر گاؤں کے آدمی جو اس وقت یہاں آئے ہیں۔'' مورین بولی۔

''وہ سب سورج ڈوبنے سے پہلے آئے تھے میم صاب .....اندھیرا پھیلنے کے بعد یہاں کوئی نہیں آتا۔ دیکھیں وہ کتنے خوفزدہ ہیں۔''

صورت حال کے تقاضے کے تحت بادل نخواستہ مورین اٹھی اور خیمے سے باہر آکر اِدھر اُدھر دیکھا۔آگ کا بہت بڑا الاؤ کیمپ کے عین درمیان روشن تھا۔سارے لوگ اس کے گرد دائرے کی شکل میں جمع تھے۔

''اس وادی پر آسیب کا اثر ہے میم صاب.....'' رمسا بولا۔''اس وادی میں رات صرف وہی گزار سکتا ہے جس کا دل لالچ سے پاک ہو۔''

مورین اس کی طرف دیکھتی رہی۔''کیا مطلب ہے تمہارا.....؟''

''مطلب یہ میم صاب..... کہ جس کے دل میں رتی بھر بھی لالچ ہوگا وہ رات کو یہاں موجود ہو تو صبح..... پو پھٹنے سے پہلے مرجائے گا۔''

''کس طریقے سے.....؟''

رمسا لال نے اپنے کندھے اچکائے۔''کوئی نہیں جانتا.....''

''تم خوف زدہ ہو.....؟'' اس نے پوچھا۔

''میں بالکل بھی خوف زدہ نہیں کیونکہ میں اس وادی میں کئی برس پہلے ایک رات گزار چکا ہوں۔''

''تم تنہا تھے.....؟''

''دو لوگ اور تھے میرے ساتھ.....''

''ان کے ساتھ کیا ہوا؟''

''ایک کو صبح ہونے سے کچھ پہلے ایک سانپ نے ڈس کر مار ڈالا۔دوسرا ابھی بھی زندہ ہے۔''

مورین نے کندھے اچکاتے ہوئے پوچھا۔''کیا تم جانتے ہو میجر فین کہاں گیا ہے؟''

''میم صاب .....جنگل میں پرانے مندر کے قریب ندی بہتی ہے۔اس کے کنارے پہاڑیوں میں یاقوت اور لعل کی کانیں ہیں۔میرا خیال ہے وہ انہی کی تلاش میں گیا ہے۔''

مورین کے پاؤں جیسے زمین پر چپک سے گئے تھے۔''وہ واپس تو آجائے گا نا.....رمسا لال۔؟''

''سورج طلوع ہونے سے پہلے ہم جان جائیں گے۔''

مورین کچھ دیر اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر بولی۔''میرے لیے کافی بناؤ۔مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ خیمے کے اندر چلی گئی اور لیمپ جلالیا۔

''کیا ستم ظریفی ہے۔اس کے شوہر نے کیمپ لگانے کے لیے یہی آسیبی وادی کیوں چنی تھی۔'' انہی سوچوں میں گم وہ بیٹھی تھی جب رمسا لال کافی لے کر آیا۔ ابھی اس نے ٹرے زمین پر رکھی ہی تھی کہ باہر ابھرنے والی ایک دلدوز چیخ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔آواز دوبارہ گونجی۔پھٹی آواز میں چیخنے کی آوازیں۔دل کو ہلا دینے والی جس کو بیان کرنا مشکل ہے۔

مورین اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھی اور رمسا لال کے پیچھے بھاگتی ہوئی خیمے سے نکلی۔کوئی چیختا ہوا جنگل کی طرف سے کیمپ کی طرف بھاگا چلا آرہا تھا۔سارے مزدور خوف زدہ ہو گئے اور جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔مگر اس آسیبی اندھیرے میں بھاگنا بھی مشکل تھا۔

مشرقی سمت گھنی جھاڑیوں کے اندر سے ایک سایہ بھاگتا ہوا باہر نکلا۔یہ میجر فین تھا جو فلک شگاف چیخوں کے ساتھ تقریباً بھاگتا ہوا اور گرتا پڑتا تقریباً مورین کے قدموں میں آن گرا۔وہ بے حال تھا اور اس کے گلے میں ہیروں کی بے شمار مالائیں تھیں اور اس نے سونے چاندی کے قیمتی زیورات اور برتنوں کی ایک گٹھری اٹھا رکھی تھی۔

رمسا لال سب سے پہلے حواس میں آیا۔لپک کر

میجر فین کو سنبھالا اور اس کو سہارا دے کر خیمے میں لے جانے کی کوشش کی۔ مورین نے بھی آگے بڑھ کر رمسالال کی مدد کی اور دونوں اسے اٹھا کر خیمے کے اندر بستر تک لے گئے۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں مگر احساس سے عاری تھیں۔ ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ مٹھیاں کھل اور بھنچ رہی تھیں۔ گھٹنے مشینی انداز میں ہل رہے تھے۔ مورین اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''رمسا لال..... رمسا لال..... اب میں کیا کروں۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' مورین روہانسی ہو کر پوچھنے لگی۔

رمسالال نے میجر کے کالر کے بٹن کھول دیے اور لیمپ اٹھا کر میجر کے سارے جسم کا معائنہ شروع کر دیا۔ بظاہر اسے کوئی نشان نظر نہ آیا پھر وہ اس کے ٹخنے دیکھنے لگا مگر میجر نے موٹے چمڑے کے لانگ بوٹ پہن رکھے تھے۔ رمسالال نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلانے لگا۔

''لگتا ہے اسے بن دیوی نے کاٹا ہے۔ مگر اس کا کوئی نشان نہیں ہے۔''

بن دیوی کا نام سن کر خیمے کے باہر خوف زدہ کھسر پھسر سنائی دی جہاں مقامی مزدور ٹولیوں کی شکل میں کھڑے اندر جھانک رہے تھے۔ مورین اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''گرم پانی لاؤ رمسالال۔'' وہ بولی۔ ''ہمیں اس کے جسم کو دھونا ہوگا۔''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں میم صاب..... اس کے جسم پر کاٹے کا کوئی نشان نہیں۔ ہوسکتا ہے یہ جنگلی بخار ہو۔''

اچانک میجر فین کی حالت میں تغیر ظاہر ہوا۔ اس کی بے چین اور مضطرب حرکات بند ہوگئیں اور وہ پرسکون ہوگیا۔ سانس معمول پر آگئی اور اس کی آنکھوں کی وہ عجیب چمک ختم ہوگئی۔ اس نے مورین کی طرف دیکھا اور پرسکون آواز میں بولا۔ ''ہیرنگے تمہیں اپنے الفاظ پر شرم آنی چاہیے۔ تم نے جان بوجھ کر مجھ پر کارڈ بدلنے کا الزام لگایا۔ میں ایسا کام بھلا کیوں کروں گا۔ مجھے تم میں سے کسی کی پرواہ نہیں۔ میں تم سب کو خرید اور بیچ سکتا ہوں۔''

مورین دھیرے سے دوبارہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور ہونٹ بھینچ کر اپنے خاوند کو دیکھنے لگی جو پاگل پن کے انداز میں اب خالی ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ دوبارہ بولنے لگا۔

''ہیرنگے۔۔۔ تم سن رہے ہو نا۔۔۔۔ میرے پاس بہت دولت ہے۔ ہیرے اور یاقوت ہیں جو پورا ایک شہر خریدنے کے لیے کافی ہیں۔ ہیرنگے۔۔۔۔ سوچو ذرا۔۔۔۔ خزانے سے بھرا وہ کمرہ..... جہاں سانپ۔۔۔۔ ہیں۔۔۔۔۔ سانپ۔۔۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔۔۔۔ سینکڑوں سانپ۔۔۔۔ مگر بڑے مستقبل کے لیے بڑا خطرہ مول لینا پڑتا ہے جیسے میں نے لیا۔''

''یہ مقام اور وقت گڈمڈ کر رہا ہے۔'' رمسالال بڑبڑایا۔ ''وہ کمشنر صاحب سے بات کر رہا ہے اس چیز کے متعلق جو یہاں اس وادی میں ہے۔''

مورین ہیجانی انداز میں سانس لے رہی تھی۔

میجر فین پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولنے لگا۔ ''تم نے دیکھا ہے میں کتنا امیر ہوں تو میں تمہیں کیوں دھوکہ دوں گا۔ تم مجھ سے بات نہ کرو۔ لعنت ہو تم پر۔''

اچانک میجر فین بستر سے اٹھ بیٹھا اور لیمپ کے پیچھے اندھیرے سایوں میں گھورتے ہوئے بولنے لگا۔ ''میں جانتا ہوں تم ایک روح ہو۔ اوہ خدا۔۔۔ میں سمجھ گیا۔ میں ہیرنگے کے بنگلے سے کافی دور آ گیا ہوں۔ میں اس وقت بیٹھا پی رہا تھا حتیٰ کہ میں نے وہسکی کی پوری بوتل خالی کر دی۔''

پھر وہ یوں آگے جھکا جیسے کان لگا کر کچھ سن رہا ہو۔ ''ہاں۔۔۔ میرے واپس جانے کی ایک وجہ تھی۔ خدا گواہ ہے میرا یہ منصوبہ نہیں تھا۔ میں کسی وجہ سے واپس گیا تھا۔''

اس کا پراسرار رویہ اور بیان جاری رہا۔ وہ دوبارہ بولنے لگا۔ ''جب میں نے برآمدے میں پاؤں رکھا تو ہیرنگے وہاں مورین کی تصویر ہاتھ میں پکڑے بیٹھا تھا۔۔۔۔ میری بیوی کی تصویر۔۔۔۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو نا۔۔۔۔ کیا تم سمجھ رہے ہو۔ مورین کی

تصویر۔۔۔۔اور جب میں اس کے پیچھے کھڑا تھا تو اس نے اس کو اپنے لبوں تک اٹھایا۔۔۔وہ۔۔۔۔۔"

میجر فین کہتے کہتے دفعتہً یوں رک گیا جیسے کسی نے اس کی بات کاٹ دی ہو۔مورین اپنے بے تحاشہ دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی غیر انسانی سرسراتی آواز سن رہی تھی۔ وہ ان مقامی مزدوروں کے سانس کی آواز بھی سن سکتی تھی جو اس کے خیمے کے باہر جمع تھے۔اس کے علاوہ جنگل سے بھی کوئی غراہٹ یا دھاڑنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس کا شوہر دوبارہ بولنے لگا۔

"..... میں نے پیچھے سے اس کے سر پر ضرب لگا کر اسے ڈھیر کر دیا۔ہاں.....اس کا خون تصویر پر بکھر گیا۔تم کیا سمجھتے ہو میں پاگل تھا؟.....اگر میں پاگل نہ ہوتا تو میں اس پر حملہ نہ کرتا۔تم مجھے الزام نہیں دے سکتے۔اس وقت میری ذہنی کیفیت درست نہ تھی میں نشے میں تھا۔"

وہ یوں پیچھے گر گیا تھا جیسے تھک گیا ہو پھر دوبارہ اچانک اٹھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔جب اس کی نظر مورین پر پڑی تو وہ بولنے لگا اگرچہ اس کی آواز نحیف تھی مگر اس کی اپنی تھی۔

"مورین۔۔۔۔تم چڑیل مجھے پینے کو کچھ کیوں نہیں دیتی۔" وہ اپنے حواس میں آگیا تھا اور اس کو پہچان گیا تھا۔اس نے اپنی بھنویں پرانے انداز میں اچکائیں۔"اب میں دولت مند آدمی ہوں اور جب انگلستان واپس جاؤں گا تو پھر دیکھوں گا کہ جیک ہیرنگے تمہارے لیے کیا کرتا ہے۔میں نے پرانے مندر سے یہ ساری دولت حاصل کی ہے اور اب میرے پیچھے وہ۔۔۔۔۔۔"اس کی بات ادھوری رہ گئی اور اس کے الفاظ ایک دل دہلا دینے والی چیخ میں بدل گئے۔میجر فین اپنے ہاتھ چلانے لگا اور حواس کھو کر بستر پر گر گیا۔

"میم صاب.....آپ کو دل مضبوط رکھنا ہو گا۔" رمسالال مورین کو تسلی دینے لگا۔"..... یہ جگہ آسیبی ہے کوئی دوا اس کو بچا نہیں سکتی سوائے ایک چیز کے۔"

مورین نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔"وہ کیا.....جلدی بولو۔"

رمسالال بے ہوش پڑے میجر فین کی طرف جھکا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔پھر اس نے مورین کو اشارہ کیا کہ خیمہ خالی کر دو۔وہ سب خیمے سے باہر چاند کی روشنی میں آگئے وہاں زمین پر آسیبی مندر سے لوٹا گیا خزانہ پڑا تھا اور دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ خوف ناک مندر بالکل سامنے کھڑا تھا۔اس کا بیرونی دروازہ وقت کے ہاتھوں تباہ ہو چکا تھا۔مورین نے سکون کی ایک لمبی سانس لی۔ان کو یہاں تک پہنچنے میں گھنے جنگل کے ایسے راستے سے گزرنا پڑا تھا جہاں سرسراتے سانپوں کے ڈھیر تھے۔رمسالال نے لالٹین اوپر اٹھا کر ٹوٹے دروازے کے تاریک خلا سے اندر جھانکا۔دروازے کے دونوں طرف بنے ستون ٹوٹ کر آدھے آدھے گر چکے تھے۔رمسالال نے وہ لالٹین ان میں سے ایک ستون پر لٹکا دی۔اس کی دھندلی پیلی روشنی چاند کی کرنوں کے سامنے پھیکی تھی۔

"ہمیں یہ سارا خزانہ واپس کرنا ہوگا۔" رمسالال نے سرگوشی کی اور ایک ایک کر کے اس نے وہ زیورات مورین کو تھمانا شروع کر دیے۔رمسالال نے لالٹین اٹھائی اور مندر کے اندر اترنا شروع کر دیا۔مورین اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"اس وادی میں اس آسیبی مندر کا راستہ صرف چند لوگ ہی جانتے ہیں۔" رمسالال نے بتایا۔

"تم یہ راستہ کیسے جانتے ہو؟" مورین نے پوچھا مگر رمسالال نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک سرنگ نما راستے سے چلتے ہوئے وہ ایک کھلے ہال میں پہنچ گئے جس کا بھاری دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔اب مورین نے اپنے آپ کو بے شمار ستونوں والے ایک ہال میں پایا۔پورے ہال میں جا بجا خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔کئی جگہ سے اس ہال کی دیواروں کی اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں اور اس میں سے چاند کی کرنیں اندر آرہی تھیں۔سامنے والی دیوار میں ایک خلا تھا جس میں خوف

ا...ل اور کالی شبیہ والی ایک دیوی کا شکستہ بت رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے قربانی کا ایک چبوترہ تھا جس پر لحیم شحیم ایک دیوتا ایک بلم اپنے کندھے پر رکھے چھاتی چوڑی کیے کھڑا تھا۔ چبوترے کے ساتھ زمین پر تین دروازے بنے ہوئے تھے یوں جیسے وہ کسی تہ خانے کا راستہ ہوں۔ مورین نے آگے بڑھ کر درمیان والے کو اوپر اٹھا دیا۔

''وہ نہیں ہے میم صاب......'' رمسالال کی تیز آواز ابھری۔ ''......یہ وہ نہیں ہے۔''

مگر اس وقت دیر ہو چکی تھی۔ جب اس نے درمیان والے کو اٹھایا تو سخت سڑی ہوئی بدبودار ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس کے چہرے پر تکلیف دہ آثار ابھرے۔ ایک بہت بڑے پروں والی سفید رنگ کی مخلوق کھلے دروازے سے نکل کر اس پر جھپٹی۔ مورین گھبرا کر پیچھے ہٹی تو وہ پرندہ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ کے نیچے سے نکل کر دائیں طرف اندھیرے میں گم ہو گیا۔ وہ اس کے پروں کی صرف پھڑ پھڑاہٹ سنتی رہ گئی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی وہ خوف ناک پرندہ ہال کے ایک ستون سے ٹکرانے کے بعد پلٹا اور دوبارہ اس پر حملہ آور ہوا۔ مورین نے اسے پلٹ کر آتے دیکھا مگر اس بار اس کا حملہ اس کے اعصاب سے زیادہ تیز تھا۔ مورین نے اس کے تیز پنجے اپنے عین چہرے پر محسوس کیے۔

☆......☆......☆

''میم صاب......'' اس نے کسی کو دور سے پکارتے سنا۔

مورین نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ صبح کا سورج سر پر چمک رہا تھا اور وہ جنگل کے باہر ایک پہاڑی کے نیچے اپنے کیمپ میں لیٹی ہوئی تھی۔ حواس بحال ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔

''رمسالال میں یہاں کیسے۔۔۔؟'' اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں نے اس مندر کا خزانہ اس کی اصل جگہ رکھ دیا تھا میم صاب......۔''

''مگر وہ دروازہ......؟'' مورین نے بے چینی سے پوچھا۔

''میم صاب......وہ دروازہ جو آپ نے کھولا تھا وہ بدقسمتی کا دروازہ تھا۔ وہاں اس رشی کی باقیات دفن ہیں۔''

''اوہ۔۔۔خدا۔۔۔'' اس نے خوف زدہ ہو کر اپنے ہاتھ سے اپنے چہرے کو ٹٹولا۔ اسے وہ خوف ناک سفید پرندہ یاد آ گیا تھا۔

''کیمپ کا کیا حال ہے۔۔۔؟''

''کیمپ ویران ہو چکا ہے۔ سب بھاگ گئے ہیں۔'' رمسالال دھیرے سے بولا۔

مورین تیزی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''میرا شوہر......میجر فین......؟''

''اس کے ہاتھ میں سونے کی ایک انگوٹھی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تھا اور جانتا تھا وہ کہاں سے آئی مگر میں اس کو اتارنا بھول گیا۔'' رمسالال نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''کیا مطلب............؟''

''میم صاب...... ہر اس چیز کو واپس مندر پہنچانا ضروری تھا جو وہاں سے آئی تھی ورنہ روح نے خود اسے واپس لے جانا تھا اس شخص سمیت......''

مورین کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ لرزتے قدموں سے اٹھی اور خیمے کی طرف بڑھی۔ رمسالال نے نرمی سے اسے سہارا دے رکھا تھا۔

''اس طرف مت جایئے میم صاب......''

''میں اسے ضرور دیکھوں گی......اس نے مجھے غلط سمجھا۔ تم نے اس کے الفاظ سنے تھے۔''

''اسے کچھ کہنا بے کار ہے میم صاب......اب وہ آپ کی آواز نہیں سن سکتا۔ مگر آپ جو کہنا چاہتی ہیں وہ میں جانتا ہوں۔ دیکھو صبح ہو رہی ہے۔''

''رمسالال......'' وہ سسک پڑی۔

''لالچی اور بے انصاف شخص رات بھر اس وادی میں صبح کی سپیدی دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا میم صاب......''

مورین اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسکنے لگی۔

Pakistanipoint.com

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

ضروری کیا نہیں ہے اور، ضروری کیا ہے
اب ان بیکار تفصیلوں میں جانا کیا ضروری ہے
(افشاں رمضان......راولپنڈی)

تمہارے لہجے میں یہ توازن بڑی مدت کے بعد آیا
کئی لہجوں کے دست دیکھے کئی روایوں کی خاک چھانی
(افشاں رمضان......راولپنڈی)

اسے وہ سب سوال آتے ہیں
جو مجھے لاجواب کردیتے ہیں
(عائشہ معین......چنیوٹ)

مجھے تیرے ساتھ چلنا ہے
شریعت کے اصولوں پر
(انتخاب: افشیں ستار......کھڈروسندھ سے)

نہیں ہوگا کمزور کبھی
تمہارا کبھی ہمارا رشتہ
(انتخاب: عارف مٹکا......نواب شاہ)

یہ تو وقت کی سازش ہے
کبھی تم مصروف کبھی ہم
(انتخاب: عائشہ خان......ساہیوال)

بہتی ہوئی آنکھوں کی روانی میں مرے ہیں
کچھ خواب میری عین جوانی میں مرے ہیں
روتا ہوں میں ان لفظوں کی قبروں پہ کئی بار
جو لفظ میری شعلہ بیانی میں مرے ہیں
(انتخاب: کائنات......محراب پور)

پردہ اٹھنے سے ہر روز نمایاں ہوگا
تیری انجمن میں کبھی تو چراغاں ہوگا
ہر موڑ پر تھی امید تیرے آنے کی
کھلے گی جب آنکھ ہر آنسو حیراں ہوگا
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

آدم خور درندے فارغ ہوگئے
جب سے وحشت پر مائل انسان ہوئے
(نبیل وسیم سیالوی......پنڈدادن خان)

یہ اپنے آپ سے نمٹ نہیں سکتی
یہ زندگی کبھی پلٹ نہیں سکتی
(انتخاب: ذکااللہ بھٹی......کراچی)

اس بھٹکے مسافر کو
اور رہنا ہے در بدر سائیں
(انتخاب: بشیر خان......کوہاٹ)

حشر میں نہ دینا اے خدا پھر سے
سزا کوئی زندگی جیسی
(انتخاب: شہریار خان......نوابشاہ)

یہ من جو تھا اس سے محبت کرتا
حق تھا اس کا کہ بدلے میں مجھ سے کرتا
وفا کا صلہ تو ملتا ہی یہی ہے
دل پھر کیوں اس سے شکایت کرتا
(محمد عادل بلوچ......بھولے دی جھول ساہیوال)

نہ کھول میرے مکان کے اداس دروازے
ہوا کا شور میری الجھنیں بڑھادے گا
میں خوب واقف ہوں اس کی فطرت سے فراز
درد دے گا تو اتنا کہ بس رلادے گا
(انتخاب: ایس حبیب خان-کراچی)

لوگ مل جاتے ہیں کہانی بن کر
دل میں بس جاتے ہیں نشانی بن کر
جن کو ہم رکھتے ہیں اپنی آنکھوں میں
کیوں نکل جاتے ہیں وہ پانی بن کر
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

کل رات برستی رہی ساون کی گھٹا
ہم بھی تیری یاد میں دل کھول کے روئے
(افتخار احمد......پھلریاں تلونڈی)

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا
(ساجدہ......کھڈیاں خاص قصور)

بھری محفل میں آنسو آگئے ہیں درگزر کرنا
قسم لے لو میں ناواقف تھا آداب محفل کے
(محمد عمران......پھلریاں تلونڈی)

☆

Pakistanipoint.com

وقت کی سب سازشیں ہی کرگئیں ہم کو جدا
آسماں کی گردشیں ہی کرگئیں ہم کو جدا
دنیا کے سارے سمندر میرے اشکوں سے بھریں گے
آنسوؤں کی بارش ہی کرگئیں ہم کو جدا
جانا تھا کس راہ پر اور جا کے ہم نکلے کہاں؟
یہ ذرا سی لغزش ہی کرگئیں ہم کو جدا
جھوٹ تھا تیرا مگر اس کو بھی سچ جانا کہ یہ
دنیا کی سب خواہش ہی کرگئیں ہم کو جدا
مانگ لے رب سے مدد ورنہ تو خانم جان لے
یہ ہماری رنجشیں ہی کرگئیں ہم کو جدا
(فریدہ خانم.....لاہور)

راتوں میں دن کے خواب لئے بھاگتے رہے
سایہ، شجر، گلاب، لئے بھاگتے رہے
پیڑوں کو کاٹتے ہوئے کھیتوں کو روندتے
ہم سبز انقلاب لیے بھاگتے رہے
گوشہ کوئی سکوں کا نہ خوابوں کا کنج ہے
صدیوں کا اضطراب لیے بھاگتے رہے
دل سے نہ بھاگ پائیں گے یہ جانتے ہوئے
زخموں کی وہ کتاب لئے بھاگتے رہے
یہ پھول بیٹھے آئے گا یوم حساب بھی
وہ خوف احتساب لیے بھاگتے رہے
لوٹا سکے نہ آپ تو، ذروں کو بھی چمک
ہاتھوں میں آفتاب لیے بھاگتے رہے
اپنائیت کہیں نہ ملی ٹھہرتے کہاں
تنہائی کا عذاب لیے بھاگتے رہے
(ایس امتیاز.....کراچی)

اس دور کے انسان وفا بھول گئے ہیں
بیچارے فرشتے ہیں، خطا بھول گئے ہیں
اب میری محبت کو نہیں اس کی بھی پروا
وہ یاد مجھے کرتے ہیں، یا بھول گئے ہیں
منزل مرا مقصود ہے یا دوری منزل
یہ بات مرے راہنما بھول گئے ہیں
مدت ہوئی میں غم سے بھی محروم ہوں یارب
کیا حادثے بھی میرا پتا بھول گئے ہیں
ہم بھول گئے ان کو خوشی بھی ہے یہ لیکن
یہ رنج بھی ہے واقعی کیا بھول گئے ہیں
آزاد سہی عشق مگر ہائے رت لذت
وہ درد ملا ہے کہ دوا بھول گئے ہیں
کس منہ سے شکایت کریں ہم تلخی غم کی
کیا زہر مسرت کا مزا بھول گئے ہیں
(انتخاب: ایس حبیب خان.....کراچی)

پیار میں جب کچھ لوگ مسکرا کے ملے ہیں
تیری یادوں کے کیا کیا پھول کھلے ہیں
یہ انداز وفا کا یہ تیرے بدلے ہوئے تیور
کانٹوں سے بھی اے مہرباں کہیں زخم سلے ہیں
میرے لیے تو سب کچھ تیرے حسن کی دولت سہی
تجھ کو تو میری بے رخی کے پھر سے گلے ہیں
خاموشی احباب تمنا پہ نہ ہم کبھی مسکرائیں گے
دل میں تو بہت کچھ سہی مگر ہونٹ سلے
سنتے ہیں کہ اس بار بھی آئی تھیں بہاریں
تیرے گلشن میں اس بار بھی کچھ پھول کھلے ہیں
آیا ہے بہت یاد جاوید پھر سے ان کا تبسم
جب بھی بہت گہرے داغ زمانے سے ملے ہیں
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

مت لو میرا نام مجھے رسوا نہ کرو
میری محبت کا سر عام تماشا نہ کرو
میرے حق دار تو تم ہو لیکن حد ہے ابھی
مٹادو مجھے شوق سے مگر ایسا نہ کرو
دل ہمارا تھا ہم ہی تھے اس کے مٹانے والے

کیوں رو کے کہا اس نے ہمیں تنہا نہ کرو
ہم تیرے خریدار تیرے در پہ پڑے ہیں
تم حسن کو یوں بازار میں بیچا نہ کرو
دل کے دھڑکنے کا سبب جو پوچھا ان سے
مسکرا کے وہ بولے کہ ہمیں دیکھا نہ کرو
دل کی بیقراری کا سبب جو سوچنے بیٹھے
تیری یادوں نے کہا ہمیں سوچا نہ کرو
لوگ آبشار سمجھتے ہیں میرے اشکوں کے دریا کو
آج پتھروں نے کہا رو کے شہزاد رویا نہ کرو
(عامر شہزاد.....ننکانہ صاحب)

اتنی بھیڑ میں، میں نے
دیکھا تو تمہیں دیکھا
اتنے لوگوں کے باوجود میں نے
چاہا تو تمہیں چاہا
اتنی بارش میں، میں نے
سوچا تو تمہیں سوچا
کوئی نہ ہو جب میرے پاس
پاس پایا تو تمہیں پایا
(مشاء شاہ.....کراچی)

آتش و خوں میں نہائے ہوئے اس منظر سے
ایک جہاں اور بنے گا اسی خاکستر سے
یوں بظاہر بڑے مخلص ہیں ہمہ اہلِ بیاں
کون کیا ہے کسے معلوم مگر اندر سے
زینت خانہ مکینوں کا ہے کردار جمیل
قدر و قیمت ہے ہر ایک سیپ کی ہر بس گوہر سے
زلزلے زیرِ زمیں جو ہیں انہیں کیا کہیے
کس کو اندازۂ تخریب بھلا باہر سے سے
زیب تن جس کے بظاہر تقدس کا لباس
لوگ ہیں آس لگائے اسی فتنہ گر سے
اس کی بیچارگی غم کا ہے اب تک احساس
خیریت پوچھ لی ایک اور جو ایک شوہر سے
نفرتوں کے جسے واجد کیا صحرا آثار
اس زمیں پر بھی کبھی ابرِ محبت برسے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

اس غم کے دریا کو پار کرنا ہوگا
میری محبت پہ اعتبار کرنا ہوگا
میں اک دن لوٹ کے آؤں گا ضرور مگر
تمہیں بہت انتظار کرنا ہوگا
زمانے میں فقط تم سے محبت تھی
سب کے سامنے یہ اقرار کرنا ہوگا
غم زمانے کے ہوں گے امتحان تیرا
امر تجھ کو اپنا پیار کرنا ہوگا
دے گئے جو راہ وفا زندگی اپنی
میرا بھی ان میں شمار کرنا ہوگا
کرکے ویراں مجھے یہ دنیا اپنی
زندگی تیری کو شہزاد کرنا ہوگا
(عامر شہزاد.....ننکانہ صاحب)

جب
سنگھاسن پر دل کے
مہمان دیوی
کوئی ہے براجمان ہوتی
تو
دل ہوش و خرد سے
جاتا ہو بیگانہ
پھر
آسیب محبت کا
جاتا ہے دل سے لپیٹ
اور
دل ایسے میں
ان
ساعتوں کے امر ہونے کی
کرتا پھر دعائیں ہے
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

محبت قید ہے
اس قید کا عادی نہ ہونا

Pakistanipoint.com

سلامتیں ٹوٹ جائیں
تو
رہائی مار دیتی ہے

(مہر پرویز احمد دولو.....میاں چنوں)

روٹھ گئی مجھ سے ہر خوشی اب تو
زہر لگتی ہے یہ زندگی اب تو
جب سے بچھڑا ہے یار تو مجھ سے
دھوکا لگتی ہے ہر دستی اب تو
اک ہی پتھر کو پوجتے عمر گزری
اچھی لگتی نہیں یہ بندگی اب تو
زہر کھاتا ہوں زہر پیتا ہوں منیر
ہوگئی خود سے ہی دشمنی اب تو

(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

نہ پوچھ غم نے کھائی ہیں پستیاں کیسی
اُجڑ گئی ہیں دل کی بستیاں کیسی
کسی پہ راز در میکدہ کھلا کہ نہیں
سناؤ اب کے رہیں فاقہ مستیاں کیسی
غموں نے لوٹ لیے ہیں عقیدتوں کے چمن
خدا بھی یاد نہیں بت پرستیاں کیسی
فلک نے خاک کو پرسہ تھا جن کے لیے
ہوئی ہیں زیر زمین دفن ہستیاں کیسی
تجھے گنوا کے فراغت کسے سنورنے کی لطف اللہ
جب شراب ہی نہ ملے تو پھر مستیاں کیسی

(ڈاکٹر محمد ریاض قریشی تھیکا.....میاں چنوں)

سامنے جب ماہتاب ہوتا ہے
دل تو پھر ہی سیراب ہوتا ہے
اس دنیا میں جو پورا ہو نہیں سکتا
وہ کسی سگندل کا خواب ہوتا ہے
سب کچھ کرلیتے ہیں ہم یہاں لیکن
جو نہیں کرسکتے وہ تیرا جواب ہوتا ہے
اس کو دیکھنا چاہتا ہوں لیکن
اس کے چہرے پر ہر گھڑی نقاب ہوتا ہے
جس کو دیکھ کر ہوش نہیں رہتا ہم کو
وہ کسی حسن کا شباب ہوتا ہے
میری جان تو مجھے مل نہ سکا لیکن
جسے کوئی مل جائے وہ تو نواب ہوتا ہے
کیوں ڈرتے ہوئے ان جدائیوں سے عادل کاں
یہ تو لگے عشق کا نصاب ہوتا ہے

(محمد عادل بلوچ.....بھولے دی جھوک ساہیوال)

وفاؤں کے انوکھے بندھن میں
اک ایسا انوکھا بندھن ہو
خلوص کے گہرے پردوں میں
اک تیری طلب کی خواہش ہو
اک تیرے ساتھ کی چاہت ہو
وہ چاہت چاہے۔۔۔ پیار ہی ہو
یا محبت کی پرچھائی میں
عشق کا دو جانا نام ہی ہو
اس بات کی مجھ کو غرض نہیں
بس سنگ تمہارا تا عمر رہے
بس اس میں خلوص کی خوشبو ہو
وفاؤں کے انوکھے بندھن میں
اک ایسا ہو۔۔۔!!

(مریم ماہ منیر.....لاہور)

رات کٹتی رہی چاند ڈھلتا رہا
آتش ہجر میں کوئی جلتا رہا!!!
پردیس کی تنہائیاں دل کو ڈستی رہیں
کوئی گھر کی دہلیز کو تکتا رہا!!!
اشک پلکوں پر آکر بکھرتے رہے!
نام لب پر کسی کا لرزتا رہا!!!
رات بھر کوئی چین سے سوتا رہا
رات بھر کوئی تنہا سسکتا رہا
رات دونوں کی کٹ گئی مگر!!!
کوئی سوتا رہا کوئی روتا رہا

(مقصود احمد بلوچ.....میاں چنوں)

چلو مان لیا دوست تمہاری بات سچی لگتی ہے
دولت نامی شے ہی آج کل سب کو اچھی لگتی ہے

چلو یہ بھی مان لیا ہم نے کہ دنیا کے اس پنڈار میں
دولت کی چمک سے ہر شے خریدی جاسکتی ہے
مگر یہ کیوں بھول گئے تم دوست کہ چاہے جتنے بھی جتن کرلو
دولت سے تم ہر ''چیز'' تو خرید سکتے ہو
مگر کیا اک بات مجھ کو بتاؤ گے تم؟
خدا کے سچ کو کبھی خرید پاؤ گے تم؟
پرخلوص جذبے کہاں سے لاؤ گے تم؟
اپنی چھوٹی سی دنیا کو کیسے سجاؤ گے تم؟
دل کا سکون کہاں سے پاؤ گے تم؟
جب خدا کی یاد سے دور جاؤ گے تم!
چلو مانا کہ دولت کی وجہ سے دنیا تمہاری مٹھی میں ہے
مگر مجھے اتنا بتادو تم کہ دنیا کے ترازو میں
دولت کے بل بوتے پر کیا خوشی خرید سکتے ہو تم؟
کہ دل کی لاکھ مانو تم مگر اتنا بتادو تم
کہ وقت کے دھارے میں بہہ کر
کیا سچے رشتوں کو خرید سکتے ہو تم؟
چلو اک آخری بات ہی مجھ کو بتادو تم
کہ اس مادہ پرست دنیا میں، دولت کی عفریت سے
کیا پرخلوص محبت خرید سکتے ہو تم؟
کیا محبت خرید سکتے ہو تم؟
کیا محبت خرید سکتے ہو تم؟

(شاعرہ: رابعہ آفرین امانت......لاہور)

اے محبت تو میری محبت کا خیال رکھنا
میں رہوں نہ رہوں تو اسے سنبھال رکھنا
محبت نادان ہے وہ میری جان وفا
تو اس کی ہنسی کو ہمیشہ برقرار رکھنا
نہ گرے آنسوؤں کی ایک بوند بھی اس کی آنکھوں سے
تو موتیوں کی طرح اس کے آنسوؤں کو سنبھال رکھنا
جب بھی وہ رویا میرے یار تو اسے اتنا کہنا
کہ میں لوٹ آؤں گا بس مجھ پر تھوڑا اعتبار رکھنا
اور جب تک لوٹ نہ آؤں تب تک اے محبت
تو میری محبت کا خیال رکھنا

(خضر حیات......روڈہ تھل، خوشاب)

ہنستے ہوئے لوگوں کو رلانے والے بہت
چہرے پہ آنسو چھپانے والے بہت
ہم جن پر اعتبار بہت زیادہ کرتے رہے
مگر ان اعتباروں کو توڑنے والے بہت
جس طرح شیشہ ٹوٹ کر زخم دیتا ہے
شیشہ دل کو توڑ کر زخم دینے والے بہت
ہنستے ہوئے لوگوں کو رلانے والے بہت

(رابعہ عباس......بستی فتے والی)

زندگی میں تو نہیں تو آرزو کس لئے
یہ محبت کس کے لئے یہ جستجو کس کے لئے
میں تجھے دیکھا کروں اور تو مجھے دیکھا کرے
یہ نہیں تو جان جاناں روبرو کس کے لئے
ہر سجاوٹ جسم و جاں کی میں نے کی تیرے لئے
تو اگر ملتا نہیں تو رنگ و بو کس کے لئے
دلبری کے تیرے چرچے جا بجا میں نے سنے
تو اگر میرا نہیں تو یہ چاہت کس کے لئے
ہر غزل میں نے لکھی اے جان جاں تیرے لئے
تو اگر سنتا نہیں تو گفتگو کس کے لئے

(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

سرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں
ہر شب تنہائی میں ستاتی ہیں تیری یادیں
لوٹ کر اب کبھی نہ آئے گا تیرے پاس
ہر شب یہی کہہ کر مجھے رلاتی ہیں تیری یادیں
روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں
تیرا نام لے کر تڑپاتی ہیں مجھے تیری یادیں
جب کبھی بجھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا
مجھ سے پوچھے بغیر اسے جلاتی ہیں تیری یادیں
فلک بھلانا چاہتا ہوں جس صورت کو
ہر شب وہی صورت دکھاتی ہیں تیری یادیں

(فلک زاہد......لاہور)

☆☆

Pakistanipoint.com

پہاڑوں کی قسم

عثمان غنی خان۔پشاور

پل پل اور لمحہ لمحہ خوف و ہراس کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اور جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی اور خوف کی پگڈنڈی پر بل کھاتی ہوئی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش دل دھلاتی رائٹر کے قلم سے نکلی ہوئی شاہکار کہانی۔

اکثر انسان مستی اور خرمستی کی وجہ سے موت کو گلے لگالیتا ہے دل فگار تحیر انگیز کہانی

آج میمل کی رخصتی تھی۔ اہل قبیلہ نے رسم ورواج کے مطابق شادی کی رسم ادا کردی تھی۔ شادی سے پہلے میمل کی سہیلیوں نے ڈانس کیا۔ یہ مقامی ناچ ہوتا تھا۔ جس میں لڑکیاں ایک دائرے میں آگ کی مشعلیں پکڑ کر گول ناچا کرتی تھیں۔ میمل کی شادی مقامی شادی ہال میں ہوئی تھی، کیونکہ وادی تک گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔ یہ ہال بڑے آقا کا تھا۔ میمل کو مقامی شادی کا عجیب سا کالا، پیلا، نیلا، زرد، سرخ بارہ رنگوں کا جوڑا پہنا دیا گیا تھا۔ اس کو عجیب سی ایک آنکھ والی بالیاں دے دی گئی تھی۔ اسے زیور کے نام پر لکڑی سے بنے منقش نقش ونگار والے زیوارات دیے گئے۔ سفید ہاتھی دانت کی ان گنت چوڑیاں پہنائی گئی تھیں۔ اس کے اوپر بارہ رنگوں کا بنا شال اوڑھا دیا تھا۔ اور پھر قبیلے کے بڑے آقا نے شادی میں آکر اس کی شادی کروادی۔ میمل کے ہونے والے بوڑھے شوہر کو ساتھ بیٹھا کر بڑے آقا نے کچھ عجیب سے کلمات کہے، اور دونوں ہر بات پر سر ہلا رہے تھے۔ اور پھر آخر میں دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

''شادی مبارک ہو۔۔۔!!'' وہ بوڑھا سر ہلاتا میمل سے جدا ہوا، اور اپنی لمبی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شادی کا آخری رواج یہی تھا۔ دلہن خود چل کر گاڑی تک جاتی۔ وہ بالکل اکیلی ہوتی۔ کوئی اس کے ساتھ ہال سے باہر نہیں جاتا تھا۔ وہ سب سے ملی، اور چل کر گاڑی کے پاس جانے لگی۔ اب وہ پراڈو کا دروازہ کھول رہی تھی۔ اور اس کے پچھلے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ہال کے اندر کسی نے یہ منظر نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ وہ سب اندر تھے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ بوڑھا دلہا اس کے برابر میں بیٹھا ہوا اس کو دیکھ رہا تھا۔ بہت لمبا سفر ابھی طے کرنا باقی تھا۔ اس لیے میمل نے سیٹ سے سر ٹھکا دیا۔ گاڑی پہاڑوں میں سفر کرنے لگی۔ اب گاڑی کافی دور نکل گئی تھی۔ میمل دل ہی دل میں اپنی ناکام محبت پر ماتم کر رہی تھی۔

اچھا خاصا سفر طے کرنے کے بعد وہ گاڑی ایک شاندار گھر کے سامنے رک گئی۔ یہ بہت بڑا گھر تھا۔ گاڑی گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ میمل سو چکی تھی۔ یہ سفر مسلسل ایک دن جاری رہا تھا۔ بوڑھے دلہا نے ہاتھ بڑھا کر میمل کو ہلایا تو میمل نے آنکھیں کھول دیں۔

''اٹھو۔۔۔!! اترو۔۔۔!! ہم گھر پہنچ گئے ہیں۔۔۔!!'' اسے اپنے شوہر کی آواز سنائی دی۔ وہ ہڑبڑائی پھر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا، جو اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے اتارنے میں مدد دے رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ اس نے حیرت سے چاروں

اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ اُپھی خاصی رات ہو چکی تھی۔ ہر چیز پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس کا شوہر اس کو گھر کے اندر لے گیا۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ مگر مطمئن سے انداز میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ پھر وہ دونوں الاؤنج سے گزر کر بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرہ بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ اس کا شوہر اسے اسی کمرے میں لے گیا۔ اندر جدید دور کی ہر شے موجود تھی۔ وہ اسے پلنگ پر بیٹھا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔۔۔!!'' بوڑھے نے اس کو سر تا پیر دیکھتے ہوئے پوچھا تو میمل نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میں ابھی ملازم سے کہتا ہوں۔۔۔!! وہ کھانا لگوا دے گا۔۔۔!!'' بوڑھے نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اب وہ اس کا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ گھبرا اٹھی تھی۔

''گھبراؤ مت۔۔۔!! میرا نام حوام ہے۔۔۔!! اس جائیداد کا میں مالک ہوں۔۔۔!! میرے تین بچے ہیں۔۔۔!! دو بیٹے، اور ایک بیٹی۔۔۔!! وہ سب یہاں نہیں رہتے۔۔۔!! میں اپنے اکیلے پن سے تنگ آ گیا تھا۔۔۔!! میری بیوی کا انتقال کچھ سال پہلے ہو گیا تھا۔۔۔!! میرے بچے شادی شدہ اور کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔۔۔!! جب میں تمہارے علاقے میں گیا۔۔۔!! تو وہاں کے رسم و رواج کے بارے میں معلوم ہوا۔۔۔!! اس لیے تم سے شادی پر راضی ہو گیا۔۔۔!! اب تم میری شریک حیات ہو۔۔۔!! یقیناً تم مجھے نا امید نہیں کرو گی۔۔۔!! اگر تم مجھ سے خوش ہوئی۔۔۔!! تو میں تمہیں مہارانی بنا کر رکھوں گا۔۔۔!!'' حوام نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میمل نے اثبات میں سر ہلایا۔ حوام اٹھا۔ اس نے میز پر رکھا انٹر کام اٹھایا اور ملازم کو کھانے کی ہدایت دی۔

''کچھ دیر میں کھانا لگ جائے گا۔۔۔!! تب تک آپ اپنے کپڑے تبدیل کر لیں۔۔۔!!'' حوام نے اٹھتے ہوئے کہا تو میمل نے گردن ہلائی۔ پھر وہ الجھن میں مبتلا ہو گئی۔

''کپڑے کہاں سے لوں؟'' میمل نے پوچھا۔ وہ پلنگ سے نیچے اتر گئی تھی۔

''سامنے الماری ہے۔۔۔!! اس میں سے اپنی پسند کے کپڑے نکال لو۔۔۔!!'' حوام نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سر ہلا کر الماری کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔ اب وہ واش روم میں جا گھسی تھی۔ حوام نے اٹھ کر دوسری الماری کھولی اور شراب کی بوتل باہر نکال کر منہ سے لگا لی۔ وہ مے نوش تھا۔ وہ بھرے بھرے جسم کا مالک تھا۔ اس پر آسانی سے شراب کا نشہ نہیں چڑھتا تھا۔ کچھ دیر بعد میمل واش روم سے باہر آئی۔ وہ نئے کپڑوں میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ حوام نے وہسکی کی بوتل رکھی۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈائننگ ٹیبل پر اسے لے آیا۔ اب دونوں کھانے کے لئے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر حوام نہیں کھا رہا تھا۔ دنیا جہاں کی ہر نعمت وہاں موجود تھی صرف میمل ہی کھانا کھا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس کے سامنے بیٹھے وہ شراب نوشی کر رہا تھا۔ میمل کو اس کے منہ سے اٹھنے والے بھبکے بہت برے لگ رہے تھے۔ حوام نے اسے دلہن کا عروسی جوڑا پہننے کے لیے کہا تھا۔ اور اس نے حوام کی بات مان لی تھی کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ حوام جیسے اس کو خمار الود نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ وہسکی کی بوتل خالی ہو گئی تھی۔

''تم اب اس گھر کی مالکن ہو۔۔۔!! میں تم پر کوئی روک ٹوک نہیں کروں گا۔۔۔!!'' اس نے میمل کا ہاتھ لبوں سے لگایا۔ میمل کے پورے وجود میں برقی لہر سی دوڑ گئی۔ وہ بڑی حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

''تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔۔۔!! بس تمہیں میرا وفادار رہنا ہوگا۔۔۔!!'' حوام نے اس کے کان سے بالی اتھاری۔ اب وہ اس کے زیور اتار رہا تھا۔

''تم اس گھر کے ساتھ ساتھ میرے دل کی ملکہ بھی ہوگی۔۔۔!!'' حوام نے اس کے بال کھول دیئے۔ وہ یک ٹک خاموش بیٹھی تھی۔

''کل میرا ایک دوست آئے گا۔۔۔!! وہ تمہیں

شادی کی مبارک باد دے گا۔۔۔!! تم نے اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔۔۔!!'' حوام نے اس کے بالوں میں لگا سونے کا بُرچ اتارا۔ دونوں آنکھیں بند کر کے میمل نے سر ہلایا۔ اب اس کا سارا زیور وہ اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔

''مگر آپ کے بچے؟'' میمل کے لب ہلے۔

''ان کی فکر مت کرو۔۔۔!! میں نے انہیں اپنی شادی کے بارے میں بتا دیا ہے۔۔۔!! ان لوگوں کو کچھ خوشی نہیں ہوئی ہے۔۔۔!! مگر وہ ہمیں تنگ نہیں کرینگے۔۔۔!!'' حوام دھیرے دھیرے اس کے قریب آ رہا تھا۔ اور اس کے منہ سے بہت زیادہ بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ اسے پاگل کر رہے تھے۔ حوام نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے پکڑا۔ اور اس کے منہ کے قریب اپنے ہونٹ لائے۔ وہ نیچے دیکھنے لگی۔ اس نے حوام کے رحم و کرم پر خود کو چھوڑ دیا۔ وہ اسے بے تحاشا چومنے لگا۔ کچھ دیر بعد کمرے میں نیلگوں اندھیرا بالکل ختم ہو گیا۔ اب وہاں گہری تاریکی تھی۔ وہاں ایک خوشیوں بھری رات اتر آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح کا سورج پہاڑوں کے دامن میں ابھرتا ہوا آج پھیکا سا تھا۔ اس کی روشنی اتنی تیز نہیں تھی۔ دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ مگر نہ ہونے کے برابر تھی۔ شینل دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میمل کو یاد کر رہی تھی۔ اچانک اس کا میمنا چوپال سے باہر نکل آیا۔ اور باہر کو بھاگ گیا۔ اس کے پیچھے وہ آوازیں لگانے لگی۔

''ارے۔۔۔!! میمنے رک جا۔۔۔!!'' وہ اٹھ کر باہر کی طرف بھاگی۔ جیسے ہی میمنا کھلے دروازے سے باہر نکلا۔ وہ اس کے پیچھے باہر نکل گئی۔ اور گھر کے چوکھٹ میں داخل ہوتے عزام سے پوری شدت سے ٹکرا گئی۔

''اوہ۔۔۔!!'' وہ اس کے ساتھ ٹکرا گئی اور اپنا سر سہلانے لگی۔ عزام اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''زیادہ لگی تو نہیں۔۔۔!!'' عزام نے اس کا ہاتھ سر سے ہٹایا۔

''ہائے۔۔۔!! دن میں تارے نظر آ گئے ہیں۔۔۔!! تم کہہ رہے ہو۔۔۔!! لگی تو نہیں۔۔۔!!'' شینل نے ٹکر والی جگہ کو سہلانا شروع کر دیا۔

''میں دیکھتا ہو۔۔۔!! تم ہاتھ ہٹاؤ۔۔۔!!'' اس نے شینل کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اس کے بالوں میں ہاتھ کی ہتھیلی کو ملنے لگا۔ اب شینل کو قدرے سکون مل رہا تھا۔

''اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟'' اس نے شینل کو دیکھا۔ وہ نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔

''بس پہلے سے بہتر ہو گیا۔۔۔!! تم اتنی صبح کیا کرنے آ رہے تھے؟'' وہ ناراض سے لہجے میں اس کا ہاتھ اپنے سر سے ہٹانے لگی۔

''تمہیں دیکھنے کو دل کر رہا تھا۔۔۔!! اس لیے۔۔۔!!'' عزام نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ اس میں ابھی بھی وہ لکڑیوں کی منقش والی چوڑیاں موجود تھیں۔ بے ساختہ شینل نے اس کی نظروں میں دیکھا۔ اب وہ دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد شینل نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''عزام۔۔۔!! ہم کہیں غلط راہ کے مسافر تو نہیں بن رہے ہیں۔۔۔!!''

''میں کچھ نہیں جانتا۔۔۔!! مگر جب میں تم سے دور ہوتا ہوں۔۔۔!! تو میرا دل تمہارا نام لیتا ہے۔۔۔!! میرے دل کی دھڑکنوں میں تمہارے نام کا ورد جاری ہوتا ہے۔۔۔!! میں نہیں جانتا۔۔۔!! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ سب غلط ہے یا ٹھیک۔۔۔!! مگر یہ سب مجھے اچھا لگتا ہے۔۔۔!!'' دروازے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ اور شینل کو اس کا کہنا اچھا لگ رہا تھا۔

''کیا اچھا لگتا ہے؟'' شینل نے دھیمے انداز میں آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے دیکھنا شروع کر دیا۔

''تمہارا نام۔۔۔!! تمہارے بارے میں سوچنا۔۔۔!! تمہارے پاس آنا۔۔۔!! اور تمہارا خیال رکھنا۔۔۔!! مجھے تم سے ہر بڑی چیز اچھی لگتی ہے۔۔۔!!'' عزام نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگایا۔ اس میں عقیدت تھی۔ شینل نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ اور وہاں سے بھاگتی ہوئی کمرے میں جانے

لگی۔وہ اسے دیکھ رہا تھا۔اب وہ واپس جا رہا تھا۔جس کا دیدار کرنے وہ یہاں آیا تھا۔وہ تو ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

لاؤنج میں میمل ساڑھی کا پلو سنبھالے کھڑی تھی۔حوام کے پیچھے وہ کھڑی بس اس کو سن رہی تھی۔اس کا دوست آج شادی کا مبارک باد دینے چلا آیا تھا۔وہ تھری پیس شائننگ سوٹ میں ملبوس تھا۔ساڑھی اسے قریبی پارلر والی عورت نے آکر پہنادی تھی۔اس کا دل گھبرا رہا تھا۔مگر اسے اب سب قبول کر لینا تھا۔اتنی شان و شوکت اور امیری دیکھ کر وہ دل ہی دل میں سب کچھ بھول چکی تھی۔مگر عزام کی محبت اب بھی اس کے دل میں موجود تھی۔

''بھابی آپ کھڑی کیوں ہیں؟ آئیں ہمارے ساتھ بیٹھ جائیے۔۔۔!!''میمل کو دیکھتے ہوئے حوام کے دوست نے کہا۔یہ شخص کچھ دیر پہلے بڑی گاڑی میں ڈھیر سارے تحائف کے ساتھ لدا پھندا گھر میں آیا تھا۔اب وہ ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی وہاں بیٹھ گئی۔

''میرا نام میرم ہے۔۔۔!!میں اور حوام گلف کے بہترین کھلاڑی تھے۔۔۔!!ہماری دوستی بھی کھیل کے دوران ہی ہوئی تھی۔۔۔!!''میرم نے اس کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔میمل نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجالی۔پھر وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''میرم۔۔۔!! تمہاری بھابی کا نام میمل ہے۔۔۔!!اس کا تعلق پہاڑی علاقے سے ہے۔۔۔!! میں اتفاقاً اس علاقے کی سیر کو گیا تھا۔۔۔!!اور تب مجھے یہ دکھائی دی۔۔۔!!بس یہ مجھے اچھی لگی۔۔۔!!''

''آپ دونوں باتیں کریں۔۔۔!!میں ابھی کچھ دیر میں آتی ہوں۔۔۔!!''شوہر کی بات بیچ میں کاٹ کر وہ اٹھ کر بولی۔شوہر نے اثبات میں سر ہلایا۔وہ سینڈل کی ٹک ٹک کرتی باہر آگئی۔مگر وہ دیوار کے سنگ رک گئی۔اسے حوام کا یوں اپنا تعارف کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے۔۔۔!!''میرم نے حوام کو دیکھا۔وہ خاموش ہو گیا تھا۔

''ہاں۔۔۔!! تب مجھے معلوم ہوا۔۔۔!! اس علاقے کے لوگ اپنی لڑکیوں کو بیچ دیتے ہیں۔۔۔!!میں نے بھی میمل کے باپ سے بات کر لی۔۔۔!!اور ہمارا رشتہ منظور تھا۔۔۔!!تو ہو گیا۔۔۔!! کیونکہ یہ لوگ اپنے بڑے آقا کی بہت مانتے ہیں۔۔۔!!جتنا پیسہ ایک لڑکی کا لیتے ہیں۔۔۔!!اس کا دسواں حصہ اپنے بڑے آقا کو نذر میں دے دیتے ہیں۔۔۔!!''دیوار سے لگی میمل اپنے شوہر کی باتیں سن رہی تھی۔اور میرم قہقہہ لگا رہا تھا۔

''واؤ انٹرسٹنگ۔۔۔!!'' میرم نے قہقہہ لگایا۔میمل چلتی ہوئی دوبارہ لاؤنج میں جانے لگی۔وہ سوچ رہی تھی۔

''اب جو کچھ بھی ہے،میرا ہی ہے۔۔۔!!''اس کے ذہن میں اچانک ایک بات آئی۔وہ جیسے ہی لاؤنج میں آئی۔میرم کے قہقہے کو بریک لگ گئے۔وہ اس کے سراپا حسن سے آنکھوں کو خیراں کرنے لگا۔وہ ادا سے چلتی ہوئی حوام کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''آپ بہت پیاری ہیں۔۔۔!!''میرم نے اس کی تعریف کی۔

''ہمارے علاقے کی ہر لڑکی بہت پیاری ہے۔۔۔!!''میمل نے اپنا کام شروع کر دیا۔

''کیا مطلب؟''میرم کچھ حیران سا رہ گیا۔

''ویسے میرم بھائی۔۔۔!! کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟ بھابی کو ساتھ لیکر نہیں آئے۔۔۔!!''وہ چالیس سال کے بیٹے کٹے انسان تھے۔میمل کو لگا تھا۔اس کی شادی ہو گئی ہو گی۔میرم ہنس کر نفی میں گردن ہلا کر بولا۔

''نہیں۔۔۔!!''ایک لفظی جواب نے میمل کو عجیب سی طمانیت پہنچائی۔

''تو پھر کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟ابھی بھی آپ بالکل ینگ لڑکوں سے اچھے خاصے نظر آتے ہیں۔۔۔!!''میمل اب اس سے فرینک ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بہت جلد۔۔۔!! مگر ابھی تک کوئی بھی نہیں ملی ہے؟ حالانکہ میں نے باہر بھی رہ کر دیکھ لیا۔۔۔!! مگر کوئی

دل کو بھا نہ سکی۔۔۔!!'' میرم نے دل کی بات زبان پر لا کر سنادی۔

''ایک میری نظر میں ہے۔۔۔!! اگر آپ سنجیدہ ہیں۔۔۔!! تو میں آپ کی بات وہاں چلا سکتی ہو۔۔۔!!'' میمل کی بات سن کر حوام نے اسے گھور کر دیکھا۔ جبکہ میرم نے خوب قہقہہ لگایا۔

''کون ہے؟ شاید آپ مذاق کر رہی ہیں۔۔۔!! ویسے اگر یہ مذاق ہے۔۔۔!! تو بہت اچھا ہے۔۔۔!!'' اس نے آخر میں مسکرا کر پوچھا۔ وہ کندھے اچکا رہا تھا۔

''ہماری وادی میں لڑکیوں کو بیچا جاتا ہے۔۔۔!! جہاں ہمارے علاقے میں لڑکیوں کی شادیاں قبیلے سے باہر کرنے کا رواج ہے۔۔۔!! میری ایک دوست اتنی پیاری ہے۔۔۔!! اتنی خوبصورت کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔۔۔!! اس کی خوبصورتی فرنگیوں سے بھی کئی گنا زیادہ ہے۔۔۔!! اس کا نام شینل ہے۔۔۔!! ہمارے گھر کے پاس ہی رہتی ہے۔۔۔!! اگر آپ ہمارے علاقے کی سیر کو جائے۔۔۔!! تو وہاں ہمارے پہاڑ پر ضرور چلے جائیں۔۔۔!! وہاں چشمے پر خوبصورت لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔۔۔!! شینل بھی وہاں ہوگی۔۔۔!! اگر آپ کو پسند آجاتی ہے۔۔۔!! تو آپ اس کے گھر والوں سے بات چلا کر دیکھ لیں۔۔۔!! مگر میرا ذکر بالکل بھی مت کیجیے گا۔۔۔!! ورنہ وہ لوگ کسی کے بھیجے گئے رشتے قطعاً قبول نہیں کرتے ہیں۔۔۔!! وہ ان کو برا شگون سمجھتے ہیں۔۔۔!!'' میمل نے ایک ہی سانس میں سب کچھ اسے بتا دیا۔ میمل کی باتیں وہ دلچسپی سے سن رہا تھا۔

''کیا بھابی ٹھیک کہہ رہی ہیں؟'' میرم نے حوام سے پوچھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔!! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔!!'' حوام نے اسے غور سے دیکھا۔

''پھر تو میں بہت جلد وہاں جانا چاہوں گا۔۔۔!! بھابی تم مجھے اپنی وادی کا پتہ لکھوا کر دیدو۔۔۔!!'' میرم نے شوخی سے کہا۔

''ہاں۔۔۔!! بالکل۔۔۔!! میں آپ کو دیدوں گی۔۔۔!!'' میمل کی دل کی کلی جیسے کھل اٹھی۔ اب وہ تینوں کچھ دیر تک خوش اخلاقی سے بات چیت کرتے رہے۔ پھر انہوں نے خوشی سے ڈنر کیا۔

☆.....☆.....☆

عزام نے پہاڑ کے دامن پر پھیلے اس بڑے لمبے گھنے درخت کے اوپر مضبوط رسی باندھ کر جھولا ڈال لیا۔ جھولے کے قریب چشمہ تھا۔ جہاں لڑکیاں پانی بھرنے آتی تھیں۔ وہ کافی مضبوط تھا، بہت بڑھیا اور خوبصورت منظر ہوتا۔ عزام جھولے کے پاس کھڑا شینل کا منتظر تھا۔ شینل دور سے آتی دکھائی دی۔ عزام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی چھا گئی۔ شینل نے گھڑا سر پر رکھا تھا۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے عزام سے پوچھا۔

''میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔۔۔!! چلو اچھا ہوا کہ تم آگئی۔۔۔!!'' عزام نے مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلائی۔ اس کے بال سورج کی حدت سے چمک رہے تھے۔

''ویسے صرف انتظار یا کچھ اور بھی۔۔۔!!'' شینل نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ اسے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

''دیکھو۔۔۔!! چشمے کے کنارے اُگے اس بڑے درخت پر میں نے تمہارے لیے جھولا ڈال دیا ہے۔۔۔!! تم جب چشمے پر آیا کرو۔۔۔!! اور میں نہ ہوں۔۔۔!! تو یہ جھولا تمہیں میری یاد دلائے گا۔۔۔!! تم میری یاد میں اس پر بیٹھ کر جھولتے رہنا۔۔۔!! تم اس چشمے کے اس پار اُس پار جاتی ہوئی نظر آؤ گی۔۔۔!!'' اس نے شینل کی توجہ جھولے کی طرف دلائی۔

''واہ۔۔۔!! مجھے جھولا جھولنا بچپن سے اچھا لگتا ہے۔۔۔!! میرے لیے جھولا ڈال کر تم نے تو دل خوش کر دیا۔۔۔!!'' وہ جھٹ سے جھولے پر بیٹھ گئی۔ اور اس

کے دونوں رسے مضبوطی سے تھام لیے۔عزام اس کے پیچھے آکر اسے جھلانے لگا۔وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔اس کی ہنسی کی آواز گونج کی صورت میں پھیلتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

خوبصورت سی جیپ پہاڑوں میں سفر کر رہی تھی۔میرم خود ڈرائیور کر رہا تھا۔جب سے اس نے شنیل کی خوبصورتی کا ذکر سنا تھا۔وہ بے چین ہو گیا تھا۔میمل بھی خوبصورت تھی۔اور وہ اس سے متاثر ہو گیا تھا۔اور پھر حوام نے بھی میمل کی بات کی یقین دہانی کرائی تھی۔اس نے کہا تھا۔جتنا وہ علاقہ خوبصورت ہے۔اس سے زیادہ اس کی لڑکیاں خوبصورت ہیں اور واقعی وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔کیونکہ اس علاقے کی یہ بات بہت مشہور ہے۔یہاں اگر کوئی مہمان آجائے۔اور وہ کسی بھی گھر کے اندر جانا چاہے تو جا سکتا ہے۔وہ مہمان اس گھر کے ماں باپ اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ مے نوشی کر سکتا ہے۔جتنی وہ چاہے۔مگر کوئی غلط حرکت نہیں کر سکتا۔اگر وہ بہک جائے،اور کسی لڑکی کو چھیڑنے کی کوشش کرے،تو علاقے کے لوگ اسے پکڑ کر وادی سے باہر نکال کر پھینک دیتے ہیں۔میرم اسی بات پر کافی دیر تک ہنستا رہا تھا۔خوبصورت بل کھاتی ہوئی سڑک،سرسبز واشاداب نظارے اس کا دل لبھا رہے تھے۔وہ جلد سے جلد میمل کے بتائے گئے وادی میں جا کر شنیل سے ملنا چاہ رہا تھا۔اس کے ذہن میں شنیل کی خوبصورتی جیسے بیٹھ گئی تھی۔وہ اپنے ساتھ فائیو ڈی ایس آر کیمرہ لایا تھا۔اس نے جو کچھ سنا تھا۔واقعی ایسا ہی تھا۔جگہ جگہ پھلدار درختوں،خوبصورت جھرنوں،اور سرسبز وشادابی کی وہ بے شمار تصویریں بنا چکا تھا۔اب وہ وادی میں داخل ہو چکا تھا۔وہاں سے آگے اسے پیدل چلنا تھا۔وادی کے لوگ بہت پیار ومحبت سے ملنے والے لگے تھے۔وہ خوش تھا۔وہ پیدل چل رہا تھا۔وہ اچھا خاصا پہاڑ کے اوپری حصے تک آچکا تھا۔راستے میں کچھ لوگوں سے پوچھ تاچھ کی تھی،تو اسے وادی ڈھونڈنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔وہ لکڑی کے بنے خوبصورت گھروں کو دور سے دیکھ رہا تھا۔ہر گھر مہارت سے بنایا گیا تھا۔یہاں کے مقامی لوگ لکڑی سے بنے گھروں میں رہتے تھے۔اور یہ گھر بے حد پیارے ہوتے تھے۔وہ چلتا ہوا وادی کی طرف بڑھنے لگا۔وہاں بہت سارے پھلدار درخت تھے۔جس میں اخروٹ،الوچے،خوبانی،لوکاٹ، بادام،وغیرہ تھے۔وہ اس کی کچھ تصویریں بنا کر آگے بڑھ گیا۔اب وہ پہاڑ کے دامن سے اوپر آچکا تھا۔یہاں اسے کچھ خوبصورت سی لڑکیاں نظر آگئیں۔اس نے اپنے کیمرے سے ان کی تصویریں اتار لیں۔وہ لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی چلی گئیں۔اب وہ ادھر اُدھر دیکھتا ہوا تصویر بنا رہا تھا۔وہ کیمرے میں دیکھ رہا تھا۔اچانک ایک لڑکی سفید مینے کو گھوڈ میں اٹھا کر اس کے لینس میں بالکل فٹ آگئی۔اس نے کلک کی۔اور تصویر اتار لی۔وہ لڑکی بے خبر تھی۔میرم نے آنکھوں سے کیمرا ہٹایا۔اور اس لڑکی کو دیکھا۔وہ بے حد خوبصورت تھی۔پھر دل ہی دل میں کہا۔

''واہ۔۔۔!! پہاڑوں کی شہزادی مل ہی گئی۔۔۔!!'' وہ لڑکی اب چشمے کی طرف جا رہی تھی۔وہ اس سے کچھ فاصلے پر تھی۔میرم کو پتہ تھا۔یہیں میمل کا قبیلہ آباد ہے۔مگر اسے شنیل کو ڈھونڈنا تھا۔اسے دیکھنا تھا۔میمل نے اسے بتایا تھا۔شنیل زیادہ تر چشمے کے قریب پائی جاتی ہے۔اس نے خود بھی ابھی تک چشمہ نہیں دیکھا تھا۔وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا کافی دیر تک چلتا رہا۔اچانک اس لڑکی نے مینا چھوڑ دیا۔اور اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔اب وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔اس جگہ سے پانی نکل رہا تھا۔اور وہ پانی کافی دور تک پھیلا ہوا تھا۔وہاں قریب ہی ایک اونچے درخت پر جھولا بندھا تھا۔وہ اسی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔اور جھولے لینے لگی۔میرم نے اس کی کئی تصویریں بنالیں۔اچانک میرم نے کیمرہ اس سے ہٹالیا۔اب وہ کیمرہ بیگ میں رکھ رہا تھا۔

''کہیں یہی یہ تو شنیل نہیں ہے۔۔۔!!'' میرم نے خود سے کہا۔وہ درختوں کی اوٹ میں ہو گیا۔اور اس نے زور سے پکارا۔

''شنیل۔۔۔!!'' میرم کی آواز بازگشت کی طرح گونجتی چلی گئی۔شنیل حیرانگی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔مگر

وہاں کوئی نہیں تھا۔درخت کے تنے کی اوٹ سے میرم نے اس کی بے چینی دیکھ لی۔وہ شنیل ہی تھی۔

''کون ہے؟''شنیل نے آہستہ لہجے میں کہا۔وہ مزید چھپ گیا۔شنیل یہاں وہاں دیکھتی ہوئی، پانی بھر کر چلی گئی۔اور بار بار مڑ کر دیکھ رہی تھی۔وہ حیران تھی۔

''واقعی۔۔۔!! شنیل تو جیسے کوئی شہزادی ہے۔۔۔!! پہاڑوں کی قسم پہاڑوں پر حسین لوگ رہتے ہیں۔۔۔!!''اس نے خود سے کہا۔اور درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔اب وہ شنیل کا ہاتھ مانگنا چاہ رہا تھا۔اس کے لیے اس کو ماں باپ کو ڈھونڈنا تھا۔

☆.....☆.....☆

شنیل کے باپ کو یقین نہیں آرہا تھا۔وہ گھر میں خوشی سے مسکرا رہا تھا۔اس کے پاس شام کو میرم نے رشتہ دیا تھا۔شنیل کے باپ نے اسے اپنے روایات کے بارے میں بتایا تھا۔وہ ہر شرط ماننے کو تیار تھا۔شنیل کے باپ نے بھی رشتہ دینے کی فوراً ہامی بھر لی تھی۔آج وہ گھر میں بتانے والا تھا۔ابھی وہ بار بار مسکرائے جا رہا تھا۔شنیل کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو جاتا تھا۔

''کیوں شنیل کے ابا کیا ہو گیا ہے؟''شنیل کی ماں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔۔۔!! بس اپنی قسمت کھل گئی ہے۔۔۔!!''وہ اسے دیکھ کر بولا۔

''کیا ہوا؟ کیا شنیل کا رشتہ آگیا ہے؟''شنیل کی ماں حیرانگی سے بولی۔

''ہاں۔۔۔!! اور وہ شنیل کے لیے لاکھوں دینے کو تیار ہے۔۔۔!! وہ کوئی سیاح ہے۔۔۔!! کل ہی آیا تھا۔۔۔!! شنیل کو دیکھ کر پسند کر لیا۔۔۔!!''شنیل دیوار کے اوٹ میں لگ کر کھڑی تھی۔اور بالکل ساکت سی ہو گئی۔وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ایسا بھی ہو سکتا ہے۔میمل کی باتیں گونج کی طرح اس کے اردگرد پھیلنے لگیں۔

''اگر تم۔۔۔!! میری جگہ ہوتی۔۔۔!! تو تم کیا کرتی؟''

''میں نے یہ سوچ کر تمہیں دھکا دیا تھا۔۔۔!! کہ کل کو تم بھی میری طرح رو رہی ہو گی۔۔۔!!'' کتنی دیر تک وہ سوچتی رہی۔اور میمل کی ہر بات اسے سچ ہوتی دکھائی دینے لگی۔

''وہ سچ کہہ رہی تھی۔۔۔!! کاش۔۔۔!!! کھائی میں گر کر میں مر جاتی۔۔۔!! میں کیوں بچ گئی۔۔۔!! میں کیوں بچ گئی۔۔۔!! ہمارا نصیب ہی ایسا لکھا ہے۔۔۔!! بندہ ساری دنیا سے لڑ کر جیت تو سکتا ہے۔۔۔!! مگر اپنے نصیب سے نہیں جیت سکتا۔۔۔!!''وہ بے آواز رونے لگی۔

''شنیل کے ابا۔۔۔!! بہت خوشی کا موقع ہے۔۔۔!! کل بازار سے کچھ میٹھا کھانے کو لے آؤ۔۔۔!! آس پڑوس میں میں دے دلا کر بات ظاہر کر دوں گی۔۔۔!!''اپنی سوتیلی ماں کی آواز وہ سن رہی تھی۔اس کا باپ نجانے کیا کچھ کہہ رہا تھا، وہ جیسے ہوش میں آگئی۔وہ گھر سے باہر کی طرف بھاگ کر چلی گئی۔وہ رو رہی تھی۔

''میری محبت جو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔۔۔!! ختم ہو گئی۔۔۔!! میں اب کیا کر سکتی ہوں۔۔۔!!''چشمے کنارے بیٹھی اداسی میں گھلی جا رہی تھی۔کبھی نفی میں سر ہلاتی۔کبھی رونے لگتی۔

''عزام اور میں یہاں سے کہیں دور بھاگ جائینگے۔۔۔!!''اس نے عزم سے سوچا۔اور اٹھ کر گھر کی طرف جانے لگی۔مگر اس کے قدم عزام کے گھر کی طرف تھے۔

☆.....☆.....☆

لکڑی سے بنا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا اچھا لگ رہا تھا۔وہ عزام کے کمرے کی طرف سے گھوم کر آگئی۔اور کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھنے لگی۔وہاں عزام بستر پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھا ہوا تھا۔اس نے کھڑکی پر دستک دی۔عزام چونک کر کھڑکی کو دیکھنے لگا۔وہ سیدھا ہو گیا تھا۔اسے دیکھ کر مسکراتا ہوا، اسی کی طرف آگیا۔اب وہ کھڑکی کے آر پار کھڑے ایک

دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔عزام نے کھڑکی کھولی۔اور کھڑکی کے راستے باہر نکل کر اس کے روبرو کھڑا ہوگیا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر شنیل کا ہاتھ تھام لیا۔شنیل نے اپنا ہاتھ چھڑا کر کہا۔

''عزام۔۔۔!! تم بہت جلد یہ حق کھو دو گے۔۔۔!!'' وہ بھیگے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ حیرت کے سمندر سے ابھر آیا۔

''آئندہ مجھ سے کبھی مت ملنا۔۔۔!! میرے بابا نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے۔۔۔!! پہاڑوں کی قسم عزام میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔!!'' شنیل نے روتے ہوئے کہا،تو عزام کو ایسے لگا جیسے اس پر آسمان کی بجلیاں ایک ساتھ گر گئی ہوں۔

''یہ کب اور کیسے ہوا ہے؟'' عزام شاک میں تھا۔

''کل کوئی سیاح آیا تھا۔۔۔!! اس نے پتہ نہیں مجھے کہاں دیکھ لیا۔۔۔!! اور پھر مجھے پسند کر کے میرے بارے میں معلومات لیتا ہوا ابا تک جا پہنچا۔۔۔!! پھر اس نے میرا ہاتھ ابا سے لاکھوں میں مانگ لیا۔۔۔!! ابا نے ہاں کر دی ہے۔۔۔!!'' شنیل نے اسے معلومات دے دی۔وہ اداسی سے کہہ رہی تھی۔

''شنیل۔۔۔!! ابھی صرف رشتہ ہی طے ہوا ہے۔۔۔!! فکر نہ کرو۔۔۔!! میں چاچا سے بات کرتا ہوں۔۔۔!!'' اس نے شنیل کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''وہ کبھی نہیں مانیں گے۔۔۔!! اور نہ تمہارے گھر والے کبھی مانیں گے۔۔۔!! کوشش فضول ہوگی۔۔۔!!'' شنیل نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس سے چھڑایا۔

''میں کوشش نہیں کروں گا۔۔۔!! میں آخری حد تک جاؤں گا۔۔۔!!'' عزام نے اس کا ہاتھ دوبارہ پکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔وہ ایک قدم بھی نہیں چلی تھی کہ عزام نے مڑ کر اسے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''عزام۔۔۔!! تمہیں پتہ تو ہے۔۔۔!! یہاں محبت کرنا جرم ہے۔۔۔!! اور اس جرم کی سزا جدائی ہے۔۔۔!!'' اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔اور وہاں سے بھاگتی چلی گئی۔وہ اس کے پیچھے بھاگا،مگر رک گیا۔اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔میمل کی باتیں اس کے دماغ میں گونجتی چلی گئیں۔وہ بھی اسی طرح اس کے پاس آئی تھی۔اپنی محبت کی بھیک مانگنے،اسے سمجھانے آئی تھی۔مگر وہ نہیں مانا تھا۔اور آج وہ اسی دوراہے پر کھڑا تھا۔اسے لگ رہا تھا۔جیسے میمل کھڑی اس پر بری طرح سے ہنس رہی ہے۔وہ بے ساختہ پیچھے ہٹ گیا۔اسے میمل نظر آرہی تھی۔جو اس پر قہقہے لگا رہی تھی۔

''نہیں۔۔۔!! یہ نہیں ہو سکتا ہے۔۔۔!!'' وہ مٹھیاں بھینچ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چیختا اب رو رہا تھا۔کتنی دیر اس اندھیری رات میں وہ روتا رہا۔میمل کا چہرہ بھی غائب ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ شنیل کے گھر گیا تھا۔وہ بہت ٹوٹا بکھرا سا لگ رہا تھا۔اس نے شنیل سے ملنا تھا۔مگر اس کے باپ سے سامنا ہوگیا۔شنیل کا باپ اسے حیرانگی سے دیکھنے لگا۔وہ جیسے حیرت کا شکار تھا۔عزام کا بکھرا سا وجود اسے حیرت میں ڈال رہا تھا۔وہ کچھ سمجھا نہیں۔

''خیریت تو ہے ناں۔۔۔!!'' شنیل کے باپ نے اس کا چہرہ اوپر کیا۔

''خیریت نہیں ہے۔۔۔!! کیونکہ میں نے کل اپنے خواب کی بہت بھیانک تعبیر دیکھ لی ہے۔۔۔!!'' عزام نے ٹوٹے لہجے میں کرچیاں سمیٹنے کی ناکام کوشش کی۔

''مگر تعبیر دیکھنے سے پہلے خواب دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔۔۔!!'' شنیل کے باپ نے کندھے اچکائے۔

''چاچا۔۔۔!! سنا ہے۔۔۔!! آپ نے شنیل کا رشتہ طے کر دیا ہے۔۔۔!!'' وہ اب بات کر رہا تھا۔

''ہاں۔۔۔!! بالکل ٹھیک سنا ہے۔۔۔!! ویسے چند دن میں اس کی رخصتی ہو جائے گی۔۔۔!!'' شنیل کا باپ اکڑ کر بولا۔

''چاچا۔۔۔!! آپ شنیل کا رشتہ طے نہ

کریں۔۔۔!! میں شینل سے بے پناہ محبت کرتا ہو۔۔۔!!وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔۔۔!!ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔۔۔!!''جیسے ہی اس نے بات مکمل کی،شینل کے باپ نے اسے کئی تھپڑ مار دیے اور اسے گھر سے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔اور دروازہ بند کردیا۔ وہ حیرت سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔شینل کا باپ غصے میں چلتا ہوا شینل کے کمرے میں آ گیا۔

''شینل۔۔۔!!شینل۔۔۔!!''وہ چیخ رہا تھا۔شینل دیوار سے لگی سہمی کھڑی تھی۔

''ابھی ابھی وہ بدذات کا بچہ جو بکواس کر رہا تھا۔۔۔!! کیا یہ سب سچ ہے؟''اس نے شینل کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ سامنے کر دیا۔مگر شینل کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''ہاں۔۔۔!!بابا یہ سچ ہے۔۔۔!!میں صرف اور صرف عزام سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔۔۔!!''شینل نے بنا نگاہیں اٹھائے کہہ دیا۔شینل کا باپ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔اس نے شینل کو تھپڑ مارا،مگر شینل کھڑی رہی۔پھر اس نے اسے دوسرا تھپڑ مارا۔

''تم نے آگ سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔۔۔!!اگر بڑے آقا کو پتہ چل گیا۔۔۔!!دونوں کو مار ڈالیں گے۔۔۔!!''شینل کے باپ نے شینل کو شانوں سے تھام کر جھنجھوڑا،اسے جیسے ہوش دلانے کی کوشش کی۔مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''بابا۔۔۔!!میں بتا رہی ہوں۔۔۔!!اگر آپ نے عزام کے علاوہ کسی سے بھی میری شادی کی کوشش کی۔تو میں اپنی جان دے دوں گی۔۔۔!!''

''تو ایسا کچھ نہیں کرے گی۔۔۔!!میں تیرا رشتہ دے چکا ہوں۔۔۔!!وہ تمہیں چند دن بعد لے جائے گا۔۔۔!!''اس کا باپ شدت سے چیختا رہا۔

''بابا۔۔۔!!پہاڑوں کی قسم ہے۔۔۔!!میں کھائی سے کود کر جان دے دوں گی۔۔۔!!''شینل نے نفی میں گردن ہلائی۔

''تمہیں پتہ ہے۔۔۔!!ہم پہاڑ جتنے سخت لوگ ہیں۔۔۔!!محبت کو اپنے وجود میں داخل نہیں ہونے دیتے ہیں۔۔۔!!اگر تم نے ایسا کچھ بھی کیا۔۔۔!!تو قسم ہے ان پہاڑوں کی۔۔۔!!میں عزام کی جان لے لوں گا۔۔۔!!''اس کا باپ رکا نہیں،وہاں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

''بابا۔۔۔!!آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے۔۔۔!!''وہ اس کے پیچھے کھڑی چیخ رہی تھی،اور بری طرح سے رو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''میمل۔۔۔!!یہ تم نے میرم کو کس راہ پر لگا دیا ہے۔۔۔!!''حوام نے میمل کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ کے دوست کو پہاڑوں کی شہزادی کے پیچھے بھیج دیا ہے۔۔۔!! کیا ہوا؟ابھی تک اس کی کوئی خیر خبر نہیں آئی ہے۔۔۔!!''میمل نے اسے دیکھ کر چہرے پر مسکراہٹ سجادی۔

''ہاں۔۔۔!!مگر ابھی تک وہ پہنچ گیا ہوگا۔۔۔!!ہر کسی کی قسمت میں شہزادی نہیں ہوتی ہے۔۔۔!!''حوام نے اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''بالکل یہ تو ہے۔۔۔!!ویسے آپ اس معاملے میں خوش قسمت ثابت ہوگئے ہیں۔۔۔!!''اس نے حوام کے کندھے پر سر رکھ دیا۔اس نے سفید سی ساڑھی پہنی تھی۔جس کے بارڈر پر میرون نگوں والا کام ہوا تھا۔

''میمل۔۔۔!!میرا دل کر رہا ہے۔۔۔!!ہم کچھ عرصے کے لیے باہر چلے جائیں۔۔۔!!''اس نے میمل سے کہا۔

''ہاں بالکل۔۔۔!!بہت اچھا خیال ہے۔۔۔!!''اس نے سر اٹھا کر نگاہوں سے تائید کی۔

''بس۔۔۔!!تمہارے کچھ کاغذات بن جائیں۔۔۔!!پھر ہم چلے جائینگے۔۔۔!!''حوام نے اس کو دیکھا۔اب دونوں محبت پاش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔میمل مسکرا رہی تھی۔مگر اسکا دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

''شاید۔۔۔!!ابھی شینل کی زندگی میں طوفان

آچکا ہوگا۔۔۔!! میرم کا دوسرا نام شینل کی محبت کی بربادی ہوگا۔۔۔!!'' وہ سر ہلا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

''شینل کو کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی ماں اس پر کڑا پہرہ رکھتی تھی۔ باپ نے اس کی کھڑکی کے پاس چارپائی ڈالنی شروع کر دی تھی۔ مگر پھر بھی، عزام گھر کے دروازے سے داخل ہو گیا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ یہ ایک دن تو جیسے اس پر قیامت بن کر گزرا تھا۔

''شینل۔۔۔!! شینل۔۔۔!! شینل۔۔۔!!'' وہ چیخنے لگا۔ گھر کے دلان میں وہ پاگلوں کی طرح کہہ رہا تھا۔ وہ شینل کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ اس نے باہر لگی کنڈی کھول دی۔ دیوار کے ساتھ ہی شینل کھڑی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی، اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ بری طرح سے رو رہی تھی۔ شینل کا باپ گھوم کر دوڑتا ہوا آ گیا۔ اور بے دردی سے شینل کو کھینچ کر اس سے الگ کر لیا۔

''خبردار۔۔۔!! شینل۔۔۔!! میں اس کی جان لے لوں گا۔۔۔!! اگر یہ یہاں سے نہیں گیا۔۔۔!! اچھا نہیں ہوگا۔۔۔!! ابھی تک میں نے کسی کو بھی اس بارے میں نہیں بتایا ہے۔۔۔!! اس کے گھر والوں کو بھی نہیں۔۔۔!! اور بڑے آقا کو بھی نہیں۔۔۔!!'' شینل کے باپ نے دونوں کو دھمکاتے ہوئے کہا۔ شینل نے باپ کو دیکھا۔

''چاچا۔۔۔!! آپ جو کہیں گے۔۔۔!! میں وہ کروں گا۔۔۔!! بس ہمیں جدا مت کریں۔۔۔!! آپ نے شینل کا رشتہ کتنے میں طے کیا ہے؟ میں وہی رقم لا کر آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا۔۔۔!!'' عزام شینل کے باپ کے قدموں سے لپٹا ہوا کہہ رہا تھا۔

''تمہاری اتنی اوقات نہیں ہے۔۔۔!! شینل کا رشتہ بہت قیمتی طے ہوا ہے۔۔۔!!'' شینل کے باپ نے اسے حقارت سے دیکھا۔

''چاچا۔۔۔!! میں اس سے دگنی رقم دینے کی کوشش کروں گا۔۔۔!!'' عزام نے چاچا کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔!! شینل کا رشتہ دس لاکھ میں ہوا ہے۔۔۔!! تم پندرہ لاکھ لا کر دو۔۔۔!! میں تم دونوں کو خود یہاں سے فرار کراؤں گا۔۔۔!!'' شینل کے باپ نے اسے کالر سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ عزام سہم گیا۔

''چاچا۔۔۔!! آپ مذاق کر رہے ہیں۔۔۔!! اتنا مہنگا رشتہ آج تک کسی کا نہیں ہوا ہے۔۔۔!! میمل کا رشتہ بمشکل تین لاکھ میں ہو گیا تھا۔۔۔!!'' عزام نے شینل کے باپ سے کہا۔

''ہاں۔۔۔!! شینل کو دیکھتے ہی وہ اس کا دیوانہ ہو گیا تھا۔۔۔!! اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔۔۔!! میں نے جب دس لاکھ مانگے۔۔۔!! تو جھٹ سے راضی ہو گیا۔۔۔!! وہ بہت امیر ہے۔۔۔!! میری شینل کو بہت خوش رکھے گا۔۔۔!! چل میں تجھے دو دن کی مہلت دیتا ہوں۔۔۔!! اگر تو پندرہ لاکھ لے آیا۔۔۔!! تو شینل تیری۔۔۔!! میں اسے تمہارے ساتھ جانے دے دوں گا۔۔۔!!'' شینل کے باپ نے اکڑ پن دکھایا۔ قریب کھڑی شینل بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ اسے پتہ تھا، عزام کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔۔۔!! وہ کبھی اتنی بڑی رقم کا بندوبست نہیں کر پائے گا۔

''بابا۔۔۔!! میں بتا رہی ہوں۔۔۔!! رخصتی کے دن میں اسی کھائی سے کود کر جان دے دوں گی۔۔۔!! عزام کے سوا میں کسی کی نہیں ہوں گی۔۔۔!!'' شینل نے باپ سے نڈر سے انداز میں کہا۔

''شینل۔۔۔!! محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔۔۔!! تو بھی اندھی ہو گئی ہے۔۔۔!! مجھے تیرا جان دینا منظور ہے۔۔۔!! مگر عزام کا ساتھ نہیں۔۔۔!!'' شینل کے باپ نے دونوں پر طائرانہ نگاہیں جمائیں۔ عزام اب الٹے قدموں جا رہا تھا۔ اور شینل دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کا باپ کمرے کا دروازہ بند کر کے کنڈی لگا کر چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

عزام پاگلوں کی طرح گھر بھاگ رہا تھا۔اس نے کمرے میں جا کر اپنی ایک ایک چیز کا حساب و کتاب کرنا شروع کر دیا۔وہ پاگلوں کی طرح انگلیوں کی پوروں پر چیزیں گن رہا تھا۔اس کے ہاتھوں میں بہت تیزی سی آ گئی تھی۔وہ نہیں جانتا تھا۔اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔اس کی دکان جو بازار میں تھی۔وہ اس نے کرائے پر حاصل کی تھی۔بمشکل ایک لاکھ کا بندوبست نہیں کر سکتا تھا۔وہ کمرے کی دیوار سے لگ گیا۔وہ شکست خوردہ قدموں سے اپنے باپ کے پاس آیا۔اس کا باپ جو دھوپ میں بیٹھا ہوا اس کے بکھرے حلیے کو دیکھ کر نظر انداز کر رہا تھا۔چونک گیا۔

''عزام کیا بات ہے؟ کیوں ایسے اجڑے حلیے میں گھوم رہے ہو؟''

''بابا۔۔۔!!میں شنیل سے بہت محبت کرتا ہوں۔۔۔!!چاچا نے اس کا رشتہ طے کر لیا ہے۔۔۔!! میں اس کے بنا مر جاؤں گا۔۔۔!!پہاڑوں کی قسم۔۔۔!! بابا میں اس کی جدائی سہ نہ سکوں گا۔۔۔!!مر جاؤں گا۔۔۔!!'' وہ باپ کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگا۔ اس کا باپ نفی میں سر ہلانے لگا۔

''چپ کر۔۔۔!!اگر شنیل کے ابا نے بڑے آقا کو بتا دیا۔۔۔!!تو تیری موت بہت بھیانک ہوگی۔۔۔!!تیری ابھی بھی چار کنواری بہنیں بیٹھی ہیں۔۔۔!!ان کا رشتہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔۔۔!!یہ محبت وحبت کچھ نہیں ہوتی ہے۔۔۔!!یہ سب کچھ چند دن بعد تو بھول جائے گا۔۔۔!!شنیل کو چھوڑ اور اپنا سوچ۔۔۔!!ہمارا سوچ۔۔۔!!تیری کئی بیویاں ہوں گی۔۔۔!!جس سے تیری بیٹیاں ہوں گی۔۔۔!!اور تو کل میری جگہ ہوگا۔۔۔!!میری طرح ان بیٹیوں کے رشتوں کے لیے پریشان ہوگا۔۔۔!!پہاڑوں کی قسم مت کھا۔۔۔!!پہاڑ ہمیں بہت ساری چیزیں دیتے ہیں۔۔۔!!اس پر سبزہ اگتا ہے۔۔۔!!اس سے پانی بہتا ہے۔۔۔!!ہماری زندگی یہی پہاڑ ہیں۔۔۔!!جھوٹی قسم کھانے والے پر پہاڑ کی لعنت ہوتی ہے۔۔۔!!اور پہاڑ اس پر اپنا رزق بند کر دیتا ہے۔۔۔!!'' اس کے باپ نے پیر چھڑا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔مگر اس نے مزید سختی سے پکڑ لیے۔

''بابا۔۔۔!!مجھے پندرہ لاکھ روپے چاہیے۔۔۔!! ورنہ میں اپنی محبت کو کھو دوں گا۔۔۔!!میں ہار جاؤں گا۔۔۔!!شنیل کے باپ نے مجھ سے پندرہ لاکھ مانگے ہیں۔۔۔!!'' عزام نے بابا کو سر اٹھا کر دیکھا۔

''ہے۔۔۔!!کیا میرا بھائی پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔۔۔!!پندرہ لاکھ۔۔۔!!کیا شنیل سونے کی بن گئی ہے۔۔۔!!اسے کوئی ایک لاکھ پر لے جائے۔۔۔!!تو بھی بہت بڑی بات ہوگی۔۔۔!!تم سے وہ خبیث پندرہ لاکھ مانگ رہا ہے۔۔۔!!'' عزام کا باپ شاک میں کھڑا ہو گیا۔

''بابا۔۔۔!!آپ کچھ بھی کر کے یہ پیسے مجھے دے دیں۔۔۔!!میری زندگی کا سوال ہے۔۔۔!!میں مر جاؤں گا۔۔۔!!'' عزام گڑگڑانے لگا تھا۔

''میرے پاس نہیں ہے۔۔۔!!پندرہ لاکھ ۔۔۔!!ہونہہ۔۔۔!!اور شنیل کا مجنوں بننے سے بہتر ہے۔۔۔!!بہادر انسان بن کر زندگی گزارو۔۔۔!! تم۔۔۔!!چند دن بعد بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔۔۔!!'' اس کے باپ نے اپنے پیر اس کے ہاتھوں سے چھڑائے۔اور اٹھ کر باہر جانے لگا۔عزام حیرت سے اسے جاتا ہوا دیکھنے لگا۔وہ رونے لگا۔اس کے علاوہ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

''شنیل۔۔۔!!میں کیا کروں؟ کیا کرو؟ کچھ بھی نہیں کر پا رہا ہوں؟'' اس نے اپنے بال مٹھیوں میں پکڑ لیے تھے۔وہ چیخ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

شنیل کا رو رو کر برا حال تھا۔عزام جیسے اس کی زندگی سے باہر نکل گیا تھا۔دو دن گزر گئے تھے۔مگر وہ پیسوں کا بندوبست نہیں کر پایا۔کل شنیل کی شادی تھی۔میرم کو بڑے آقا کے گھر کے قریب ایک خاص مہمان خانے میں مہمان کی حیثیت سے جگہ دے دی گئی

تھی۔اس کا ہر قسم کا خیال رکھا جا رہا تھا۔بڑے آقا اس سے کئی بار خود ملنے آئے۔وہ کچھ دنوں میں پردیس جانے والے تھے۔شنیل کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔وہ کرے تو کیا کرے۔اپنی پریشانی میں وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔یہ دن بھی دوسرے دنوں کی طرح تمام ہوگیا۔اس کے باپ نے اس کے کمرے کی کھڑکی میں اینٹیں لگا کر بند کر دیا تھا۔وہ شنیل پر اب بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔وہ اندر پریشان حال بیٹھی ہوئی تھی۔

اچانک رات سر پر آ گئی۔گھر میں لوگ آنے جانے لگیں۔اسے لگا۔عزام اسے بھلا چکا ہے۔اب وہ کبھی نہیں آئے گا۔رات بھر اپنی اور میسل کی باتیں وہ یاد کر کے روتی رہی۔وہ کب سوئی،اسے پتہ ہی نہیں چلا۔صبح جب وہ اٹھی،اسے دلہن بنایا جانے لگا۔وہ بالکل گم صم تھی۔اسے لگ رہا تھا۔وہ اپنی دنیا لٹا بیٹھی ہے۔اسے دلہن بنا کر نیچے پہاڑ سے بڑے آقا کے پاس لے کر جانا تھا۔جب سب کچھ مکمل ہوگیا۔اس کے گھر میں وادی کے سارے لوگ گھوم پھر رہے تھے۔وہ دلہن تھی۔مگر بالکل بھی خوش نہیں تھی۔اس کا ذہن بار بار کہہ رہا تھا۔

''اگر میں عزام کی نہیں ہو سکی۔۔۔!!تو کسی کی بھی نہیں ہو سکوں گی۔۔۔!!میں کھائی سے کود کر جان دے دوں گی۔۔۔!!''اس کا باپ بھی گھر میں موجود تھا۔اس کو میرم نے پیسے دے دیے تھے۔وہ بہت مطمئن تھا۔اس کا باپ اس کے پاس آیا۔اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''تمہاری شادی کا وقت آ گیا ہے۔اٹھو۔۔۔!! تمہیں رخصت کر دوں۔۔۔!!سب لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہونے لگے۔یہ یہاں کا رسم تھا۔دلہن کا باپ یا بھائی کے ساتھ ہی جاتی،باقی لوگ اس کے پیچھے پیچھے شادی ہال تک جاتے۔اور اس کی شادی کرا کر اسے الوداع کرتے۔آج اس کی باری تھی۔

''بابا۔۔۔!!عزام کہاں ہے؟''شنیل نے اٹھ کر باپ سے آہستہ آواز میں پوچھا۔

''وہ خبیث۔۔۔!!اپنے گھر میں ہوگا۔۔۔!!تم چلو۔۔۔!!اس موقع پر اس کی پرواہ کرنا بیکار ہے۔۔۔!! وہ تمہیں بھلا چکا ہے۔تم بھی اسے بھول جاؤ۔۔۔!!''اس نے شنیل کا ہاتھ تھاما۔اور پہلا قدم اٹھایا۔اب وہ کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔اب وہ گھر کے دہلیز سے باہر قدم رکھ رہی تھی۔اس نے عزام کے گھر کی طرف دیکھا۔وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑا ویران نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔وہ رک گئی۔اور عزام کو دیکھنے لگی۔ دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں۔

''بابا۔۔۔!!رک جاؤ۔۔۔!!''اس نے باپ کے کندھے کے قریب اس کے کان میں سرگوشی کی۔اس کا باپ رک گیا۔مگر یہ چند لمحوں کے لیے ہوا تھا۔باپ نے قدم آگے بڑھایا۔اس کو بھی بڑھنا پڑا۔وہ مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔عزام قدم قدم اس کے پیچھے آنے لگ گیا۔اب سامنے وہی کھائی تھی۔کھائی کو دیکھ کر اس کو اچانک امسواک یاد آیا۔جو اسے آوازیں دیا کرتا تھا۔جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔جو اس کے پاس آتا تھا۔جو اس کا محسن تھا۔اور وہ اسے بھلا چکی تھی۔اسے اپنے آپ پر غصہ آیا۔

''میں بھی کتنی پاگل تھی۔۔۔!!امسواک کو بھول گئی۔۔۔!!اُف۔۔۔!!یہ میں نے کیا کر دیا۔۔۔!!ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔۔۔!!میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گی۔۔۔!!''وہ رک گئی۔اس کا باپ رک گیا۔اس کے پیچھے لوگ قطار کی صورت میں نکل رہے تھے۔وہ سب رک گئے۔ان لوگوں میں عزام بھی تھا۔وہ حیران ہو رہا تھا۔یہاں ایک رواج یہ بھی تھا اگر شادی کے دن دلہن کسی لڑکے کی وجہ سے شادی سے انکار کر دیتی،تو لوگ اسے پکڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر گنجا کر دیتے۔اور دونوں کو پکڑ کر پہاڑ کے اوپر لے جا کر پتھر مارنے لگتے۔ اور بڑے آقا اس سے بھی زیادہ بھیانک سزا دیتے تھے۔ عزام ڈر سا گیا۔اسے لگا۔شنیل انکار کر دے گی۔مگر شنیل نے باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھڑایا۔اور کھائی کی طرف دوڑ پڑی۔یہ سب بہت اچانک ہوا تھا۔کسی کو بھی گمان تک نہیں گزرا تھا۔ایسا کچھ بھی ہو سکتا ہے۔اس کا باپ

اسماء الحسنی کامیابی کا راستہ

پریشانیوں سے چھٹکارہ
ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے

آزوائیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہے

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک مرتبہ ضرور لیں عامل وہ جس کا علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہو گا اولاد فرمان بردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید فرمان شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو	جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح	اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا
گھریلو ناچاقی	کاروباری بندش
جنات کا سایہ	دیگر مسائل

سید عالم شاہ

کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں
وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

سسرال میں، بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام راز داری کے ساتھ کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

خواہش

زندگی کی کوئی خواہش ہے کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہو گی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزمالیجئے

ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے

نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہو گی

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ وہ آنکھیں کی کیا جن میں شرم نہ ہو وہ علم ہی کیا جس عمل نہ ہو وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو

سیّد عالم شاہ

رام تلائی چوک جی ٹی روڈ گجرات

0300-6282386

اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر وہ بہت آگے نکل گئی تھی۔ کھائی کے سر پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ اس کا باپ اسی کے پاس آرہا تھا۔

''رُک جا شنیل رک جا۔۔۔!!'' اس کا باپ چیخنے لگا۔ شنیل نے مڑ کر اپنے باپ کو اپنے قریب آتے دیکھا۔ بس دو تین گز کا فاصلہ تھا۔

''امسواک۔۔۔!! آجاؤ۔۔۔!! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔۔۔!!'' شنیل چیخی، اور کھائی میں چھلانگ لگادی۔ سب لوگ حیرت سے کھائی میں جھانکنے لگے۔ عزام شاک میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ مگر کسی کو شنیل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ عزام صدمے سے گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ وہ کبھی آسمان کو دیکھتا، کبھی اس جگہ کو جہاں سے شنیل نے چھلانگ لگائی تھی۔ مگر وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ نیچے گرتی شنیل کو امسواک نے اپنی بانہوں میں پکڑ لیا۔ شنیل کو وہ نظر نہیں آرہا تھا، مگر شنیل کو لگ رہا تھا کہ کسی انجانے وجود کے بانہوں کے حصار میں ہے۔ جو نیچے کی طرف جارہی ہے۔ مگر وہ گر نہیں رہی تھی۔ وہ جیسے لیٹ کر اڑ رہی تھی، پہاڑ کے اسی سوراخ کے قریب پہنچ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ امسواک نے اسے سوراخ سے گزار کر اندر پہاڑ میں اتارا۔

''امسواک۔۔۔!! تمہارا بہت بہت شکریہ۔۔۔!!'' شنیل مشکور سی تھی۔

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے؟ آپ میری محسن ہیں۔۔۔!! آپ کو جب بھی کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہوگی۔۔۔!! میں آپ کی مدد کروں گا۔۔۔!!''

''امسواک۔۔۔!! میں کچھ دن یہاں گزارنا چاہتی ہوں۔۔۔!!'' شنیل نے سوچ لیا۔ وہ چند دن بعد عزام کے ساتھ یہاں سے بھاگ جائے گی۔

''تمہیں پریشان ہونے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔۔۔!! جب تک تمہارا دل کہے۔۔۔!! تم یہاں رہ سکتی ہو۔۔۔!!''

''شکریہ امسواک۔۔۔!!''

''میں تمہارے لیے یہاں زندگی کے سامان کا سارا انتظام کردوں گا۔۔۔!! آپ کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔۔۔!!'' اسے امسوک کی آواز آئی۔ اس نے آنکھیں بند کردیں۔ پھر کچھ دیر بعد امسواک کی آواز آئی۔

''آنکھیں کھولیں۔۔۔!!'' جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہاں ایک عالیشان کمرا تھا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔

''آپ کو جب بھی کسی چیز کی ضرورت ہو۔۔۔!! مجھے یاد کرلینا۔۔۔!! میں آجاؤں گا۔۔۔!! اب میں جارہا ہوں۔۔۔!! کھانے پینے کی ہر چیز سامنے پڑی ہے۔۔۔!!'' امسواک کی آواز اس نے سنی، اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ خوش ہورہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی۔

''سب سمجھ گئے۔۔۔!! میں مرچکی ہوں۔۔۔!! سب لوگوں کی حالت دیکھنے والی ہوگی۔۔۔!! وہ دلہا تو جل کر خاک ہوگیا ہوگا۔۔۔!!'' اس سوچ نے اسے عجیب سی طمانیت بخش دی۔ وہ اب مسکرا رہی تھی اور وہ کمرے میں گھوم پھر رہی تھی۔ اور ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

عزام نے کھائی کے قریب آکر دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ سب لوگ عجیب سے انداز میں کھائی کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے اس نے شنیل کو نگل لیا ہو۔ اس کا باپ سر پکڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور رو رہا تھا۔ عزام سب لوگوں کو دیکھ کر قہقہے لگانے لگا۔ وہ ناچ اٹھا۔

''شنیل چلی گئی۔۔۔!!! سب دیکھو۔۔۔!! شنیل اس کھائی میں گم ہوگئی۔۔۔!! اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔۔۔!! اب وہ آرام سے رہ رہی ہوگی۔۔۔!!'' وہ ایک ایک کو پکڑ پکڑ کر کہنے لگتا۔

''ہاہاہا۔۔۔!!'' اور قہقہے لگاتا۔ وہ پاگل سا ہونے لگا۔ کبھی کھائی کی طرف دوڑ کر آتا۔ کبھی رک کر کھائی میں دیکھ کر قہقہے لگاتا۔ وہ عجیب سے انداز میں سب کو دیکھ کر خوشی سے چیخنے لگتا۔ اور پھر چھلانگیں مار مار کر کہنے لگا۔ وہ اس صدمے کو سہہ نہ سکا تھا۔ وہ واقعی میں پاگل ہوچکا

تھا۔وہ ناچ رہا تھا۔اس کا دماغ ایک لمحے میں خراب ہوگیا تھا۔

''دیکھا۔۔۔!!شنیل نے کہا تھا۔۔۔!!وہ کھائی میں چھلانگ لگادے گی۔۔۔!!اس نے لگادی۔۔۔!!وہ کھائی میں گر کر گم ہوگئی۔۔۔!!''لوگ اسے ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔کچھ لوگ جا کر بڑے آقا کو خبردار کرنے چلے گئے۔وہاں دلہا بھی انتظار کر رہا تھا۔اور شنیل کے باپ کو شنیل کی فکر نہ تھی۔اسے اپنے اس دس لاکھ کی فکر تھی۔جو ابھی اسے واپس کرنے تھے۔

☆.....☆.....☆

میرم پر یہ خبر بجلی بن کر گری،اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ شنیل نے کھائی میں کود کر جان دے دی ہے۔وہ عجیب سے الجھن میں پڑ گیا۔بڑے آقا نے فوراً اس کی لاش کو ڈھونڈنے کے لیے کچھ لوگوں کو کھائی میں بھیجوا دیا۔مگر کھائی میں جا کر کچھ بھی نہ مل سکا۔وہ لوگ ناکام لوٹ آئے۔میرم نے شنیل کے باپ سے اپنے پیسے واپس مانگ لیے۔وہ شنیل کے باپ نے دے دیے۔مگر وہ شنیل کو بہت گالیاں دے رہا تھا، میرم وہاں سے واپس آگیا۔اس نے ان لوگوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔اسے افسوس تو تھا۔مگر اسے لگا اتنی دولت ہونے کے باوجود اس کے نصیب میں شادی نہیں لکھی ہے۔وہ کافی ڈپریس تھا۔یہاں سے واپسی کا سفر اس کا بہت برا گزرا تھا۔کچھ دنوں تک وہ بخار میں تپتا رہا تھا۔کچھ دن ہسپتال میں گزار کر گھر آگیا۔اسے میمل سے ملنا تھا۔اسے بتانا تھا۔پہاڑوں کی شہزادی نے خودکشی کرلی ہے۔

☆.....☆.....☆

چند دن بعد وہ میمل سے ملنے آیا تھا۔میمل اسے دیکھ کر اچھی خاصی حیرانگی کا شکار ہوگئی۔اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔کیونکہ وہ اداس ،الجھا ہوا،اور بہت خاموش سا تھا۔حوام بھی گھر پر نہیں تھے۔

''میرم بھائی کیا ہوا ہے؟ آپ کے چہرے پر یہ پریشانی بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی ہے۔۔۔!!''میمل اس کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''بھابی۔۔۔!!آپ کی دوست شنیل نے خودکشی کرلی۔۔۔!!شادی سے کچھ دیر قبل اس نے کھائی میں کود کر جان دے دی۔۔۔!!پہاڑوں کی شہزادی ہر کسی کے قسمت میں نہیں ہوتی ہے۔۔۔!!میرے خیال میں وہ کسی سے محبت کرتی تھی۔۔۔!!تبھی اس نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔۔۔!!''میرم نے اسے دیکھا۔وہ کچھ سوچ رہی تھی۔وہ طنزیہ سی ہنسی ہنسنے لگی۔میرم اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

''آپ کیوں ہنس رہی ہیں؟ کیا آپ کو خوشی ہورہی ہے۔۔۔!!''میرم کو شدید حیرانگی ہونے لگی۔

''نہیں۔۔۔!!نہیں۔۔۔!!ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔۔۔!!شنیل نے سب کو بے وقوف بنایا ہے۔۔۔!! وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔!!تو جان کر کھائی میں چھلانگ لگادی۔۔۔!!اگر وہ ایک بار پہلے بھی کھائی میں گر چکی تھی۔۔۔!!مگر اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔۔۔!!تب بھی میں نے اس سے پوچھا تھا۔۔۔!!تم بچ کیسے گئی؟ اس نے کہا تھا۔۔۔!جب میں گری تو میں نے گرتے وقت درخت کی شاخیں پکڑ لیں۔۔۔!!اور یوں میں آرام سے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔۔۔!!اور کچھ دیر بعد پھر درخت سے پہاڑ پر چڑھ کر آگئی۔۔۔!!''میمل نے اس کو دیکھ کر مزے لے لے کر بتایا۔

''بھابی۔۔۔!!تو آپ کا مطلب ہے۔۔۔!! شنیل نہیں مری ہے۔۔۔!!''میرم شاک سے کہنے لگا۔

''نہیں۔۔۔!!بالکل بھی نہیں۔۔۔!!پہلے بھی جب وہ گری تھی۔۔۔!!مگر مری نہیں تھی۔۔۔!!اس بار تو جان بوجھ کر کودی ہے۔۔۔!!وہ زندہ سلامت ہوگی۔۔۔!!''میمل نے میرم کو یقین دلانے کی کوشش کی،وہ اپنے الفاظ پر بہت زور دے رہی تھی۔

''اب اگر وہ زندہ بھی ہو۔۔۔!!تو میرے لیے بے فائدہ ہے۔۔۔!!وہ مجھے پسند آئی تھی۔۔۔!!ہماری شادی دس لاکھ میں طے ہوئی تھی۔۔۔!!پتہ

نہیں۔۔۔!! کیوں شینل نے ایسا کیا۔۔۔!! کیا وہ شادی سے خوش نہیں تھی۔۔۔!! یا پھر وہ کسی کو پسند کرتی تھی۔۔۔!!'' میرم نے میمل سے یہی جاننا تھا، اس لیے تو وہ یہاں آ گیا تھا۔ اور میمل دس لاکھ کا ذکر سن کر اچھل پڑی۔ کتنی دیر وہ شاک میں تھی۔

''پتہ نہیں۔۔۔!! میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔!! مگر ہماری وادی میں محبت کو جرم سمجھا جاتا ہے۔۔۔!! وہاں پسند کی اجازت ہی نہیں ہے۔۔۔!! اگر شینل دل ہی دل میں کسی کو چاہتی تھی۔۔۔!! تو یہ اس کی سب سے بڑی بے وقوفی ہوگی۔۔۔!! کیونکہ دل کی پسند کسی کو نہیں ملتی ہے۔۔۔!! وہاں رشتے ایسے ہی طے کیے جاتے ہیں۔۔۔!! آپ نے شینل کے باپ کو کچھ زیادہ ہی قیمت دے دی تھی۔۔۔!!'' میمل نے آنکھیں بڑی کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ ہنسا۔

''ہاں۔۔۔!! انمول تھی۔۔۔!! وہ لاجواب تھی۔۔۔!!! اس لیے اس کی قیمت میں نے من پسند اس کے باپ کو دے دی تھی۔۔۔!! مگر پھر بھی میری نہیں ہو سکی۔۔۔!!'' عزام دکھ سے ہنس پڑا۔

''میرم بھائی۔۔۔!!! اگر وہ تمہاری قسمت میں نہیں تھی۔۔۔!! تو پھر وہ بہت بڑی بدقسمت تھی۔۔۔!! اور اگر وہ تمہاری قسمت میں ہوگی۔۔۔!! تو اسے تم سے کوئی نہیں چھین سکتا ہے۔۔۔!!'' میمل نے کہا۔

''اچھا۔۔۔!! میں ابھی جا رہا ہوں۔۔۔!! پھر کبھی حوام سے ملنے آجاؤں گا۔۔۔!!! ابھی تو میں بہت ڈسٹرب ہوں۔۔۔!!'' میرم فوراً اٹھا۔

''نہیں۔۔۔!! آپ بیٹھیں۔۔۔!! میں چائے بھیجوا دیتی ہوں۔۔۔!!'' میمل جلدی سے اٹھ کر کچن میں آئی۔ اس نے ملازمہ کو چائے لانے کا کہہ دیا۔ اور خود واپس آ گئی۔ اب وہ دونوں اسکرین پر کوئی نئی مووی دیکھ رہے تھے۔ مگر میرم کا دل بہت اداس ہو رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کچھ دن گزر گئے، عزام کا پاگل پن عروج پر پہنچ گیا۔ اس کو اب ایک پیر سے کمرے میں زنجیر سے باندھا جانے لگا۔ سارے لوگ باتیں کرنے لگے تھے۔ لوگ سمجھ گئے تھے۔ شینل اور عزام کا چکر چل رہا تھا۔ شینل اپنی شادی سے خوش نہیں تھی۔ اور عزام اسے پا نہیں سکتا تھا۔ اس لیے شینل نے خودکشی کر لی۔ اور عزام کو دلی صدمہ پہنچا۔ مگر لوگ حیران اس لیے تھے۔ صدمہ جب دل کو لگتا ہے۔ تو دماغ کیوں خراب ہو جاتا ہے۔ اور انسان کیوں پاگل ہو جاتا ہے۔ ایک لڑکی کی محبت میں کیا اتنی طاقت ہوتی ہے۔ جو انسان کو پاگل بنا کر رکھ دے۔ ہاں محبت میں بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ انسان کی دنیا جس طرح آباد کر سکتی ہے۔ جس کو دنیا کی سب سے بڑی خوشی دے سکتی ہے۔ اس کو اتنا بڑا غم بھی دے سکتی ہے۔ یہ پاگل بھی کر سکتی ہے۔

اس کا باپ افسوس کرتا۔ اسے لگتا۔ اسے عزام کو شینل کے ساتھ بھاگنے دینا چاہیے تھا۔ کم از کم دونوں آج ساتھ تو ہوتے۔ مگر اب ایک پاگل انسان کے ساتھ زندگی گزارنا بے حد مشکل کام تھا۔ وہ خود تو پاگل ہو کر سب سے بے خبر تھا۔ مگر سب اس کی وجہ سے جیسے جیتے جی آگ میں زندگی گزار رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

شینل پہاڑ کے کھا سے نکل کر کبھی سوراخ کے دہانے پر کھڑی ہو جاتی، اور پہاڑ سے نیچے گہری وادی کی سیر کرتی، وہ کچھ دنوں کے لیے سب کچھ بھلانا چاہ رہی تھی۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے وہ کام کر دیا تھا۔ جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اسمواک وقت پر کھانا دیتا۔ اس کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ وہ یہاں اس کھا میں خوش تھی۔ مگر اس کا دل انجانے خطرے سے بہت پریشان تھا۔ اس کو عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔ وہ ہر وقت انجانے خوف سے ڈرتی رہتی۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ مگر کل ہی اس کا یہاں ایک ہفتہ مکمل ہو گیا تھا۔ آج رات وہ اسمواک سے کہہ کر واپس وادی میں جانا چاہ رہی تھی۔ ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھا کے دہانے پر کھڑی تھی۔ اور نیچے گہری کھائی میں جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ واپس کھا میں جانے لگی۔ یہ کھا

بالکل ویران تھی۔اب اس کے سامنے ایک بڑا سا کمرا تھا۔ جس کے دروازے سے داخل ہو کر وہ اس کمرے میں داخل ہوگئی۔کمرے میں دنیا جہان کی ہر چیز موجود تھی۔وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔وہ نیند کی وادیوں میں گم ہوگئی۔جب وہ اٹھی تو اچھی خاصی رات ہوگئی تھی۔وہ غسل خانے میں گھس گئی۔اب وہ بالکل تروتازہ تھی۔اس نے میز پر سے رکھا ہوا کھانا اٹھایا۔اور کھانے لگی۔کھانے کے بعد برتن غائب ہوگئے تھے۔امسواک نے اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تھا۔

''امسواک۔۔۔!! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔۔۔!!''شینل نے زوردار آواز میں کہا۔

''جی۔۔۔!! میں یہاں موجود ہوں۔۔۔!!''امسواک کی آواز سنائی دی۔

''مجھے واپس جانا ہے۔۔۔!! تم مجھے چھوڑ آؤ۔۔۔!!''

''میں آپ کو کھائی کے اوپر پہاڑ کے دامن میں چھوڑ آتا ہوں۔۔۔!!''اسے امسواک کی آواز سنائی دی۔

''جی۔۔۔!! ٹھیک ہے۔۔۔!!''اس نے آواز کو محسوس کیا۔اور اسی سمت میں دیکھا۔اچانک وہ کسی انجانے احساس کے تابع آگئی۔کسی نے اسے بانہوں میں اٹھایا۔اب وہ ہوا میں اڑ رہی تھی۔کچھ دیر بعد وہ کھا سے باہر تھی۔ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔اسے اچھا لگ رہا تھا۔امسواک نے پہاڑ کے دامن پر اسے اتار دیا۔اب وہ وہاں سے خود عزام کے کمرے تک جا سکتی تھی۔پہاڑ پر ویرانی تھی۔امسواک چلا گیا تھا۔شینل قدم قدم چلتی ہوئی،عزام کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔اب وہ لکڑی سے بنے گھر کے اطراف میں گھوم کر عزام کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔اس نے شیشے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔کھڑکی کھل گئی۔اس نے وہاں گھپ اندھیرا دیکھا۔وہ کمرے میں کھڑکی کے ذریعے جا گھسی۔

☆.....☆.....☆

اندر پہنچ کر اس نے لالٹین روشن کر دی۔کمرے میں ہر طرف زرد روشنی پھیل گئی۔وہاں عزام ستون سے بندھا پڑا تھا۔اس کا حال بہت برا تھا۔اس کے ایک پیر میں زنجیر تھی۔جس کو ستون سے باندھ دیا تھا۔اس نے پھٹے پرانے سے کپڑے پہن رکھے تھے۔اس کے سر کے بال بے ترتیب سے ہوگئے تھے۔داڑھی اچھی خاصی بے ترتیب تھی اور بڑھ گئی تھی۔وہ نیچے دیکھ رہا تھا۔اس کے پیر میں زخم تھا۔کیونکہ زنجیر اچھا خاصا تنگ تھی۔

''عزام۔۔۔!!''شینل نے اسے پکارا۔وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔عزام بالکل کسی پاگل پن میں تھا۔اور پاگل لگ رہا تھا۔

''عزام۔۔۔!! میں تمہیں لینے آگئی ہوں۔۔۔!!''

وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔اس نے عزام کو ہلایا۔وہ اسے دیکھنے لگا۔اسے دیکھ کر وہ حیرانگی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔

''تو کون ہے؟ کون ہے؟ بتا۔۔۔!! یہاں کیوں آئی ہے؟ کیوں آئی ہے؟ بول ناں۔۔۔!!''عزام نے پوچھا۔شینل کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ کر گر گئی۔وہ صدمے سے بیٹھتی چلی گئی۔وہ اسے بھلا چکا تھا۔اس کے سارے حرکات عجیب سے تھے۔

''میں شینل ہوں۔۔۔!! تمہاری محبت۔۔۔!! میں تمہیں لینے آئی ہوں۔۔۔!! ہم یہاں سے بہت دور چلے جائینگے۔۔۔!! جہاں یہ وادی والے کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔۔۔!!''

''ہاہاہا۔۔۔!!''عزام قہقہے لگانے لگا۔وہ پاگل ہو چکا تھا۔

''عزام۔۔۔!! تم قہقہے کیوں لگا رہے ہو؟''وہ اس کی زنجیر کو دیکھنے لگی۔اسے وحشت ہو رہی تھی۔

''ہاہاہا۔۔۔!!''وہ اسے ہلا ہلا کر تھک گئی۔اسے سمجھ آگیا۔عزام اس کی محبت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکا۔اور پاگل ہوگیا۔اسے لگا وہ اس بازی میں اپنا سب کچھ ہار چکی ہے۔کچھ دیر وہ بے آواز روتی رہی۔وہ صدمے سے نڈھال اس کے پاس بیٹھی تھی۔اچانک اسے امسواک یاد آیا۔

''میں ہر غم میں ہر پریشانی میں اُسے کیوں بھول جاتی ہوں۔۔۔!! وہ اسے ٹھیک کر سکتا ہے۔۔۔!! میں

ابھی اسے بلاتی ہوں۔۔۔!!''اس نے سوچا۔وہ ہنس دی۔اپنے آنسو آستین سے پونچھ لیے۔

''امسواک۔۔۔!! آجاؤ۔۔۔!مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔۔۔!!''اس نے بلند آواز سے کہا۔

''جی۔۔۔!!میں آگیا ہوں۔۔۔!!''امسواک کی آواز سنائی دی۔

''امسواک۔۔۔!!صرف تم میری مدد کر سکتے ہو۔۔۔!!ہر مشکل میں تم نے میرا ساتھ دیا ہے۔۔۔!!سامنے دیکھ رہے ہو۔۔۔!!میری محبت کی جدائی کا صدمہ اس نے دل کے بجائے دماغ پر لے لیا ہے۔۔۔!!یہ پاگل ہو چکا ہے۔۔۔!!میں چاہتی ہوں۔۔۔!!تم اسے پھر سے بالکل ٹھیک کردو۔۔۔!!اس کے دماغ سے پاگل پن کو ہٹادو۔۔۔!!''اس نے روتے ہوئے کہا۔وہ امسواک کی آواز کا منتظر تھی۔مگر وہاں خاموشی تھا۔وہ کچھ جواب ہی نہ دے پایا۔

''امسواک تم نے کچھ جواب نہ دیا۔۔۔!!''اس نے خود ہی پوچھا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔!!یہ میرے بس میں نہیں ہے۔۔۔!!میں صرف تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔۔۔!!کسی اور کا نہیں۔۔۔!! اور جو پاگل ہو جائے۔۔۔!!وہ جب تک زندہ رہتا ہے۔۔۔!!پاگل ہی ہوتا ہے۔۔۔!!میں تمہارے علاوہ کسی اور انسان کی مدد کروں گا۔۔۔!!تو جل کر خاکستر ہو جاؤں گا۔۔۔!!اب یہ ساری زندگی ایسا ہی رہے گا۔۔۔!!''امسواک کی آواز سے افسوس ظاہر ہو رہا تھا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔۔۔!!''شینل کے آنکھوں میں موٹے سے آنسو چمکنے لگے تھے۔

''صرف تم مجھے سن سکتی ہو۔۔۔!!یہ نہیں۔۔۔!! کوئی دوسرا انسان مجھے سن نہیں سکتا ہے۔۔۔!!اگر میں خود سے اس کی مدد کروں گا۔۔۔!!تو اپنے قبیلے کے روایات کے خلاف ہو کر کروں گا۔۔۔!!اور جن باتوں سے ہمیں منع کیا جاتا ہے۔۔۔!!ان باتوں میں سب سے پہلے انسان سے دور رہنے کی تلقین ہوتی ہے۔۔۔!!اگر ہم کسی ایسے انسان کے کہنے پر جو ہماری آواز سنتا ہو۔۔۔!!ہم سے باتیں کرتا ہو۔۔۔!!اس کے کہنے پر کسی بھی دوسرے انسان کے ساتھ کچھ بھی کرے۔۔۔!!تو ہم جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔۔۔!!'' امسواک نے جو کچھ کہا۔شینل نے سر پکڑ لیا۔

''اب تم ہی بتاؤ۔۔۔!!امسواک میں کیا کروں۔۔۔!!''شینل نے دونوں گھٹنوں پر سر پریشانی سے رکھا۔

''آپ جو کہیں گی میں کروں گا۔۔۔!!مگر میں آپ کے کہنے پر کسی دوسرے انسان کے ساتھ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔۔۔!!''امسواک کی آواز میں اُس سے زیادہ پریشانی تھی۔

''اگر میں تم سے کچھ پیسے مانگ لوں۔۔۔!!تو کیا تم مجھے دے سکتے ہو؟''شینل نے دکھ سے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔!! کتنے چاہیے۔۔۔!!''امسواک کی آواز میں اشتیاق تھا۔

''پندرہ لاکھ۔۔۔!!''شینل کے باپ نے پندرہ لاکھ مانگے تھے۔جو عزام نہیں دے سکا تھا۔اور اس وقت وہ اپنی پریشانی میں امسواک کو بھول گئی تھی۔

''آپ آنکھیں بند کریں۔۔۔!!!ابھی کچھ دیر میں آپ کو پیسے مل جائیں گے۔۔۔!!''امسواک نے فوراً کہا۔شینل کو اس کا جواب سن کر رونا آیا۔وہ اسے کیوں بھول گئی تھی۔

''امسواک۔۔۔!!تم جاؤ۔۔۔!! مجھے پیسے نہیں چاہیے۔۔۔!!میں بس یہ رات اس کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔۔۔!!''امسواک چلا گیا،اسے محسوس ہوتا تھا۔

''عزام۔۔۔!!تمہاری اس حالت نے میری جان نکال کر رکھ دی ہے۔۔۔!!میں بھی تمہاری یہ جدائی برداشت نہ کر پاؤں گی۔۔۔!!مر جاؤں گی۔۔۔!!تم میری جدائی میں پاگل ہو گئے۔۔۔!!اور میں صرف رو رہی ہوں۔۔۔!!تمہارے بنا میں کسی کام کی نہ رہی ہوں۔۔۔!! آسمان کے تارے بھی گواہ ہونگے۔۔۔!!

اب میں جو بھی کہوں۔۔۔!!جتنا بھی تجھے پکاروں۔۔۔!!تمہیں ان سب کی کچھ سمجھ نہیں آئے گی۔۔۔!!تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔۔۔!!'' وہ آخر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اس کے پیر میں جو زنجیر تھی۔وہ بڑے تالے سے باندھ دی گئی تھی۔وہ اس کے قریب جانے لگی۔عزام بے چینی سے ڈر کے مارے پیچھے ہٹنے لگا۔وہ ڈر رہا تھا۔کانپ رہا تھا۔ایک پاگل ایسا ہی کرتا ہے۔شنیل مزید اسے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''آج رات تم صرف میرے ہو۔۔۔!!'' وہ اس کے گلے جا لگی۔عزام نے اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کی۔وہ چیخنے لگا۔شنیل اس سے دور ہوگئی۔وہ رونے لگی۔عزام اسے دیکھ کر اچھلنے لگا۔تو شنیل کھڑکی کے راستے باہر آگئی۔وہ اب ہمیشہ کے لیے یہاں سے جانا چاہتی تھی۔وہ وادی والوں کے لیے مر چکی تھی۔اس کا اب یہاں کچھ نہیں تھا۔اور پاگل کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاتی ہے۔زار و قطار رو رہی تھی۔اس نے بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔

☆.....☆.....☆

رات کے اندھیرے میں وہ بے دھیانی میں پہاڑ کے دامن پر آخری سرے تک جا رہی تھی۔ہر قدم پر وہ تکلیف سے بلبلا اٹھتی۔اسے یقین نہیں آرہا تھا۔یہ سب ہو جائے گا۔اس کی محبت وہ رہ نہ پائے گی۔جو وہ چھوڑ کر گئی تھی۔

''بے وجہ۔۔۔!!یہ کیا ہو گیا ہے؟ کاش۔۔۔!! عزام پاگل نہ ہوتا۔۔۔!!میں اس کا ہر دکھ کا مداوا کر دیتی۔۔۔!!مگر پاگل پن کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔۔۔!!'' وہ بری طرح سے رونے لگی۔کچھ دیر بعد وہ چلتے چلتے اسی پہاڑ کے دہانے پر آکر رک گئی۔وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے جا رہی تھی۔وہ اندھیرے میں کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔وہ کپکپانے لگی۔دونوں بار اس سے پہلے جب وہ کھائی میں گئی تھی۔وہ اپنی مرضی سے نہیں گئی تھی۔ایک بار میمل نے اسے دھکا دیا تھا۔اور دوسری بار وہ سوچ سمجھ کر کھودی تھی۔اور آج اسے اپنی زندگی کا کچھ مقصد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔وہ یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانا چاہتی تھی۔

''اسواک۔۔۔!!'' اس نے پکارا۔اس کے وجود کے پار ایک ہوا کا سرد سا جھونکا لہرایا۔

''ہاں۔۔۔!!کیا بات ہے؟ آپ اتنی رو رہی ہیں۔۔۔!!اس ویرانے کو بھی وحشت سی ہو رہی ہے۔۔۔!!'' اسواک کی آواز سنائی دی۔

''کچھ نہیں۔۔۔!!میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے جانا چاہتی ہو۔۔۔!!تم ہی بتاؤ۔۔۔!!میں کیا کروں؟'' وہ آخر میں اپنے جذبات پر ضبط نہ رکھ سکی۔

''میں کیا بتاؤں؟ آپ کی زندگی کا فیصلہ ہے۔۔۔!!ویسے آپ کو اپنے گھر واپس چلے جانا چاہیے۔۔۔!!''

''اگر میں گھر واپس گئی۔۔۔!!تو وادی والے مجھے شادی سے انکار کے جرم میں گنجا کر کے۔۔۔!!پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر کے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیں گے۔۔۔!!اور مجھے زخمی حالت میں وہاں چھوڑ دیں گے۔۔۔!!'' شنیل نے دلبرداشتہ ہو کے بتایا۔

''پھر آپ اس شخص کے پاس کیوں نہیں جاتی ہیں۔۔۔!!جس سے آپ کی شادی ہو رہی تھی۔۔۔!!یا پھر کسی ایسے قریبی شخص کے پاس جو آپ کا خیال رکھے۔۔۔!!آپ کو پہچانتا ہو۔۔۔!!'' اسواک نے اسے مشورہ دیا۔

''ہاں۔۔۔!!میری ایک بہت اچھی دوست ہے۔۔۔!!اس کا نام میمل ہے۔۔۔!!کیا تم مجھے اس کے پاس لے جا سکتے ہو۔۔۔!!''

''ہاں۔۔۔!!یہ تو میرے لیے بہت معمولی سا کام ہے۔۔۔!!اگر اس نے نہیں رکھا تو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ اپنے دیس لے کر چلا جاؤں گا۔۔۔!!'' اسواک نے کہا۔وہ کچھ دیر سوچ میں چلی گئی۔پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔اور پھر اسی لمحے شنیل کھائی میں چھلانگ لگا دی۔اسواک نے اسے تھام کر اڑانا شروع

کر دیا۔اب وہ ہواؤں میں یہاں سے دور جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبح سویرے گھر کے باہر گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔میمل کے ملازم نے دروازہ کھولا،تو عجیب وغریب سے لباس میں کوئی لڑکی کھڑی تھی۔

''کون؟'' ملازم نے پوچھا۔

''میں میمل کی دوست ہوں۔۔۔!!!اس سے بہت دور سے ملنے آئی ہوں۔۔۔!!''شینل نے ملازم سے کہا۔

''اچھا۔۔۔!! آپ اندر آجائیے۔۔۔!مگر بیگم صاحبہ تو اس وقت سو رہی ہوتی ہیں۔۔۔!!خیر میں اسے کسی ملازمہ کو بتا کر جگا دیتا ہوں۔۔۔!!''شینل اس کے ساتھ اندر چلی آئی۔وہ بوڑھا ملازم اندر کہیں گھر میں گم ہوگیا۔شینل اس کے گھر کو بہت حیرت سے دیکھ رہی تھی۔وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔میمل شادی کے بعد اس طرح عالیشان زندگی گزارے گی۔میمل نیند سے جاگ چکی تھی۔ملازمہ جب اندر اس کے پاس گئی،تو وہ پہلے سے جاگی ہوئی تھی۔حوام صبح سویرے کام پر گئے تھے۔

''بیگم صاحبہ۔۔۔!!باہر آپ کی کوئی سہیلی ملنے آئی ہے؟'' ملازمہ کی زبانی سہیلی کا سنا،تو ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

''میری سہیلی۔۔۔!!نوراں مگر میری تو کوئی بھی سہیلی نہیں ہے۔۔۔!!''

''بیگم صاحبہ۔۔۔!!وہ کہتی ہے۔۔۔!!بہت دور سے اور آپ تک بہت مشکلوں اور مصیبتوں سے پہنچی ہے۔۔۔!!''نوراں نے اسے جو کچھ بتایا۔وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''اچھا۔۔۔!! اس کو الاؤنج میں بٹھاؤ۔۔۔!! میں تیار ہو کر آتی ہوں،مگر اس پر نظر رکھنا کہیں کوئی سہیلی کا بہانہ بنا کر گھر میں چوری نہ کر لے۔۔۔!!'' وہ نائٹی میں ملبوس تھی۔اس نے ملازمہ سے کہا۔ملازمہ باہر چلی گئی۔اب وہ تیار ہو رہی تھی۔

شینل لاؤنج میں بیش قیمت چیزوں کو دیکھ دیکھ تھک چکی تھی۔مگر میمل ابھی تک نہیں آئی تھی۔اسے لگتا تھا۔امسواک نے اسے غلط جگہ پہنچا دیا ہے۔وہ امسواک کے بارے میں ہی سوچنے لگی۔جب سینڈلز کی ٹک ٹک کی آواز آنے لگی۔ اس نے سامنے دیکھا،تو شیشے کے دروازے سے میمل نکل کر باہر آرہی تھی۔وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ پر رک سی گئی۔اور میمل اسے دیکھ کر ساکت کھڑی رہ گئی۔میمل کو یقین نہیں آرہا تھا۔میمل کو آتے دیکھ کر ملازمہ نوراں وہاں سے چلی گئی۔

''شینل۔۔۔!!تم۔۔۔!!اور یہاں؟'' وہ حیرانگی سے اس کے پاس آکر گلے لگ گئی۔

''میمل۔۔۔!!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا ہے؟شینل۔۔۔!!تم یہاں کیسے آگئی ہو؟اور میرا گھر کیسے معلوم کر لیا؟''میمل نے اسے کچھ دیر رونے دیا۔پھر اس نے شینل سے الگ ہو کر پوچھا۔اب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔

''میمل۔۔۔!!جہاں تمہاری شادی ہوئی تھی۔۔۔!!وہاں تمہارا دلہا ایک دن رکا ہوا تھا۔۔۔!!میں وہاں گئی تھی۔۔۔!!اور تمہارے شوہر کا پتہ معلوم کیا تھا۔۔۔!!میں تمہارے پاس آگئی ہوں۔۔۔!!میں سب کچھ چھوڑ کر آئی ہوں۔۔۔!!''اس کی بات سن کر میمل شاک میں چلی گئی۔وہ دل ہی دل میں ڈر گئی تھی۔اسے یقین نہیں آرہا تھا۔شینل زندہ ہے۔میرم نے تو اسے بتایا تھا۔شینل نے خودکشی کر لی ہے۔وہ سوچنے لگی۔

''شینل اور عزام بھاگ کر یہاں آگئے ہیں۔۔۔!! مجھے ان دونوں کو پناہ نہیں دینی چاہیے۔۔۔!!میں عزام کو نہیں بھلا سکوں گی۔۔۔!!''میمل ابھی سوچ رہی تھی۔جب شینل نے اسے چونکا دیا۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''کیا تم اکیلی ہو؟یا کسی کے ساتھ بھاگ کر آئی ہو؟''میمل نے اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔شینل نے کچھ جواب نہ دیا۔کیونکہ اس کے ساتھ امسواک تھا۔جو نظر نہیں آرہا تھا۔وہ کشمکش میں تھی۔اسے امسواک

کے بارے میں بتائے یا نہیں۔۔۔!!

’’کیا سوچ رہی ہو؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟‘‘

’’نن نہیں۔۔۔!! میں یہاں تک بالکل اکیلی آئی ہوں۔۔۔!! کوئی میرے ساتھ نہیں ہے۔۔۔!!‘‘ شینل نے جلدی سے کہا۔

’’مگر تم کیوں اس طرح اپنوں کو چھوڑ کر آ گئی ہو؟‘‘ میمل اس کے جواب سے کچھ اندازہ نہ لگا سکی، تو پوچھا۔ جواب میں اسے شینل نے سب کچھ بتانا شروع کر دیا۔ مگر وہ امسواک کا ذکر چاہ کر بھی نہیں کر سکی۔ اور جب میمل نے عزام کی پاگل پن کی بات سنی، تو اس نے شینل کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

’’شینل میں تمہیں یہاں رکھنے پر تیار ہوں۔۔۔!! مگر تمہیں میری ایک شرط ماننی ہوگی۔۔۔!!‘‘ میمل نے اسے دیکھا، شینل الجھ کر اسے دیکھتی رہی۔

’’کیسی شرط؟ میمل کیا تمہیں بھی شرائط پر کام کرنا آ گیا ہے؟‘‘ شینل کو کچھ بھی اندازہ نہ ہو رہا تھا۔

’’شینل۔۔۔!! میں تمہاری شادی کراؤں گی۔۔۔!!‘‘ میمل کی بات سن کر شینل خاموش ہو گئی۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’ٹھیک ہے۔۔۔!! جیسی تمہاری مرضی۔۔۔!! مگر میں جلد شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔!!‘‘ شینل نے اسے دیکھا۔ وہ غور سے شینل کے چہرے میں کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔

’’نہیں۔۔۔!! شادی تو تمہیں جلد ہی کرنی ہوگی۔۔۔!! کیونکہ حوام کا ایک بہت اچھا دوست ہے۔۔۔!! کنوارا ہے۔۔۔!! کچھ عرصے پہلے پردیس سے آیا ہے۔۔۔!!‘‘

’’چلو۔۔۔!! اچھا ہے۔۔۔!!‘‘ شینل نے بجھے دل سے کہہ دیا۔

’’اچھا۔۔۔!! تم اٹھو۔۔۔!! جلدی سے کپڑے تبدیل کر لو۔۔۔!! یہاں ایسے حلیے کو دیکھ کر لوگ ہنستے ہیں۔۔۔!! میں تمہیں پیارا سا جوڑا دے دیتی ہوں۔۔۔!!‘‘ اس نے شینل کو اٹھایا۔ اور واش روم میں جا کر اسے چھوڑ دیا۔ اب وہ اپنے وارڈ روب سے بالکل نیا جوڑا نکال رہی تھی۔

☆.......☆.......☆

رات کو حوام سے اسے ملایا۔ تو وہ بھی اس کے ساتھ کچھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ مگر اس کو شینل کا اپنے گھر میں رہنا پسند نہیں آیا۔ مگر میمل کے سامنے کچھ کہا نہیں۔ البتہ اس کے تاثرات سے ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ ناگواری محسوس کر رہا ہے۔ میمل نے ڈنر کے بعد شینل کو کمرے میں بھیج دیا اور خود حوام سے ملنے اس کے کمرے میں آ گئی۔ میمل چلتی ہوئی اس کے ساتھ پلنگ پر بیٹھ گئی۔

’’میمل۔۔۔!! تمہاری یہ دوست کتنے دن رہنے آئی ہے؟ کیا یہ ہمیشہ کے لیے تو یہاں نہیں آئی ہے؟ اور کیا تمہارا اب بھی اپنے وادی والوں کے ساتھ رابطہ ہے۔۔۔!!‘‘ حوام نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

’’نن نہیں۔۔۔!! ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔!! پتہ نہیں۔۔۔!! یہ میرے گھر تک کیسے چلی آئی۔۔۔!! کہہ رہی تھی۔۔۔!! آپ کا پتہ اس شادی ہال سے لیا ہے۔۔۔! جہاں ہماری شادی ہوئی تھی۔۔۔!! آج صبح جب یہ گھر آئی تھی۔۔۔!! تو اسے دیکھ کر میں خود شدید حیران ہوئی تھی۔۔۔!! کیونکہ ایک ہفتے پہلے اس کی میرم سے شادی ہونے والی تھی۔۔۔!! اور میرم نے بتایا تھا۔۔۔!! اس نے خودکشی کر لی ہے۔۔۔!! میں نے اس سے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔۔۔!! یہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔!! تبھی کھائی سے کود کر درخت میں چھپ کر بیٹھ گئی۔۔۔!! اور ایسی حرکت کر ڈالی تھی۔۔۔!! مگر خودکشی نہیں کی تھی۔۔۔!! میں اب اس کی شادی میرم سے ہی کراؤں گی۔۔۔!! اس لیے تو اس کو گھر میں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔۔۔!!‘‘ میمل نے شوہر کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ کچھ دیر حیران ہوا۔ پھر مطمئن ہو گیا۔

’’جب ایک مرتبہ پہلے اس نے شادی سے انکار کیا۔۔۔!! اور سب لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خودکشی کا ناٹک کر کے شادی سے بچ گئی ہے۔۔۔!! تو اب

کیونکر میرم سے شادی پر رضامند ہوگی۔۔۔!!'' حوام نے اپنا چشمہ نکال کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا خدشہ بجا تھا۔

''اس بار ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا۔۔۔!! کیونکہ میں شینل سے وعدہ لے چکی ہوں۔۔۔!! میں نے اسے گھر میں رہنے کی شرط یہی رکھی ہے۔۔۔!! میری مرضی کے مطابق اسے شادی کرنی ہوگی۔۔۔!! میں اسے یہ کبھی نہیں بتاؤں گی۔۔۔!! جس سے ایک مرتبہ پہلے شادی ہو رہی تھی۔۔۔!! اب دوبارہ بھی اس سے ہی ہو رہی ہے۔۔۔!! کیونکہ ہماری وادی میں لڑکیوں کو شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر کا نام تک معلوم نہیں ہوتا ہے۔۔۔!!! اسے بھی معلوم نہیں ہوگا۔۔۔!!'' میمل نے ساری بات بتادی۔ حوام نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب وہ لیٹ گیا۔ اس کے پہلو میں میمل بھی لیٹ گئی۔ مگر میمل کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ عزام کا پاگل پن کی خبر سن کر وہ بے چین ہوگئی تھی۔ اور وہ رو رہی تھی۔ مگر بے آواز آنسو تھے۔ جو گر رہے تھے۔

''یہ کیا ہوگیا ہے؟ میں تو شینل کو عزام کی زندگی سے دور کرنا چاہتی تھی۔۔۔!! عزام کا پاگل پن میری وجہ سے ہوا ہے۔۔۔!! مگر اب میں کیا کروں؟ کیسے اس کو ٹھیک کرسکتی ہوں۔۔۔!! پاگل پن کا علاج تو بڑے ماہر ڈاکٹر کے پاس نہیں ہوتا ہے۔۔۔!!'' اس نے سوچا۔ اور پھر سے بے آواز رودی۔

''ہاں۔۔۔!! مجھے جلد سے جلد شینل کی شادی کرنی ہوگی۔۔۔!! کل ہی میرم کے پاس جانا ہوگا۔۔۔!!'' وہ کچھ دیر رونے کے بعد مطمئن ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

میرم کے گھر میں میمل موجود تھی۔ وہ یہاں اس سے ملنے آئی ہی اس لیے تھی۔ وہ شینل کی شادی اس سے کرنا چاہتی تھی۔ میرم اسے دیکھ کر کچھ حیران تھا۔ وہ دونوں چائے پی رہے تھے۔

''میرم۔۔۔!! میں نے ٹھیک کہا تھا۔۔۔!!'' وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

''کیا؟'' میرم نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی۔ وہ حیران ہو رہا تھا۔

''شینل نے خودکشی نہیں کی۔۔۔!!'' میمل نے تھیلے سے بلی باہر نکال دی۔

''کیوں۔۔۔!! آپ کو کیسے پتہ چلا؟ کیا آپ کا اب بھی وادی والوں سے رابطہ ہے۔۔۔!!'' میرم نے پوچھا دونوں آنکھیں پر سوچ ہو کر چھوٹی کردیں۔

''نہیں۔۔۔!! کل شینل میرے گھر آئی ہے۔۔۔!! وہ وادی چھوڑ کر آگئی ہے۔۔۔!! یہ ایک ہفتہ اس نے میرا گھر ڈھونڈنے میں گزارا ہے۔۔۔!! وہ شادی صرف اس لیے نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔!! کیونکہ اس کا ابھی من نہیں تھا۔۔۔!!'' میمل نے اسے دیکھا۔ میرم کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔

''اب میں کیا کرسکتا ہوں۔۔۔!! جب وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔!! تب اسے اپنے گھر جانا چاہیے تھا۔۔۔!! آپ کے پاس کیا کرنے آگئی؟'' میرم کو حیرانگی کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

''کیونکہ ہمارے قبیلے کا رواج ہے۔۔۔!! جو لڑکی شادی سے انکار کرتی ہے۔۔۔!! یا خودکشی کرتی ہے۔ اور بچ جاتی ہے۔۔۔!! اس کا سر گنجا کرکے اسے پہاڑ کی چھوٹی پر کھڑا کرکے سارے قبیلے والے پتھر مارتے ہیں۔۔۔!! وہ اس سزا سے بچنے کے لیے میرے پاس آگئی۔۔۔!! میں نے اسے اس شرط پر اپنے گھر میں جگہ دی ہے۔۔۔!! میں اس کی شادی کروں گی۔۔۔!! اور اس نے میری شرط مان لی ہے۔۔۔!! میں اس کی شادی آپ سے کرنا چاہتی ہو۔۔۔!! اس بار وہ رضامند ہوگی۔۔۔!! مگر آپ کو ایک وعدہ کرنا ہوگا۔۔۔!!'' میمل نے اپنی بات کے آخر میں اس کو دیکھا۔

''کیسا وعدہ۔۔۔!! میں کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔۔۔!!'' میرم بالکل سیدھا ہوگیا۔

''آپ اسے کبھی نہیں بتائیں گے۔۔۔!! کہ آپ وہی شخص ہیں۔۔۔!! جس کی پہلے بھی آپ سے شادی ہو رہی تھی۔۔۔!!''

''کیوں؟ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں؟ یہ سب کچھ

کیوں چھپانا ہوگا۔۔۔!!'' میرم نے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

''کیونکہ۔۔۔!! آپ کو میں نے بھیجا تھا۔۔۔!! بس اگر آپ یہ باتیں رہنے دیں۔۔۔!! تو اچھا ہوگا۔۔۔!! میرا بھرم بھی رہ جائے گا۔۔۔!!'' میمل نے اٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔۔۔!! مجھے ان باتوں سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہے۔۔۔!!'' میرم نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

''تو بس چند دن بعد تمہاری اس سے شادی ہو رہی ہے۔۔۔!!'' اب وہ اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اب وہ دونوں کچھ کہہ رہے تھے۔ میرم سوچ سوچ کے جواب دے رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

میرم کا رشتہ جھٹ میمل نے طے کر دیا۔ شینل کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ دلہن بن کر میرم کے گھر میں آج موجود تھی۔ مگر یہ شادی اس کی وادی کے قبیلے کے مطابق نہیں ہوئی تھی۔ یہ بالکل مختلف تھی۔ یہاں کا ہر رسم اور رواج مختلف تھا۔ میمل نے اس کو پہاڑوں کی قسم دے کر شادی پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ لوگ پہاڑ کو بہت مانتے ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ پہاڑ پر رہتے ہیں۔ پہاڑ سے کھاتے پیتے ہیں۔ اور ان کی زندگی جو وہاں گزرتی ہے۔ وہ پہاڑ کے ساتھ ہی گزرتی ہے۔ یہ لوگ پہاڑ کے چشموں سے پانی بھر کر ان کو اپنے لیے انعام سمجھتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ پہاڑوں کو نہیں کاٹتے ہیں۔ اور نہ ان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کیونکہ وہ پہاڑ ان کو بہت کچھ دے جاتے ہیں۔ جب بھی ان لوگوں کو کچھ منوانا ہوتا ہے۔ تو یہ ایک دوسرے کو پہاڑوں کی قسم دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے بس میں ہوتا، تو پہاڑوں کی عبادت کرتے۔ اور ساتھ ہی یہ لوگ پہاڑوں کا اپنے آپ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

میرم اسے پا کر بے حد خوش تھا۔ وہ میمل کا بہت شکر گزار تھا۔ شادی اس نے نکاح کر کے کیا تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے جب اس کی شادی ہو رہی تھی۔ اس میں نکاح نہیں ہو رہا تھا۔ وہ قبیلے کے مطابق عجیب سے رسموں کے ساتھ ہو رہی تھی۔ میرم نے اس کے ساتھ اچھے خاصے وعدے کیے۔ وہ دلہن بن کر بہت پیاری لگ رہی تھی۔ میرم بھی اچھا تھا۔ اسے پسند آیا۔ مگر وہ عزام کو کبھی نہیں بھلا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اس کی بچپن کی محبت تھا۔ دوبارہ اس نے کبھی بھول کر بھی اموساک کو آواز نہیں دی۔ وہ اب اپنے سارے مسائل خود حل کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ جو بڑا مسئلہ اس کی زندگی میں عزام کا تھا۔ وہ جوں کا توں رہتا تھا۔ اموساک اس کے لیے بیکار تھا۔ وہ عزام کو ٹھیک نہیں کر سکتی تھی۔ عزام واقعی میں اس کے نصیب میں نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

عزام کی زنجیر اس کے باپ نے کھول دی تھی، اب وہ بغیر زنجیر کے تھا۔ گاؤں کے بچے بچیاں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے۔ اور اس کو پتھر مارتے۔ وہ چیختا چلاتا۔ مگر وہ لوگ اس سے محظوظ ہوتے۔ وہ ان لوگوں سے بچتا بچاتا۔ بھاگتا ہوا پہاڑ کے دامن سے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ اور وہ قہقہے لگانے لگا۔ پتہ نہیں وہ جگہ اسے کیوں جانی پہچانی سی لگتی تھی۔ اس کے پیچھے وادی کے بے شمار بچے مل کر اسی کی طرف آ رہے تھے۔ اس نے اچانک کھائی میں چھلانگ لگا دی۔ سارے بچے رک گئے۔ ان کے ہاتھوں سے پتھر گر گئے۔ وہ واپس جا رہے تھے۔ عزام کے باپ کو خبر دینے اس کے پاگل بیٹے نے خودکشی کر لی ہے۔ جب وہ اس کے گھر آئے، اسے بتایا۔ تو وہ شکر کا سانس لے پایا۔ عزام کا وجود ویسے بھی اس کے لیے ناکارہ تھا۔ وہ اس کو رکھ کر کیا کرتا۔ مگر پھر بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ اور اسے عزام کی لاش کی آخری رسومات بھی تو ادا کرنی تھی۔ یہ لوگ مرنے والے کو خوشی اور ناچ گا کر پہاڑ کے اونچی جگہ پر چھوڑ کر آ جاتے تھے۔ اور مرنے والے کی ساری قیمتی چیزیں اس کے ساتھ رکھ دیتے۔ مرنے والا ان چیزوں کے ساتھ خوشی خوشی دوسری دنیا میں چلا جاتا۔ ایسا قبیلے کا ماننا تھا۔ مگر یہ لوگ امن سے رہتے تھے۔

☆.....☆.....☆

صبح سے شنیل کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ برا ہوا ہے۔ مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ گھر کے ٹیرس پر کھڑی بے سبب رو رہی تھی۔ اس کے آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے۔ اس کا شوہر میرم ٹیرس پر بیٹھا کیمرے سے اس کی تصویریں بنا رہا تھا۔ اسے اس کے رونے کا کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ جب بھی شنیل سے کچھ پوچھتا۔ شنیل یہی کہتی۔ ''گھر والوں کی یاد آرہی ہے۔'' اور اس نے اس طرح کا ذکر حوام سے بھی سنا تھا، حوام کا کہنا تھا میمل تنہائی میں اکثر روتی رہتی ہے۔ اور وہ بھی جب پوچھتا ہے۔ ''کیوں رو رہی ہو؟'' میمل کہتی تھی۔ ''وادی والوں کی یاد آگئی تھی۔۔۔!!''

دوسری طرف میمل کا دل انجانے خدشے سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے سفید ساڑھی زیب تن کی تھی۔ مگر وہ اپنے حال سے خوش نہیں تھی۔ کچھ دن پہلے اس کے شوہر کے بچے آئے تھے۔ وہ اتنی نوجوان ماں کو دیکھ کر باپ سے بہت لڑے تھے۔ مگر حوام نے سب کو گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ کیونکہ اس کے بچے حوام اور میمل کے جوڑی پر ٹھٹھے اڑا رہے تھے۔ اور آج تو میمل کو ایسا لگا تھا۔ جیسا اس کا دل ہی کہیں کھو رہا ہے۔ مگر یہ احساس تو اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے عزام کے پاگل پن کی خبر سنی تھی۔ تب بھی وہ اتنی پریشان اور بے چین نہیں ہوئی تھی۔ جتنی وہ آج ہوئی تھی۔

اسمواک آخری بار شنیل سے ملنے آیا تھا۔ عزام کی موت کی خبر شنیل کے پاس لایا تھا۔ مگر پھر وہ شنیل کو اپنے گھر میں خوش دیکھ کر واپس چلا گیا۔ وہ آج بھی پہاڑ کے اسی گپھا میں رہتا تھا۔ جب عزام نے خودکشی کی، تو وہ گپھا میں کھڑے ہو کر دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ اور اگر بچاتا بھی تو وہ خود جل کر بھسم ہو جاتا۔ وہ اب واپس اپنی دنیا میں جانا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک دن شنیل کیمرے میں اپنی تصویریں دیکھ رہی تھی، تو اس نے اپنی وہ تصویریں بھی دیکھ لیں۔ جو میرم نے اس کی اس وقت کھینچی تھیں۔ جب وہ وادی میں تھی۔ اور وہاں میرم آگیا تھا۔ وہ بہت حیران ہوئی۔ اس نے میرم سے اس بارے میں پوچھا۔ وہ ایک تصویر میں وادی میں گھوم رہی تھی۔ دوسری میں جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کے گھوڑ میں میسنا تھا۔ وہ حیران ہوتی چلی گئی۔

''میرم۔۔۔!! آپ کے کیمرے میں میری یہ تصویریں کہاں سے آگئیں؟'' شنیل نے ایک تصویر میرم کے سامنے کردی۔ میرم اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

''ہاں۔۔۔!! یہ جب میں تمہاری وادی میں آیا تھا۔۔۔!! تم تب پہلی بار مجھے نظر آئی تھی۔۔۔!!! اور میں نے تمہیں پسند کرلیا تھا۔۔۔!! تمہاری کچھ تصویریں بنالیں۔۔۔!! پھر تمہارا رشتہ مانگ لیا تھا۔۔۔!! ہماری شادی طے ہوگئی تھی۔۔۔!! مگر شادی والے دن تم نے کھائی میں چھلانگ لگا دی۔۔۔!! اور اسی دن میں واپس لوٹ آیا۔۔۔!!'' میرم کی باتیں سن کر وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

''میرم۔۔۔!! مگر یہ اتفاق نہیں ہے کہ پھر سے میری شادی تمہارے ساتھ ہوگئی۔۔۔!! اور تم نے مجھے کچھ بھی نہیں بتایا۔۔۔!! کیا تم جان بوجھ کر خاموش تھے۔۔۔!!'' شنیل نے میرم کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ وہ حیرانگی سے میرم کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں۔۔۔!! یہ اتفاق بالکل بھی نہیں ہے۔۔۔!! دراصل میں جب میمل بھابی سے ملا تھا۔۔۔!! انہوں نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔۔۔!!! انہوں نے مجھے وادی میں تم سے ملنے بھیجا تھا۔۔۔!! وہ تمہیں پہاڑوں کی شہزادی کہتی تھی۔۔۔!! غلط نہیں کہتی تھی۔۔۔!!! اس دن جب میں نے تمہیں دیکھا تھا۔۔۔!! تو مجھے یقین ہوگیا تھا۔۔۔!! تم ہی شنیل ہو۔۔۔!! جب تم جانے لگی تھی۔۔۔!! میں نے زور سے تمہارا نام بھی پکارا تھا۔۔۔!!! تم مڑ کر دیکھتی رہی تھی۔۔۔!!'' شنیل کو یاد آیا۔ ایک دن چشمے کے جھولے پر بیٹھی ہوئی، جھولنے کے بعد جب وہ واپس جا رہی تھی۔ تب اس نے کسی انجان مرد کی آواز سنی تھی۔ بعد میں

اسے اس نے جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔

''ہاں۔۔۔!! مجھے یاد آگیا ہے۔۔۔!!'' وہ سر ہلانے لگی۔

''مجھے۔۔۔!! میمل نے منع کر دیا تھا۔۔۔!! وہ تمہیں پتہ نہیں کیوں یہ سب نہیں بتانا چاہتی تھی۔۔۔!!'' میرم نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور اسے سب کچھ سچ سچ بتانا شروع کر دیا۔ اور جب اسے پتہ چلا۔ میرم کو میمل نے اس کے پاس وادی میں بھیجا تھا۔ اس کی بہت تعریفیں کی تھیں، وہ بہت دکھی ہوئی۔ مگر وہ میرم کو کچھ ظاہر نہیں کر پا رہی تھی۔ اسے سب کچھ سمجھ آ گیا۔ اور وہ سوچنے لگی۔ وہ کڑی سے کڑی ملاتی چلی گئی۔ اور ایک زنجیر سی بن گئی۔ ایک ایک منظر اس کی آنکھوں میں واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

''مجھے میمل نے دھکا کیوں دیا۔ اور جب میں بچ گئی، تو پھر میرم کو میمل نے میرے پاس اتنے دور تک کیوں بھیج دیا۔ صرف اور صرف مجھے عزام سے دور کرنے کے لیے۔۔۔!! کیونکہ میمل بھی عزام سے محبت کرتی تھی۔۔۔!! مگر بتاتی نہیں تھی۔۔۔!!! اور جب میں میمل کے پاس آئی۔۔۔!!! اس نے فوراً میرم سے میری شادی کر دی۔۔۔!! وہ ڈرتی تھی۔۔۔!! کہیں عزام ٹھیک ٹھاک ہو کر میرا نہ ہو جائے۔۔۔!!'' وہ دیر تک سوچ سوچ کر روتی رہی، اور سوچتی رہی۔ اسے سب کچھ سمجھ میں آ چکا تھا۔ اچانک اس نے میرم کو دیکھا۔

''میرم۔۔۔!! میں ابھی کچھ دیر بعد آتی ہوں۔۔۔!!'' وہ ڈورتی ہوئی اوپر چھت پر جانے لگی۔ ایک دم اسے امسواک یاد آ گیا تھا۔ وہ اس سے تصدیق کرنا چاہ رہی تھی۔ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ چھت پر کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ میرم اسے حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا ہو گیا۔

☆......☆......☆

شینل رو رہی تھی۔ کچھ دیر رونے کے بعد اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''امسواک۔۔۔!! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔۔۔!!'' اچانک اس کے ارد گرد سرد ہوا کا جھونکا گزر گیا۔

''جی۔۔۔!! میری کیسی مدد چاہیے۔۔۔!! حکم کریں۔۔۔!!'' امسواک کی آواز سنائی دی۔

''امسواک۔۔۔!! کیا تمہارے پاس غیب کا علم ہے۔۔۔!!''

''ہاں۔۔۔!! موجودہ زمانے میں جو کچھ ہو رہا ہے۔۔۔!! میں اس کے بارے میں علم رکھتا ہوں۔۔۔!!'' اسے آواز سنائی دی۔

''تم میرے پاس عزام کی موت کی خبر لائے تھے۔۔۔!! مگر میری ایک دوست میمل اسے بہت چاہتی تھی۔۔۔!! کیا تم میمل کی پرانی زندگی کے بارے میں مجھے کچھ بتا سکتے ہو؟''

''ہاں۔۔۔!! مگر کتنی پرانی باتیں آپ جاننا چاہتی ہے؟ اگر سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہوگی۔۔۔!! تو میں کچھ نہیں بتا سکوں گا۔۔۔!!'' امسواک نے بتایا۔

''امسواک۔۔۔!! میری دوست میمل کیا عزام کو چاہتی تھی۔۔۔!! عزام کی محبت میں اس نے مجھے پہاڑ سے نیچے دھکا دیا تھا؟ تاکہ میں مر جاؤں۔۔۔!!! اور عزام اس کا ہو جائے۔۔۔!!'' شینل نے جلدی سے اندیشے والے سوالات زبان پر لے آئے۔ امسواک سوچتا رہا۔ اور کافی دیر بعد اس نے جواب دیا۔

''ہاں۔۔۔!! تمہاری وہی دوست۔۔۔!! جسے تم نے رات کے اندھیرے میں روح بن کے ڈرایا تھا۔۔۔!! یہی سب کچھ اس کی مرضی سے ہوا تھا۔۔۔!! اس نے تمہارے کہنے پر عزام سے اظہار محبت بھی کیا تھا۔ مگر عزام نے اسے انکار کر دیا تھا۔۔۔!!! اور میمل نے پہلے خود کو مارنے کی کوشش کی تھی۔۔۔!! مگر عزام نے اسے بچا لیا تھا۔۔۔!!! اور تب اس نے سوچا کہ اگر عزام اس کا نہیں ہو سکتا ہے۔۔۔!! تو تمہارا بھی نہیں ہونا چاہیے۔۔۔!! وہ تم سے نفرت کرتی تھی۔۔۔!!! اور کرتی ہے۔۔۔!!! اور عزام اب جس دنیا میں ہے۔۔۔!! وہ بہت جادوئی دنیا ہے۔۔۔!! بہت خاص ہے۔۔۔!! وہ

وہاں زیادہ خوش ہوگا۔۔۔!!“ اسواک کی آواز آئی۔ شینل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئیں۔

”اسواک۔۔۔!! پلیز مجھے اپنا چہرہ دکھا دو۔۔۔!!

بس آج کے بعد تمہیں کبھی نہیں بلاؤں گی۔۔۔!! آج سے تم کبھی نہیں آؤ گے۔۔۔!!“

اچانک اس کے اردگرد خاموشی چھا گئی۔ پھر اس کے سامنے سنہرے رنگ والا ایک بندہ نظر آیا۔ اس کے بال بہت گھنے اور خوبصورت تھے۔ اس کی آنکھیں بہت بڑی اور گہری تھیں۔ قد آٹھ فٹ سے نکلتا تھا۔ بال کندھوں تک تھے۔ اور اس کا لباس سفید تھا۔ جس پر سنہرا کام ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔ وہ بہت پیارا تھا۔ دل اور آنکھوں میں اس کا سراپا جیسے گھس رہا تھا۔

”آج کے بعد میں آپ کو کبھی نظر نہیں آؤں گا۔۔۔!! آپ جتنا پکاریں گی۔۔۔!! آپ کی پکار مجھ تک سنائی نہیں دے گی۔۔۔!! کیونکہ ہمارے قبیلے کا قانون ہے۔۔۔!! جو ہمارا محسن ہوتا ہے۔۔۔!! وہ ہمیں کبھی نہیں دیکھ سکتا ہے۔۔۔!! مگر آپ نے مجھے دیکھ لیا ہے۔۔۔!! آپ کا احسان آج میں نے اتار دیا ہے۔۔۔!! الوداع۔۔۔!! الوداع۔۔۔!! الوداع“ اسواک نے کہا۔ اور دھیرے دھیرے غائب ہوگیا۔ وہ اسے دیکھ کر الوداعی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اب وہ دل ہی دل میں خود سے کہہ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی۔

”میمل۔۔۔!! تم نے کبھی بتایا ہی نہیں۔۔۔!! تم بھی عزام کو چاہتی ہو۔۔۔!!! اس سے محبت کرتی ہو۔۔۔!! کاش تم مجھے صرف ایک بار بتا دیتی۔۔۔!! میں عزام کو تم سے بانٹ لیتی۔۔۔!! ہم دونوں ایک عزام سے شادی کر کے خوشی کی زندگی بسر کرتیں۔۔۔!! ہماری وادی میں تو خود ایک لڑکے کی بیوی۔

اس کی دوسری اور تیسری شادی تک کروا لیتی ہے۔۔۔!! اگر میں عزام سے کہہ دیتی۔۔۔!! وہ کبھی انکار نہ کرتا۔۔۔!! مگر تم نے کبھی دل کی بات بتائی ہی نہیں۔۔۔!! حالانکہ کتنا پوچھا تھا۔۔۔!! میں نے بار بار پوچھا تھا۔۔۔!! میمل میں زندگی بھر تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔۔۔!! آج ہمارے پاس سب کچھ ہے۔۔۔!!! مگر خوشی نام کو نہیں ہے۔۔۔!! تم میری شکل کو ترس جاؤ گی۔۔۔!! مگر میں تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔۔۔!!! اور اگر کہیں آمنا سامنا ہو بھی گیا۔۔۔!! تو ایک اجنبی بن کر تمہیں نظرانداز کر دوں گی۔۔۔!! مگر کیا کریں ہمارے شوہر آپس میں دوست ہیں۔۔۔!! کبھی کبھار دوستوں کی بیویوں سے بھی تعلق رکھنا ہی پڑتا ہے۔۔۔!! ہمارا تعلق اگر رہ پایا بھی تو صرف سلام کلام تک محدود رہے گا۔۔۔!!“ اس نے سوچ کر اثبات میں سر ہلایا۔

”شینل۔۔۔!! کیا سوچ رہی ہو؟“ میرم نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اس کے پیچھے چھت پر آ گیا تھا۔ میمل نے اپنے چمکتے آنسو صاف کیے۔

”میرم۔۔۔!! تم کہتے تھے۔۔۔!! کہ ہمیں باہر چلے جانا چاہیے۔۔۔!! مگر میں ہمیشہ انکار کرتی تھی۔۔۔!! آج میں کہہ رہی ہوں۔۔۔!! میں تمہارے ساتھ پردیس جانے کو تیار ہوں۔۔۔!!“ اس نے شوہر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ میرم نے خوشی سے اسے گلے لگایا۔ وہ جو میمل کی احسان مند تھی کہ اس نے اس کی شادی کروائی ہے۔ آج وہ احسان اس نے ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا۔ وہ شادی نہیں عزام کے پاگل پن کی زمہ داری تھی۔ اور جس دن عزام مرا تھا۔ اس دن شینل کو لگا تھا۔ اس کا دل نہیں رہا۔ مگر پھر بھی اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ اور اسے زندگی گزارنی تھی۔ مگر ادھوری نامکمل ناخوش گوار، اور میمل کی زندگی بھی روکھی پھیکی سی تھی۔ ایک بوڑھا شوہر اسے جتنی بھی دولت کیوں نہ دے دیتا۔ مگر وہ پیار اسے کبھی نہیں دے سکتا تھا۔ آج ان دونوں کی راہیں جدا ہوگئی تھیں کیونکہ وہ کچھ دنوں میں باہر ملک شفٹ ہونے والے تھے۔ **ختم شد۔**

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com